تخلیق

اظہر جاوید نمبر

ماہنامہ تخلیق لاہور

اظہر جاوید نمبر

مرتّب : سونان اظہر جاوید

جلد : 43	جون 2012ء	شمارہ : 3

قیمت فی پرچہ : 80روپے .... سالانہ : 500روپے

قیمت اظہر جاوید نمبر : 300روپے

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور۔54000

فون نمبرز:04236671007، 04236620499......موبائیل فون:03218899007

ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com......ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14رفروری 2012ء کو اپنی جان...... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود...... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کر رہا ہوں۔دم ہے تو "تخلیق" پیہم رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "صریر"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔(انشااللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔اس مشکل وقت میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر تخلیق کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کی باقاعدہ اشاعت کے لئے "تخلیق فاؤنڈیشن" قائم کی جا رہی ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے دفتر "تخلیق" کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔یورپ اور امریکہ کے لئے زرِ تعاون پچاس (50) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِ سالانہ صرف 500 روپے ہے۔

PAKISTAN
Soonan Azhar
E/13/13C-1, Bismilla Lane, Cavalary Ground, Officer Colony, St.No.7
Walton Lahore-Cantt.
Ph: 04236620499
Cell : 0321-8899007
Email:ajavedtakhleeq@gmail.com
Email:ajavedtakhleeq@yahoo.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus,
New Delhi-110001,
India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
Northern California
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

تخلیق۔اظہر جاوید نمبر 2012ء

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	7
اظہر جاوید کی شخصیت	سونان اظہر جاوید	13
محترمہ بے نظیر بھٹو کی جلاوطنی کے بعد پہلی پریس کانفرنس		15

فن، شخصیت اور تاثرات (پاکستانی مصنفّین)

غمِ محرومی جاوید اظہر	انور سدید	19
کچھ اظہر جاوید کے بارے میں	سیّد مشکور حسین یاد	26
اظہر جاوید۔کچھ یادیں	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	28
اظہر جاوید۔ایک کھرّا......	فخر زمان	30
ایک مہربان دوست کی یاد	ڈاکٹر سلیم اختر	33
محبتوں کا سفیر	عابد حسن منٹو	34
کون۔اظہر جاوید؟	مستنصر حسین تارڑ	35
جدید رومانی شاعر۔اظہر جاوید	خواجہ محمد زکریا	37
سراپا اسرار۔اظہر جاوید	مرتضیٰ برلاس	44
دوستوں کا دوست۔اظہر جاوید	نذیر ناجی	48
کبھی نہیں کبھی نہیں!	یونس جاوید	49
لے گئے خاک میں ہم......	صابر لودھی	53
کاش! یہ ''تخلیق'' کی موت نہ ہو	محمود شام	59
اظہر جاوید کے بارے میں......	قاضی جاوید	62
اظہر جاوید۔چند یادیں	رشید امجد	70
ادب کا با اثر راہنما	ظفر عظیم	73

اظہر جاوید۔درونِ خان (گوشۂ خاندان)

میری ماں	اظہر جاوید	81
سعدیہ۔سونان	اظہر جاوید	82
دل کے نہاں خانوں سے	سعدیہ سونان	83
آخری دیدار	سونان اظہر جاوید	84

ترنجن (خواتین کی یادیں اور تاثرات)

اظہر جاوید چند تاثرات	بانو قدسیہ	91
اظہر جاوید کا تخلیقی عہد	بشریٰ رحمان	95
کدھر سے آتے ہیں......	عطیہ سیّد	99
آبرومند شاعر۔اظہر جاوید	کشور ناہید	101
حسّی لطافت کا شاعر	عذرا اصغر	102
اب وہ آواز گم ہوگئی	بشریٰ اعجاز	106
نہ جاتا کوئی دن اور......	سلمیٰ اعوان	110
تنہا راستوں کا مسافر	سیما پیروز	114

رب راکھا	تسنیم منٹو	117
اظہر جاوید۔ ایک زندۂ جاوید	امینہ عنبرین	121
اظہر جاوید	ڈاکٹر مرحب قاسمی	123
ہم نے کیا کھویا	لبنیٰ جاوید	126
محبتوں کا سفیر	عمرانہ مشتاق	129
عشق کے سلسلے	دردانہ نوشین خان	131
دیکھا اس بیماریِ دل نے......	منور سلطانہ	133
اظہر جاوید	صائمہ نورین	135
باعثِ عقیدت اظہر جاوید	سحر حفیظ	141
''جی اظہر!''	عافیہ جہانگیر	144

مزید پاکستانی مصنفّین

خالق اور تخلیق	عزیز میرٹھی	149
اظہر جاوید کی یاد میں	طارق محمود	154
وضع دار اظہر جاوید	علی سفیان آفاقی	157
اظہر جاوید اور میں	ڈاکٹر کنول فیروز	158
اظہر جاوید۔ یارِ طرحدار	اعزاز احمد آذر	163
محبت فاتح عالم	جمیل آذر	166
اظہر جاوید کے بارے میں	سرفراز سیّد	169
نصف صدی کا قصّہ	پیروز بخت قاضی	173
رابطے ختم ہو گئے سارے	ظفر علی راجا	175
غمِ دوست	سلطان رشک	180
اظہر من الشّمس	نجم الحسن رضوی	184
مر بھی جائیں ہم تو......	ضیاء الرحمان ضیا	188
میرا ہم نفس	سلطان احمد علوی	190
آہ! اظہر جی	قیصر نجفی	193
اظہر جاوید سے آخری ملاقات	ملک مقبول احمد	200
اظہر جاوید ایک یار باش شخصیت	راجہ اسد علی خان	203
خوددار اظہر جاوید	نوید قتیل	206

منظوم نذرانے

اظہر جاوید!	مشکور حسین یاد	211
غبارِ غفلت۔ اظہر جاوید	امین راحت چغتائی	211
قہقہہ بردار خوش نوا	ناصر زیدی	212
تعزیتی غزل	اقبال گرامی	212
اظہر جاوید کی یاد میں	انور سدید	213
عجیب سلسلہ ہے	سلیم آغا قزلباش	215
جی اظہر!	یونس جاوید	215
تخلیق کار	دل نواز دل	216
اظہر جاوید کی یاد میں	صفدر سلیم سیال	216
بھول سکتا ہے انہیں کوئی......	وصی شاہ	217
روئے قرطاسِ ادب	شبہ طراز	217
بیادِ اظہر جاوید	بسمل صابری	218
اظہر جاوید	رشیدہ عیاں	219
اظہر جاوید کے لیے	صفدر صدیق رضی	220
اظہر تمہارے بعد......	مظہر بخاری	220
ہدیۂ عقیدت	اقبال راہی	220
اظہر جاوید کے نام	اسلم حنیف	221
اظہر جاوید کے لیے	حمیرا راحت	222
خوشبوؤں والا گھر	شبہ طراز	222
اظہر جی!	سرفراز سیّد	223
آفتابِ صحافت۔ اظہر جاوید	خورشید احمد	223
اظہر جاوید کے نام	مناظر عاشق ہرگانوی	224
اظہر جاوید کی یاد میں	زمان کنجاہی	224

اظہر جاوید — عمرانہ مشتاق — 225
اظہر جاوید کی یاد میں — آفتاب راجا — 226
اظہار عقیدت — محمد ضیاءاللہ قریشی — 226
نذرِ اظہر جاوید — رومانہ رومی — 227
اظہر جاوید کی یاد میں — نسرین نگہت سبزواری — 228
وفا کا پیکر — زمان کنجاہی — 228

غیر ملکی مصنّفین کے نذرانے

لاہور سنسان......خالی پاکستان — نیّر جہان — 231
اظہر جاوید......ہمیشہ یاد رہیں گے — نارنگ ساقی — 233
اظہر جاوید اور میں — سیّد ذہانت حسین — 236
اگلی صفوں کا...... — کشمیری لال ذاکر — 238
اظہر جاوید......میرا لاہور — کیول دھیر — 240
کبھی آپ اپنی مثال تھا — تاشی ظہیر — 243
اظہر جاوید۔وجودی زاویہ — مناظر عاشق ہرگانوی — 248
غمِ عشق گر نہ ہوتا — کرشن کمار طُور — 251
بھگوان سٹریٹ — اختر شمار — 257
بیادِ اظہر جاوید — پروین شیر — 260
اظہر! واپس آجاؤ — نذیر فتح پوری — 262
اظہر جاوید ایک دوست — کلدیپ راج جوشی — 267
خاکِ درِ مے فروش — مجید اختر — 269

اظہر جاوید۔ چند نادر اور نایاب تصویریں

اظہر جاوید۔ اپنی تحریروں کے آئینے میں

اپنی بات (اداریے) — 283
چلو اچھا کیا — 293
جنم دن — 293
کج ادا کے لئے — 294
محبوبہ 2008ء — 295
بجھتی ہوئی اِک شام — 296
11/اپریل کی شام (ناکام محبت کی تقریب) — 297
ایک نظم — 298
اکیلا شجر — 298
ڈھلتی شام (آخری نظم 12 دسمبر 2011ء) — 299
چند قطعات — 300
گھر چلے ہو یار تو یہ کرم بھی فرماؤ — 301
یہ دعاؤں کی بے ثباتی ہے — 301
خوابوں کے سہارے جینے دو یہ خواب تو ہم...... — 302
کس نے کتنے دن جینا ہے، کس نے کیسے مرنا ہے — 302
موت نے دستک دی تھی لیکن دل دروازہ بند رہا — 303
کوئی نہیں اُمید نہ حسرت، پھر بھی جینا پڑتا ہے — 303
جب جب شعر کا موڈ بنا ہے، بتی گُل ہو جاتی ہے — 304
ہزار ضبط کروں پھر بھی ٹوٹ جاتا ہوں — 304
گھر، اِک اپنا گھر بھی ہوتا، سوچیں جب تڑپاتی ہیں — 305
اُس نے نہیں آنا ہے لیکن آنکھیں رستہ تکتی ہیں — 305
اُوٹ پٹانگ یہ کہتا ہے — 306
اُوٹ پٹانگ کی ہوگئی...... — 306
اُوٹ پٹانگ نے عید منائی — 307
تھر کی پیاس — 307
خاکہ — اسرار زیدی — 302
کالم — محفل محفل — 312
انٹرویو (حمید اختر سے) اظہر جاوید — 314
انٹرویو (اظہر جاوید سے) عزیز جبران — 320
پنجابی کہانی۔ دوجا، ٹی بیگ۔ اظہر جاوید — 322
اظہر جاوید کے خطوط — 325

تعزیتی کالم

شبنم شکیل 334
بیدار سرمدی 335
حسین شاد 338
بیراجی 339
شہباز انور 340
شاہد بخاری 342

سوالنامے کی روشنی میں

لطیف قریشی (امریکہ) 345
شباب للت (انڈیا) 349
ڈاکٹر طاہرہ بخاری (پاکستان) 352

انجمن خیال (خطوط)

لطیف قریشی (امریکہ) 345
مسز شمیم خان اور خان پرویز 355
سلطان احمد علوی (سرگودھا) 355
عادل حسن (کراچی) 356
امین راحت چغتائی (کراچی) 356
خورشید عالم سیّد (کراچی) 356
بشریٰ رحمان (اسلام آباد) 356
سجاد مرزا (گوجرانوالہ) 357
صفدر سلیم سیال (جھنگ) 357
پروفیسر زُہیر کنجاہی (راولپنڈی) 357
رضی الدین رضی (ملتان) 357
نجم الحسن رضوی (کراچی) 357
سالار مسعودی 358
برکات احمد نیاز 359
جمیل صدیقی 360
ایس ایم معین قریشی (کراچی) 360

سرورق

سلیمہ ہاشمی صاحبہ

ناشر

سونان اظہر جاوید 0321-8899007

طابع

بیدار سرمدی

مطبع

بکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی۔ لاہور

پہلی بات

14رفروری 2012ء کی صبح کو والدِ محترم اظہر جاوید کی اچانک وفات سے مجھ پر غم کا ہی نہیں مصیبتوں کا پہاڑ بھی ٹوٹ پڑا۔ میں حیران تھا کہ پلک جھپکنے میں یہ سانحہ کیوں کر ہو گیا کہ ایک ہنستا، چمکتا، مسکراتا اور دوستوں کی محفلوں کو گُدگُداتا ہوا شخص زندگی سے محروم ہو گیا۔ اردو کے ممتاز ادبی رسالہ ''تخلیق'' کی آبیاری 42 برس تک کرنے والا فردِ فرید ہمارے سامنے بے جان پڑا تھا۔ ان کے ہزاروں دوستوں نے جو پوری اُردو دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اس خبر کو بے یقینی سے سن رہے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ خبر غلط ہو، لیکن قدرت کے اسرار کو کون جانتا ہے؟ ان کے سب دوستوں کو پریشانی یہ تھی کہ اب ''تخلیق'' کا کیا بنے گا جو اظہر جاوید صاحب کی رگِ جان تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''تخلیق'' میری زندگی میں تو ہرگز بند نہیں ہو گا۔'' انہوں نے اپنے وعدے کا پالن کیا۔ اس کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کرتے رہے اور اب ان کے سب دوست شہادت دیتے ہیں کہ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھا۔

انہیں لحد میں اتارا جا رہا تھا تو سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے کہ ان کے حقیقی بیٹے کی حیثیت میں ''تخلیق'' جو اظہر جاوید کی شناخت تھا، اب میں نے مستقبل میں ان کی پہچان کے طور پر قائم رکھنا تھا۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا احساس تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ جناب صہبا لکھنوی کی وفات کے بعد ماہنامہ ''افکار''، جناب پیام شاہ جہان پوری کی وفات کے بعد پندرہ روزہ ''تقاضے''، ڈاکٹر فہیم اعظمی کی وفات کے بعد ماہنامہ ''صریر''، جناب شبنم رومانی کی رحلت کے بعد سہ ماہی ''اقدار''۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کے بعد ''اوراق'' اور جناب احمد ندیم قاسمی کی وفات کے بعد عہد ساز جریدہ ''فنون'' بھی جاری نہیں رکھے جا سکے تھے۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ میرے والد اظہر جاوید کو **محترم تاشی ظہیر، محترم نارنگ ساقی، محترم لطیف قریشی، محترم جاوید منظور، محترم محمود شام، محترم ضیا الرحمٰن ضیا، محترم راجہ اسد علی، محترمہ سیما پیروز، محترمہ تسنیم منٹو، محترمہ لبنیٰ جاوید، محترمہ غزالہ نثار صاحبہ** اور سب سے اہم **محترمہ آنٹی نیّر جہاں** جیسے مخلص دوست ملے جنہوں نے میری ہمت بندھائی اور ''تخلیق'' کے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے اور طباعت و اشاعت میں عملی معاونت اسی طرح کرنے کا وعدہ کیا جس طرح وہ اظہر جاوید کی زندگی کے آخری لمحات تک کرتے رہے ہیں۔ ان کی اعانت نے مجھے اپنے غم پر قابو پانے اور ''تخلیق'' کی اشاعت کو تسلسل دینے کا حوصلہ دیا۔ اور میں نے سب سے پہلے ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کرنے کے لیے کمرِ ہمت باندھ لی۔ ''تخلیق'' کے دفتر کے بند دروازے کھولے اور بھگوان سٹریٹ میں ان کے کمرے کو آباد کیا۔ اب اس دفتر میں اظہر جاوید وجودی طور پر تو موجود نہیں لیکن ان کی روح آپ کے خیر مقدم کے لیے موجود ہے اور ان کی ادارتی کرسی بھی خالی نہیں، اس پر والد صاحب کے دوستوں نے مجھے بیٹھنے کا اعزاز عطا کیا ہے، میں اپنے مقدور کے مطابق اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور آپ کے عملی تعاون اور مشوروں کے لیے ہمہ وقت چشم براہ رہوں گا۔ (انشاءاللہ)

سب سے پہلے میں نے ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو اس شخص کے بارے میں ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں ''تخلیق'' میں اپنی کوئی تخلیق کبھی نہیں چھاپی۔ اب ان کے سینکڑوں دوست ان کو خراجِ تحسین ادا کر رہے ہیں، ان کے اوصافِ حسنہ کو یاد کر رہے ہیں اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ''تخلیق'' ہی خانوادۂ اظہر جاوید کی پہچان ہے لیکن ان کا بیٹا سونان اظہر جاوید جسے اپنی کم علمی کا احساس ہے، ان کی میراث کو قائم رکھنے کی اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرے گا اور ''تخلیق'' اہلِ ادب کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہے گا۔

میں نے اظہر جاوید صاحب کی اس یادگار کو ہمیشگی عطا کرنے کے لیے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کرنے کا ارادہ بھی کر لیا ہے۔ اسے مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے مجھے آپ کے قیمتی مشوروں اور معاونت کی ضرورت ہے۔ اس ادارے کے تحت جناب اظہر جاوید کی نظم و نثر کی کلیات، ان کے غیر مطبوعہ مضامین ''تخلیق'' کے اداریے اور ان کی ''آپ بیتی'' جو وہ خفیہ طور پر لکھتے رہے تھے، چھاپنے کا پروگرام ہے۔ اور ''تخلیق'' کو بھی اظہر جاوید صاحب کے انداز میں اور ان کے معیار کے مطابق چھاپنے کا آرزومند ہوں۔

''اظہر جاوید نمبر'' کی ترتیب و تدوین میری ابتدائی کاوش ہے۔ مجھے عملی راہنمائی **ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب یونس جاوید، محترمہ امینہ عنبرین، جناب سرفراز احمد سیّد اور شاہد بخاری** سے حاصل ہوئی۔ اس کے خوبصورت سرورق کے لیے میں **محترمہ سلیمہ ہاشمی** کا شکرگزار ہوں جو فیض احمد فیض جیسے عظیم باپ کی عظیم صاحبزادی ہیں۔ میں ''تخلیق'' کے قلمی معاونین کا بھی شکرگزار ہوں جن کے تاثرات سے یہ پرچہ مزّین ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ''تخلیق دوستوں'' کے سب مضامین اس پرچے میں شامل نہیں ہو سکے۔ ڈاک کی غیر معمولی شرح کی وجہ سے اس کی ضخامت محدود کرنی ناگزیر ہو گئی تھی۔ اظہر جاوید صاحب کو یاد رکھنے کا سلسلہ آئندہ شماروں میں بھی جاری رہے گا اور میں ان مضامین سے استفادہ کروں گا جو اس پرچے میں شامل نہیں کیے جا سکے۔ کچھ دوستوں نے 2012ء کو ''سال اظہر جاوید'' کے طور پر منانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس مشورے کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا ہوں۔ ''تخلیق'' کا اگلا شمارہ معمول کا پرچہ ہوگا۔ تاہم اس میں ''گوشۂ اظہر جاوید'' بھی شامل ہوگا۔ اور یہ سلسلہ 2012ء کے پرچوں میں بھی جاری رہے گا (انشاءاللہ)۔ زیرِنظر ''اظہر جاوید نمبر'' میں کوئی حصہ کمزور ہو یا کہیں خامی نظر آئے تو اس کو نظرانداز کر دیں کہ یہ میری پہلی ادارتی کاوش ہے۔ اور میں آپ کی دعاؤں اور عملی تعاون کا محتاج ہوں۔ میں اس سمت میں گامزن رہنا چاہتا ہوں جو میرے والدِ محترم نے ''تخلیق'' میں متعین کی تھی۔ اللہ کی رحمت سے کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جناب اظہر جاوید

اعزاز : صدارتی اعزاز برائے حُسنِ کارکردگی

شعبہ : ادب

جناب اظہر جاوید اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں۔ آپ جنوری 1938ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ابھی آپ سترہ سال کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے بعض ہفت روزہ اخبارات (ضرب مجاہد اور رفیق) کی ادارت کی۔ آپ نے سینئر شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ ''خلوص'' کا آغاز کیا۔ بعد میں آپ لاہور آ گئے اور کچھ عرصہ کے لیے ماہانہ جریدے ''عکس نو'' کی ادارت کی۔ اس کے بعد آپ نے روزنامہ ''امروز'' میں رپورٹر کے طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کالم لکھنے شروع کر دیے۔ پہلے پچھلی کئی دہائیوں سے مدیر کے طور پر ادبی جریدے ''تخلیق'' کی بے لوث ادارت کر رہے ہیں۔ بطور شاعر اور ادیب بڑی تعداد میں آپ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں غم عشق اگر نہ ہوتا (اردو شاعری) ''بڑی دیر ہو گئی''، ''ناکام محبت''، ''ساحر لدھیانوی''، ''موت میرے تعاقب میں'' شامل ہیں۔ آپ کو ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی جانب سے متعدد انعامات ملے ہیں۔

ادب کے شعبے میں آپ کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر، اسلامی جمہوریہ پاکستان نے جناب اظہر جاوید کو ''صدارتی اعزاز برائے حُسن کارکردگی'' عطا کیا۔

مقام : اسلام آباد

تاریخ : 23 / مارچ، 2012ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکستان

میں بحیثیت صدرِ اسلامی جمہوریۂ پاکستان

جناب اظہر جاوید

کو ادب کے شعبہ میں نمایاں کارکردگی کے اعتراف میں

صدارتی اِعزاز برائے حسنِ کارکردگی

عطا کرتا ہوں۔

مقام: اسلام آباد

تاریخ: ۲۳ مارچ ۲۰۱۲ء

(آصف علی زرداری)
صدر

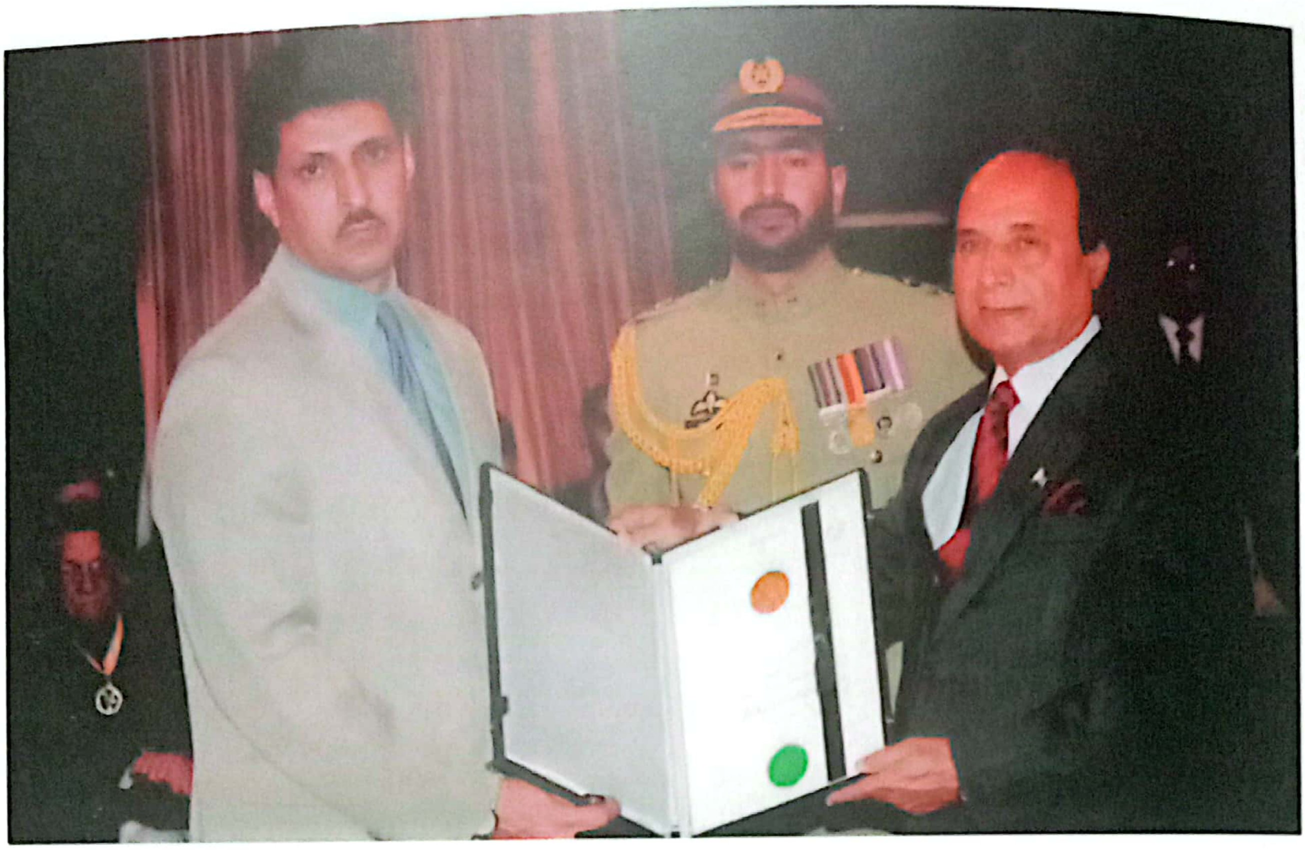

سونان اظہر جاوید گورنر پنجاب جناب لطیف کھوسہ سے اظہر جاوید کا صدارتی ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

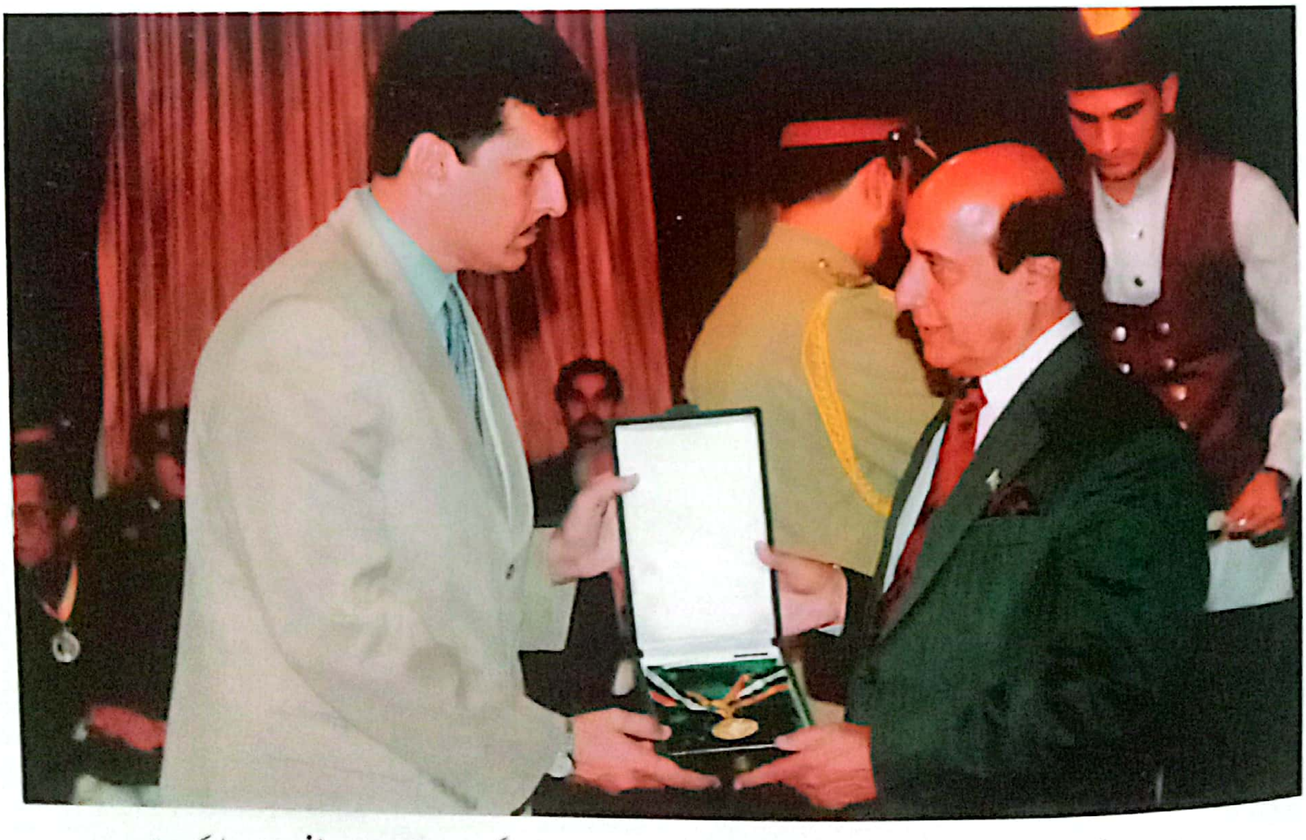

سونان اظہر جاوید گورنر پنجاب جناب لطیف کھوسہ سے اظہر جاوید کا تمغہ حسنِ کارکردگی "پرائڈ آف پرفارمنس" وصول کرتے ہوئے

CamScanner

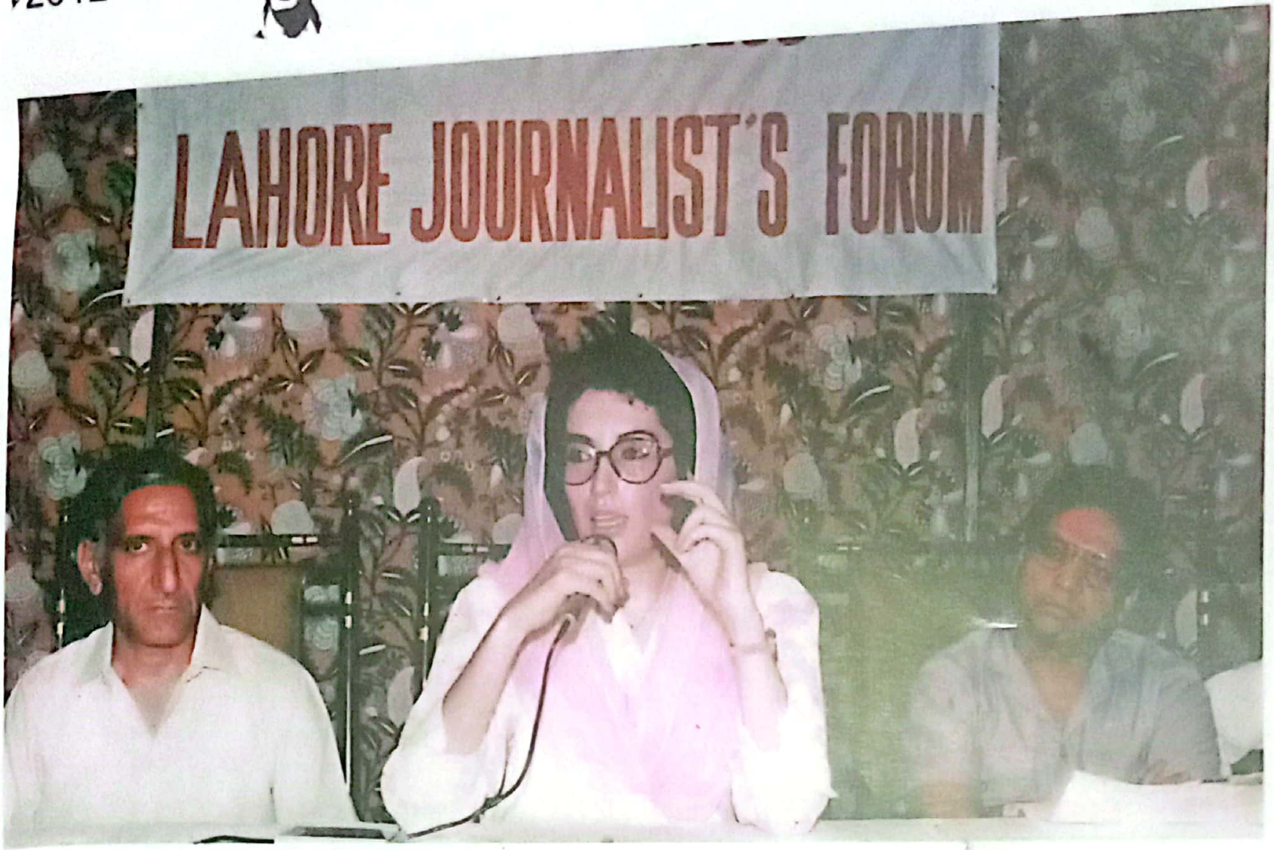

مارشل لاء کے دور میں محترمہ بینظیر بھٹو کی لاہور آمد پر پہلی پریس کانفرنس' جناب اظہر جاوید کا جرات مندانہ اقدام۔

پہلی پریس کانفرنس میں اظہر جاوید محترمہ بینظیر بھٹو کو کسی نقطے کی وضاحت کر رہے ہیں۔

CamScanner

شخصیت

اظہر جاوید

سونان اظہر جاوید

- پیدائش : 4 جنوری 1938ء......راولپنڈی
- تعلیم : بی۔اے
- ۱۷(سترہ) برس کی عمر میں شعروادب اور صحافت سے تعلق پیدا ہوا۔
- سرگودھا کے چند ہفت روزہ اخبارات (''ضربِ مجاہد'' اور ''رفیق'') کی ادارت کی۔ ممتاز شاعر الطاف مشہدی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''خلوص'' نکالا۔
- لاہور آ کر ایک ادبی ماہنامے ''عکسِ نو'' کی ادارت کی اور اسی سلسلے میں کراچی گئے۔ سال بھر کے بعد واپسی ہوئی تو چند فلمی پرچوں کی ادارت کی۔ کچھ عرصہ بے روزگاری میں گزارا۔ اس کے بعد روزنامہ ''امروز''، لاہور میں رپورٹر ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ادبی ڈائجسٹ کے ادارتی عملے میں بھی شامل ہو گئے۔ ایک پنجابی فلم کی کہانی، گانے اور سکرین پلے لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے دوگانے نور جہاں اور مہدی حسن کی آواز میں ریکارڈ ہوئے لیکن یہ پتھر بھی چوم کر چھوڑ دیا۔
- روزنامہ ''جمہور'' لاہور میں کالم نگار کی حیثیت میں وابستگی اختیار کی۔ پھر روزنامہ ''امروز'' لاہور کے عملۂ ادارت میں باقاعدہ شامل ہو گئے اور میگزین ایڈیٹر بنائے گئے۔ روزنامہ ''امروز'' لاہور اور روزنامہ ''حریت'' کراچی میں کالم ''محفل محفل'' طویل عرصے تک لکھا۔
- سالہا سال تک ''امروز'' میں سیاسی و سماجی کالم ''دیدبان'' بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے۔
- ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' کراچی، ہفت روزہ ''تقاضے'' لاہور، روزنامہ ''دن'' لاہور میں بھی کالم لکھے۔
- ان سب مصروفیات کے ساتھ 1969ء میں ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور جاری کیا اور اسے پابندیِ وقت سے شائع کیا۔
- بیالیسویں سال کا پہلا پرچہ فروری 2012ء کے اوائل میں شائع ہوا۔ اپنے ہاتھ سے پتے لکھ کر قارئین کو روانہ کیا۔ لیکن 14 رفروری کو صبح نو بجے موت نے مزید زندہ رہنے کی مہلت نہ دی۔ فروری 2012ء کا پرچہ بیالیسویں سال کا آخری پرچہ ثابت ہوا۔

کتابیں

- اُردو شعری مجموعہ ''غمِ عشق گر نہ ہوتا''
- پنجابی (شاہ مکھی) کہانیوں کا مجموعہ ''بڑی دیر ہوگئی''
- بلغارین افسانے (انگریزی سے ترجمہ)
- صوفی خاتون حضرت رابعہ بصریؒ کی شخصیت پر کتاب
- ''ناکام محبت، ساحر لدھیانوی'' (دو ایڈیشن بھارت میں بھی چھپ چکے ہیں)
- ''موت میرے تعاقب میں ہے'' بینظیر بھٹو کی شہادت پر کتاب۔
- ''تخلیق'' کا سندھی ادب و ثقافت نمبر...... چھ سو صفحات پر مشتمل اُردو زبان میں واحد اور منفرد کام
- ''تخلیق'' کا افسانہ نمبر...... پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، کشمیری کہانیوں سمیت
- ''تخلیق''، خلیجی ریاستوں میں اُردو نمبر...... ضخامت چھ سو صفحات، پہلی اور تادمِ تحریر آخری کوشش

اعزازات

- سفیرِ پاکستان متعینہ دوحہ (قطر) کی طرف سے تقریب پذیرائی
- ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ (لدھیانہ) 2004ء
- ساحر گولڈ میڈل (لدھیانہ) 2005ء
- اُردو مرکز انٹرنیشنل (لاس اینجلس) لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، نقد دو ہزار ڈالر 2005ء
- اُردو اکادمی۔ کیلی فورنیا، اری زونا ایوارڈ
- پنجابی مجلس (امریکا) شیلڈ
- مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ میں مدیر مطبوعات کی حیثیت سے 2008ء میں وابستگی، جو زندگی کے آخری دن (13؍ فروری 2012ء) تک جاری رہی۔
- لائف فیلو۔ اکادمی ادبیات پاکستان
- صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی 2011ء
- اَن گنت اور بے شمار دوسری علمی ادبی سرگرمیاں

وفات

- 14؍فروری 2012ء۔ لاہور

◆◆◆

اظہر جاوید کی ایک تقریر

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بےنظیر بھٹو اپنی خودساختہ جلاوطنی سے جوانہوں نے جنرل ضیاء الحق کے دور میں اختیار کی تھی وطن واپس آئیں تو اظہر جاوید نے ان کے پہلے عوامی جلسے کا اہتمام کیا۔ضیاء الحق کے آمرانہ دور میں لاہور کے سیاسی ادارے محترمہ بےنظیر بھٹو کی پذیرائی سے گریزاں تھے لیکن اظہر جاوید صاحب نے جلسے کا انتظام کر کے بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا۔اس جلسے میں اظہر جاوید نے جو تقریر کی وہ ان کے کاغذات سے مل گئی ہے اور یہ ''تخلیق'' کے قارین کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔(ادارہ)

....

واجب الاحترام چیئر پرسن، پاکستان پیپلز پارٹی، آنسہ بےنظیر صاحبہ!

میں اپنے باشعور ساتھیوں اور لاہور کے باضمیر دانشوروں کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔وقت کا دھارا تیز سہی، حالات کی سختی شدت آمیز سہی، مگر ہم اِس لمحۂ موجود پر مطمئن ہیں اور آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی بے شمار مصروفیات سے کچھ وقت نکالا اور ہماری بات سُننے اور اپنے خیالات سے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کیا۔

محترمہ! آپ کے فدائین، آپ کے جاں نثار اور آپ کے پیروکار، آپ کو قوم کی تقدیر کہتے ہیں۔آپ کو پاکستان کے وفاق کی علامت بتاتے ہیں۔خدا کرے ایسا ہی ہو۔مگر مجھے آپ سے ایک اور گذارش کرنی ہے۔آپ اس بار جب وطنِ وطنِ عزیز کے اُس حصے سندھ کے کسی دور دراز گاؤں کے کسی عام سے فرد کو بھی ملیں تو اسے صرف اتنا یاد دلا دیں کہ جب آج سے چار برس پیشتر......سندھ سے بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کا آغاز ہوا تھا تو اس پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اِسی لاہور کے ساٹھ شاعر، ادیب اور صحافی تھی جو آج بھی کسی نہ کسی صورت میں ملک وقوم سے جرمِ محبت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ان میں سے دس اخبار نویسوں کو تو بہ یک جنبشِ قلم نوکریوں سے نکال دیا گیا تھا۔

خاتونِ محترم......نہ میں اس مسئلے کو سیاسی بنانا چاہتا ہوں نہ متنازعہ...... مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ معزز عدالتوں کی معرفت بحال ہو چکے ہیں۔کچھ کا معاملہ عدالت میں پڑا ہوا ہے اور......ان میں سے ایک ایسا کم نصیب بھی تھا

کہ جو دُنیا کی عدالت کا فیصلہ سُننے سے پہلے ہی، یہ جہان چھوڑ گیا، اپنی ہر آس توڑ گیا اور سب عدالتوں سے بڑی عدالت میں پیش ہو گیا۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں اور آپ کی معرفت سندھ کے کونے کونے میں بسنے والے اپنے ہر بھائی کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے آج تک ان پر کوئی احسان نہیں جتائے، ہم نے اُنہیں کبھی بھی اپنے زخم نہیں دکھائے اور ہم آپ سے بھی نہ بے جا ہمدردی کے طالب ہیں نہ کسی صاحبِ اختیار سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ بس، صرف اتنی سی خواہش اور گذارش ہے کہ آپ جو پاکستان کے وفاق کی علامت ہیں، ہمارے اُن عزیزوں کو بتائیں کہ آج بھی جب اِدھر سے جانے والے دریاؤں اٹک، جہلم، چناب اور راوی کا پانی سندھ کے پانی سے ملتا ہے تو ان کی روانی میں ہماری محبتوں اور جذبوں کی جولانی بھی شامل ہوتی ہے اور جب وہاں شہباز قلندر کے دربار میں دھمال مچتی ہے تو یہاں بھی دھڑکنوں کی تال تیز تر ہو جاتی ہے۔

محترمہ چیئر پرسن!

آج کی اس صحافیانہ تقریب کے بعد ایک دوست آپ کو ایک کتاب پیش کر رہے ہیں۔ یہ جناب بھٹو اور آپ کے لئے کہی ہوئی اُن نظموں اور شاعروں کے اُن جذبوں کا مجموعہ ہے جسے ''نئی سحر کی چاپ'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے اس عہد کے شاعر کے کان برسوں سے بھاری قدموں کی دھمک سُن سُن کر پک گئے ہیں اور اب اُن کی سماعت کسی سُبک خرام چاپ کو سُننا چاہتی ہے۔ یا شاید...... وہ اس چاپ کو سُن رہے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کل کیا ہونا ہے، یہ آپ لیڈر لوگ جانتے ہیں یا خدا کی ذاتِ بابرکات...... ہم اہلِ قلم بہت حساس ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک خوش فہم بھی ہوتے ہیں ہم بہت جلد اُمیدیں باندھ لیتے ہیں، بہت سی توقعات رکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا اور اس ملک کا نگہبان ہو۔

اب میں زیادہ دیر آپ کے اور صحافیوں کے درمیان حائل نہیں رہتا۔

ایک بار پھر لاہور جرنلسٹس فورم کی طرف سے آپ کی اس کرم فرمائی کے لئے سپاس گذار ہوں کہ آپ نے ہمیں وقت دیا، یہ اعزاز بخشا۔

◆◆◆

اظہر جاوید

بہت خیال، بہت خواب سو گئے تھک کر
خُدا کرے تری یادیں کہیں نہ سو جائیں

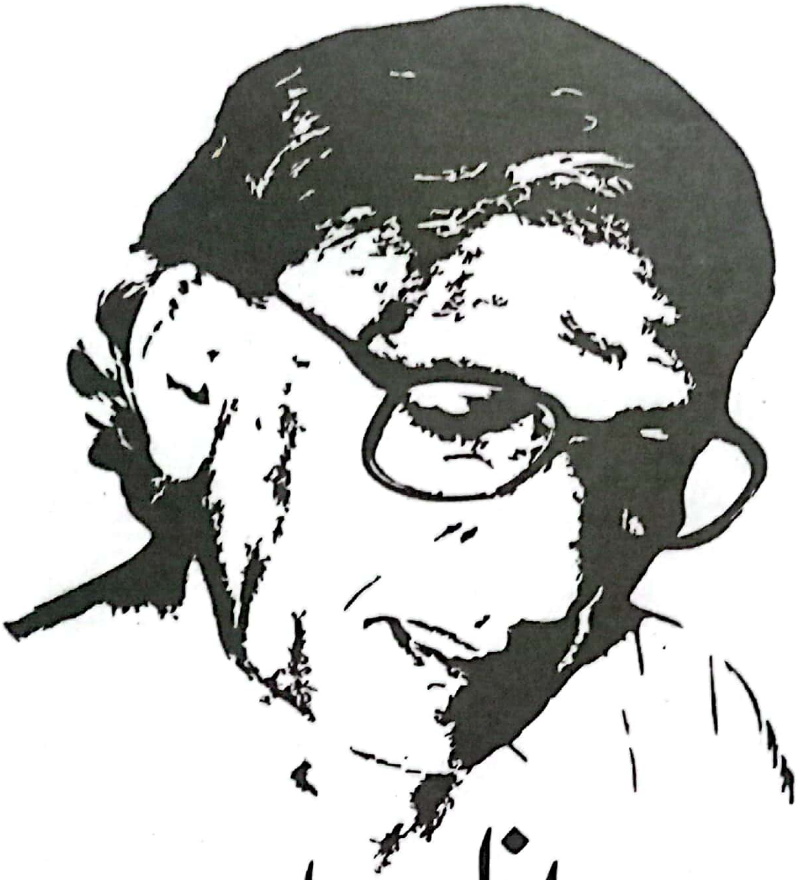

اظہر جاوید

فن، شخصیت اور تاثرات

(پاکستانی مصنّفین)

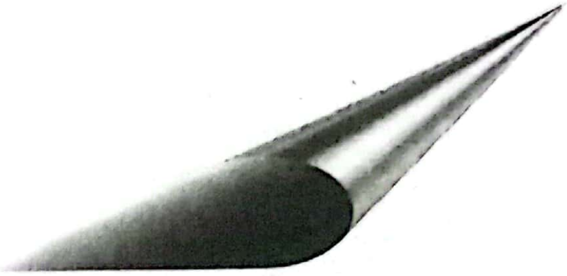

CamScanner

میں تو صدیوں سے مقیّد تھا اندھیرے غار میں
اس نے جب اچھا کہا تو روشنی اچھی لگی

اظہر جاوید

غمِ محرومیِ اظہر جاوید

انور سدید

گذشتہ چالیس سال سے پابندیِ وقت سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ ’’تخلیق‘‘ لاہور کے مدیر اظہر جاوید 14 فروری 2012ء کی صبح کو اس دنیا کے بھرے میلے سے یوں اٹھ گئے جیسے وہ بازار سے گزر رہے تھے لیکن دنیا کے خریدار نہیں تھے۔ گزرے ہوئے کل کی شام کو ان سے ’’الحمرائیوں‘‘ کی اس محفل میں ملاقات ہوئی تھی جو محترم شاہد علی خان (مدیر ماہنامہ الحمراء) نے لندن سے آئے ہوئے، علّامہ اقبال کے شیدائی اور الحمراء کے قدیم قلمی معاون ڈاکٹر سعید اختر درانی کے اعزاز میں جم خانہ کلب میں آراستہ کی تھی۔ اس محفل میں اظہر جاوید اپنے استری شدہ سوٹ میں ملبوس، غیر معمولی دراز گیسوؤں کے ساتھ بڑے چاق و چوبند نظر آئے، شرکائے محفل پر نظر ڈالی تو مجھے ’’الحمراء‘‘ کے علاوہ ’’تخلیق‘‘ میں لکھنے والے کئی چہرے نظر آئے ...... مجھے ڈاکٹر درّانی صاحب کا خیر مقدم کرنے کا موقعہ دیا گیا تو میں نے اس محفل کو بے ساختہ دو ادبی کنبوں کی محفل قرار دیا۔ ایک کنبے کے سربراہ اظہر جاوید اور دوسرے کے شاہد علی خان تھے جنہیں رسالہ ’’الحمراء‘‘ کی وراثت اپنے جلیل القدر والد گرامی مولانا حامد علی خان سے ملی تھی۔ اس محفل کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر سعید اختر درّانی الحمراء کے اس دور میں بھی قلمی معاون تھے جب یہ رسالہ مولانا حامد علی خان کی ادارت میں چھپتا تھا۔ لیکن اگلی صبح جب اچانک جان کاشمیری صاحب نے گوجرانوالہ سے فون پر کہا:

’’انور سدید! ایک زبردست سانحہ ہو گیا ہے‘‘۔

اس وقت میں نوجوان ادیب عبّاس نجمی کی وفات کی خبر پڑھ چکا تھا جو گذشتہ روز ’’برین ٹیومر‘‘ سے شوکت خانم ہسپتال میں وفات پا گئے تھے۔ میں نے جواب دیا:

’’عباس نجمی کی وفات کا بہت افسوس ہوا ہے‘‘۔

جان کاشمیری بولے ’’انور سدید! ’’تخلیق‘‘ کی محفل اجڑ گئی ہے۔ اظہر جاوید دنیا چھوڑ گئے، ان کی حرکت قلب بند ہو گئی‘‘۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ عارضۂ قلب کے وہ پرانے مریض تھے لیکن اب کچھ عرصے سے ان کا قلب ان سے

تعاون کر رہا تھا اور وہ زندگی میں پوری طرح فعّال تھے۔ اس خبر نے میرے حواس باختہ کر دیئے اور اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کے چالیس سال کی فلم الٹی چلنے لگی:

اظہر جاوید 4 جنوری 1938ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا آبائی وطن سرگودھا کے نواح میں قصبہ بھاگٹانوالہ تھا۔ پرائمری کی تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی اور پھر آبائی گاؤں میں اپنے ننہال کے ساتھ سکونت اختیار کر لی۔ میٹرک کرنے کے بعد سرگودھا آ گئے تو شاعری کا ذوق اپنے ماموں سے حاصل کر چکے تھے جو شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی والدہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ گھر کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اظہر جاوید نے لکھا ہے:

''ماحول کا اثر تھا یا گھریلو فضا...... میں نویں دسویں تک شعر کہنے اور نثر لکھنے کی طرف مائل ہو چکا تھا''۔

اظہر جاوید کے والد صاحب کا نام عبدالغفور تھا اور وہ ریلوے میں ملازم تھے۔ لیکن اظہر جاوید نے سرکاری ملازمت کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی پرورش رزق حلال پر کی گئی اور ان کے ذوق نے انہیں سگِ دنیا نہ بننے دیا۔ وہ اپنے گاؤں سے شہر میں آئے تو ایک مقصد تلاشِ معاش تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے پہلے سرگودھا کے مقامی اخبارات ''شعلہ'' (مدیر عبدارشید اشک) اور ''نظامِ نو'' (مدیر اخگر سرحدی) سے وابستگی اختیار کی۔ ان دنوں اس شہر کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان ارشد بھٹی لاہور کے انگریزی اخبار ''پاکستان ٹائمز'' کی نامہ نگاری پر فائز تھے۔ اظہر جاوید نے بھی صحافت کے وسیع تر میدان کی تلاش کی تو لاہور کے معروف اخبارات میں ضلعی نامہ نگاری حاصل کر لی۔ اس دور کے ایک مقبول اخبار ''کوہستان'' کے ساتھ ان کا رابطہ بھی مجھے یاد ہے۔ لیکن جب تاج الدین حقیقت لاہور پہنچے تو اظہر جاوید نے اپنی جگہ انہیں دے دی، ان کی نظر میں تاج الدین حقیقت ان سے زیادہ ضرورت مند تھے۔ سرگودھا میں ان کا دوسرا مقصد اپنے ادبی ذوق کی تسکین تھی۔ چنانچہ شاعری کا شوق انہیں ملک کے معروف شاعر الطاف مشہدی کی محفل میں لے گیا جو بلاک نمبر 18 میں مقیم تھے۔ ان دنوں جوش ملیح آبادی کے نام کا اہم ترین سابقہ ''شاعر انقلاب'' تھا۔ الطاف مشہدی کو ''شاعر شباب'' موسوم کیا جانے لگا۔ ان کا مجموعہ کلام ''تصویرِ احساس'' کے نام سے چھپ چکا تھا۔، اور وہ شاعروں میں اپنی نظم:

''پتّہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے''

پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ ان کی ایک اور نظم ''اقبال'' پر تھی۔ جو محفلوں میں ان سے فرمائش کر کے سنی جاتی تھی۔ اس نظم میں الطاف مشہدی نے علّامہ اقبال سے عالمِ بالا میں ملاقات کی اور ان سے اسبابِ زوالِ امّت دریافت کیے تھے۔ یہ نظم تو مجھے یاد نہیں لیکن میری لوحِ دماغ پر الطاف مشہدی کا یہ شعر ثبت ہے۔

دیکھا کہ وہاں حضرتِ اقبال کھڑے ہیں
اور پاؤں میں بے چارے مسلمان پڑے ہیں

اظہر جاوید ایک شام الطاف مشہدی کی محفل میں پہنچے تو وہ ان کے اندازِ گفتگو، سعادت مندی کے طور طریقے اور

اچھے شعر پر داد دینے کے سلیقے سے بہت متاثر ہوئے۔ اظہر جاوید اس محفل میں باقاعدگی سے حاضر ہونے لگے تو مختصر سے عرصے میں انہوں نے الطاف مشہدی کے دل میں جگہ بنا لی اور وہ انہیں سرگودھا کے دیگر باذوق نوجوانوں ...... اصغر جالندھری، صفدر بخاری، اصغر مشہدی اور رشک ترابی پر فوقیت دینے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس محفل میں شاعری کے دور کے ساتھ شراب کا دور بھی چلتا تھا لیکن الطاف مشہدی نے اظہر جاوید کو کبھی بادۂ ناب کے قریب ہونے کی اجازت نہ دی، لیکن شاعری کے سرور میں افراط سے شریک کیا۔ چند سال قبل الطاف مشہدی سرگودھا سے ایک ادبی رسالہ ''ہم لوگ'' اپنی ادارت میں نکالتے تھے، جس کی برعظیم ہندوستان میں بڑی دھوم تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرا ایک افسانہ ''نیل کنٹھ''، ''ہم لوگ'' میں چھپا تھا جو میں نے کلورکوٹ سے بھیجا تھا۔ ''ہم لوگ'' کے قلمی معاونین میں فراق گورکھ پوری، عبدالحمید عدم، کرشن چندر، جگر مراد آبادی، سیماب اکبرآبادی، ڈاکٹر تاثیر، غلام عباس، مہندر ناتھ اور عبدالمجید سالک جیسے ممتاز ادیب شامل تھے۔ سرگودھا کے ادیبوں میں سے پروفیسر فیروز الدین رازی، ڈاکٹر وزیر آغا، مرزا معمول انور، جوہر نظامی، اخگر سرحدی اور عبدالرشید اشک کے مضامین بھی باقاعدگی سے چھپتے تھے۔ ادبی سطح پر نمایاں کامیابی کے باوجود کاروباری اعتبار سے ''ہم لوگ'' منفعت بخش نہیں تھا۔ چنانچہ الطاف مشہدی اسے زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے۔ لیکن صحافت کی چاٹ بھی ...... ''چھٹتی نہیں ہے یہ بت کافر لگی ہوئی'' کی طرح ہے۔ اظہر جاوید اس محفل کے مستقل رکن بن گئے تو ایک دن الطاف مشہدی نے کہا'' آؤ! مل کر ایک ہفتہ وار رسالہ شروع کرتے ہیں''۔ اس پرچے کا نام ''خلوص'' تجویز کیا گیا۔ اظہر جاوید کے نام پر ڈیکلریشن لینے کے لئے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی گئی تو ان کی عمر ۱۸ سال سے کم نکلی، اس لیے ڈیکلریشن نہ مل سکا اور پھر ''اجازت نامہ'' الطاف مشہدی کے نام لیا گیا۔ لیکن اس کی ادارت کا تمام بار عملی طور پر اظہر جاوید نے ہی اٹھایا۔ اب یہ کہنا درست ہوگا کہ شاعری کے بعد اظہر جاوید نے صحافت سے لو لگائی اور یہ ان کی شخصیت کی دوسری تابندہ جہت بن گئی۔ اور اس میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ بھی آگے بڑھایا اور مطالعے کی نصابی کتب تک محدود نہ رکھا بلکہ اردو کے کلاسیکی ادب تک وسعت دے دی۔ ایک دن بتانے لگے کہ ادیب فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے صرف انگریزی کا پرچہ دے کر ایف اے اور بی اے کی ڈگری لے لی تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ اظہر جاوید نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں شاعری سے جو ذاتی رشتہ قائم کیا تھا، اس کی فنی تہذیب جناب جوہر نظامی نے کی، جو سرگودھا میں ممتاز الشعراء تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اظہر جاوید کے باطن سے ایک رومانوی شاعر کو برآمد کیا جو خود رومیو بن چکا تھا اور ایک جیولیٹ جس کا تعاقب کر رہی تھی۔ جوہر نظامی نے دونوں کے رومان کو شرعی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن اظہر جاوید کے سامنے اپنے معاصر دوست انور مشہدی کا یہ شعر بار بار جلوہ بار ہو جاتا اور وہ اپنی پہلی محبت کی کامیابی کے لئے جوہر نظامی صاحب کے منصوبے پر غور کرنے لگتے۔

غمِ زمانہ مری محبت کے راستوں سے گریز کرنا
وگرنہ میرے یہ ہاتھ ہوں گے ترے گریباں کے چاک ہوں گے

لیکن ان کی اصل دستگیری فیض احمد فیض کے اس مصرعے نے کی

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

چنانچہ اگلے روز وہ ٹرین میں بیٹھے اور اپنی محبت کے مدار سے نکل کر پہلے کوئٹہ گئے اور پھر لاہور پہنچ گئے۔اس وقت وہ شادی کی ''بیماری'' سے تو گلوخلاصی کرا چکے تھے لیکن لاہور میں بیکاری حرزِ جاں بنی ہوئی تھی۔لاہور میں انہوں نے صحافت کے پاپڑ بیلے اور شاعری کی دیوی کی پرستش کی، لاہور کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے راہ و رسم پیدا کی اور اپنے نام کا سکّہ چلانے کی بجائے، بڑے ادیبوں کی شہرت و عظمت میں مزید ستارے ٹانکنے اور ان کی تابندگی میں اضافے کو اپنا فرض حیات بنالیا۔اور اس فرض کی تکمیل اس خلوص سے کی کہ ادب سے نام و نمود کشید کرنے والی شخصیات بھی حیرت زدہ رہ گئیں کہ قصباتی وضع کا یہ نوجوان نہ شہرت کا تعاقب کرتا تھا اور نہ اسے دنیا دار شاعروں کی طرح دولت کمانے کی ہوس تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہزار ترغیب کے باوجود اظہر جاوید شاعروں کے شاعر نہ بن سکے۔ مجھے ان کی شاعری میں اولاً اختر شیرانی کی رومانویت کا پرتو نظر آیا لیکن اب وہ دور گزر چکا تھا جب اختر شیرانی کی سلمیٰ اہل زمانہ کی نظروں سے چھپ کر رات کو وادی میں آیا کرتی اور شاعر کے رومانوی احساسات کی آسودگی کا باعث بن جاتی تھی۔اس دور میں ترقی پسند شعراء نے عورت کو بھی نعرہ بازی کے لئے سڑکوں پر لانے کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور دوپٹے سے پرچم کا کام لینے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اظہر جاوید کو لاہور کے ترقی پسند شعراء فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی اور عارف عبدالمتین سے گہری عقیدت تھی اور وہ حمید اختر کو بھی جھک کر سلام کیا کرتے تھے اور انہوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور عابد علی عابد کے جمال فن سے بھی فیض حاصل کیا تھا لیکن ان کے قلب و نظر پر غائبانہ طور پر شب خون ساحر لدھیانوی نے مارا تھا جو اس زمانے میں بمبئی منتقل ہو چکا تھا اور اب اس کی شاعری کی مشہور کتاب ''تلخیاں'' کا مطالعہ اظہر جاوید کا وظیفۂ حیات بن چکا تھا۔میرا اندازہ ہے کہ اظہر جاوید کو نہ صرف ''تلخیاں'' پوری یاد تھی بلکہ انہیں ساحر لدھیانوی کے فلمی گیت بھی یاد تھے۔ چنانچہ جب وہ ساحر لدھیانوی کے اشعار دمِ گفتگو برموقع پڑھتے تو بھری محفل کو حیرت زدہ کر دیتے۔وہ ''تلخیاں'' کی نظموں کی وجہ تخلیق معلوم کرنے کی سعی کرتے تو کئی ان کہی کہانیوں کا سراغ لگا لیتے۔ان کہانیوں کو اظہر جاوید نے اپنی کتاب ''ناکام محبت......ساحر لدھیانوی'' میں پیش کر دیا ہے۔

اظہر جاوید جذبات و احساسات سے بھرپور ہری بھری عورت کے شاعر تھے۔ وہ کچی کلیوں کی ثناء خوانی نہیں کرتے بلکہ نودمیدہ پھولوں کو فطرت سے رس کشید کرنے اور حسن کو نکھرنے کا موقع دینا پسند کرتے تھے۔، یہ تشنہ عورت اپنے داخلی جزر و مد سے مغلوب ہو جاتی ہے تو اپنے ثنا خوان کی تلاش میں خود نکلتی ہے اور ناکام نہیں ہوتی بلکہ اس کی مڈبھیڑ اظہر جاوید جیسے کسی کنہیّا سے ہو جاتی ہے اور وہ شاعر کے فطری اظہار کا وسیلہ بن جاتی ہے۔اسے ثمرابور کر ڈالتی ہے۔ چنانچہ اظہر جاوید کی شاعری اخبار کے اداریے کو کسی مقبول بحر کے وزن میں لا کر منظوم کرنے کی شاعری نہیں بلکہ یہ ایسی شاعری ہے جس میں فطری شاعر اپنے

جذبات کا اظہار کھل کر کرتا ہے اور عشق میں ناکامی پر مایوس نہیں ہوتا۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اظہر جاوید کی شعری زبان کو ان کا مخاطب، جو ان کا محبوب بھی ہے، پوری طرح محسوس کرتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محبوب کو ان بیڑیوں کا بھی احساس ہے جو اس کے پاؤں میں سماج نے ڈال رکھی ہیں اور وہ معاشرتی اقدار کو شکستہ کرنے والا کردار بھی نہیں بننا چاہتا۔ اظہر جاوید نے اس قسم کے کرداروں کی پوری پاسداری کی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے کسی شعری کردار سے اپنا خون کا رشتہ قائم نہیں کیا۔ وہ عورتوں میں بے حد مقبول تھے لیکن انہوں نے کسی کو خواہر یا دختر بنا کر ''بڑھکیں'' نہیں ماریں، نہ ریشہ خطمی ہوئے ہیں، بلکہ اعتماد کی ایسی فضا پیدا کی کہ ان کا کوئی سکینڈل منظر عام پر نہیں آیا اور نہ اپنی شرافت کو اشتہار بنانے کی کوشش کی۔ مجھے یاد ہے کہ ''تخلیق'' کی تیسویں سالگرہ کی تقریب میں اشفاق احمد نے تقریر کی تو یہ بات خاص طور پر کہی کہ اظہر جاوید بہت سی خواتین کے دلوں میں رہتا ہے۔ بانو قدسیہ انہیں ''بھگوان سٹریٹ'' کا کنہیا موسوم کر رہی تھیں اور حمید اختر نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ تخلیق نے جن نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے ان میں اکثریت خواتین ہی کی ہے اور وجہ بھی بتا دی کہ اظہر جاوید کی ان میں یا ان کی اظہر جاوید میں دلچسپی بھی ہو سکتی ہے''۔ یہ حکایۂ لذیذ ان کی شاعری کے مجموعے میں بکھری پڑی ہے جس کا نام ''غم عشق اگر نہ ہوتا'' ہے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اظہر جاوید کا دوسرا عشق ''صحافت'' تھا۔ اس عشق کو سرگودھا میں رسالہ ''خلوص'' کی ادارت نے پروان چڑھایا تھا لیکن ان کا جوہر لاہور آ کر اس وقت ظاہر ہوا جب صحافت ان کی روزی روٹی کا وسیلہ بن گئی۔ لاہور میں اظہر جاوید نے ادبی صحافت کی ابتداء ماہنامہ ''سیّارہ ڈائجسٹ'' سے کی۔ محمد عباس مولوی کی معیّت میں انہوں نے ''سیارہ ڈائجسٹ'' کا جو ''منٹو نمبر'' شائع کیا تھا وہ اب تک یادگار ہے۔ اور اس کی نادر معلومات منٹو کے فن اور شخصیت کا بنیادی ماخذ ہیں۔ اس دور میں ہی ان کو ملک کے ممتاز اخبار ''امروز'' میں جگہ مل گئی جس کے ادبی صفحے کے ابتدائی خطوط مولانا چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض اور سبط حسن نے آراستہ کیے تھے۔ اظہر جاوید نے اس اعلیٰ روایت کو توسیع دی اور اپنے دور میں ''امروز'' کے ادبی صفحے کو ملک کا مقبول ترین ایڈیشن بنا دیا۔ اس دور میں ''امروز'' کے چند انقلابی صحافیوں نے آمریت کے خلاف جمہوریت کی آواز اٹھائی اور یہ آواز چونکہ پریس ٹرسٹ کے سرکاری اخبار سے ابھری تھی اس لیے آمر مطلق ضیاء الحق کو پسند نہ آئی۔ جمہوریت کے مطالبے کی دستاویز پر اظہر جاوید نے بھی دستخط کر دیئے اور ان کی نوکری موقوف ہو گئی۔ لیکن اس مستقل مزاج انسان نے اپنی خودی اور غیوری کو قائم رکھا اور ''امروز'' کی جن سیڑھیوں سے ایک مرتبہ اترے تھے ان پر دوبارہ اوپر جانے کیلئے قدم نہیں رکھا۔ اس عرصے میں انہوں نے ایک ڈائجسٹ پرچے میں کام کیا۔ ایک فلم کی کہانی لکھی۔ چند گیت بنائے۔ ایک گیت نور جہاں نے اپنی پرسرور آواز میں ریکارڈ کرایا۔ دوسرا گیت مہدی حسن نے گایا لیکن فلمی فضا ان کے مزاج کو راس نہ آئی کہ ان کا ناتہ خالص ادب سے قائم نہیں ہوتا تھا اور ادبی جنون انہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔ چنانچہ اظہر جاوید نے اپنی تمام توجہ اپنے رسالہ ''تخلیق'' کی طرف مبذول کر لی۔ اسے اعلیٰ معیار کے مضامین نظم و نثر سے مرصّع کرنا اور پابندیِ وقت

سے شائع کرنا ان کی زندگی کا راسخ نصب العین بن گیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ تین سال قبل انہیں اختلاجِ قلب کا پہلا ہولناک وار سہنا پڑا اور وہ کئی دن ''انتہائی نگہداشت'' کے وارڈ میں رہ کر آئے اور ڈاکٹروں نے مکمل آرام کی تلقین کی تو ان حالات میں بھی ''تخلیق'' کی اشاعت موقوف نہیں ہوئی اور اسے معیّن وقت پر شائع کیا گیا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ متعدد ضخیم پرچوں کے مقابلے میں ''تخلیق'' کی پذیرائی پوری دنیا میں ہوئی اور اسے ادب وفنون کا اعلیٰ نمائندہ شمار کیا گیا۔ بیالیسویں سال کا پہلا شمار 3 فروری 2012ء کو شائع ہوا قارئین ابھی اس کے وصول ہونے کی رسید بھی نہیں دے پائے تھے کہ اظہر جاوید کو سناؤنی آ گئی اور پھر انہونی ہو گئی۔

اظہر جاوید کی شاعری اور صحافت کی دو جہات کے تذکرے کے بعد اب ان کی افسانہ نگاری کی جہت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے انہوں نے پنجابی زبان کو موزوں قرار دیا تھا اور وجہ شاید یہ تھی کہ اس زبان کے ادیبوں نے اظہار کیلئے شاعری کو فوقیت دی تھی لیکن افسانہ محرومِ توجہ رہ گیا تھا۔ اظہر جاوید نے پنجابی کے افسانوی ادب کو ثروت مند کرنے کی کاوش کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''بڑی دیر ہو گئی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اور اسے مسعود بھگوان ٹرسٹ نے انعام سے نوازا ہے۔ اظہر جاوید کی نثر کی ایک اور کتاب کا نام ''ناکام محبت......ساحر لدھیانوی'' ہے۔ میں اسے سہل ممتنع نثری نظم کہتا ہوں کہ اس کے ہر ورق پر اظہر جاوید نے شاعرانہ اسلوب میں عقیدت کے چراغ جلائے ہیں اور ساحر لدھیانوی کی زندگی کے ان گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے جہاں صابر دت اور ساحر لدھیانوی کی ہمشیرگان بھی نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع تو ساحر لدھیانوی ہی ہے لیکن اس کتاب کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں بمبئی کی فلمی زندگی اور فلمی شخصیات کا تذکرہ بھی سما گیا ہے۔ ساحر کی محبوباؤں کا ذکر ہوا ہے تو ساحر کے فلمی گیتوں کے پس منظر سے اس کی جذباتی زندگی کے آثار بھی دریافت کئے گئے ہیں۔

اظہر جاوید کی ادبی زندگی کی ایک اور جہت ان کی ترجمہ نگاری ہے۔ اس کی مستند مثال ان کی کتاب ''بلغارین افسانے'' ہے اور یہ ایک ایسے ملک کے معاشرے سے متعارف کراتی ہے جہاں پاکستان کے سیّاح بھی کم کم ہی گئے ہیں۔ اظہر جاوید کا تخلیقی ترجمہ ہمارے سامنے بلغاریہ کے تہذیبی نقوش بنات النّعش گردوں کی طرح عریاں کر دیتا ہے۔ ان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ جب ان کے معاصر صحافی اپنے کالموں کا پیٹ طنز و مزاح اور سیاست اور سیاستدانوں کی نوک جھوک سے بھر رہے تھے تو اظہر جاوید نے ''محفل محفل'' کے عنوان ''ادبی کالم نگاری'' کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا یہ کالم پہلے کراچی کے اخبار ''حریت'' میں چھپتا تھا۔ اور پورے ملک میں نہ صرف دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا بلکہ اسے ادب کا بیرومیٹر بھی شمار کیا جاتا تھا۔ ''حریت'' کے علاوہ اظہر جاوید اسی عنوان سے ''امروز'' میں بھی کالم لکھتے تھے لیکن دونوں کالموں کے موضوعات الگ الگ ہوتے تھے۔

اظہر جاوید اردو اور پنجابی ادب کی اہم شخصیت تھے۔ انہوں نے جس کوہِ بے ستون کو اپنے تیشۂ ضرب سے کاٹ کر

ادب کی جوئے شیر رواں کردی تھی اس کا نام رسالہ ''تخلیق'' ہے۔اس رسالے میں تین امور کو ہمیشہ فوقیت دی گئی۔

اوّل: اعلیٰ ادب کی ترویج واشاعت۔ دوم: اعلیٰ تخلیق کاروں کی تلاش وجستجو اور نئے لکھنے والوں کا تعارف اوران کے دل میں ادب کی شمع جلائے رکھنے کی کاوش۔ سوم: سینئرادبا کا احترام اوران کی ادبی خدمات کا وسیع پیمانے پر تعارف، توضیح، تفہیم اور تشریح۔

تخلیق کا عام شمارہ بھی اعلیٰ معیار کے مضامین نظم ونثر کی وجہ سے خاص شمارہ ہی شمار ہوتا تھا۔تاہم اظہر جاوید کے من میں موج آئی توانہوں نے ایک ضخیم افسانہ نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بھی بنالیا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس خاص نمبر کے لئے ایک سیمینار بھی ''وائی ایم سی اے'' ریستوران میں منعقد کیا تھا جس میں احمد ندیم قاسمی اوراشفاق احمد کے علاوہ متعدد نقادوں نے شرکت کی تھی۔ایک اورخاص نمبر ''خلیجی ریاستوں میں اردو'' تھا جس میں ترک وطن کرکے خلیج کی ریاستوں میں مستقل طور پر آباد ہوجانیوالے ادیبوں اورشاعروں کی پذیرائی کی گئی تھی اوران کے احساس محرومی کورفع کیا گیا تھا۔ان کی اعلیٰ ادبی خدمات پر صدر پاکستان کا ''تمغہ حسن کارکردگی'' دیئے جانے کا اعلان 14 اگست 2011ء کوہوالیکن عطا ئیگی سے پہلے موت آگئی۔

اظہر جاوید نے ''رسالہ تخلیق'' کی اشاعت کے ساتھ کوئی بڑا مادی مقصد وابستہ نہیں کیا، حد یہ ہے کہ اسے اپنی شہرت کا وسیلہ بھی نہیں بنایا۔ ان کی اپنی تخلیقات اس پرچے کیلئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن دوسرے ادیبوں کو پرموٹ (promote) کرنے میں اظہر جاوید تاخیر نہیں کرتے تھے۔ادب کی خدمت انکا مشن تھا اور وہ آخری سانس تک اس فریضے کوحسنِ کمال سے ادا کرتے رہے۔ان کی مجلس آرائی بھی ادب کی خدمت کا ہی ایک زاویہ تھا۔ان کے دل پر چوٹ اس وقت لگی جب ادب کی ایک معروف ومقبول شخصیت نے ان کے حق میں لکھے گئے ''اداریے'' سے اہانت کا زاویہ نکال لیا اور وہ اپنی حیثیت عرفی تسلیم کرانے کیلئے اظہر جاوید کوعدالت میں کھینچ لے گئے۔اظہر جاوید نے اپنی نیاز مندی کے ثبوت میں مطبوعہ دستاویزات پیش کیں لیکن استغاثہ کی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی۔اوران کی شہرت کے آفتاب کے سامنے اظہر جاوید کی صداقت کا چراغ بجھا دیا گیا۔اس غیر منصفانہ فیصلے کے بعد متذکرہ معروف شخص زیادہ دن زندہ نہ رہا کہ اعلیٰ عدالت میں اظہر جاوید کی اپیل کا سامنا کرسکے۔لیکن جب ان کی لحد پر اظہر جاوید عقیدت کے تحت موم بتیاں روشن کرنے لگے تو اہل جہاں دانش حیرت زدہ رہ گئے۔اکیسویں صدی کی آتش نمرود نے ان کوجھلسا دیا تھا لیکن وہ اس آگ سے کندن بن کر نکلے اورعزم واستقلال اور ہمت وایثار سے ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔انہوں نے پاکستانی ادب کو اپنی شخصیت کے سب زاویوں سے منور کیا اور پھر اچانک بھرے میلے سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

''بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں''

◆◆◆

کچھ اظہر جاوید کے بارے میں

سید مشکور حسین یاد

اظہر جاوید میرے بزرگ ہونے کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے تھے۔ایک دن میں نے ان سے کہا''حضرت! بال تو آپ کے سفید ہیں اور آپ مجھ کالے بالوں والے کو بزرگ کہہ رہے ہیں'' کہنے لگے''یہی تو مزے کی بات ہے، کالے بال ہونے کے باوجود آپ بزرگ ہیں۔آپ کے خیالات بزرگانہ اور آپ کا کلام بزرگی سے لبریز ہے''۔ میں نے کہا''اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ میرا کلام، میری غزل اس لئے سب سے اوّل رکھتے ہیں کہ وہ ایک بوڑھے کی نظم یا غزل ہے۔اس لئے نہیں کہ وہ غزل یا نظم واقعی اس قابل ہے کہ اسے سب سے اوّل رکھا جائے''۔

ایک دم سنجیدہ ہو کر بولے:

''نہیں نہیں مشکور صاحب! ایسی بات نہیں، آپ اپنے انداز کی غزل کہتے ہیں اور میری دانست میں خوب کہتے ہیں۔ویسے بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے میں اپنے ''تخلیق'' میں سوچ سمجھ کر اہلِ قلم کی نگارشات کو جگہ دیتا ہوں۔''تخلیق'' مجھے بہت عزیز ہے۔اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز''۔

ایک بار انہوں نے میرے بارے میں ''تخلیق'' میں ایک غلط بات لکھ دی۔ مجھے بہت برا لگا تو ''الحمد'' کے دفتر میں صفدر حسین کے سامنے انہوں نے مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے کہا''برادرم معافی مانگنا معمولی بات نہیں یہ بھی انسان کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔بس آپ نے معافی مانگی تو میں نے معاف کر دیا۔اب آپ کی طرف سے میرا دل صاف ہے اور ہمیشہ صاف رہے گا''۔لیکن اس معافی کے بعد جو انہوں نے پھر اسی بات کو دہرایا تو مجھے اس کا بے حد قلق ہوا اور میں نے ان پر واضح بھی کر دیا۔ کہنے لگے''مشکور صاحب انسان خطا کا پتلا ہے''...... میں نے کہا''بس آگے کچھ مت کہیے'' میں نے انہیں گلے سے لگا لیا، کہنے لگے''مشکور صاحب آپ بڑے دل کے آدمی ہیں'' میں نے کہا آپ جو میری یہ تعریف کر رہے ہیں یہ بھی تو آپ کے بڑے دل کا اظہار کر رہی ہے''۔

افسوس! اظہر جاوید صاحب سے میری بہت کم ملاقات رہی لیکن جب بھی رہی خوب رہی۔ میں ان سے کہا کرتا تھا''۔اظہر جاوید صاحب ''تخلیق'' واقعی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔آپ اپنے اس ادبی جریدہ میں اس کے معیار کو ہمیشہ قائم رکھتے ہیں، بلکہ آپ ''تخلیق'' کو اتنا بلند کردیتے ہیں کہ مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ یہ اظہر جاوید نے ترتیب دیا ہے۔ یا ان کی کسی محبوبہ یا محبوب نے''...... کہنے لگے......''مشکور صاحب آپ شرارت سے باز نہیں آتے''...... میں نے کہا''آپ اپنے ایمان سے کہیں میں شرارت کرتا ہوں یا آپ'' ذرا رک کر بولے''دراصل ہم دونوں ہی شرارت کرتے ہیں اور پیارے بھائی وہ بھی کوئی آدمی ہے جو شرارت نہ کرے''؟

یہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ آخری رات جم خانے میں اظہر جاوید میرے برابر بیٹھے زندگی سے بھرپور باتیں کررہے تھے اور اگلی صبح وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئے۔

◆◆◆

شفیع عقیل

''جن لوگوں سے زندگی میں سرسری سے تعلقات رہے ہوں، اُن کے بارے میں لکھنا یا تاثرات کا اظہار کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جن سے برسوں کے دوستانہ مراسم اور برادرانہ روابط کا سلسلہ ہو اُن کے متعلق کچھ تحریر کرنا، بہت مشکل ہوتا ہے۔کم از کم میرے لئے بہت مشکل ہے۔اگر کسی کے بارے میں لکھا جائے تو ایسے کہ اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی ہو۔اس کے لئے وقت درکار ہے۔لہٰذا مجھے اظہر جاوید مرحوم کی مغفرت کی دعا میں شریک سمجھئے۔اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔آمین''۔

مشفق خواجہ

''آپ کے مجموعہ کلام کا لکھا ہوا، آپ کا اپنا ابتدائیہ پڑھ کر پرانی فرمائش (گزارش) پھر دہراتا ہوں اپنی آپ بیتی لکھ چھوڑیں حضرت!''

اظہر جاوید......کچھ یادیں

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

اظہر جاوید اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی یادیں جانے کا نام نہیں لیتیں ہر چند ان سے آخری ملاقات چار پانچ برس پہلے ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی پہلی ملاقات کی یادوں کا سایہ ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ اظہر سے پہلی ملاقات کراچی میں لگ بھگ پچاس برس پہلے ہوئی تھی۔ سال 1962ء کا تھا اور مہینہ جون جولائی کا۔ وہ ''افکار'' کے دفتر میں آئے تھے اور اس وقت وہاں صہبا لکھنوی مرحوم کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا، گفتگو شروع ہوئی۔ وہ گفتگو کے دوران خاصے بے تکلف ہو گئے اور بے تکلفی بھی شائستگی کے ساتھ۔ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں...... کراچی شہر میں اپنی صحافتی زندگی کے حوالے سے کچھ ایسے واقعات سنانے لگے کہ میں نے سوچا کہ اظہر ایک دلدار دوست ہیں اور انہوں نے یقینی طور پر کم عمری ہی میں زندگی کے اس قدر نشیب و فراز دیکھ لئے ہیں کہ اگر وہ ساٹھ سال کے بھی ہوتے تو شاید ان کے پاس اتنے مزیدار واقعات کا ہجوم نہ ہوتا۔

پھر یہ سلسلہ ملاقات ان کے کراچی کے سفر اور میرے لاہور کے سفر کے دوران مدتوں جاری رہا۔ خط کتابت بھی رہی اور وہ ان دوستوں میں سے ہو گئے جو اپنا خط ''یار محمد علی، یا، یار صدیقی'' سے شروع کرتے اور آخر میں ''رب راکھا اظہر'' پر ختم کرتے۔ لاہور میں ملاقات ہوتی تو ان کے دفتر میں سموسوں اور برفی سے ضرور تواضع ہوتی۔ دفر میں کچھ خواتین ادیب بھی تشریف رکھتیں اور میں سوچتا کہ اظہر کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے اور سب سے بطور خاص خواتین سے اس درجہ خلوص اور توجہ سے ملتے ہیں کہ وہ ان کے قریب آنے میں اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتیں۔

''تخلیق''، میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں شروع میں ''جامِ نو'' میں شائع ہوا ہفت روزہ ''الماس'' سے سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ''الماس'' میں زیادہ تر سماجی اور سیاسی مضامین شائع ہوئے۔ اس کے بعد کچھ مضامین ''انشاء''، ''ادب لطیف'' اور ''سیپ'' میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد میں صرف ''فنون'' اور ''اوراق'' کا ہو کر رہ گیا مرحوم قاسمی صاحب سے مرحوم اظہر نفیس صاحب نے تعارف کروایا تھا۔ اور یہ تعارف قاسمی صاحب سے مودت اور عقیدت کے رشتے میں بدل گیا اس کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم نے بھی ''اوراق'' میں مضامین شائع کئے اور بعض حضرات کو اس امر پر حیرت ہوتی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی صاحبان کے درمیان رنجش اور اختلافات کے باوجود میں نے دونوں مرحومین سے اچھے تعلقات قائم رکھے......

اظہر جاوید کو شکایت رہتی کہ میں ''تخلیق'' کیلئے کم لکھتا ہوں لیکن میں 25 سال ماہنامہ ''افکار'' کا مدیر اعزازی بھی رہا اور صہبا صاحب سے بہت قریبی تعلقات کے ساتھ یہ تعلقات وقت کے ساتھ ساتھ گرم جوشی میں اضافے اور زیادہ سے زیادہ قلمی

تعاون کا سبب بنتے گئے۔ میں حکیم محمد سعید صاحب کے افکار فاؤنڈیشن کے وقت Trust کی صدارت کے بعد اس ٹرسٹ کا متولی بھی بنا دیا گیا۔ پھر 1989ء سے ارتقاء Irteqa کی ادارتی ٹیم کا ممبر بن گیا اور ارتقاء انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز کا بانی رکن۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے لئے ''ارتقاء'' کے علاوہ دیگر جرائد میں لکھنا دشوار ہوتا گیا۔ اظہر جاید اس صورتحال سے واقف تھے اس لئے وہ میری کوتاہیوں سے درگزر کرتے رہے لیکن ہمارے تعلقات کی گرم جوشی میں کبھی بھی کمی نہ ہوئی۔، ہمارے درمیان ایک پیارے دوست ظفر اقبال موجود تھے۔ اظہر جاوید ہی نے ظفر اقبال سے ملوایا تھا جس نے کہا کہ روزنامہ ''ڈان'' کے ایریل (Ariel) کے کالم ہم اسکول کے زمانہ ہی سے پڑھ رہے تھے۔'' اس لئے ظفر اقبال کو محمد علی صدیقی کے ساتھ ایریل Ariel سے بھی ملوایا تھا۔ آج ایریل Ariel کو لکھتے ہوئے 49 سال ہو رہے ہیں۔ اس کالم کی وجہ سے ظفر اقبال کے ساتھ جو سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے ممبر کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچے وہ اپنی علم دوستی اور خود ادیب ہونے کی وجہ سے میرے اور اظہر جاوید کے مابین دوست کے ساتھ ساتھ پل بن گئے۔ آپ نے ''تخلیق''، میں ظفر عظیم کی طرف سے تخلیق کیلئے خیرسگالی اور تپاک کے طور پر مندرجات دیکھیں ہوں گی۔ ظفر عظیم ہی ظفر اقبال ہیں اور وہ اس وقت ٹیکسیشن ٹربیونل (Taxation Tribunal) کے جج ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ظفر اقبال نے اظہر جاوید اور میرے ساتھ مل کر ایک ایسا مثلث بنایا تھا جو بے تکلف دوستوں ہی کے مابین ہوسکتا ہے۔

اظہر جاوید اچھے نثر نگار تھے۔ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہوا، اچھے اور خوبصورت شاعر تھے۔ ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم کی رومانی زندگی پر ایک بہت دلچسپ کتاب بھی لکھی۔ انہوں نے بلغارین کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا۔ مترجم کی حیثیت سے لیکن ماہنامہ ''تخلیق'' کی ادارت نے اس کے وقت کا بیشتر حصہ ادارتی مواد اور طباعت کے کاموں نے لے لیا اور باقی حصہ دوستوں کی خاطر اور مدارات کیلئے۔ اظہر جاوید اپنے خاندان کو بھی مقدور بھر وقت نہ دے سکا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کا بیٹا اپنے باپ کے مشن کو پورا کرنے کیلئے دل وجان سے کوشش کر رہا ہے۔

''تخلیق'' نے گذشتہ دس پندرہ سال میں ملک کے بہت اہم دوماہی رسالہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ متعدد ماہنامے اپنے مدیروں کے انتقال کے ساتھ انتقال کر گئے۔ دست بدعا ہوں کہ ''تخلیق'' اپنے سابقہ معیار اور امتیاز کے ساتھ اس کے بیٹے کے ذریعے زندہ رہے اور تخلیق کے محبت کرنے والے اس کے ساتھ قریبی تعاون جاری رکھیں تاکہ اردو ادب کی یہ شمع جلتی رہے۔ اظہر جاوید سے ایک دو باتوں پر اختلاف بھی رہا لیکن وہ اختلاف بھی کیا جو دوستوں کے درمیان ہو اور باقی رہے۔ دوستوں کے درمیان اختلافات وقتی ہوتے ہیں اور رہنے چاہئیں لیکن دوستی وہ لازوال قدر ہے جو اختلافات کو بے معنی بلکہ لایعنی بنا دیتی ہے۔ میرے لئے لاہور اب ایک بہت عزیز دوست سے خالی ہو چکا ہے۔ اس لئے زندگی کا وہ حصہ جو اس کے ساتھ ملزوم تھا وہ بھی مر چکا ہے۔ دوست مرتے ہیں تو بہت سی گواہیاں اور زندگی کا ایک حصہ بھی مر جاتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ زندہ کسے رہنا ہے اور کون رہ پایا ہے۔ بس دوستی کی ایک قدر ہے جو مرنے کا نام نہیں لیتی اور دنیا کی ساری رونقیں اسی یقین کے ساتھ زندہ ہیں۔

اظہر پیارے جہاں رہو خوش رہو، تم نے خوشیاں بانٹی ہیں اور یہ منقسم شدہ خوشیاں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہم تمہیں ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

◆◆◆

اظہر جاوید ایک کھرا اور سچا انسان

فخر زمان

زندگی اور موت ایک ایسا سلسلہ ہے جو صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ ہر روز لاکھوں ہزاروں لوگ اس دنیا میں آتے ہیں اور لگ بھگ اتنے ہی یہاں سے اپنا رخت سفر باندھ کر نہ جانے کس جہان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جسمانی طور پر تو یہاں سے چلے جاتے ہیں مگر ان کی یادیں اتنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں کہ وہ ذہنوں میں نقش ہو جاتی ہیں کہ کوئی انہیں مر کر بھی بھلا سکتا ہے۔ اظہر جاوید میرے چند اُن دوستوں میں سے ایک تھا جسے میں مر کر بھی نہ بھلا پاؤں گا۔

اس کی موت کی خبر مجھے پنجابی زبان و ادب کے محقق و مترجم ڈاکٹر امجد علی بھٹی نے پاکستان سے فون کر کے دہلی (انڈیا) میں دی۔ وقت کی کمی کے باعث اس کے جنازے میں شرکت تو نہ کر سکا مگر چالیس سالوں پر محیط دوستی کا سفر گویا اب بھی اس کی یادوں کے سہارے جاری ہے۔ میں آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ اظہر جاوید کا فون آئے گا اور وہ مجھ سے گھنٹوں لمبی ملاقات کرنے میرے گھر آ جائے گا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہوتا گویا وقت تھم سا جاتا تھا اور ہم فلسفے سے لے کر سیاست کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے۔

روزنامہ امروز میں اس کی تحریریں ہوں یا ماہنامہ ''تخلیق'' کا بیالیس سالہ سفر اس نے ہمت و بہادری سے ہر آمریت خاص طور پر ایوب خان اور ضیا الحق کی آمریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایک طویل عرصے تک ادبی رسالہ نکالنا واقعی اس کے عزم و حوصلے کی علامت ہے۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے حالات سے کمپرومائز کر لیا ہو، وہ حقیقی معنوں میں نہ بکنے والا اور نہ جھکنے والا انسان تھا۔

اظہر جاوید کا ظاہر اور باطن ایک تھا، اسی لیے وہ کسی بھی مشکل سے نہ گھبراتا تھا۔ حالات کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، اس نے جرأت سے ان کا مقابلہ کیا۔ مشکل حالات میں اس کا دل گویا چٹانوں جیسا سخت اور دماغ زیادہ چلنا شروع ہو جاتا تھا۔ آج وہ ہم میں نہیں مگر اس کی یادیں اور مٹھاس بھرے جملے میرے کانوں میں کل کی طرح رس گھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ میں آج بھی فون کی گھنٹی بجنے پر چونک جاتا ہوں کہ اظہر جاوید کا فون ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس کے بغیر ادھورا سا لگنے لگا ہوں۔ اظہر جاوید تم یاد آتے ہو بلکہ ہر وقت یاد آتے ہو۔

◆◆◆

ایک مہربان دوست کی یاد

ڈاکٹر سلیم اختر

میں اب عمر کے اُس دور میں ہوں، جہاں دوستی اور تعلقات کا عرصہ 7,5 سال سے زیادہ نہیں بنتا لیکن اظہر جاوید سے دوستی چالیس پچاس تک جا پہنچی تھی۔ گویا ع

''یہ نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں''

یوں سمجھیے کہ ''تخلیق'' کے اجراء سے پہلے ہم دوست بن چکے تھے۔ اب ''تخلیق'' کا ذکر آیا تو اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ اظہر جاوید نے پہلے ''تخلیقِ نو'' کے نام سے ایک ادبی پرچے کا اجراء ڈیکلریشن کے بغیر کیا تھا۔ اس کے غالباً دو یا تین شمارے طبع ہوئے تھے۔ اس کے بعد اسے ڈیکلیریشن مل گیا اور پھر ''تخلیق'' باقاعدہ رسالے کے طور پر چھپنے لگا اور اظہر جاوید کے انتقال تک بڑی باقاعدگی سے یہ پرچہ طبع ہوتا رہا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ملک میں ادبی پرچہ نکالنا سو فیصد گھاٹے کا سودا ہے۔ ادبی پرچوں کے نہ سالانہ خریدار بنتے ہیں اور نہ ہی ان کی ''سٹال سیل'' ہوتی ہے۔ چند اشتہارات جو ملتے ہیں وہ لائف لائن کا کام کرتے ہیں لیکن اظہر جاوید نے بھی نامساعد حالات کے باوجود پرچے کو زندہ رکھا جو بذاتِ خود کریڈٹ کی بات ہے۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ ادبی پرچہ بلکہ کوئی بھی پرچہ مدیر کی شخصیت کی توسیع ہوتا ہے۔ جیسا مدیر کا مزاج ویسا پرچے کا مزاج، جیسی مدیر کی تخلیقی شخصیت ویسی ہی تخلیقات اس میں طبع ہوں گی۔ بالالفاظِ دیگر ایڈیٹر کی پسند اور ناپسند بالواسطہ طور سے ہی سہی، لیکن پرچے میں نظر ضرور آتی ہے۔ اسی سے ہی 'نقوش'، 'فنون'، 'اوراق'، 'سیپ' اور دیگر ادبی پرچوں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات ایک نوع کی تحریر جو ایک رسالے میں قابلِ قبول نہیں ہوتی وہ دوسرے پرچے میں چھپ جاتی ہے۔ اظہر جاوید نے بھی ''تخلیق'' کو اپنی تخلیقی شخصیت کا آئینہ بنا دیا تھا۔ اس کے ہر ورق سے اظہر جاوید منعکس ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کی تصویر ''تخلیق'' میں کبھی نہیں چھپی۔

اظہر جاوید جب سرگودھا سے آیا تو وہ لاہور کے لئے اجنبی تھا، اب افراد کی طرح شہروں کے بھی مخصوص مزاج ہوتے ہیں۔ میں لاہور کو ایک نرگسی شہر سمجھتا ہوں۔ یہ شہر کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، اسی لئے مضافات کے ادیب لاہور کو

سومنات کی طرح فتح کرنا چاہتے ہیں لیکن لاہور کو فتح نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس شہر سے سمجھوتا کر کے بقائے باہمی کے اصول پر زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

اظہر جاوید سیلف میڈ انسان تھا۔ اس نے بڑی محنت سے لاہور کے ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنایا اور اپنے فن کو تسلیم کروایا اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے روزنامہ ''امروز'' جیسے معیاری اخبار میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ''امروز'' ترقی پسند ذہن کا اخبار تھا اور ملک کے معروف ترقی پسند ادیب اور شاعر اس پرچے سے وابستہ تھے۔ فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت اس کے پہلے مدیران تھے۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی ''امروز'' کی ادارت سنبھالی۔ اس ماحول سے اظہر جاوید نے بہت کچھ سیکھا اور بحیثیت صحافی اس کی صلاحیتیں صیقل ہوئیں۔ امروز سے جو کچھ اظہر جاوید نے سیکھا وہ ''تخلیق'' کی ادارت میں اس کے کام آیا۔

رسالہ ''تخلیق'' ممتاز ادبی جریدہ 'نقوش' کی طرح ضخیم تو نہیں تھا لیکن مزاج اس کا بھی تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا تھا۔ اظہر جاوید کو اس لحاظ سے بھی کامیاب مدیر کہا جا سکتا ہے کہ اسے پاکستان اور ہندوستان کے نامور اہلِ قلم کا تعاون حاصل تھا چنانچہ پرچے کی کم ضخامت بھی معیار کی بلندی کی ضامن تھی۔

جہاں تک میرے اور اظہر جاوید کے تعلقات کی بات ہے تو میں محض ایک لکھنے والا نہیں تھا۔ بلکہ اظہر سے میری گہری دوستی تھی جس زمانے میں ''تخلیق'' کا دفتر نیشنل بنک کے ساتھ والی سڑک پر تھا تو اس کا دفتر میرا ٹھکانہ ہوتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ میں ٹی ہاؤس میں نہیں بیٹھتا تھا بلکہ دفترِ ''تخلیق'' میں پایا جاتا تھا چنانچہ مجھ سے ملنے والے سیدھے دفترِ تخلیق آ جاتے اور ان سے ملاقات ہو جاتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دفتر میرا مستقل ٹھکانہ تھا۔

میرے اظہر جاوید سے کس نوع کے تعلقات تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ جب میں نے ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی تو احباب نے پارٹی کا تقاضا کیا۔ پارٹی کا اہتمام ایک ہوٹل میں کیا گیا اور تمام معروف ادیبوں نے اس میں شرکت کی۔ دعوت نامے کے کارڈ پر بطور میزبان اظہر جاوید کا نام اور اس کے دفتر کا پتا درج تھا اور اس نے ہی میزبان بن کر مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اس طرح کی بہت سی یادیں ہیں اور واقعات ہیں جن سے ہمارے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ درمیان میں بعض معاملات پر کچھ اختلافات بھی ہوئے لیکن دوستی کا رشتہ مستحکم رہا۔

اظہر جاوید اکثر مذاق میں یہ کہا کرتا تھا ''میں ایڈیٹر بھی ہوں، کلرک بھی اور چپڑاسی بھی۔ یعنی سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے''۔ مطلب یہ کہ ''تخلیق'' کے وسائل اتنے محدود تھے کہ اظہر جاوید کوئی عملہ نہیں ملازم رکھ سکتا تھا وہ خود ہی رسالہ پریس سے لاتا اپنے ہاتھ سے پتے لکھتا اور خود ہی جا کر جی پی او میں سپردِ ڈاک کرتا، لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی اشتہارات کی بھیک نہ مانگی۔ جو مل گیا، جتنا مل گیا اسی پر گزارا کیا بلکہ اس ضمن میں دوستوں کو بھی زحمت نہ دی کہ تم میرے لئے کچھ کرو۔ میں ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے اُس کی خودداری اور عزتِ نفس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب پہلی مرتبہ اسے دل کا دورہ پڑا تو میں حال پوچھنے گیا۔ اُن دنوں حکومتِ پنجاب نے رائٹرز ویلفیئر فنڈ قائم کر رکھا تھا جو ادیبوں کی امداد کے لئے تھا۔ ان دنوں میں رائٹرز ویلفیئر فنڈ کا ممبر تھا۔ میں نے اظہر جاوید سے کہا۔

''تم اسپتال آئے ہو، دل کا معاملہ ہے، خاصا خرچ ہوا ہوگا میں بڑی آسانی سے تمہیں کم از کم تیس ہزار روپے دلوا سکتا ہوں بلکہ اگر چاہو تو میں کوشش کر کے پچاس ہزار تک روپے منظور کروا سکتا ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ایک صفحے کی عرضی لکھنے کی پریشانی بھی نہیں ہوگی۔ میں سب سنبھال لوں گا''۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس نے امداد لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ یہ حکومت کا پیسہ ہے اور ادیبوں کی امداد کے لئے ہی ہے۔ اور اس میں کسی کا احسان نہیں ہے۔ لیکن میرے اصرار کے باوجود اس نے امداد کی رقم لینا قبول نہ کیا۔

یہ تھی خودداری اُس شخص کی جس نے خودی نہ بیچی، غریبی میں نام پیدا کیا۔

ویسے تو پاکستان پر فوجی آمروں کا عفریت مسلط رہا ہے لیکن ضیاء الحق کا دور پاکستان کے لئے عذاب سے کم نہ تھا۔ آزادیٔ تحریر و تقریر کی پابندی، سخت سنسر شپ، روشن خیال ادیبوں اور صحافیوں نے جمہوریت کے سلسلے میں ایک قرارداد پر دستخط کئے۔ ان دستخط کرنے والوں میں اظہر جاوید بھی تھا اور دیگر اخبارات کے صحافی بھی۔ ضیاء الحق نے ان سب کو ملازمتوں سے برخواست کر دیا۔ مسعود اشعر کو بھی ''امروز'' سے اسی سلسلے میں نکالا گیا۔ بے روزگاری کا یہ وقت اظہر جاوید کے لئے بہت کٹھن تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ''تخلیق'' کو بھی نکالتا رہا اور گھر بھی چلاتا رہا۔ عزتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ کسی دوست سے بھی اُدھار نہ مانگا۔

اظہر جاوید کی شخصیت کا یہ پہلو قابلِ قدر ہے کہ اس نے کبھی ناجائز طور پر مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی نہ ہی ''تخلیق'' کو غیر تخلیقی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ وہ خاموش بیٹھا کام کرتا رہا حتیٰ کہ حکومت میں سے کسی کو خیال آ ہی گیا کہ ایک اظہر جاوید بھی ہے جو خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ چنانچہ گزشتہ برس اسے ''صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی'' دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمغہ اسے 23 مارچ کو گورنر پنجاب سے لینا تھا لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ 13 رفروری کی رات جم خانہ کلب کے ایک عشائیے میں وہ حسبِ معمول چہک رہا تھا اور بہت خوش تھا لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اگلا دن جان لیوا ثابت ہوگا۔ اظہر جاوید نے جس سکون سے زندگی بسر کی تھی اُسی سکون سے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

رہے نام اللہ کا!

◆◆◆

محبتوں کا سفیر

عابد حسن منٹو

اظہر جاوید سے میری پہلی ملاقات سن ستر کی دہائی میں اس وقت ہوئی جب ہم لوگ ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلہ میں لاہور کے ان ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں سے رابطہ کر رہے تھے جنہیں ترقی پسند سمجھا جاتا تھا......اظہر جاوید کا نام اسی فہرست میں تھا۔ نہ تو یہ ملاقات کچھ لمبی تھی اور نہ ہی اس کے بعد ہمیں ایک لمبے عرصہ تک کبھی ملنے کا موقعہ ملا، مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے یا نہیں اگرچہ ٹوبہ میں کوئی ڈیڑھ لاکھ کسانوں اور محنت کشوں کے ساتھ پنجاب خاص طور پر لاہور کے درجنوں اہلِ فن اور دانشور شامل تھے۔ میں خود اس دوران اپنے پیشہ ورانہ کاموں اور کچھ اپنی سیاست میں گم رہا، ادب اور ادبی ہنگاموں اور مجلسوں سے میرا پہلے جیسا تعلق نہ رہا۔ پھر کیا ہوا کہ ایک روز تسنیم منٹو نے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھمایا جس پر اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کا پتہ درج تھا اور مجھے تاکیداً کہا کہ یہ آج ہی پہنچنا چاہیے......بھگوان سٹریٹ میں واقع دفتر ''تخلیق'' کا نیم بند دروازہ کھول کر جب میں اندر داخل ہوا تو کتابوں، رسالوں اور بہت سی بے ترتیبی کے درمیان اظہر جاوید اپنی میز پر جھکا کچھ کام کر رہا تھا، اس نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا اور ابتدائی کلمات کہے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہم اجنبی تو ہرگز نہیں......اظہر جاوید کی شخصیت کا یہ حصہ تھا کہ اس میں اجنبیت نہیں تھی، وہ دوستوں کا دوست تو تھا ہی اس پر اس میں ایک خاص طرز کی گرمجوشی (Warmth) تھی جو وہ ہر ملنے والے کو بانٹتا تھا......

پھر مجھے بھگوان سٹریٹ کئی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا......کبھی تسنیم منٹو کا افسانہ پہنچانے اور کبھی اظہر جاوید کی شام کی دعوتِ طعام میں شمولیت کے لیے۔ یہ دعوتیں بھی دل چسپ تھیں، اظہر کے لکھنے پڑھنے والے دوستوں (خاص طور پر خواتین) کا باہم مل بیٹھنے کا بہانہ......گفتگو، ادبی اور غیر ادبی، اور کھانا......اس دوران اظہر جاوید نے مجھے از سرِ نو لکھنے پر اکسایا، اور کئی سالوں کے بعد 'تخلیق' 1999ء کے اواخر میں میرا مضمون ''پھر وہی نظریئے کی بحث'' شائع ہوا...... نئے لکھنے والوں کو متعارف کروانا اور ان کے تخلیقی کاموں کو سراہنا یہ اظہر جاوید کا 'طرزِ ادارت' تھا۔ اس نے اپنا تخلیقی کام بھی باقاعدگی سے جاری رکھا اور اس میں نام کمایا اور سرکاری اعزاز سے بھی نوازا گیا......تاہم ایک شخص کی حیثیت سے دوستی، محبت، رفاقت کا متلاشی اور یہی جذبات تقسیم کرنے والا اظہر جاوید اب نہیں رہا...... یار زندہ رہتے ہیں تو محبتیں باقی رہتی ہیں اور جب وہ نہ رہیں تو صحبتوں میں گزرے ہوئے لمحے یاد رہتے ہیں۔

◆◆◆

کون اظہر جاوید؟

مستنصر حسین تارڑ

اگر آپ کو پچھلے چالیس برس سے ایک محبوب کے ہاتھوں کے سبز روشنائی سے لکھے ہوئے آپ کے نام کے پیام باقاعدگی سے آتے رہے ہوں...... آپ کی ڈاک کے پلندوں میں، نو آموز شاعروں، افسانہ نگاروں کے مجموعے، ادبی رسالوں کے انبار، آپ کے تازہ ترین ناول کے حوالے سے کچھ تنقیدی کچھ توصیفی خطوط آتے رہے ہوں جنہیں آپ محفوظ نہیں کرتے، تو ان پلندوں میں کہیں باقاعدگی سے سبز روشنائی سے لکھا ہوا اُس کے ہاتھوں کا لکھا ہوا جو پیام ہوتا ہے، آپ اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اُسے آپ سینے سے لگا لیتے ہیں کہ یہ اظہر جاوید کے ''تخلیق'' کا پیام ہوتا ہے۔

اور پھر یک دم یہ سلام و پیام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

اظہر جاوید مر جاتا ہے، حیات سے منقطع ہو جاتا ہے۔

وہ گرین مارکر جس کے ساتھ وہ میرا نام ''تخلیق'' کے تازہ ترین شمارے کے لبادے پر لکھا کرتے تھے، وہ بنجر ہو جاتا ہے۔

''تخلیق'' ایک لو لیٹر تھا جو میری ڈاک کے پلندوں میں ایک چراغ کی مانند روشن ہو کر مجھے متوجہ کرتا تھا۔

وہ ایک بے مہر اور تاریک شب تھی جس میں، میں اُس گلی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا جس کے ایک گھر میں وہ مُردہ پڑا تھا۔

اُس گلی کا کوئی بھی مکین اظہر کو نہیں جانتا تھا۔

''کون اظہر جاوید۔''

اس لئے کہ وہ اس گھر میں بہت کم آیا تھا۔ اُس کی ایک اپنی پوشیدہ حیات تھی۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُس پوشیدگی میں اظہر کہاں مقیم ہے؟

ایک عجیب سی مسجد جس کے اندر کرسمس کی سی جلتی بجھتی روشنیاں تھیں، جھالریں لٹکتی تھیں، اُس کے باہر اُس کا جنازہ تادیر منتظر رہا۔ اُس کے دوست احباب انتظار کرتے کرتے تھک گئے، جو اُس کے لئے پھولوں کی چادر لائے تھے وہ تھک گئے۔ جنہوں نے اُسے اپنے ادبی تعصب سے شکار کیا تھا، وہ تھک گئے۔ کچھ اپنی کہولت کو آسرا دینے کی خاطر مسجد کے برابر میں واقع ایک گول گپوں کی دکان سے کرسیاں مستعار کر کے اُن پر ڈھیر ہو گئے...... منتظر ہو گئے کہ کب اظہر کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور کب ہم فارغ ہوں۔

ان میں سے کچھ ایسے تھے جو اظہر کے جانے کے بعد ادبی یتیم ہو گئے تھے۔اُن کا کوئی والی وارث نہ رہا تھا۔

ہم دونوں، شائد چالیس برس پیشتر دوستی کے ایک ڈبے میں سوار ہو کر ادبی سفر پر گامزن ہوئے......لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ راستے میں کون سے سٹیشن پر اظہر اتر گیا یا میں نے اُس کی ہم سفری سے فرار حاصل کر لیا۔

ہماری خصلتیں جدا تھیں، مزاح کے رنگ مختلف تھے۔ہم نے جدا ہونا ہی تھا۔شائد یہ تیس برس پہلے کا قصہ ہے کہ میں نے اور ذوالفقار تابش نے...... جسے صوفی کا خطاب اظہر نے دیا تھا، باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ''تخلیق'' کی ادارت میں شامل ہو کر اس کے ادبی معیار کو بہتر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

تمام ادبی پرچوں میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ''تخلیق'' کا اپنے تئیں معیار بلند کرتے ہیں کہ اظہر نہایت رقیق القلب یا رکیک القلب واقع ہوا تھا، اُس کا ادبی پیمانہ یہی تھا کہ تحریر کسی نسوانی ہاتھ کی ہو، کہیں بھی ہو، قابلِ اشاعت ہے۔ بے شک ''تخلیق'' میں اس عہد کے تمام بڑے ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں، جن کی نہیں شائع ہوتیں یا وہ بڑے ادیب نہ تھے لیکن......اظہر ایک عورت ترس انسان تھا، وہ خوبرو ترین خواتین سے لے کر قریب المرگ......اپنی بتیسیاں سنبھالتی، بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی خواتین سے بھی یکساں سلوک کرتا تھا۔وہ ایک ایسا صوفی تھا چنانچہ ''تخلیق'' کو سدھارنے کی خاطر ہم تینوں کی ایک خفیہ محفل کا انعقاد ہوا۔تابش نے ''تخلیق'' کے سرورق کے پیچھے شائع ہونے والی آؤٹ آف فوکس خواتین کی تصاویر سے اجتناب کا مشورہ دیا تو اظہر کہنے لگا ''ظالمو......انہی تصویروں کے لئے تو میں ''تخلیق'' کے پاپڑ بیلتا ہوں......بقیہ صفحات پر جو تم کہو گے وہ شائع کروں گا لیکن......!'' چنانچہ مذاکرات فوری طور پر ناکام ہو گئے۔

اب سوچتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا......کہ ''تخلیق'' اُس کی ذات کی محرومیوں، اُداسیوں، ناکام محبتوں اور عائلی زندگی کی ناکامیوں سے عبارت تھا۔ہماری دخل اندازی اس کی شباہت بدل دیتی اور وہ ''تخلیق'' نہ رہتا۔کوئی عام سا ادبی پرچہ ہو جاتا۔خواجہ زکریا نے اظہر کی یاد میں ایک محفل میں کیسی پتے کی بات کی تھی کہ ہمارے درمیان قربت نہ پیدا ہو سکی اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کسی بھی شخص سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ہماری مرغوب زندگی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔

اظہر نے اپنی طرز کی مرغوب زندگی گذاری۔''زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے'' کے رونے روتا رہا لیکن یہ ایک ایسا لبادہ تھا جس میں وہ خوش رہتا تھا۔میں ان زمانوں کو یاد کرنے سے اجتناب کرتا ہوں جب......اُس کی بے رُخی اور بے پروائی کی فریادیں مجھ تک آتی تھیں۔مجھے اُس کی موت سے صدمہ تو ہوا لیکن میں نے اُس پر رشک بھی کیا۔اُس نے اپنی من پسند زندگی گذاری اور نہایت آرام سے مر گیا۔یہ خوش نصیبی ہم میں سے کتنوں کی قسمت میں ہے۔

اُس کی موت نے مجھے سب سے بڑا دُکھ یہ دیا کہ اُس کے ہاتھوں کے لکھے جو پیام، جو لو لیٹر آتے تھے وہ معطل ہو گئے اور اُس گلی میں جس کے ایک مکان میں اُس کا جنازہ پڑا تھا وہاں اُسے کوئی نہ جانتا تھا۔

کون اظہر جاوید؟

◆◆◆

جدید رومانی شاعر......اظہر جاوید!

خواجہ محمد زکریا

اظہر جاوید ہمہ جہت شخصیت تھے لیکن میرے خیال میں ان کی اہم ترین جہت ان کی شاعری ہے۔ ان کی شعری حیثیت ہی انھیں صحافت میں لائی اور صحافت میں بھی کسی نہ کسی حوالے سے وہ شعروادب ہی سے وابستہ رہے۔

انھوں نے نوجوانی بلکہ لڑکپن میں شعر کہنے کا آغاز کیا اور تا دمِ آخر شعر گوئی میں منہمک رہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کی عمر قریب قریب ساٹھ سال بنتی ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے مختلف اصناف میں اتنی شاعری کی کہ اگر ان تمام نگارشات کو یکجا کر لیا جائے تو کم از کم نو دس مجموعے تیار ہو سکتے ہیں لیکن وہ مقدار کے نہیں معیار کے قائل تھے اسلئے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' 2003ء میں شائع ہوا جب ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی۔ اب احباب کے اصرار پر دوسرے مجموعے کی اشاعت پر آمادگی ظاہر کرنے لگے تھے مگر اجل نے مہلت نہ دی۔ خدا کرے یہ مجموعہ منظرِ عام پر آ سکے۔

''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' کا سرسری مطالعہ بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ اظہر جاوید بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ ہمارا عہد رومانیت کا دشمن عہد ہے۔ روزمرہ کے حالات سنگین حقائق کو اتنی شدت سے سامنے لاتے ہیں اور بنیادی ضروریات کے حصول کی تگ و دو ہمیں اس طرح اسیر کر لیتی ہے کہ رومان اور رومانی جذبات گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ سعدؔی نے کہا تھا کہ ایک بار دمشق میں اس شدت کی خشک سالی ہوئی کہ لوگوں نے ''عشق'' کو بھلا دیا ہمارا زمانہ بھی کم وبیش ایسا ہی ہے اسلئے ہمارے ہاں رومانی شاعری تو مل جاتی ہے لیکن اب کچھ عرصے سے کوئی شاعرِ رومان پیدا نہیں ہوا۔ اظہر جاوید سیاسی لحاظ سے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے کچھ عملی جدوجہد کی اور زیرِ عتاب بھی آئے لیکن شاعری کو اس رنگ میں زیادہ ملوث نہیں کیا۔

اظہر جاوید کو اخترؔ شیرانی، ساحر لدھیانوی، ابنِ انشاء، فیض، اور احمد فراز کی شاعری پسند تھی۔ علاوہ ازیں اپنے سرگودھے کے قیام کے زمانے میں الطاف مشہدی سے بھی ان کا قرب رہا جو اپنے عہد کے معروف رومانی شاعر تھے۔ قدرت نے انھیں رومانی مزاج عطا کیا تھا اور روحانی دنیا میں رہنا پسند کرتے تھے۔ حقائق کی دنیا انھیں بار بار بلاتی تھی مگر وہ رومانی دنیا کے باغ وراغ میں زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ تمام عمر رومانی انداز میں شعر کہنے کی وجہ سے ایک ایسا رومانی رنگ ان کے

ہاں نظر آتا ہے جو کسی اور رومانی شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ ان کے کلام کی مشابہت ایک حد تک احمد فراز سے ہے۔ باقی شعراء کے کلام کی پسندیدگی کے باوجود ان کی کہیں پر چھائیں تو پڑ جاتی ہے مگر گہرا اثر ان میں سے کسی کے کلام کا نظر نہیں آتا۔ سب سے پہلے اختر شیرانی کی رومانیت کو لیجئے، ایک لحاظ سے اختر۔ ہمارے ہاں رومانی شاعری کا آغاز کرنے والے ہیں۔ غزل کی عشقیہ شاعری سے قطع نظر جو رومان ہمارے ہاں مغرب سے بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں میں آیا اس کا کچھ نمونہ اختر شیرانی کے ہاں موجود ہے۔ مغربی رومانی شعراء کے ہاں محبوباؤں کو نام لے کر نظموں میں مخاطب کیا جاتا ہے یا ان کو صیغہ واحد غائب میں بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ورڈز ورتھ کی لوسی یا ٹینی سن کی ماڈ (maud) اسی طرح کے رومانی نام ہیں۔ اختر شیرانی کے ہاں سلمیٰ اور اس قبیل کے کئی نام دراصل انگریزی رومانی شعراء کی پیروی میں نظر آتے ہیں۔ رومانی نام اظہر جاوید کے ہاں بھی موجود ہیں مثلاً لیلیٰ، عینی، مومل وغیرہ۔ فرق یہ ہے کہ اختر کے ہاں یہ نام زیادہ تخیلی لگتے ہیں اور گوشت پوست کے پیکر معلوم نہیں ہوتے جب کہ اظہر کے ہاں رومانی عناصر ان نسوانی ناموں سمیت گوشت پوست کے پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اختر کے زمانے اور موجودہ زمانے کی فضا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس دور میں متوسط طبقے کی کوئی لڑکی بے نقاب کہیں آ جا نہیں سکتی تھی جب کہ ہمارے زمانے میں لڑکیاں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں اور مردوں سے میل ملاپ کے سلسلے میں وہ پابندیاں خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

رومانی شاعر عشق وعاشقی کے مضامین تو باندھتا ہی ہے لیکن ان مضامین کی نوعیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض رومانی شعراء کسی ایک کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور ایسا عموماً ناکام محبت میں ہوتا ہے چنانچہ وہ اس ناکامی کے بارے میں اپنے تخیل کی مدد سے داستان تراشی کرتے رہتے ہیں جب کہ ایسے رومانی شعراء بھی ہیں جن کا ایک ساجن نہیں ہوتا بلکہ ہر قریب آنے والا ساجن کا روپ دھار لیتا ہے۔ ہر ساجن کا الگ روپ بہروپ اور منفرد ناز و انداز ہوتا ہے۔ رومانی مزاج کا حامل شخص اس اختلافِ ظاہر و باطن سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مختلف نوعیت کے ان تجربات کو حرزِ جاں بنا کر رکھتا ہے۔ ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی رومانی شاعری ہمیں ایسے ہی ایک شاعر سے متعارف کراتی ہے۔

یہ شاعر اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرتا ہے۔ یقیناً اس میں کچھ صداقت بھی ہوتی ہے۔ وہ حالات کا ستایا ہوا ہوتا ہے۔ عموماً زندگی میں اسے کہیں ٹک کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا۔ گھریلو مسائل کو سلجھا نہیں پاتا۔ ان سے گریز کر کے۔ ادب وشعر اور تخیل و رومان کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور یہ پناہ اول تو ملتی نہیں اور اگر مل بھی جائے تو کسی نہ کسی بہانے اس سے کنارہ کشی کر لیتا ہے کیونکہ وہ جنم جنم کا بنجارہ ہوتا ہے۔ بے سکونی ہی اسے سکون دیتی ہے اور سیلانی مزاج اسے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا۔ یوں تو پرندوں کو لوٹتے دیکھ کر اسے اپنی بے گھری کا ملال ہوتا ہے لیکن اس ملال ہی میں اسے یک راحت ملتی ہے اور اگر اسے گھر فراہم بھی کیا جائے تو ''نگھرا'' ہونا ہی اس کے لیے قابل ترجیح ٹھہرتا ہے۔ ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کا شاعر دکھ، درد، ملال، تنہائی، ناکامی، محرومی، عدم تحفظ وغیرہ کا شکار ہے۔ زندگی میں سب کو یہ ''غذا'' کم وبیش میسر آتی ہے۔ بقولِ میر

جگر چاکی، ناکامی! دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہوگا

لیکن میرؔ سمیت رومانی شخصیات اپنی ناکامیوں کو ان کے تناسب سے زیادہ محسوس کرتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تخلیقی فن کار بننے کی بجائے مادی مفادات کے حصول میں سرگرداں ہوتے۔ اپنی زندگی میں ان ناکامیوں سے پیدا ہونے والے دکھ درد اور اس کے نتیجے میں یہ احساس کہ ان کی زندگی ناکام ہے، ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی رومانی شاعری میں اس ناکامی کو بنیادی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ناکامی اشعار میں مختلف روپ دھار کر ظاہر ہوئی ہے۔

شام ہوئی سب بنجارے سب پنچھی گھر کو لوٹ چلے
کاش کوئی میرا بھی گھر ہو کاش کبھی گھر جاؤں میں

....

تمام عمر کی بے چارگی کا حامل ہیں
یہ چند شعر جو مقبول ہیں حسینوں میں

....

عمر بھر یہی سوچا
سوچنے سے کیا پایا
چاہنے سے کیا حاصل
چند بے نوا یادیں
اور دل کی فریادیں
(بے ثباتی)

....

کچھ زخم سہی کچھ خواب سہی
اب عمر کے باقی سال مرے
اس الجھن میں کٹ جائیں گے
بس آہوں میں بٹ جائیں گے
(نظم)

تاہم یہ رومان سراسر ناکامی اور نامرادی پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں متعدد مواقع آتے ہیں جب شاعر کسی کے قرب

سے سرشار ہوتا ہے اور جواب میں بھی اسے چاہت ملتی ہے۔اس قسم کے تاثرات ’’غمِ عشق گر نہ ہوتا‘‘ کی نظموں اور متفرق شعروں میں کئی جگہوں پر منعکس ہوئے ہیں اور۔ یہی لمحات ہیں جو شاعر کو بعد میں آنے والے ’’فراق لمحوں‘‘ کا دکھ برداشت کرنے کی ہمت دیتے ہیں۔اس مجموعے کی بہت سی دلکش ’’وصال لمحوں‘‘ کی سرشاری اوران کی یادوں کے سبب ہے۔

اتنا پیار دیا ہے اس نے دامن میرا تنگ ہوا
قدرت کے اس لطف و کرم پر میں حیرت سے دنگ ہوا

....

وہ آنکھوں سے سناتا ہے کہانی
بھری محفل میں بھی ڈرتا نہیں ہے

....

میری عرضِ شوق پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی
اور میں خوش ہوں مجھے اس کی ہنسی اچھی لگی

....

چھوڑو یار یہ پیار کی باتیں، کتنی گھاتیں کتنی ماتیں
جس جس نار کو یاد کرو گے لاکھوں درد پرو دے گی

....

اک بار ہاتھ چھو گیا اس کے بدن کے ساتھ
برسوں میں انگلیوں کو یونہی چومتا رہا

....

عجیب پارہ صفت ہے وہ بھی
کبھی وہ اک پل میں مہرباں ہے
کبھی وہ لمحوں میں سرگراں ہے
کبھی وہ شعلہ کبھی ہے شبنم
کبھی ہے آنکھوں میں کھردرا پن
کبھی تبسم میں اک ترنم
کبھی ہے لہجے میں کپکپاہٹ
کبھی نگاہوں میں مسکراہٹ

کبھی رفاقت کا ایک بادل
کبھی عداوت کی دھوپ ہے وہ
کبھی بہاروں کا سبز آنچل
کبھی خزاؤں کا روپ ہے وہ

(شعلہ شبنم لڑکی)

....

سوچتا ہوں اس نے کیوں چاہا مجھے
مجھ میں کیا دیکھا کہ میری ہوگئی

(میں اور وہ)

اک پل میں یوں لگتا ہے
ان آنکھوں سے جتنا پیار جھلکتا ہے
وہ سب میرا حصہ ہے

(دو جا پل)

اس مجموعے کا شاعر شاید عشق کا گہرا زخم کھانا نہیں چاہتا۔ وہ مختلف ''حسینوں' سے مختلف اوقات میں تعلق بڑھا کر زندگی کو رنگین کرنا چاہتا ہے۔ ان میں ایسی بھی ہیں جو آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایک جگہ محبت کا رشتہ قائم کر کے اچانک بدل جانا اور کسی دوسری جانب رخ کر لینا اور پھر واپس آ جانا ان کے لیے باعثِ عار نہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ شاعر بھی اس رویے کو طوعاً و کرہاً یا تقدیر کا پھیر سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں اور اپنی تعریف سن کر پھولی نہیں سماتیں لیکن یہ بھی ہے کہ اس تعلق کے دوران وہ نفسیاتی یا مادی فوائد کے حصول سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ دراصل زندگی ''فارمولا'' نہیں ہے۔ دل و دماغ میں مختلف اور متضاد لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ پرانے سماج نے ''وفا'' کو ایک بڑی قدر بنا دیا تھا اور کم از کم عورتوں کو ''وفا کی دیوی'' قرار دے کر اس پر وہ تمام راستے بند کر دیے تھے جو مردوں کے لیے کھلے تھے لیکن گزشتہ چند دہائیوں میں ہمارے ہاں یہ ''قدر'' بدلتی جا رہی ہے اور عورتوں نے معاشرتی مساوات کی فضا میں اپنے دل و دماغ کی لہروں کو بھی مردوں کی طرح تسلیم کر لیا ہے اور ان پر عامل بھی ہونے لگی ہیں اس لیے اب ایسی خواتین ہمارے ہاں ادھر اُدھر دکھائی دینے لگی ہیں جو مردوں سے محض عاشقی اور محبوبیت کا سلسلہ نہیں چاہتیں بلکہ دوستی کا تعلق چاہتی ہیں جب کہ مرد اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ''وفا کی دیوی'' بن کر رہے۔ اس کشمکش میں کتنے ہی رومانی اور کتنے ہی غیر رومانی مراحل آتے ہیں، اظہر جاوید کے ہاں ایسے تمام مراحل میں مرد اور عورت کی جذباتی کشمکش کا اظہار شعروں میں منتقل ہو گیا ہے۔

کبھی شاعر اپنی بے چارگی، تنہائی اور اداسی کا بیان کرتا ہے، کبھی اپنے مقدر کو کوستا ہے، کبھی اپنے سیلانی مزاج کو ناکامی کا جواز بناتا ہے، کبھی کسی حسینہ کی قصیدہ خوانی کر کے اسے اپنی طرف مائل کرتا ہے، کبھی مسلسل محرومیوں کا ذکر کر کے حسیناؤں کی ''ممتا'' کے جذبے کو اکسانے کی کوشش کرتا ہے......اور ان ''ہنرمندیوں'' سے انھیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ عشقیہ شاعری میں ایسے تمام مراحل کی مصوری کسی ایک شاعر کے ہاں اپنی تمام نفسیاتی گہرائی کے ساتھ دیکھنی ہو تو وہ اظہر جاوید کی شاعری میں ملے گی......اور یہ مراحل دراصل زندگی کے سرابوں میں پانی کی تلاش سے مشابہہ ہیں۔

حقیقت کی دنیا بہت سنگین ہے۔ اس میں تلخیاں بھری پڑی ہیں۔ زندگی گزارتے ہوئے لمحہ لمحہ اپنے آپ سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اکثر اوقات اپنے آپ پر جبر کر کے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو زندگی میں ہمیشہ خوش رہا ہو۔ جس کے ہاں ناکامیاں اور محرومیاں نہ ہوں، جو اپنی شرائط پر زندگی گزار سکے۔ اس سنگین دنیا سے فرار کے لیے ہم سب اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ یہ فریب ہی ہمیں رومانی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں محرومیاں ہیں تو دل فریب، ناکامیاں ہیں تو لذت آمیز دوستی، خلوص، قربانی کا جذبہ سنگین حقیقتوں سے فرار کے ازالے کی ایک صورت ہے۔ عموماً یہ جذبہ بھی عارضی ہوتا ہے۔ اس کے محرکات اور افراد بدلتے رہتے ہیں۔ رومانی شاعر ان تضادات کو خوبصورت انداز میں لفظوں کا روپ دے کر ہماری زندگیوں کو، عارضی طور پر ہی سہی، نشاط، حیرت اور لذت اور آگہی مہیا کرتا ہے اس لیے رومانی شاعری ''آشوبِ حالات'' کے باوجود پسند کی جاتی ہے اور پسند کی جاتی رہے گی۔

آخر میں ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' سے چند اشعار اور نظموں کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں جن میں ایسی ''رومانی حقیقتوں'' کی تصویریں بنائی گئی ہیں جن کے رنگ و روغن سے ہماری آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور محسوسات سے ہمارے دلوں پر عجیب کیفیتیں گزر جاتی ہیں۔

میں شاد کام ہوں خوش ہے رقیب بھی میرا
عجیب رشتہ بنایا ہے تم نے تینوں میں

....

تیرے روکھے پن کا شکوہ کیا کرنا
میں نے چاہت کا بھی دریا دیکھا ہے
جب تم مجھ کو بانہوں میں بھر لیتی ہو
میں نے وقت کو رکتا تھمتا دیکھا ہے

....

دیر تک رہتا نہیں موسم بھری برسات کا
دیر تک اظہر چمکتی بجلیاں رہتی نہیں

تتلیاں پکڑنے کا شوق ہم کو تھا لیکن
انگلیوں کو کانٹوں سے ہم فگار کر بیٹھے

....

کیا ہے تقدیر کی تقسیم، رضا کیسی ہے
بندگی چپ ہے جواب اس کا دیا جاتا نہیں

....

نظم لکھوں تو کیا لکھوں یارو!
خواب بُنتا رہوں تو اچھا ہے
وقت کے ناتمام دامن سے
درد چنتا رہوں تو اچھا ہے
بے بسی کے سروں میں ڈوبے ہوئے
گیت سنتا رہوں تو اچھا ہے

....

آج پھر آنکھوں سے بے موسم کی برساتیں ہوئیں
دیر تک تیری سہیلی سے تری باتیں ہوئیں

....

تم سے لاکھوں سوال کرنے ہیں
اپنی بے رنگ زندگانی میں
جانے اَن جانے خواب بھرنے ہیں

....

فون پر اس کم سخن کی دل لگی اچھی لگی
مجھ کو پہلی بار اپنی زندگی اچھی لگی

◆◆◆

سراپا پُراَسرار......اظہر جاوید

مرتضیٰ برلاس

مجھے اظہر جاوید مرحوم کے قریبی حلقہء احباب میں ہونے کا دعویٰ تو نہیں البتہ اس حلقہ سے وابستہ ہونے کا افتخار ضرور حاصل ہے جس سے بات چیت کرتے ہوئے وہ ہمیشہ حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے تھے۔ مجھے ملازمت کی دربدری کی وجہ سے لاہور میں رہنا کم ہی نصیب ہوا۔ ہم لکھنے لکھانے والے لوگ اخبارات، رسائل کے توسط سے غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے پہلے سے واقف ہوتے ہیں مگر پہلی بار 1976ء میں دو سال کے لئے مجھے پاکستان آرٹس کونسل (الحمراء) کا ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بنا کر بھیجا گیا تو میری بالمشافہ اظہر جاوید سے قتیل شفائی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ قتیل صاحب ہمیشہ دوستوں کو اکٹھا کرنے کے منتظر رہتے تھے اور جب کوئی پردیسی دوست لاہور آتا وہ اس کو فوراً دو چار دوستوں کے ساتھ کھانے پر مدعو کرتے البتہ ان کے گھر کھانے پر شعر و شاعری نہیں ہوتی تھی۔ لطیفہ بازی ہوتی' ملکی سیاست پر بات چیت ہوتی، سیاحت اور فلمی شخصیات کے تذکرے۔ غرضیکہ شاعری کے علاوہ ہر قسم کی خوش گپیاں ہوتیں چنانچہ پہلی ملاقات میں مجھے اظہر کی ادبی اہمیت کا اندازہ تو نہ ہو سکا البتہ ان کے لہجہ کی مٹھاس اور باتوں میں مزاح کی چاشنی سے ان کی باغ و بہار شخصیت نے متاثر ضرور کیا۔

پھر اس کے بعد ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اب وہ ادبی جریدہ 'تخلیق' کا اجراء کر چکے تھے۔ میری ایک دو رومانی نظمیں اس میں شائع ہوئی تھیں۔ ان دنوں 'تخلیق' کا دفتر میکلیگن روڈ پر ہوتا تھا۔ قتیل شفائی کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح نو دس بجے جب گھر سے نکلتے تو اکثر میرے پاس پاکستان آرٹس کونسل (الحمراء) آتے اور وہاں سے نیشنل سنٹر ہوتے ہوئے میکلیگن روڈ 'تخلیق' کے دفتر اظہر جاوید کے پاس جاتے۔ وہاں ہمیشہ 'نئے نئے خواتین کے چہرے دیکھنے کو مل جاتے اور قتیل صاحب کی مراد بر آتی۔ میری لاہور میں تعیناتی کا یہ پہلا دور دو برس کا تھا۔ اس عرصہ میں مجھے اظہر جاوید کی قربت کے کئی مواقع ملے۔

لاہور میں میری تعیناتی کا دوسرا دور 1980ء سے 1982ء کا تھا کہ جب مجھے بورڈ آف ریوینیو میں سیکرٹری کالونیز تعینات کیا گیا۔ اس دوران ایک مطلقہ زمین دار شاعرہ کہ جو کئی بہچوں قسم کی ستم رسیدہ خواتین کی طرح اکثر اظہر جاوید کے دفتر میں پائی جاتی تھیں اور وہ ان خواتین کے مسائل حل کرانے میں پوری دلدہی سے شریک ہوتے تھے اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ مظلوم اس حد تک مایوس نہ ہو کر رابطہ ہی ترک کر بیٹھے۔ اس لئے وہ پورے خلوص سے یہ کوشش کرتے تھے کہ 'سلسلہ چلتا رہے یار کی دلداری کا'۔ ایسی ہی ایک خاتون اپنے کسی کام کے سلسلہ میں میرے دفتر آئیں اور اپنی پاکدامنی

کا یقین دلانے کے لئے اظہر جاوید کی جمال پسند فطرت پر ناقدانہ گفتگو کرتی رہیں مگر دوسرے دن اتفاق سے جب میں اور قتیل شفائی تخلیق کے دفتر آئے تو دیکھا کہ وہی خاتون اظہر جاوید کے پاس بیٹھی تھیں اور گرم گرم جلیبیاں چل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ خاتون سٹ پٹا گئیں اور پھر اس کے بعد وہ خاتون کبھی میرا سامنا نہیں کر سکیں۔

ہمارے ملک میں ادبی جریدہ نکالنا اور پھر اس کا جاری رکھنا آسان نہیں لیکن اظہر جاوید نے بڑے وقار اور حوصلہ سے تادم مرگ اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ 1992ء میں مجھے بہاول پور کمشنر کے عہدہ سے تبدیل کر کے سیکریٹری پاپولیشن پلاننگ پنجاب تعینات کیا گیا۔ چارج لینے کے فوراً بعد میں نے اپنے طور پر اظہر جاوید کو بلایا اور چاہا کہ خاندانی منصوبہ بندی کے کچھ اشتہارات ماہنامہ 'تخلیق' کے لئے جاری کردوں لیکن انھوں نے اپنے کسی تلخ تجربے کی وجہ سے ان اشتہارات کو شائع کرنے کی حامی نہیں بھری۔ ان کا یہ رویہ میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ اتفاق سے مجھے ایک ماہ بعد یہاں سے تبدیل کر کے ممبر بورڈ آف ریوینیو لگا دیا گیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنے تبادلہ کے بعد ان کو جو دفتری بابوؤں سے اپنے بل پاس کرانے میں تکالیف ہوتیں اس سے وہ بچ گئے۔

مدتوں 'تخلیق' کا اعزازی نسخہ مجھے ملتا رہا۔ میری قلمی نگارشات کبھی کبھی اس میں شائع ہوتی تھیں۔ میں حسب توفیق اپنے طور پر کبھی کبھی علی الحساب زرسالانہ بھیج دیتا تھا لیکن اظہر نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ پھر یوں ہوا کہ عباس تابش نے جون 2004ء میں 'دبستان' کے نام سے ایک ادبی سلسلہ شروع کیا اور اس پر بطور 'سرپرست' میرا نام شائع کر دیا۔ یہ پرچہ کافی ضخیم تھا اور اس پر لاگت بھی کافی آتی تھی میری حیثیت اس میں محض 'اعزازی سرپرست' کی تھی اور میں پرچہ کی تقسیم کے بارے میں قطعاً لاعلم تھا بلکہ خود بھی اگر کسی دوست کو پرچے بھیجنے کی خواہش ہوتی تو پرچہ کا زرِ خرید نقد ادا کر کے پرچہ حاصل کرتا تھا مگر اظہر کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی کہ میں نے ان کو پرچہ نہیں بھیجا جس کے بعد انھوں نے تخلیق کے اعزازی ترسیل کا سلسلہ روک دیا۔ پھر ایک بار جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں انھوں نے اس کا اظہار کیا، میں نے وضاحت کی مگر میری وضاحت سے ان کی تسلی نہ ہو سکی اور ان کو یقین نہ آسکا کہ اعزازی سرپرست کی حیثیت سے مجھے یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ میں اپنے حلقہ احباب کو اعزازی جریدہ ارسال کر سکوں۔

بہرحال کبھی کبھی ''تخلیق'' کا پرچہ نظر سے گزرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ 2010ء کے کسی شمارہ میں کسی صاحب نے جوش ملیح آبادی کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا مجھے اپنی یادداشتوں کے سلسلہ میں کہ جو ماہنامہ 'الحمراء' میں بالاقساط شائع ہو رہی تھیں اس مضمون کی تلاش تھی۔ اتفاق سے اپنے انتقال سے دو دن قبل اظہر مجھے ایک عشائیہ میں مل گئے۔ یہ عشائیہ قاضی پیروز بخت اور ان کی بیگم سیما پیروز نے اظہر جاوید کو تمغہ حسن کارکردگی ملنے کے اعلان کی خوشی میں اپنی رہائش پر ترتیب دیا تھا۔ قاضی صاحب اور ان کی بیگم سیما پیروز نے مجھے بالخصوص اس عشائیہ میں شرکت کی تاکید کی تھی۔ اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ میں اپنی بیگم فریدہ کے ساتھ آؤں اور بیگم تسنیم منٹو کو جن کی نگارشات اظہر جاوید کے جریدہ میں تواتر سے شائع ہوتی ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ لیتا آؤں۔ چنانچہ ہم تینوں قاضی صاحب کی رہائش واقع ڈیفنس لاہور پہنچے۔ وہاں پر اس رات جو لوگ اظہر

جاوید کو ملنے والے اعزاز کے اعلان کی خوشی میں جمع تھے ان میں معروف مصور اسلم کمال، ٹی۔وی۔سیریز اندھیرا اجالا کے مصنف یونس جاوید، ماہنامہ الحمراء کے مدیر شاہد علی خان۔معروف مصنفہ ڈاکٹر عطیہ سید برصغیر کی فلم اور موسیقی کی معلومات کی انسائکلوپیڈیا اور گفتگو میں رس گھولنے والے آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر عمر عادل، فرانسیسی ادب کے مترجم اور جدید نظم گو ڈاکٹر کوثر محمود، معروف سفرنامہ نگار خاتون سلمیٰ اعوان، اور 'تخلیق' میں تواتر سے چھپ کر شناخت حاصل کرنے والی خواتین پروین عاطف، نیلم احمد بشیر، رخشندہ نوید، تسنیم کوثر، دُرانجم عارف، اور معروف ماہر تعلیم فرحت ناگی موجود تھیں۔اظہر جاوید کے ایک دوست جاوید منظور اور ان کی بیگم لبنیٰ جن کا شعروادب سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن حلقہ مخلصین میں شامل تھے وہ اس تقریب میں تشریف لے آئے۔ میزبان قلمکار جوڑی قاضی پیروز اور ان کی بیگم نے بہت پُر تکلف اہتمام کیا ہوا تھا اور ان کے صاحبزادے عمر قاضی اور دخترِ نسبتی ثمینہ عمر مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے تھے۔کھانے کے بعد قہوے کے انتظار میں لوگوں کو نشستوں کی ضرورت پڑی تو پتہ چلا کہ ایک کمرے میں نشستیں کم پڑ گئیں ہیں لہٰذا کچھ حاضرین ڈرائینگ روم میں جا کر گپ شپ میں لگ گئے اور کچھ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔اظہر جاوید، میں، میری بیگم فریدہ، بیگم منٹو، ڈاکٹر عطیہ سید، اسلم کمال، درِنجف عارف اور جاوید منظور اور ان کی بیگم لاؤنج میں بیٹھے تھے۔اظہر جاوید اس شب کچھ خلافِ معمول زیادہ نہیں چہک رہے تھے۔جب کوئی تخاطب اُن سے کرتا تو اس کا جواب وہ دیتے۔اُس دن وہ گہرے نیلے رنگ کی ٹوپی ترچھی کر کے سر پر رکھے ہوئے تھے اور اس سے نکلی ہوئی ان کی سفید زلفیں ان کی شخصیت کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

مہمان کھانا کھا چکے تھے۔میزبان فیملی ابھی کھانے کی میز کے گرد ہی تھی کہ ادبِ لطیف کی مدیرہ صدیقہ بیگم اور رکن صوبائی اسمبلی معروف افسانہ نگار بشریٰ رحمان کی آمد ہوئی۔دونوں خواتین میزبان فیملی کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلی گئیں۔حاضرین میں سے کسی نے بتایا کہ ڈرائینگ روم میں موجود ڈاکٹر عادل عمر اور ڈاکٹر کوثر اپنے سیاحت کے تجربات پر بڑے شدومد سے بات چیت کر رہے ہیں۔جس لاؤنج میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہاں میں نے اظہر جاوید سے گزشتہ برسوں میں چھپنے والے تخلیق کے اُس شمارے کی بات کی جس میں جوش صاحب کے کسی حاشیہ نشیں نے ماڈل ٹاؤن میں رہنے والی ایک خاتون اور ان کی نوعمر لڑکیوں سے جوش صاحب کے جنسی تعلقات کی روداد لکھی تھی۔انہوں نے بتایا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کا گزشتہ دنوں انتقال ہو چکا ہے پھر بھی انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مطلوبہ جریدہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے بعد اظہر جاوید نے ایک طرف رکھا ہوا اپنا اوورکوٹ اٹھایا۔سر پر رکھی ہوئی نیلی ٹوپی کو ذرا درست کیا اور میزبان سے اپنے ہمراہی جاوید منظور اور ان کی بیگم کے ساتھ اجازت چاہی۔یہ میری اظہر جاوید سے ان کے انتقال سے دو دن قبل آخری ملاقات تھی۔

دو دن بعد ناصر بشیر کی موبائل نیوز سروس پر اظہر جاوید کے انتقالِ پُر ملال کی خبر نشر ہوئی۔اتفاق سے اس دن سہ پہر تک میں نے موبائل پر میسیجز نہیں پڑھے تھے۔جب یہ خبر میں نے موبائل پر دیکھی تو بہت دیر ہو چکی تھی میں تدفین میں شریک

نہیں ہوسکا۔جس کا مجھے افسوس ہے۔بہر حال ''خدا رحمت کند ایں عاشق پاک طینت را''

اظہر جاوید ایک پُر اسرار شخصیت کے مالک تھے۔ان کی گھریلو زندگی disturbed تھی۔ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ حیثیت نہ مل سکی تھی جو ایک خاندانی سربراہ کی ہوتی ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ ان کا کوئی ایسا ہمراز دوست تھا یا نہیں کہ جو ان کی خانگی زندگی سے پوری طرح واقف ہو۔جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی مبادا کہ میرا تجسس ان کی کسی طور آزردگی کا سبب بنے اور نہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی اظہار کیا۔وہ بظاہر ایک ہنس مکھ شخص تھے لیکن حقیقتاً وہ ایک دکھی انسان تھے۔ان کے اکثر ملنے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ دن بھر خوش گپیاں کرنے والا شخص رات کے اندھیرے میں کہاں شب باش ہوتا ہے۔وہ کسی کرائے کے کمرے میں رہتا ہے،کسی عزیز،رشتہ دار کے ہاں رہتا ہے،یا کسی دوست کے ساتھ شریک رہائش ہے۔ان کے انتقال کی خبر جب NBNS سے لوگوں تک پہنچی تو اکثر دوستوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں کہاں گزاریں،کہاں ان کی آخری رسومات ادا کی جائیں گی اور بحیثیت پسماندگان کس سے رابطہ کیا جائے۔اس کے باوجود بھی سنا ہے کہ خاصے لوگ شریک ہوئے مگر سینہ بہ سینہ جیسے جیسے دوستوں کو اطلاع ملتی گئی کیولری گراؤنڈ بسم اللہ سٹریٹ پر ان کے سوئم میں سوگواران کا خاصا اجتماع ہوگیا۔ہر شخص ان کی ناگہانی موت پر اشک بار تھا۔

ادبی حلقوں میں اظہر جاوید کو لاہور کے راجہ اندر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔کیونکہ ان کی محفلوں میں زیادہ تر خواتین قلمکار نظر آتی تھیں۔لیکن کبھی ان خواتین میں سے کسی نے بھی ان کے کردار میں کسی آلودگی کے بارے میں بات نہیں کی۔بلکہ ان میں سے اکثر کے گھروں میں ان کو ایک فیملی ممبر کی حیثیت حاصل تھی۔اور ظاہر ہے یہی اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے خواتین سے مراسم محض اخلاص پر مبنی تھے۔وہ نماز روزہ کے پابند تھے لیکن نمائش نہ کرتے تھے۔اکثر نماز کے وقت خاموشی سے محفل سے اٹھ جاتے تھے اور نماز ادا کر کے واپس آجاتے تھے۔بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تہجد بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتے تھے۔دراصل ان کی شخصیت میں جو جاذبیت تھی وہ اُن کی شائستگی گفتار کی وجہ سے تھی۔ان کی ارادت مند خواتین میں کئی خواتین تو اپنے گھروں سے ٹفن تیار کر کے ان کے دفتر آجاتی تھیں اور وہاں پر جو لوگ موجود ہوتے تھے سب مل بیٹھ کر دعوتِ شیراز میں شریک ہوجاتے تھے۔

بحیثیت قلمکار نہ انہیں شاعرِ خوش کلام ہونے کا زعم تھا اور نہ صاحب اسلوب نثر نگار کا۔البتہ بحیثیت مدیر انہوں نے انتہائی غیر مساعد حالات میں ایک ادبی جریدہ زندہ رکھا اور اس میں شائع ہونے والے تخلیق کاروں کی ایک ایسی کہکشاں اردو ادب میں روشناس کرائی کہ جس اعزاز کی وجہ سے ان کا نام ادبی صفحات پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

◆◆◆

دوستوں کا دوست......اظہر جاوید

نذیر ناجی

اظہر جاوید بنیادی طور پر فنا فی الادب انسان تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی ادب کی خدمت میں گزاری اور بے لوث گزاری۔ اپنے ادبی جریدہ ''تخلیق'' کے ذریعے وہ چاہتے تو اسے ذریعہ معاش بنا سکتے تھے اور چاہتے تو اس کے ذریعے بے شمار فوائد بھی حاصل کر سکتے تھے لیکن وہ صرف ادب کی خدمت کو ہی محنت کا صلہ سمجھ کر مطمئن رہے۔ بہت خوش رہنے والے انسان تھے۔ انہیں ان کی ہنسی سے الگ کر کے یاد کرنا مشکل ہے۔

دوستوں کے دوست تھے۔ ذاتی مسائل کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے۔ میری ان سے دوستی 45 سال پر محیط ہے میرے ان کے درمیان ہمیشہ خوش گوار تعلقات رہے ہیں۔ جب اکادمی ادبیات کا سربراہ بنا تو اس وقت ان کا اکادمی کے ساتھ ایک مقدمہ چل رہا تھا جو کئی سال پرانا تھا۔ اکادمی کا خیال تھا کہ اظہر جاوید یہ مقدمہ ضرور جیت جائیں گے جس سے اکادمی کی سبکی ہوگی۔

جب میں نے کہا کہ وہ میرے دوست ہیں اور میں انہیں مقدمہ واپس لینے پر آمادہ کر سکتا ہوں تو سب کا خیال تھا کہ وہ نہیں مانیں گے مگر سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میرے ایک ٹیلی فون پر ہی انہوں نے مقدمہ واپس لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی تعلقات کو وہ کتنی اہمیت دیتے تھے اور دوستوں کی خاطر اپنی انا کے سوال کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

◆◆◆

کیفی اعظمی

''تم سے مل کر ''تخلیق'' دیکھ کر اور تمھاری شاعری سن کر بہت دکھ ہوا۔ دکھ اور حیرت اس لیے کہ اتنی دیر بعد کیوں ملے ہو؟''

کبھی نہیں......کبھی نہیں!

یونس جاوید

دل میں گرہیں پڑی ہیں۔ کروٹ لیتا ہوں تو بوجھ دوگنا ہو کر دل کے بھاری پن کو بڑھاوا دیتا ہے۔ کیسے کہہ دوں کہ اجی چلا گیا...... کہا جاتا ہے، نہ سہا جاتا ہے۔ آدھی صدی پر محیط رشتہ یوں بھی خس وخاشاک ہوتا ہے کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں؟ مجھے معلوم ہے اجی...... تمہیں سرپرائز دینے کا جنون تھا۔ خصوصاً مجھے...... مگر یار...... یہ سرپرائز نہیں بے وفائی ہے۔ تم نے 14 فروری کو مجھ سے ملاقات طے کی تھی۔ اگر 13 کا ہندسہ منحوس ہوتا تو 13 فروری کی شام جم خانہ کلب کی محفل میں آ ہی نہ پاتے جو شاہد علی خاں نے برپا کی تھی۔ شگفتہ، تروتازہ، ہنستا مسکراتا چہرہ سجائے۔ کُڑیوں چڑیوں سے کیا کیا مذاق نہیں کیے تھے تم نے؟ میں بچ بچا کر جلدی نکل آیا کہ دوسرے دن رفاقت بھری پھولوں سے لدی ملاقات طے تھی۔ مجھے اس دن اُس کے لیے نئی گاڑی لے کر جانا تھا جس کا اس کو بھی انتظار تھا۔ گاڑی تو میں جم خانہ بھی لے آیا تھا مگر نہ وہ میرے ساتھ لوٹا نہ ہم سفر ہوا...... نہ ہی اس کا ذکر ہوا۔

یوں بھی اجی ایسی بھری پُری محفلوں میں دیر تک چہکتا مہکتا تھا، لہٰذا میں دھوکا کھا گیا اور اس آخری ملاقات کو آخری نہ سمجھ سکا۔ انسان کے اندازے کس قدر غلط ہوتے ہیں۔ دوسرے دن منگل کی ملاقات میں ویلنٹائن کے سرخ گلابوں کی باس بھی تھی اور لالی بھی۔ ملاقات تو ہوئی مگر آفیسر کالونی میں، اس کے بسترِ مرگ پر جہاں وہ چپ سادھے پڑا تھا۔

آفیسر کالونی کا گھر تلاش کرتے کرتے جب میں 13/13 پہ پہنچا تو گیراج کا چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ سامنے چارپائی پہ لیٹا یہ کون تھا؟ آنکھ جھپکنے کے ہزارویں حصے میں میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ بے جان چہرہ کس کا ہے؟ میت کا پیلا پن اُڑ کر میرے لہو میں آن شامل ہوا۔ دو تین عورتیں سوگوار سی بیٹھی تھیں۔ پھر نگاہ میں نمی نے دھندلا پن پیدا کر کے اسے خیرہ کر دیا کہ سارا منظر لہو رنگ ہو کر دل پہ نقش ہو گیا۔ دو عورتیں تو سامنے پڑوس سے آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر پوچھنے آئیں۔ پھر ایک نے کرسی گلی میں مجھے لا کر دی اور دونوں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ میں اکیلا تنہا...... ویران گلی میں حیران آنکھوں سے آسمان کو تکنے لگا۔ جیسے عالم سکرات کا لمحہ ہو...... میں جوں کا توں گڑ گیا تھا اور اپنی ذات میں انجمن اجی اتنا تنہا اس قدر اکیلا...... اور بے سروسامانی میں پتھر بنا تھا۔ ایک متحرک، تیز طرار، ہمہماتا ہوا کلکاریاں مارتے کھلنڈرے بچے جیسا...... پارے کا بنا بوڑھا بالک یوں مٹی پتھر بھی ہو جائے گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وسیم گوہر کے بعد یہ دوسرا صدمہ تھا۔ وسیم کو تین مٹھی مٹی دیتے بھی مجھے امیر مینائی ہی یاد آئے تھے جن کا کہا ہوا ایسے منظر میں دل میں ترازو ہوا تھا کہ یہی میرے دل کی آواز تھی۔

لاش پر عبرت یہ کہتی تھی امیرؔ آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے؟؟

بھارت کے عظیم دانشور اور فلم ''داغ'' کے ہدایت کار امیہ چکرورتی کی لاش بھی میں نے دیکھی تھی۔ ارتھی اٹھنے سے پہلے لاش کا ماتھا چوم کر اس کی محبوب بیوی نے کہا تھا

''کیا اِسی دن کے لیے ہم تم ملے تھے ایک دن؟''

یہ عجیب سوال ہیں جو ہم ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والوں کے واسطے اپنی اپنی زبان پر لیے پھرتے ہیں۔ کوئی جاتا ہے تو پلٹتا نہیں۔ کچھ بتاتا ہے نہ خط نہ فون، نہ سندیسہ۔ یہ کیسی دنیا ہے جس کے اور ہمارے درمیان صرف دیوارِ گریہ ہے۔

یار! تم نے تو اُس دن ملنے کا پکا وعدہ کر رکھا تھا۔ تم وعدہ خلاف نہ تھے تم نے وعدہ تو ایفا کر دیا مگر وہی سرپرائز کا جھٹکا۔ تم نے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کچھ بھی نہ سوچا۔ کوئی پیغام، کوئی محبت بھرا جملہ، اتنی گوڑھی چپ ہے، تمہیں کیا خبر کتنے دلوں میں کہرام برپا ہے۔ اور کتنے دل ویران ہو گئے ہیں۔ مجھے تو خیر ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ ڈاکٹر سبزواری سے داستان سننے کے باوجود بھی نہیں۔ اس مسیحا صفت ڈاکٹر کی آواز میں بھی لرزش تھی۔

یاد کرنے بیٹھتا ہوں تو سرا نہیں ملتا۔ لمبی داستان ہے، آغاز کہاں سے ہو؟ زمانہ شوق سے سُن رہا تھا تو تم کیوں سو گئے ہو؟ مجھے داستان گوئی کا سلیقہ ہی کہاں ہے۔ تم ایسا تو بالکل نہیں۔ اپنی محبتوں کا شمار تم نے نہیں کیا تو میں کیوں کروں؟ تیری ہر جیب میں کیا کچھ نہ تھا۔ دل جوئی، پذیرائی، حوصلہ افزائی حتیٰ کہ ادافروشی بھی۔

ہر ایک کا حصّہ تمہاری ہر جیب میں الگ سے رکھا ہوتا...... ادا بھی فوراً ہوتا۔ دکھ شیئر ہوتے رہتے۔ کتھارسس ان کا ہوتا جو تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رونے آیا کرتے تھے۔ اب یہ سب کہاں جائیں گے۔ کیا کریں گے؟ تم نے ان تمام رومالوں سے ہی سفید براق کفن بنوا لیا جس میں ہر دکھیارے یا دکھیاری کے الگ الگ آنسو بندھے رکھے تھے۔

اب کوئی کون اُن کے لیئے، اُسی وفور اور تابناک تپاک سے اپنا کندھا پیش کرے گا۔ کون آنسو پونچھ کر ان کی نمکیات محفوظ کرے گا۔ کون دو ممتاؤں کے گداز بھرے دل سے گلے لگائے گا۔ دکھ سنے گا، بٹائے گا، تسلیاں دے دے کر رُلائے گا۔

یہ دروازہ اب بند ہوا۔ روزِ قیامت وا ہو تو ہو مگر میرے لیئے تو روزِ قیامت ہو چکا۔ ربِ قدیر، کائنات کے ہر راز کو جانتا ہے۔ وہی تمہاری کوتاہیوں کو درگذر فرمائے گا۔ اس کا دل بھی ہزاروں، لاکھوں ممتاؤں کا گداز رکھتا ہے۔

اپنی اس تخلیق کے لیے...... وہی مہربان ہے، وہی معاف فرمانے والا ہے جسے تم اکثر میرے سامنے ''اے میرے پیارے پیارے رب'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

سرما کی وہ کیسی ملگجی دوپہر تھی۔ جب ایم ایم خان پرویز نے مجھے بتایا کہ بچوں کی فوج میں پھنسا ہوا میرا پیارا دوست جو سرگودھوی بھی ہے۔ جال میں کلبلاتی مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اس نے لکھا ہے ''لاکھ سفارشوں کے بعد سورج طلوع ہونے والا ہے۔ رہائی ملنے والی ہے اگر رہائی مل گئی تو کیا لاہور میں رہ سکوں گا؟'' پرویز اطلاع نہیں دے رہا تھا، یہ اس کا سوال تھا۔ میں نے پوچھا ''ہے کون؟'' وہ محبت بھرے جملوں سے نہایت شاندار پورٹریٹ پینٹ کرتا رہا کہ محبت، وفا، رومانس اور کچّی پکّی شاعری جھلملاتی دکھائی دینے لگی۔ تعریف کا پل بامحاورہ ہونے کے باوجود دل کو اعتبار آ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا ''آ جائے''...... پھر رک کر کہا ''ایسا اچھا ہے پیارا ہے...... جب آئے گا تب دیکھیں گے۔''

پرویز بولا ''چند روز...... یا چند ماہ...... میں وہ اپنی جگہ بنالے گا۔ بس پاؤں رکھنے کی جگہ دے دو۔''

''تمہارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے؟'' میں نے اُلٹا سوال کیا۔

''ہے......مگر اتنی......جس میں میں بھی رات بارہ بجے کے بعد سماتا ہوں......چھپ چھپا کر۔''

اس وقت پرویز سے دوستی نئی نئی تھی...... ہمارے محلے میں مہینہ بھر پہلے اترے تھے......خود ہی ایک روز پتہ پوچھتے پرویز نے پورے اعتماد سے دستک دی۔ اتفاق سے دروازہ میں نے کھولا......اس نے جلدی جلدی بتایا مگر جس انکساری، عاجزی اور آداب دنیا کو اختیار کیا وہ الگ داستان ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ موصوف شاعری کا جرم کرتے ہیں اور پورے خاندان میں معتوب ہیں۔ والد صاحب ڈی ایس پی اور......''میں سمجھ گیا......'' اور واقعی میں باقی سب بات سمجھ گیا تھا۔ ہم سب تنہا لوگ سوچنے کے جرم میں صاحبِ اختیار لوگوں کی نگاہ میں ناکارہ تھے۔ ہم اندر بیٹھ گئے......اور ہماری دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔ اور ایسی پڑی کہ اب تک وہ بھی دل میں آباد ہے اور دل کو آباد رکھتا ہے۔ اس نے کنول فیروز پوری سے ملوایا......اسی نے اجی سے۔

ایک روز ایم ایم خان پرویز سے میں نے کہا ''کیا خان پرویز کہنا زیادہ مناسب نہیں؟ لگتا ہے لوگ ''یم یم خان پرویز'' کہہ رہے ہیں۔ پرویز کھل کر ہنسا......وہ اجی کی طرح قہقہہ بہت لگاتا تھا۔ جب بھی مجھے یقین ہوا کہ دونوں بے حد دکھی بلکہ دکھوں سے پُور ہیں......اور یہ سچ تھا بھی......!

یہ کہنا بھی جملۂ معترضہ ہے......کوئی کریڈٹ والی بات بھی نہیں کہ کنول بلکہ نیلسن ڈی کنول فیروز پوری سے میں نے گذارش کی تھی کہ صاحب! اگر آپ کنول فیروز لکھیں تو ایک تو فیروز پور تک محدود نہ رہیں گے دوسرا صوتی حُسن پیدا ہو جائے گا۔ پتہ نہیں وہ کیسی گھڑی تھی کہ کنول صاحب فوراً رضامند ہو گئے۔ حالانکہ اپنے فیصلوں میں وہ اس قدر اٹل ہیں کہ میں نے ان کے خاکے کا عنوان ''مونا سِکھ'' رکھا تھا۔ اُس زمانے میں......اڑیل......ہٹ دھرم......ہٹ کا پکا......مگر کھرا تھا۔ اڑیل، ہٹ دھرم، ہٹ کا پکا اور کھرا تو وہ اب بھی ہے مگر وہ شکوہ، جلال اور بانکپن، جو کبھی تھا......اب اس کی جگہ Loudman ہے۔ پنجاب کا مخصوص میوہ!

پھر وہ روزِ روشن آ پہنچا جب ایک چھوا مُوا گورا چٹا......لڑکپن اور جوانی کا کلچر......مگر ہنستا مسکراتا میٹھے پان جیسا اجی میرے ہاں آن اُترا۔ دن بھر کی تنہائیوں کے کرب کو ٹالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، ہم قطرہ قطرہ ہو کر وقت گذار لیتے۔ یوں اُسے بھی......اور مجھے بھی......صرف رات بسر کرنے کا آسرا چاہیے تھا۔ وہ دن بھر اخبارات اور رسائل کے دفتروں میں رہتا، دوستوں سے ملتا......(مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جس دفتر میں جاتا ہے......تین چار کو دوست، ایک آدھ کو گرویدہ بنا لیتا ہے) اور واقعی اس نے دنوں میں سارا لاہور چھان لیا۔ ہر ادارے میں اس کے واقفانِ ادب اور دوست، ملنے والے اور گرویدہ اس قدر پھیل گئے کہ مجھے حیرت بھی ہوئی، خفت بھی۔ اس کا اعتماد اس قدر زیادہ تھا کہ دوسرا پہلے ہی وار میں مضروبِ محبت ہو جاتا۔ چند مہینوں میں لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے ہماری ملاقاتیں اسی کے توّسط سے ہونے لگیں اور ہم سب حیرتوں میں ڈوب ڈوب گئے۔

قصہ مختصر ایک روز اس نے مجھے لاہور میں مستقل ٹھہرنے کے بارے میں کوئی سبیل کرنے کے لیے کریدا۔ میں ابھی جواب نہ دے پایا تھا کہ اس نے خود ہی تجویز پیش کی......''کوئی نازنین ایسی نہیں کہ ہمارے عقد میں آ کر دل اور پاؤں کو زنجیر کر دے'' یہ بات یوں تو اس نے محض شہنشاہوں کے سے انداز میں مزاح کے لیے کہی تھی......جو میری مرحوم ماں نے سن لی۔ اس نے

مداخلت کرتے ہوئے کہا...... ''کیوں نہیں......تم بھی تو میرے بیٹے ہو......'' (یہ داستان اس کے خاکے ''مووا وور'' میں لکھی گئی ہے) لہٰذا یہ قصہ یہیں چھوڑتا ہوں۔

میں دو پہر اڑھائی بجے ہی آفیسر کالونی پہنچ گیا تھا۔ میں کبھی کسی کی موت پر اتنی جلدی گیا نہ اتنی دیر تک رُک سکا کہ ماضی کی یادیں سنپولیوں کی طرح دامنِ دل سے لپٹ لپٹ جاتی ہیں اور چپ منہ سے بے آواز رُلاتی ہیں کہ آنسو اندر گرتے اور سسکاریاں کلیجے میں چبھتی ہیں کہ کلیجہ اس جگہ نہیں رہتا جہاں کہ ہوتا ہے مگر آج تی کے لیے سب سہا۔ رات تک زمین میں گڑا رہا۔ درمیان میں جی بلک گیا چاہا کہ بھاگ کر بھگوان سٹریٹ جاؤں او دیکھوں کہ نئے ''تخلیق'' کی کاپیاں جڑواتا...... جملے کستا، قہقہوں کے پیچھے آنسو چھپاتا کوئی بیٹھا تو نہیں؟ مگر سب لوگ تو یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ خواجہ زکریا سے سرور سکھیرا تک اور اعزاز آذر سے کنول فیروز تک اور سیما پیروز سے قاضی پیروز بخت اور تسنیم منٹو، عابد منٹو، تسنیم کوثر اور بے شمار چہرے......جو دفتر ''تخلیق'' کی یادوں میں جڑے تھے، سب یہیں تھے......پھر یک لخت کلمہ شہادت کی آواز نے سوگوار کر دیا جو یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ یقین آ گیا کہ جنازہ اٹھا اور میت کو کندھا دینے سے پہلے ہی قریبی مسجد کے باہر سڑک پر رکھ دیا گیا کہ عشاء کی نماز ختم ہونے کے بعد ہی نماز جنازہ ہو سکتی تھی۔ اظہر کا جسدِ خاکی الگ تھلگ ویران پڑا تھا اور سب ٹولیوں میں بٹے تھے۔ انسان کی روح کے بغیر بے توقیری مجھ سے برداشت نہ ہو رہی تھی اور نماز عشاء تھی کہ ختم نہ ہو رہی تھی۔ اس کے بعد نوافل شروع ہوئے۔ لوگ اپنی دعاؤں اور عبادت میں مصروف رہے۔ جنازے کے ساتھ آنے والوں کے پاس مرحوم کی باتیں ختم ہو چکی تھیں کہیں کہیں کرنٹ افیئر تھا، کرپشن کا ذکر تھا اور عام آدمی کی زندگی کو بے حد بے حد مشکل بنانے والوں کا ذکر......صرف ذکر......پھر ہم لوگوں کو وقت کے زیاں کا احساس ہوا تو کسی نے تجویز پیش کی......کیوں نہ اتنے وقت میں مرحوم کا چہرہ دیکھ لیا جائے کہ سب نماز جنازہ سے پہلے اس رسم سے عہدہ برا ہو جائیں۔ لوگ میّت کی طرف بڑھے مگر میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میں جو، اپنے کسی دوست کو چند برسوں کے لیے بیرون ملک جاتے ہوئے ''سی آف'' بھی نہیں کر سکتا آج تی کے تا قیامت بچھڑنے والے چہرے کو کیسے دیکھتا۔ کیوں دیکھتا؟

میں اس مٹی چہرے کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ میں اپنے دل سے اس چہرے کی تصویر کو کیوں کر کھرچ دوں جو میری پیشانی چومتے، گلے لگاتے، گلنار ہو جایا کرتا تھا اور اس وقت آئینۂ دل پر اس کا تازہ چہرہ نقش تھا، جم خانہ کی محفل والا شگفتہ اور اُجلا تر...... اس پر مٹی چہرے کا فریم کیسے مڑھ دیتا؟ ایسے میں، میں نے نگاہیں سمیٹ لی تھیں۔ میں اس مٹی چہرے کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا جو میرے سامنے سڑک کے گرد و غبار میں کٹی پتنگ کی طرح پڑا تھا۔ میں نے نم آنکھوں سے دھندلائی نگاہ دوسری طرف پھیر لی اور آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور منجمد ہوتی ہوئی سسکی کو سینے میں دبا لیا۔

کیا یہ چہرہ......یہ منظر......یہ دائمی جدائی کا لمحہ میں آنکھوں میں مقفّل کر سکتا تھا؟

کبھی نہیں!

کبھی نہیں!

کبھی نہیں!

◆◆◆

اظہر جاوید

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط

ـــــــــصابر لودھی

اظہر جاوید نے رومان پرستی کے دور میں ہوش سنبھالا۔ زندگی بھر رومانی لمحات کو آنکھوں میں بسائے رکھا اور پھر...... کسی بڑے رومان کی تلاش میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا رشتہ تخیّلات کی دنیا میں بسنے والے ان لوگوں سے جڑا ہوا تھا جو حسن کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانے ہو جاتے ہیں۔ جو خوابوں کے کھیت آباد کرتے ہیں اور ان کھیتوں کو زرخیز بنانے کیلئے، ان میں اپنے ارمانوں کی کھاد ڈالتے ہیں، حسرت و حرماں کی فصل کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں زندگی کا حاصل یہی کچھ تھا۔

میں نہیں جانتا کہ حسن کی تپش سے خود کو جلانے کا جذبہ اس کے بھیتر سے جاگا تھا، یا ماحول اور مطالعے نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس کی باتوں سے سراغ ملتا تھا کہ جب ان کے کھیلنے کھانے کے دن تھے وہ اردو شاعر کے رومانوی دبستان میں الجھ گیا تھا۔ اختر شیرانی اور ساحر لدھیانوی کی شاعری اس کو آسودگی عطا کرتی...... نیاز فتح پوری کی خیال پرور تحریریں اسے اچھی لگتی تھیں۔ اپنے مکاتیب میں نیاز فتح پوری، بانسری کی آواز کا تذکرہ اکثر کرتے۔ یہ بانسری اظہر جاوید کو بھی بے قرار رکھتی تھی گوئٹے کے المناک ناول ''ورتھر کے آلام'' کا مطالعہ اظہر جاوید نے نیاز فتح پوری کے ترجمے کے ذریعے کیا تھا۔ سلمٰی اور ریحانہ کی خیالی صورتیں اظہر جاوید نے اختر شیرانی کے کلام میں دیکھی تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی ''گیتانجلی'' کی شاعری اس کی بے قرار روح کو تسکین عطا کرتی تھی اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں بنگال کے مانجھیوں کے اداس گیت سنتا۔ اسے قتیل شفائی بھی پسند تھا کہ پختگی کے دور میں بھی اس کی شاعری سے گھنگھروؤں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ اظہر جاوید کو شکستگی سے پیار تھا۔ میرؔ نے شاید اظہر جاوید کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا:

نہیں تازہ دل کی شکستگی ، یہی درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوقِ شکار تھا، اسے زخم سے سروکار تھا

وہ حسن و جمال کا شکار ہوتا رہا۔ زخم کھاتا رہا اور بدنام ہوتا رہا۔ لیکن اس تخریب سے اس کی تعمیر کا خمیر اٹھا۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔اظہر جاوید اپنے خوابوں کے ساتھ، سرگودھا سے لاہور چلا آیا۔اور اپنا رزق فلمی اور ادبی رسائل میں تلاش کرنے لگا۔اس کے ذہن میں ایک ایسی فلم کا خاکہ ابھر رہا تھا جو''دیوداس'' سے بھی بڑھ کر المناک ہو اور عشق بلاخیز کی روداد بیان کرتی ہو۔پاکستان میں فلم کو صنعت کا درجہ کبھی حاصل نہ ہو سکا۔پڑھے لکھے سرمایہ کار ادھر توجہ ہی نہیں دیتے تھے اور فلم کی پروڈکشن اور ڈائریکشن بدمعاشوں اور رسہ گیروں کے ہاتھ میں تھی۔جلد ہی اظہر جاوید کو اپنی شکستِ آرزو کا احساس ہو گیا۔اور اس نے ادب نوازی اور ادب دوستی کو اپنا مسلک بنا لیا۔

اظہر جاوید کو میں نے پہلی بار سید قاسم محمود یا اسرار زیدی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں دیکھا تھا۔منگول نسل کے لوگوں کی طرح کھچا ہوا چہرہ اور اٹھی ہوئی ناک،لمبوترا چہرہ، چوری پیشانی اور پیچھے کی طرف پھیلائے ہوئے لمبے بال جو زلفوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔بے چین سی طبیعت، آنکھیں جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔کسی نے میرا اس سے تعارف نہیں کرایا۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ اظہر جاوید سے میرا با قاعدہ تعارف کب اور کہاں ہوا۔اتنا ضرور یاد ہے کہ 1966ء میں جب فرخندہ لودھی کا افسانہ'پاربتی'' ماہنامہ اوراق کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تو''امروز'' کے دفتر میں ستّار طاہر اور اظہر جاوید نے چند فقرے اس افسانے کی تعریف میں کہے۔مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان دنوں ستّار طاہر میکلوڈ روڈ پر واقع''گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ'' میں''ویمن ڈائجسٹ'' کا مدیر تھا۔(کچھ عرصہ بعد اسی عمارت میں منیر نیازی نے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا)۔

ستار طاہر کے کمرے میں میلہ لگا رہتا۔اظہر جاوید اور روزنامہ نوائے وقت کے دو تین صحافی (یا کالم نویس) بھی وہاں موجود ہوتے۔میرے ایک واقف کار بشیر سلمی، جو ڈان اخبار کے کمرشل شعبے سے منسلک تھے،ایک دن مجھے وہاں کھینچ لے گئے۔اظہر جاوید فلمی ستاروں کے سکینڈلز کی تفصیل بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔بیچ بیچ میں طبقہ اشرافیہ کے کارناموں کا حوالہ بھی آ جاتا۔ہم بھی حیرت سے یہ باتیں سن رہے تھے کہ اتنے میں عارف عبدالمتین دفتر میں داخل ہوئے۔موضوعِ سخن بدل گیا لیکن غیبت کا سلسلہ جاری رہا۔''نوائے وقت'' کا ایک کالم نویس عارف عبدالمتین کو سمجھا رہا تھا:

''آپ سچے اور پکّے ترقی پسند ہیں۔روشن خیال ہیں۔آپ نے کبھی کسی رجعت پسند کا ساتھ نہیں دیا۔اب اچانک آپ''اوراق'' کے معاون مدیر بن کر ایک جاگیردار کا ساتھ دے رہے ہیں۔(ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں''اوراق'' کا اجراء کیا تھا اور وہ اپنی لمبی شیورلیٹ کار میں لاہور کا چکر لگاتے تھے اور اپنے احباب کو مال روڈ کے انفنسٹن ہوٹل (انڈس ہوٹل) میں چائے پلاتے تھے۔کئی ادیبوں اور شاعروں کو ان کی یہ روش پسند نہ تھی) عارف عبدالمتین مدلّل اور لمبی بات کرنے کے عادی تھے۔وہ بڑی نرم روی سے معترضین کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔مکالمہ نہ جانے کب تک چلتا رہا۔ میں بشیر سلمی کے ساتھ وہاں سے اٹھ آیا۔میرے دل پر بوجھ تھا۔مجھے بے کار کی دشمنی اچھی نہیں لگتی تھی۔(بعد میں جو حالات پیدا ہوئے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ''اوراق'' کی اشاعت کے ساتھ ہی''فنون'' اور''اوراق'' میں لکھنے والوں کے مراسم بگڑ گئے۔

1969ء میں فرخندہ لودھی کا ناول''حسرت عرض تمنا'' شائع ہوا۔احمد ندیم قاسمی نے محمد خالد اختر سے اس ناول پر

تبصرہ لکھوایا۔ محمد خالد اختر کو ناول پسند نہیں آیا۔ فرخندہ نے ناول کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام کیا تھا اور لکھا تھا ''ڈاکٹر وزیر آغا کے نام۔ جنہوں نے میرے قلم کو اعتبار بخشا''۔ محمد خالد اختر نے ایک فقرہ اس انتساب پر کسا تھا۔ دو تین تبصرے اور بھی ہوئے ان میں بھی یہی مفہوم تھا، ''کاش وزیر آغا ان کو اعتماد نہ بخشتے''۔

ان تبصروں کا فائدہ بھی ہوا۔ زاہد ڈار، ستار طاہر اور اظہر جاوید نے یہ ناول پڑھا اور بہت تعریف کی (ستار طاہر نے تو ''ویمن ڈائجسٹ'' میں توصیفی مضمون بھی لکھا) اظہر جاوید، بشیر سلمی کے ہمراہ داد دینے (یا منفی تبصروں پر پرسا دینے) ہمارے گھر آیا۔ موضوع کے رومانوی لہجے اور موضوع پر دیر تک بات ہوتی رہی۔ فرخندہ کا ردعمل بے نیازی کا تھا۔ ''یہ ناول میں نے اپنے تسکین کے لئے لکھا ہے۔ میں توصیف و تنقیص سے بے نیاز ہوں'' اظہر جاوید کو یہ لاتعلقی پسند آئی اور ہمارے درمیان عزت و احترام کا ایک رشتہ قائم ہو گیا جو آخر تک قائم رہا۔

اظہر جاوید نے ادب کو اپنی روزی کا ذریعہ بنایا۔ اخباروں میں کالم لکھے۔ رسالوں میں غزلیں اور نظمیں چھپوائیں۔ بلغارین افسانوں کے اردو میں ترجمے کیے پھر ''تخلیق'' کے نام سے اپنا رسالہ نکالا اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ ابتدائی نظموں اور غزلوں میں ''ش'' کی آواز نمایاں کرنے والے الفاظ بہت استعمال ہوتے تھے، شعلہ، شبنم، شناسائی، شاید، خوشی وغیرہ۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ان لفظوں میں سے شبنم کا استعمال جا و بے جا کرتا ہے۔ ایک ملاقات میں، میں نے کہہ دیا۔ ''یار!'' شبنم کا استعمال ذرا کم کر دو'' قہقہہ لگا کر جواب دیا ''میں اس لفظ ہی کو بھلا دیتا ہوں'' پھر اس نے شبنم اور خوشی دونوں کو فراموش کر دیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ''شبنم'' تیرتی رہی۔ شبنم کے لفظ نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔

اظہر جاوید کا معمول تھا کہ وہ دو بجے (بعد دوپہر) محفل آرائی کیلئے گھر سے نکلتا۔ ابا جی کی معذوری کے سبب میں شام کے وقت بہت کم گھر سے نکلتا تھا۔ اس لیے ہمارے ملاقاتیں وقفے وقفے سے یا اتفاقاً ہو جاتیں۔ البتہ جب اس نے اپنے جریدے ''تخلیق'' کو خالص ادبی رنگ دیا (چند فلمی صفحات ختم کر دیئے) اور اسے پاک ٹی ہاؤس کے قریب، میکلیگن روڈ پر ایک عمارت کی پہلی منزل میں کمرہ مل گیا تو میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پیدل چلتا ہوا ''تخلیق'' کے دفتر پہنچتا۔ کمرہ سبز الائچی کی خوشبو سے یا وائٹ جیسمین چائے کی خوشبو سے مہک رہا ہوتا۔ مستطیل کمرے میں اظہر جاوید کی کرسی کے عین سامنے، تیکھے نقوش کی مالک ابھرتی ہوئی اداکارہ ریکھا کے رقص کی 5 فٹ x 3 فٹ کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر لگی ہوتی۔ اس تصویر کو دیکھ کر کسی شاعر کا یہ مصرعہ یاد آجاتا ع ''بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا''۔ یہ تصویر کئی سال تک اظہر جاوید کے کمرے میں لگی رہی اور میں دو تین بار محض اس تصویر کو دیکھنے اس کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھا۔

اظہر جاوید کا ''تخلیق'' ادبی حلقوں میں ہمیشہ موضوع بحث رہا۔ میرے خیال میں اظہر جاوید نے اپنے رسالے کو منفرد رنگ دینے کے لئے چند حربے استعمال کیے تھے۔ پہلا حربہ یہ تھا کہ اس نے ''تخلیق'' میں طبقہ اناث کی شاعری اور کہانیاں کثرت سے شائع کیں اور جان بوجھ کر ''خواتین کو پروموٹ'' کرنے کا الزام اپنے سر لیا۔ دوسرا حربہ یہ تھا کہ اس میں ستار

طاہر سے (فٹ نوٹس) کے عنوان سے، کئی قسطوں میں معاصرین کی تحریروں پر کڑی تنقید کروائی۔ کبھی کبھی کسی معروف شاعر یا ادیب کی شخصیت کے تضادات بھی موضوعِ سخن بنے۔ اس طرح ''تخلیق'' کے مندرجات ٹی ہاؤس اور دیگر ادبی محفلوں میں دہرائے جاتے۔ چند صفحات مستقل طور پر پنجابی ادب اور شاعری کیلئے وقف کیے۔ اس طرح پنجابی لکھنے والے اور (خصوصاً لکھنے والیوں) کو اظہار کا ایک ذریعہ میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجابی رسالوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ صرف ''امروز'' کے ''قسمت علمی و ادبی'' میں چند سنجیدہ تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ اظہر جاوید نے اپنے رسالے میں پنجابی زبان کی کئی خوبصورت کہانیاں اور نظمیں شائع کیں۔

اظہر جاوید بدنام ہوا مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ انیس ناگی نے کہا ''یار! اردو کے پرچے میں خواہ مخواہ پنجابی داخل کرنے کی کیا ضرورت؟ میں بھی پنجابی میں لکھ سکتا ہوں لیکن اس کا حلقہ بہت محدود ہے میں کیوں ادھر آؤں''۔

میں اپنی ایسوسی ایشن (ویسٹ پاکستان لیکچرار ایسوسی ایشن) کی ایک خبر لگوانے اپنے شاگرد عارف نظامی سے ملنے گیا۔ واپسی پر گلزار وفا چودھری سے ملاقات ہو گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔ چند لکھنے والے اور جمع ہو گئے۔ ''تخلیق'' کے حوالے سے اظہر جاوید کا ذکر چل نکلا۔ ایک کالم نویس نے اس کی خواتین نواز پالیسی کے خلاف زہر اگلا۔ میں اس ماحول میں اجنبی تھا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ دو تین سال بعد میرے شاگرد رشید اختر حیات نے مجھے بتایا کہ جو لوگ اظہر جاوید کے ظاہری عاشقانہ رنگ کو ناپسند کر رہے تھے وہ خود ''چوں بہ خلوت می رود آں کار دیگر'' کی عمدہ مثال تھے۔

اصل میں نوعمری میں چاند چہرہ تلاش کرنے کا جنون مٹا نہیں تھا، کبھی کبھی اظہر جاوید پر وارفتگی طاری کر دیتا تھا۔ وہ منافق نہ تھا، بے تکلفی میں کسی خوبصورت چونچال خاتون کو ''مائی'' کہنے کی لپک بھی اسی جنون کے سبب تھی۔ اس کے دل میں ''مائی'' سے مراد انگریزی زبان کی My تھی۔ وہ حسن کے ہر پرتو کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

اسّی کی دہائی میں بشیر سلمی نے مجھے بتایا کہ اظہر جاوید ان دنوں بہت پریشان ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں ہے۔ اظہر جاوید کی زندگی کے بعض پہلو امریکن ناول نگار ہرمن میلول کے مشہور ناول ''موبی ڈک'' کے مرکزی کردار ''اہاب'' کی طرف پراسرار تھے۔ سنا تھا کہ اس کی شادی اچانک ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش و خرم تھا۔ میں کسی کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتا لیکن میں رہ نہیں سکا۔ اظہر جاوید سے ہی پوچھ لیا۔ ''سنا ہے آپ کے گھریلو معاملات ٹھیک نہیں چل رہے'' وہ مسکرایا ''لوگوں کو دوسروں کے معاملات میں دلچسپی لینے کی عادت ہے۔ کسی دن اپنی بیگم کے ہمراہ ہمارے ہاں چائے پر آ جایئے''۔

اگلے روز، شام کے وقت فرخندہ اور میں ان سے ملنے چلے گئے۔ شیر پاؤ پل سے پرانے ہوائی اڈے کی طرف جانے والی سڑک پر، ایک فوجی سکول میں اس کی بیگم پڑھاتی تھیں، کوارٹر ملا ہوا تھا۔ صاف ستھرے ہوادار کمرے، اور چھوٹا سا خوبصورت آنگن، اظہر جاوید کی بیگم نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ پر تکلّف چائے پلائی۔ دیر تک باتیں ہوتی

رہیں۔ ان کے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ سونان کھیلتا رہا اور اس کی بڑی بہن فرخندہ کے پاس بیٹھی رہی۔ ماحول میں کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ اظہر جاوید معمول کے مطابق اپنی زلفیں سنوار رہا تھا اور ہنس بول رہا تھا۔ بدمزگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ لگتا ہے، سچے جھوٹے قصے بہتان بن کر ان کی بیوی تک پہنچے۔ دل نواز شوہر اور سادہ دل بیوی کے درمیان فاصلے بڑھ گئے۔ ان دنوں اظہر جاوید سنجیدہ ہو چلا تھا پوری توجہ ''تخلیق'' کو معیاری مجلّہ بنانے پر دے رہا تھا۔ انگریزی زبان کے ایک مشہور افسانے ''سوپی'' (Soapy) کے مرکزی کردار کی طرح بدبختی کے تاریک سائے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ریکھا کی 5×3 فٹ تصویر دیوار سے اتر گئی لیکن اس وقت تک ریکھا کی کنڈلی کے دوش نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔

پائیدار رشتے ناپائیدار ہو گئے لیکن اظہر جاوید کے مزاج کی شگفتگی برقرار رہی۔ وہ دوست نوازی کی روش پر قائم رہا۔ اچانک ضیاء الحق کا جمہور کش سیاہ دور آ گیا۔ سیاسی کارکنوں، ترقی پسندوں، دانش وروں اور صحافیوں کے جسم پر کوڑے برسنے لگے تو وہ تلملا اٹھا۔ آنکھوں میں چھپائی ہوئی ''شبنم'' چھلک کر باہر آ گئی۔ اس کی باتوں سے لگتا کہ یہ سارے کوڑے اس کے جسم پر برس رہے ہیں۔ وہ ترقی پسند تھا اور اس نازک صورتحال میں اس کی ترقی پسندی، اس کے رومان پر غالب آ گئی۔

وفا کا رنگ دھندلایا، پڑی ہے برف جذبوں پر
جفا کے سرد جھونکوں کا کیا ہے دل کو اب چھلنی
یہ ہونی تو نہیں ٹلنی
چلو پھر کوچ کر جائیں (نظم ''ہجرت'')

وہ اتنے سوگوار دن تھے کہ خوابوں میں بھی کوڑوں کی گونج دار آواز سنائی دیتی تھی (کوڑوں کی اذیّت کے احساس نے مجھ جیسے ناشاعر کو بھی ایک نظم لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''کتنی راتوں سے میں نہیں سویا، ضربِ شلّاق میرے خوابوں پر'')

''تخلیق'' کی اشاعت سے پہلے اظہر جاوید ادب نواز اور ادیب دوست تھا۔ ادبی حلقوں میں اس کے بے تکلف دوست اسے ''بندہ نواز گیسو دراز'' بھی کہتے تھے۔ لیکن ''تخلیق'' کی اشاعت کے ساتھ وہ ادیب گر بن گیا۔ جس نثر نگار میں اسے افسانہ لکھنے کا جوہر نظر آیا اسے ''تخلیق'' کے ذریعے ادبی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ ناپختہ شاعروں اور شاعرات کے کلام کی نوک پلک سنواری اور انہیں مقبولیت کی سند دلوائی، بے وزن مصرعوں کو وزن میں کیا۔ ہزاروں کتابوں کے خصوصی اور عمومی مطالعے پیش کیے۔ خطوط کے ذریعے مباحث کو عام کیا اور اس خدمت کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ مختصر اداریے کے سوا بہت کم اپنی تحریریں اپنے رسالے میں شائع کیں۔

رومان پرور لوگ ذکی الحس ہوتے ہیں۔ جس شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں اس سے عقیدت کی ڈور میں بندھ جاتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی سے اظہر جاوید کا عشق اس کے کلام تک تھا۔ احمد ندیم قاسمی کو وہ سچا ترقی پسند تصور کرتا تھا۔ جب قاسمی صاحب جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے لئے قطار میں لگ گئے تو اظہر جاوید پر قیامت گزر گئی اور اس نے اپنے

رسالے کے اداریے میں اپنی چبھن کا اظہار کیا۔ قاسمی صاحب ناراض ہوئے اور ان کے کم فہم ساتھیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اظہر جاوید کے خلاف ہتک عزت کی نالش کی جائے۔ مقدمہ درج ہوا اور اظہر جاوید ٹوٹ کر رہ گیا۔ چاہنے والوں کو اپنی چاہت کا صلہ اس رنگ میں بھی ملتا ہے۔

اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی اور اظہر جاوید جیسے لوگ دنیا داری کے لئے پیدا نہیں ہوتے۔ قدرت ان سے کچھ اور کام لیتی ہے۔ وہ اپنی شاعری اور اپنی تخلیقات سے عوام الناس کا دل لبھاتے ہیں اور خود خاکستر ہو جاتے ہیں۔ موت کے بعد ان کا کام اور ان کا نام زندہ رہتا ہے۔ اظہر جاوید دوسروں کے لئے زندہ رہا اور اس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی بے قرار روح کو سمت عطا کی۔ اپنے آپ کو پراسراریت کے پردے میں چھپائے رکھا مگر دوسروں کے لئے روشنی کا سامان فراہم کر دیا۔ اس نے اپنے ظاہری اور باطنی نگارخانے کو درویشی کی چادر میں چھپا لیا۔ پرانی انارکلی کے نئے دفتر میں وہ مصلّے پر کھڑا خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتا رہا۔ ملاقاتی اس کی میز پر بکھری ہوئی کتابوں اور مجلّوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہ گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔ وہ مولانا روم کے درویشانہ رقص میں شریک ہونے والا تھا کہ وہ ندا سے بلاوا آ گیا۔

اپنے رومانی رویّے کے باوجود وہ اصول پرست اور وضع دار انسان تھا۔ تمام بلند ہمت اور روشن خیال ادیب جانتے ہیں کہ اس نے اس قرارداد پر دستخط کیے تھے جو ملک کو فوجی آمروں سے نجات دلانے کیلئے حق پرست ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے تیار کی تھی (بعد میں چند ادیبوں نے اپنے دستخطوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور چند نے معافی مانگ لی تھی) اظہر جاوید نے روزنامہ 'امروز'' کی مستقل ملازمت سے برطرفی قبول کر لی، معافی نہیں مانگی۔ آمدنی کا واحد ذریعہ چھن گیا لیکن وہ اپنا پرچہ نکالتا رہا۔ معاشرے سے منافقت اور بے حسی ختم کرنے کیلئے کاٹ دار تحریریں لکھتا رہا۔ وہ آغازِ شباب کی ذہنی آوارگی کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔ ''تخلیق'' کے گذشتہ پانچ برس کے اداریے اس کے پرائسچت کا ثبوت ہیں۔

◆◆◆

محشر بدایونی

''مخلصی ورفیقی اظہر جاوید صاحب! ''تخلیق'' میرا عزیز ترین اور انتہائی پسندیدہ رسالہ ہے۔ بڑے شوق اور انہاک سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں...... ''تخلیق'' ان چند رسائل میں شامل ہے جو اپنی ساکھ ادبی حلقوں سے منوا چکے ہیں۔ اس کی اعلیٰ نگارشات آپ کی مخلصانہ کاوشوں کی ترجمان ہیں۔

کاش یہ ''تخلیق'' کی موت نہ ہو

محمود شام

ہر ڈیڑھ دو مہینے بعد دفتر سے گھر پہنچنے پر سبز سیاہی سے لمبی لمبی لکھائی میں نام اور پتہ درج، خاکی لفافہ پہنچتا، تو میں سوچتا کہ نہ جانے کتنے لفافوں پر اپنے ہاتھ سے پتے لکھنا، آخر کس عشق کا اظہار ہے۔ کتنا وقت اس کی نذر رہتا ہوگا؟

14 فروری کو جب گلشن اقبال بلاک 7 میں انجمن ترقی اردو کے ممتاز اور منفرد صاحبِ قلم جناب حمایت علی شاعر کے اعزاز میں تقریب منعقد ہو رہی تھی، تو جناب جمال نقوی کے ہاتھ میں ایک ویسا ہی لفافہ نظر آ رہا تھا۔ جس پر وہی سبز الفاظ، وہی لمبی لکھائی۔ اسی صبح لمبی سبز لکھائی والے، بلند قامت، سفید بالوں والے اظہر جاوید کے دنیا سے چلے جانے کی ناقابل یقین خبر، ایک ایس ایم ایس کے ذریعے آئی تھی۔ لاہور کے ایک شاعر صحافی ناصر بشیر نے اپنے طور پر ایک مفت ادبی سروس شروع کر رکھی ہے۔ ادب کے حوالے سے واقعات اور تقریبات کی خبریں بروقت فراہم کر دی جاتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر خبریں دوستوں کے اس دنیا سے اٹھ جانے کی ہوتی ہیں۔

ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے رخصت

ایسے مواقع پر ہمارے بزرگ دانشور الطاف گوہر کے برادر عزیز راجہ تجمل حسین اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

وہ بادہ کش بھی تھے۔ اور اٹھ بھی گئے۔ اظہر جاوید بادہ کش نہیں تھے۔ البتہ ہماری محفلوں میں بیٹھتے تھے۔ مسحور کن گفتگو کرتے تھے۔ محفل کو زندہ رکھتے تھے۔ جنوری کی 28 کو میں اپنی کسی میٹنگ کے سلسلے میں لاہور میں تھا۔ اپنی صحافتی مصروفیات سے ایک ادبی ملاقات کے لئے وقت ضرور نکالتا تھا، الحمد پبلی کیشنز بھی اسی علاقے میں ہے۔ جہاں ''تخلیق'' کا گوشۂ عافیت ہے۔ پرانی انارکلی، پرانے لوگ۔ کبھی ''تخلیق'' کے دفتر میں احباب جمع ہو جاتے۔ الحمد کے صفدر حسین بھی وہیں آ جاتے۔ کبھی الحمد کے دفتر میں محفل جمتی۔ اظہر جاوید بھی ادھر آ جاتے۔ یونس جاوید ہوتے۔ خواجہ محمد زکریا، عباس تابش، صفدر حسین۔ یہاں کے دہی بڑوں کی تعریف کرتے اور منگوا بھی لیتے۔ ادبی مسائل، حکومت کے شکوے اور حالات کی شکایتیں۔ اس بار میں تھا، اظہر جاوید اور

صفدر حسین۔ بات یہی چھڑی ہوئی تھی کہ 40 سال مسلسل ایک ادبی جریدہ شائع کرنا، سب دوستوں کو اعزازی طور پر ارسال کرنا، ادب سے عشق کا اظہار ہے۔ اس میں کسی بافت کا سوال ہی نہیں۔ قتیل شفائی کے صاحبزادے نوید بھی آ گئے۔ پھر یہ طے ہونے لگا کہ اظہر جاوید کی اس مسلسل جدوجہد کے اعزاز میں کسی تقریب کا اہتمام کیا جائے۔ کون سا مہینہ مناسب رہے گا؟

اظہر جاوید کہنے لگے۔ ''پہلے بھی دوستوں نے ایسا پروگرام بنایا تھا اور عین اسی روز ہی میرے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہو گئی تھیں۔ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔ ساری تیاریاں دھری رہ گئیں۔ میں دوستوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

اس وقت کسے علم تھا کہ وہ دوستوں کو پریشان نہیں، سوگوار کرنا چاہتے تھے۔

صفدر حسین ان کے پڑوسی بھی تھے۔ دل وجگر بھی۔ آپس میں گاڑھی چھنتی تھی اور چھیڑ چھاڑ بھی رہتی تھی۔ اظہر جاوید شاعر تھے۔ غزل ''حروف بازناں گفتن'' کہلاتی ہے۔ تو وہ حسن تغزل قائم رکھنے کے لئے خواتین سے گفتگو کے زیادہ ہی قائل تھے۔

ہمارا لاہور جب بھی جانا ہوتا تو صفدر حسین اور اظہر جاوید مشترکہ طور پر شیزان فورٹریس سٹیڈیم میں احباب کو ضرور جمع کرتے۔

خواجہ محمد زکریا، شہزاد احمد، نوید قتیل، عباس تابش، کنول فیروز، رخشندہ نوید، سے ملاقات ہو جاتی۔ ادب کے عروج وزوال۔ نئی کتابوں اور مشاعروں پر گفتگو رہتی۔ اظہر جاوید کے احتجاجی اداریے ہر بار لازمی زیرِ بحث ہوئے۔

اس بار 14 اگست کو ان کے لئے ''تمغہ حسن کارکردگی'' کا اعلان ہوا تو سب احباب بہت خوش تھے کہ بہت تاخیر سے ایک ایسے شخص کی خدمات کا اعتراف کیا گیا، جو چار دہائیوں سے مسلسل ادب کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے اپنی زندگی خودداری سے، قناعت سے، بسر کر رہا ہے۔ وہ ملک کے سینئر ترین صحافیوں میں سے تھا اور 'امروز' جیسے اردو کے مثالی اخبار میں نمایاں عہدے پر نامور شخصیتوں کے رفیق کار رہا۔ اب جو وی آئی پی کالم نویس ہیں، تجزیہ کار ہیں، یہ نہ صرف پیشہ ورانہ زندگی میں ان سے جونیئر تھے بلکہ علم ودانش اور بذلہ سنجی میں بھی ان سے کہیں کم تر ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں لاہور میں میری کتابوں کی رونمائی کی تقریبات منعقد ہوئیں، سب انتظامات کی ذمہ داری اظہر جاوید نے اپنے سر لے لی۔ مقررین کے نام، شرکا کی فہرست، ادبی سیاسی حلقوں کی نمائندگی۔ ایک تقریب 1967ء سے 2000ء تک کے سیاسی انٹرویوز پر مشتمل ''روبرو''، ''ون ٹو ون''، ''امریکہ کیا سوچ رہا ہے'' کی تھی۔ جس میں صدر جناب حمید اختر تھے۔ مہمان خصوصی اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی تھے۔ اس میں نظامت اظہر جاوید کر رہے تھے۔ پھر محترمہ بےنظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ''پاکستان پر قربان'' کی تقریب افتتاح میں، ساری شخصیتیں ایسی مدعو کی گئیں، جو موجودہ پی پی پی حکومت میں شامل نہیں ہیں۔ اظہر جاوید خوش تھے کہ ہم سرکاری شخصیتوں کو نہیں بلا رہے۔ اس کی نظامت بھی انہوں نے کی اور بہت جم کر برمحل جملے اور تنقید۔ ایک ایک مقرر کی تقریر سے جملے اٹھانا ان کا کمال تھا۔

جب تک وہ عارضۂ قلب کا شکار نہیں ہوئے تھے، کراچی میں ان کا ہر سال آنا ہوتا تھا، اس کے لئے زیادہ تر ہم ہی انہیں مجبور کرتے کہ یہاں اکثر احباب سے ملاقاتیں بھی ہو جاتیں اور ''تخلیق'' کے لئے اشتہارات کا اہتمام بھی۔ نیشنل بنک کے جناب

رسول احمد کلیمی، حبیب بنک کے شجاعت علی بیگ، ہلٹن کے سردار یاسین ملک، یحییٰ پولانی، حاجی مسعود پاریکھ، ویلکم کے قیصر زیدی، قمر زیدی، اصغر زیدی۔ کراچی میں آمد میں تعطل کا سبب ایک تو دل کی بیماری، دوسرے ان کے ایک دوست ظفر عظیم کا تبادلہ۔ اب کئی سال سے ان کا کراچی آنا نہیں ہوا تھا۔ پورا کراچی ان کے لیے اداس تھا اور چشم براہ تھا۔ لیکن وہ من مرضی سے کسی اور طرف چلے گئے۔

بھارت کے ادبی حلقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ قتیل شفائی اور وہ اکثر مشاعرے لوٹتے رہے۔ مجھے ایک بار ان کے ساتھ دِلّی میں مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جنرل پرویز مشرف، آگرہ مذاکرات کے لئے گئے تھے۔ میں بطور صحافی ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہاں ایک مشاعرے میں بھی مدعو تھا۔ پرانی دلّی میں مشاعرہ تھا۔ وی پی سنگھ کی صدارت تھی۔ احمد فراز بھی تھے اور بہت سے نامور شعراء، اظہر جاوید کو بہت محبت سے سنا گیا۔

اس سے پہلے ایک اور مشاعرے کے لئے ہم گئے تو دلی ایئر پورٹ پر اترنے سے پہلے میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ میرے ساتھ امیگریشن کا مسئلہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے فارغ ہوکر باہر نکل جایئے گا۔ میرا انتظار باہر جا کر کیجئے گا۔ اجازت مل گئی تو آجاؤں گا۔ ورنہ میں اطلاع دے دوں گا۔ یہی ہوا۔ مجھے ایئر پورٹ پر ہی روک لیا گیا۔ مشاعرہ انبالے میں تھا۔ میں نہ جا سکا۔

یادیں تو بہت ہیں اور حملہ بھی کر رہی ہیں۔ یہ پھر کبھی سہی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جب سے یہ خبر ملی ہے، مجھے اس ادبی تسلسل کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہے، جو ''تخلیق'' کی باقاعدگی سے قائم تھا۔ ''تخلیق'' ایک رسالہ نہیں ایک ادبی تحریک ہے۔ ایک حلقہ ہے۔ ایک ادبی خاندان ہے۔ چوپال ہے۔ جہاں سب اپنی تخلیقات لے کر جمع ہوتے ہیں۔ گذشتہ تخلیقات پر سیر حاصل گفتگو خطوط میں کرتے ہیں۔ انور سدید ایک بزرگ مؤرّخ ہیں۔ جو ''تخلیق'' کی تاریخ قلمبند کرتے رہتے ہیں۔

اظہر جاوید ایک جسم تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ لیکن جو ایک روح ہے، تحریک ہے، دریا ہے، اسے رواں رہنا چاہیے۔ یہ ہم سب کا فرض ہے اور سب سے بہتر خراجِ عقیدت بھی یہی ہے کہ ''تخلیق'' کا سلسلۂ اشاعت نہ ٹوٹے۔

◆◆◆

اظہر جاوید

جو ہیں شہرت گزیدہ، وہ سمجھ پائے نہیں اظہرؔ
کدورت دل میں ہو تو آبرو پوری نہیں ہوتی

اظہر جاوید کے بارے میں دو چار باتیں

قاضی جاوید

ماہنامہ ''تخلیق'' کی اشاعت کے چالیس سال پورے ہونے کی خوشی میں چند تخلیق دوستوں نے 24 نومبر 2009ء کی سہ پہر کو لاہور کے پنجاب انسٹیٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھ کو جو دعوت نامہ موصول ہوا اس پر لبنیٰ جاوید، روبینہ طاہر، جاوید منظور، زریں پنّا اور طاہر منظور کے نام تھے۔ یہاں یہ نام اس ترتیب سے درج کئے گئے ہیں جس کے مطابق وہ دعوت نامہ پر لکھے تھے۔ میرے بس میں ہوتا تو شاید اس ترتیب کو کسی قدر بدل دیتا۔ بہرحال یہ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ سب خواتین و حضرات ''تخلیق'' کے دوست ہیں اور مدیر ''تخلیق'' اظہر جاوید صاحب کے ہمدرد بھی۔

تقریب سے تین روز پہلے دعوت نامہ ملتے ہی میں نے شرکت کا ارادہ کر لیا تھا۔ سہ پہر کی تقاریب میں شرکت آسان نہیں ہوتی۔ میں تین بجے کے لگ بھگ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے واپس گھر پہنچتا ہوں اور گھر ماڈل ٹاؤن میں ہے جس کو میری مرحومہ والدہ ''اللہ میاں کا پچھواڑہ'' کہا کرتی تھیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد گھر سے نکلنا مشکل مہم بن جاتا ہے۔ مگر ''تخلیق'' اور مدیر ''تخلیق'' دونوں سے دلی طور پر محسوس کئے جانے والے تعلق کے تقاضے مجھے عین وقت پر قذافی سٹیڈیم کے احاطے میں واقع پنجاب انسٹیٹیوٹ لے گئے اس ادارے کے دروازے جو دو سال پہلے تک سب کے استقبال کیلئے کھلے ہوئے تھے، اب ملکی حالات کے سبب کڑے پہرے میں ہوتے ہیں اور کار پارکنگ کیلئے بھی پہرہ دار سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ چھوٹے دروازے کے پاس موٹر کھڑی کرتے ہوئے میں نے پہرہ دار سے اشارے سے پوچھا کہ آیا وہاں پارکنگ کی اجازت ہے۔ وہ جواب دینے کے بجائے میرے پاس آ گیا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بھائی ملنا نہیں۔ میں تو اظہر جاوید صاحب کے ساتھ ہونے والے فنکشن میں شرکت کے لئے آیا ہوں''۔

''صاحب وہ تو ختم ہو گیا''۔

''کیا......کیا'' میں نے حیرت سے کہا'' کون ختم ہو گیا؟

میرا مطلب ہے فنکشن کیسے ختم ہو گیا۔ وہ تو چار بجے شروع ہونا تھا''۔

''نہیں صاحب۔ وہ کینسل ہو گیا۔ دیکھتے نہیں یہاں کوئی گاڑی نہیں۔ فنکشن ہوتا تو رش ہوتا''۔

''اچھا ٹھیک ہے''۔ میں نے اس خلاء کی اذیّت محسوس کرتے ہوئے جواب دیا جو کسی اچھی شے کے اچانک ہاتھ سے نکل جانے پر محسوس ہوتی ہے۔ اظہر جاوید کے ساتھ منائی جانے والی کسی تقریب میں شرکت کا پہلی بار موقع مل رہا تھا اور عین وقت پر اس کو چھین لیا گیا تھا۔ میں نے موبائل فون پر ایک دوست سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ اظہر جاوید تو ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔ اسی لیے تقریب منعقد نہ ہو سکی تھی۔

واپس آتے ہوئے میں نے سوچا کہ کتنے ہی سال بیت گئے ہیں جب میں نے اظہر جاوید کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ وہ 1970ء کی دہائی کے ابتدائی سال تھے اور اظہر جاوید روزنامہ امروز سے منسلک تھے۔ میں بھی اس اخبار میں کالم لکھتا تھا۔ لیکن ہمارے شعبے مختلف تھے۔ وہ دیگر ذمہ داریوں کے علاوہ اخبار کے فلمی ایڈیشن کے انچارج تھے اور میں نظریاتی مسائل اور بین الاقوامی امور پر لکھا کرتا تھا۔ ان دنوں حمید جہلمی، ہارون سعد، شفقت تنویر مرزا، منور بھائی اور کئی دوسرے جانے پہچانے صاحبان اس اخبار سے منسلک تھے، اگر چہ اس کے اچھے دن گزر چکے تھے اور اخبار نیشنل پریس ٹرسٹ کی تحویل میں آ چکا تھا۔ امروز کے دفاتر میں کبھی کبھی اظہر جاوید صاحب کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا...... اور میں ان کو دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ شاعر ہیں اور احساس بھی تھا کہ وہ ان شاعروں کی آخری نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو پہلی نظر میں ہی شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ یہ پہچان میں نے بہت پہلے بچپن میں پیام شاہجہان پوری کو دیکھ کر حاصل کر لی تھی۔ وہ ہمارے محلے میں رہتے تھے اور شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی لئے بغیر انہوں نے گھر سے باہر کبھی قدم نہ نکالا تھا۔ مجھے وہ اچھے لگتے تھے۔ اظہر جاوید نہ شیرانی پہنتے اور نہ ہی پاجامہ، ٹوپی اور چھڑی ان کے زیر استعمال رہی ہے۔ مگر ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ نظر دیکھتے ہی احساس ہو جاتا کہ وہ شاعر ہیں۔ شاید اس میں زیادہ رول لمبے بالوں کا ہے جن کے سبب بعض دوست ان کو خواجہ گیسو دراز بھی کہا کرتے تھیں۔ خیر شاعروں ادیبوں اور عام لوگوں میں جو فرق تھے، وہ اب نہیں رہا۔ شاید اس لئے کہ اب صرف معاشی محرک ہی ہم سب کو متحرک رکھتا ہے۔ یوں تحریک کی یکسانیت نے ہماری انفرادیتوں کو کچل کر ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

امروز کے دنوں میں اظہر جاوید صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا۔ ان سے بس یکطرفہ شناسائی تھی۔ چند برسوں کے بعد یک طرفہ رقابت کے چند دن آ گئے۔ وہ قصہ یوں ہے کہ یونیورسٹی کے زمانہ میں ہماری ایک دوست تھیں جو لاہور کے ایک علمی ادارہ میں ملازمت کرنے لگی تھیں۔ میں ایک بار اس سے ملنے گیا تو دیکھا کہ اظہر جاوید اس کے کمرے میں بیٹھے ہیں (اور مجھے یوں لگا کہ) دونوں خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور اس ادارے کی کینٹین کی طرف چلا گیا۔ وہاں چائے پی اور پندرہ منٹ گزارنے کے بعد دوبارہ جھانکا تو اظہر جاوید وہیں تھے۔ ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش گفتار شاعر کی موجودگی میں کسی لڑکی سے ملنے کی حماقت مجھ سے سرزد نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے مجبوراً ایک بار پھر کینٹین کی طرف آ گیا۔ دس بارہ منٹوں کا ایک اور وقفہ دینے کے بعد کمرے میں جھانکا۔ اظہر جاوید وہیں تھے۔ رقابت کی جلن میں جنم لینے والے بہت سے وسوسے

دل میں لئے میں واپس آ گیا۔

چند دنوں کے بعد شام کے وقت کیمپس پر اس بی بی سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں نے جلے بھنے انداز میں کہا کہ ''ان شاعر صاحب سے بڑی لمبی پینگیں چل رہی ہیں''

''لمبی پینگیں''اس نے ترت جواب دیا''۔ میں نے تو انہیں تمہارے لئے روک رکھا تھا۔ ان کو بتایا تھا کہ ایک دوست آنے والے ہیں جو فلسفے پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان سے مل کر جایئے گا۔ اس لئے وہ رک گئے۔ ورنہ وہ تو ایک منٹ بھی نہ ٹھہر رہے تھے''۔

''ہوں'' اظہر جاوید صاحب کی عشق بازیوں کے سنے سنائے قصے میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔''جان من، اگر اظہر جاوید ایک پل بھی تمہارے پاس نہ ٹھہر رہے تھے تو پھر جان لو کہ تم شہر کی حسیناؤں کی قطار میں نہیں ہو''۔

یہ قصہ جلد ختم ہو گیا۔ وہ جو محبوبہ شہر بننے کی آرزو رکھتی تھی۔ انہی دنوں انگلستان چلی گئی۔ خدا جانے اب کہاں ہے؟

خیر، اظہر جاوید صاحب کو میں نے نزدیک سے بھی دیکھا، ان کے ساتھ سفر کیا ہے اور چار پانچ دن ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ ابھی پانچ سات سال ہوئے، ان کے ایک عزیز دوست ظفر عظیم کی کتاب کی تقریب رونمائی کراچی میں ہونے والی تھی جہاں وہ کسٹم کے محکمہ میں بڑے منصب پر فائز تھے۔ اس تقریب کے سلسلہ میں وہ مجھے ساتھ لے گئے اور ہمارے ساتھ ایک خاتون شاعرہ بھی تھیں۔ چار دن ہم وہاں رہے اور میں نے دیکھا یہ کہ وہ بے حد مہذب، بے حد شائستہ ہیں۔ یہ جو آداب ہیں سماج کے، تہذیب کے اور میل جول کے، ان کی وہ بہت پابندی کرتے ہیں اور خواتین سے خاص طور پر شائستگی سے پیش آتے ہیں۔ ہم کراچی میں میں بہت گھومے، بہت سی باتیں کیں۔ پاکستان میں صحافت کی آزادی اور وقار کی علامت بن جانے والے ضمیر نیازی صاحب سے میرا ان دنوں قریبی تعلق تھا اور وہ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ ہم ان سے ملنے گئے۔ یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ موذی مرض نے ان کو لاچار کر دیا تھا۔ مگر تپاک سے ملے۔ انہوں نے شاعری میں اپنی دلچسپی کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ معاشرے کی صحت مند نشوونما کے لئے صحافت کی آزادی کیوں ضروری ہے۔ ایک اور عزیز دوست ایوب ملک جو ان دنوں بحریہ میں اعلیٰ افسر ہوتے ہوئے بھی کراچی کے بائیں بازو کے دانش وروں کی بہت سرپرستی کر رہے تھے اور تب سے ''بدلتی دنیا'' کے نام سے ایک ترقی پسند ماہوار رسالہ باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں، انہوں نے ایک شاندار دعوت دی۔ اس دعوت میں مجھے خالد علیگ سے ملنے کا موقع ملا جن کا ایک مقبول شعر کراچی کے ہی ماہنامہ عوامی منشور، جس کو طفیل عباس اور شوکت علی چوہدری ایڈٹ کرتے ہیں، کے سرورق پر برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ وہ شعر ہے:

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ اس دعوت میں ہم مسلم شمیم سے ملے اور منظور رضی سے بھی۔ گویا کراچی کے کئی دوستوں سے

ملاقات ہوگئی۔

کراچی میں ایک صبح ناشتے کے وقت میں نے اظہر جاوید سے پوچھ لیا کہ ''آپ تو اپنی شاعری کو سینے سے لگائے رہتے ہیں، دوسروں سے چھپاتے ہیں تو پھر آپ کا اکلوتا مجموعہ، غمِ عشق گر نہ ہوتا، کیونکر منظرِ عام پر آ گیا ہے''۔

انہوں نے بات ٹالنا چاہی۔ مسکراتے ہوئے کہا:

''بس کسی طرح (الحمد پبلشنگ ہاؤس والے) محمد صفدر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ دوست ہے۔ اس نے چھاپ دیا''۔

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا۔ ''محمد صفدر کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ مجموعہ کے ناشر کے طور پر انہی کا نام درج ہے۔

مگر کچھ اور بھی معاملہ ہوگا جو مسودہ ان تک پہنچا''۔

اس سے اظہر جاوید وضاحتوں کے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے:

''معاملہ وہی ہے جو میں نے لکھا بھی ہے۔ مگر آپ جیسے دوست دھیان سے پڑھیں تو تب ہے ناں۔ بہر حال پہلا دھکا سلیمہ ہاشمی نے دیا۔ اس نے یقین دلایا کہ شاعری فیض صاحب جیسی نہ ہو، تب بھی اشاعت کا حق رکھتی ہے۔ باقی کام کے لئے مہربان دوست پہلے ہی سے مستعد تھے''۔

اظہر جاوید اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کا ''الزام'' اپنے عزیز دوستوں کے سر دھرتے اور کہا کرتے تھے کہ یہ منظور خاندان کا کیا دھرا ہے۔ وہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور مہربان دوست بھی۔ ''انہوں نے ایک روز میری شاعری کے پلندے اٹھائے اور ساتھ لے گئے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ستمگر اب ان کو جلا کر چائے بنائیں گے۔ مگر انہوں نے ورق سیدھے کئے اور استادِ شہر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سپرد کر دیئے۔ ان کی دوست نوازیاں سب کو معلوم ہیں۔ خدا جانے کتنے شب و روز انہوں نے محنت کر کے ان اوراق پریشان کو مجموعۂ کلام کا روپ دیا۔ ایڈٹ کیا اور پھر محمد صفدر کے حوالے کر دیا۔ میں نے اس سارے معاملے میں کچھ بھی نہیں کیا''۔

ایک اور شام کو چائے پیتے ہوئے میں نے کہا:

اظہر جاوید صاحب جیسے ہمیں پہلی محبتیں نہیں بھولتیں، ویسے ہی، میں نے سنا ہے کہ، شاعروں کو پہلے شعر نہیں بھولا کرتے۔ آپ کو بھی تو یاد ہوگا''۔

''ہاں یاد ہے۔ خوب یاد ہے۔ میری پہلی غزل کا ایک شعر ہے جو سرگودھا کے اخبار میں چھپی تھی:

جب غمِ ایام سے گھبرا گئے
ہم تیری ہستی کی جانب آ گئے

گھر لوٹ کر جانے کی خواہش اظہر جاوید کی شاعری میں نمایاں ملتی ہے۔ انہوں نے اپنا مجموعہ کلام کا انتساب بھی ''اپنی دربدری کے نام'' کیا ہے اور یہ شعر بھی درج کیا ہے:

شام ہوئی سب بنجارے، سب پنچھی گھر کو لوٹ چلے
کاش کوئی میرا بھی گھر ہو، کاش کبھی گھر جاؤں میں

اصل میں یہ مابعدالطبیعاتی بے گھری (Metaphysical Homelessness) ہے جو مسلسل بے کل رکھتی ہے اور زندگی کی لایعنیت سے بھاگ کر معانی کی تلاش پر اکساتی ہے۔مگر معانی ہیں کہاں!

'سفر' کے عنوان سے ان کی ایک نظم ہے جو اس کیفیت کو......معانی کی تلاش میں سسی فس جیسی جدوجہد کو بیان کرتی ہے:

زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں
دربدر گھومتے ، بے خبر گھومتے
اپنی راہوں کے سنگِ سفر چومتے
عمر گزری مری
وقت کی گرد بالوں پہ جمنے لگی
دھڑکنوں کی جوانی بھی تھمنے لگی
میرے چہرے کو ویرانیاں کھا گئیں
میری آنکھوں میں حیرانیاں چھا گئیں
منزلوں کا نشان پھر بھی پایا نہیں
اور......میں لوٹ کر گھر بھی آیا نہیں

اظہر جاوید کی شاعری کا تجزیہ تو ادبی دانش وروں کا معاملہ ہے میں اپنے موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔کراچی کا ذکر میں کر رہا تھا تو وہاں ان کے ساتھ گزرنے والے دنوں میں میں نے دیکھا کہ وہ اس امیج سے بہت مختلف شخصیت ہیں جو یار لوگوں کے پھیلائے ہوئے قصے کہانیوں پر مبنی تھا۔ایک بات یہ بھی نوٹ کی کہ وہ پانچ وقت کی نماز با قاعدگی سے ادا کرتے تھے۔سرفراز سید کی گواہی یہ ہے کہ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے اور یہ سلسلہ بیس پچیس برسوں سے جاری تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ گذشتہ صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے زرعی قصبہ سرگودھا کے متوسط طبقہ کے خاندان کی تربیت کا نتیجہ ہے۔4 جنوری 1938ء کو وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے ،اس نے Establishment کو کئی اعلیٰ عہدیدار دیئے۔ (ان کے ایک تایا عبدالقیوم سرکاری خبر رساں ادارہ اے پی پی کے پہلے چیئرمین تھے) اور ساتھ ہی باغیوں کو بھی جنم دیا۔ان کے ایک چچا سبھاش چندر بوس کے ساتھی تھے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی چلے گئے۔وہاں سے انہوں نے ہندوستان کو برطانوی راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دینے والی خبریں اور دوسرے پروگرام شروع کئے تھے۔انگریزوں نے ہندوستانیوں کو جرمن ریڈیو کی نشریات سننے سے منع کر رکھا تھا، پھر بھی لاکھوں قوم پرست چوری چھپے ان کو سنا کرتے تھے۔

ایک خوشگوار تعجب مجھے اس وقت ہوا جب اظہر جاوید نے بتایا کہ ان کی والدہ نے کانونٹ سے تعلیم حاصل کی تھی......یعنی آپ ذرا خیال کیجئے کہ مسلم گھرانے سے تعلق رکھنے والی ان کی والدہ محترمہ نے 1930ء کے عشرے کے ہندوستان میں کانونٹ سے تعلیم پائی تھی اور خود وہ کوئٹہ سے منشی فاضل تک پہنچ پائے تھے...... دوستو، یہ ہے وہ قیمت جو اظہر جاوید نے ادب، عشق بازیوں اور آزاد زندگی کے لئے ادا کی۔ واقعی یہ بڑی قیمت ہے۔ (ایک بار، جہاں تک مجھے علم ہے، ایک ہی بار انہوں نے اس صورتحال پر افسوس کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ’’والدہ مجھے سی ایس پی بنانے کی آرزومند تھیں لیکن میں بہت کچھ بننے کی چاہ میں کچھ بھی نہ بن سکا‘‘۔ ساحر لدھیانوی سے اس کو بہت لگاؤ تھا اور ان کو اپنی آئیڈیل شخصیت قرار دیتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ساحر پر ایک کتاب بھی لکھی۔ اس کتاب کے بین السطور مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ساحر کے حالات لکھتے ہوئے اظہر جاوید اصل میں اپنی امنگوں، محرومیوں اور جذبوں کو بیان کر رہے ہیں۔ اس کتاب کا ذکر ہو رہا ہے تو میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بھارت کی ایک ادبی انجمن کی طرف سے اس کتاب پر ان کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ مگر دونوں ملکوں میں سیاسی کشیدگی کے باعث وہ ایوارڈ کی تقریب میں نہ جا سکے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد وہ گئے اور ایوارڈ وصول کیا)۔ انہوں نے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان کی تربیت کو ضائع نہ کیا۔ وہ ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ اس پال پوس کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ادبی صحافت کی بہترین قدروں کو سینے سے لگائے رکھا۔ 1969ء سے، وہ ماہنامہ تخلیق شائع کر رہے تھے جو فی الواقعہ ون مین شو تھا۔ اس معاملے میں کوئی ان کا مددگار نہیں تھا۔ وہ ایڈیٹر تھے، سب ایڈیٹر تھے، کلرک اور چپڑاسی بھی تھے۔ اس ادبی ماہنامہ نے جنوبی ایشیاء کے درجنوں ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تحریریں شائع کیں، بہت سے نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا اور ان کو نمایاں ہونے میں مدد دی۔ لیکن اس ایڈیٹر صاحب نے تخلیق میں اپنی ادبی تحریروں کو کبھی جگہ نہ دی۔ یہ طرزِ عمل انہوں نے اس زمانے میں بھی برقرار رکھا جب اردو کے کئی ادبی رسائل اپنے مدیروں، جو عام طور پر مالک بھی ہوتے ہیں، کی مدح سرائیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

خیر، اظہر جاوید کے لئے ابھی بہت کچھ کہنے کو ہے۔ یہاں میں نے صرف وہ باتیں لکھی ہیں جو 24 نومبر 2009ء کی سہ پہر کو منعقد ہونے والی ایک تقریب سے گھر لوٹتے ہوئے میرے ذہن میں آئیں۔ ہاں، ان کی ایک نظم بھی ہے۔ جو مجھے زبانی یاد ہے اور کبھی کبھی زبان پر آ جایا کرتی ہے:

گزرے سال کا نوحہ

اور بھی سال اک بیت گیا
اب کے بھی دل ہار گیا اور غم پھر ہم سے جیت گیا
اب کے بھی ہم اس کے لمس کی خوشبو سے محروم رہے
اب کے بھی ناشاد رہے
برباد رہے

اب کے برس بھی اس کے عشق میں قریہ قریہ خوار ہوئے
خود سے بھی بےزار ہوئے
پیر فقیر نہ چھوڑا کوئی، در در سجدہ بار ہوئے
ہم کیسے لاچار ہوئے
سب جذبے بیکار ہوئے
ساری دعائیں خجل ہوئیں اور امیدیں ناکام ہوئیں
اب کے برس بھی سکھ کی گھڑیاں ہم پر اک الزام ہوئیں
اب کے برس بھی اس کے ہونٹوں کی لذت کو ترسے ہیں
اب کے برس بھی دکھ کے بادل کھل کر ہم پر برسے ہیں
اب کے بھی یہ ظلم ہوا، وہ اپنی ضد پر اڑی رہی
گزرے برسوں کی صورت یہ جنجال رہا
آنسو، آہیں، زخم ملے اور مندا جی کا حال رہا
خوشیوں کا ہر گیت گیا
اور بھی سال اک بیت گیا

مندرجہ بالا تحریر 2009ء کے آخری دنوں میں لکھی گئی تھی اور ماہنامہ الحمراء کے جنوری 2010ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اظہر جاوید ہسپتال میں دو تین روز رہنے کے بعد صحت مندی کے ساتھ لوٹ آئے تھے اور ابھی ان کے پاس اس جہان فانی میں رہنے کیلئے دو اور سال تھے۔ یہ سال انہوں نے معمول کی سرگرمیوں میں بسر کئے۔ میری تحریر نظر سے گزری تو انہوں نے فون پر شکریہ ادا کیا اور کچھ تعریف بھی کی۔ چند روز کے بعد جم خانہ کلب میں ہماری مڈبھیڑ ہوئی تو انہوں نے دوبارہ شکریے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ''قاضی صاحب آپ نے سمجھا ہوگا کہ اظہر جاوید اب کے گرا ہے تو اٹھ نہ پائے گا۔ لہٰذا لگے ہاتھوں اس کا قرض اتار دیا جائے''۔

انہی دنوں حسین مجروح کی تحریک پر میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی لائبریری میں ''تخلیق'' کی چالیس سالہ اشاعت کے حوالے سے ایک تقریب منعقد کی جس میں بہت سے دوست شریک ہوئے، 'تخلیق' کے بارے میں باتیں ہوئیں اور ان سے بھی زیادہ باتیں مدیر ''تخلیق'' کے متعلق ہوئیں۔ خود انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے کئی واقعات سنائے اور سرگودھا کو بہت یاد کیا جہاں ان کے پہلے ادبی دوست اور استاد رہتے تھے۔

ان کیلئے ایک اور اچھی تقریب چند ماہ بعد منعقد ہوئی، یہ ایک ڈنر تھا جو اظہر جاوید کے لئے ''پرائڈ آف پرفارمنس''

کا اعلان ہونے پر ڈاکٹر شائستہ نزہت نے گلبرگ کے ایک ریسٹورنٹ میں دیا۔ اس میں شرکت کے لئے محمود شام خاص طور پر کراچی سے آئے تھے۔ توقع کے مطابق اس محفل میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ اس میں اظہر جاوید کے صاحب زادے سونان اظہر بھی اپنی بیگم کے ساتھ شریک تھے۔ مجھے اور شاید بعض اور دوستوں کو بھی پہلی بار ان سے ملنے کا موقع ملا تھا۔

''پرائڈ آف پرفارمنس'' ان کو یوم پاکستان کے موقع پر لاہور کے گورنر ہاؤس میں ملنا تھا۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی دوسرے جہان کو سدھار گئے۔ 14 فروری کو میں مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ کے ایک سیمینار میں شرکت کے لئے حیدرآباد میں تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا، دن کا آغاز سوگواری سے ہوا تھا۔ صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر عباس نجمی کی وفات کی خبر موصول ہوئی تھی۔ برسوں کے تعلق اور ان کی موت کے اذیت ناک حالات نے اس بے وقت موت کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ میں آبادی سے کوسوں دور جام شورو کے نیم صحرائی میدان میں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں دس بجے یونیورسٹی کے سابق ڈین ڈاکٹر محمد ابراہیم بیوڑ، یونیورسٹی کے شعبہ آرٹ اینڈ ڈیزائن کے چیرمین ڈاکٹر بھائی خان اور اسرہ یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر اسد قاضی تشریف لائے۔ چائے کی میز پر ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں کہ میرے موبائل فون نے ایک پیغام موصول ہونے کا اشارہ دیا۔ گفتگو جاری رہی۔ کچھ دیر بعد جب ہم مہران یونیورسٹی کے تدریسی بلاک کی طرف جانے والے تھے تو گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے میں نے پیغام کھولا۔ یہ پیغام ہم سب کے مہربان ہمدرد ناصر بشیر کی طرف سے تھا اور انہوں نے اظہر جاوید کے چلے جانے کی اطلاع دی تھی۔

میرے چہرے پر صدمے کا تاثر دیکھ کر ساتھیوں نے سبب پوچھا۔

''میرا شہر ایک لیجنڈ سے محروم ہو گیا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

◆◆◆

فارغ بخاری (لندن)

''اظہر بھائی! ''تخلیق'' بھیج کر تم نے جی خوش کر دیا۔ ''افکار'' کے بعد یہ دوسرا پرچہ ہے جو پاکستان سے ہوائی ڈاک کے ذریعے آ رہا ہے...... پتہ چلا کہ میمورنڈم پر دستخط کرنے کے سلسلے میں تم پر بھی نزلہ گرا اور ''امروز'' سے نکال دیئے گئے۔ خوشی ہوئی۔ نیک کام کرنے کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔ شکر کرو کہ صرف نوکری گئی۔ کوڑے نہیں پڑے۔ میرا مطلب ہے کہ تسکین قلب کے لیے ضروری ہے کہ روشن پہلو پر نظر رکھو اور یہ بھی کہ ''ہور گنے چُوپُو'' ...... یعنی اور اکیڈمی کے عرس شریف میں جاؤ۔''

اظہر جاوید......چند یادیں

ڈاکٹر رشید امجد

اظہر جاوید سے میرے تعلقات کا سلسلہ ساٹھ کی دہائی کے اولین دور میں شروع ہوا۔اس وقت وہ کراچی میں تھے اور وہاں سے شائع ہونے والے ایک جریدے ''عکس نو'' کے شریک مدیر تھے۔نثار ناسک نے میرا افسانہ انہیں بھجوایا، چند روز بعد ہی ان کا خط آ گیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔''عکس نو'' میں میرے کئی افسانے شائع ہوئے، اظہر جاوید سے پہلی ملاقات راولپنڈی میں ہوئی، وہ پرچے کے کسی کام سے یہاں آئے، دو ایک دن رہے، اس دوران طویل ملاقاتیں ہوئیں اور کئی ادبی و سیاسی مسائل پر گفتگو رہی۔جب انہوں نے ''تخلیق'' نکالا تو افسانے کی فرمائش کی۔''تخلیق'' کے ابتدائی زمانے میں میرے کئی افسانے اس میں شائع ہوئے، پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا لیکن اظہر جاوید سے تعلقات اسی طرح بلکہ پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے قائم رہے۔میں جب بھی لاہور آتا ان سے ملنے جاتا اور تادیر ان کے پاس رہتا۔وزیر آغا بھی لاہور آتے تو میں بھی لاہور پہنچتا اور ان کے ساتھ اظہر جاوید سے ملنے کا موقعہ مل جاتا، کبھی وہ آغا جی کے پاس ہوٹل آ جاتے کبھی آغا جی ان سے ملنے چلے جاتے، میں بھی ساتھ ہی ہوتا۔آغا قاسمی چپقلش ابھی شروع ہی ہوئی تھی اور آغا صاحب کے خلاف آئے دن گمنام خطوط آتے تھے۔بعض کی زبان اتنی گندی ہوتی تھی کہ انہیں پڑھتے ہوئے شرم آتی تھی، پھر انور سدید میدان میں اتر آئے، اظہر جاوید نے کھل کر وزیر آغا کا ساتھ دیا، یوں اظہر جاوید سے اور زیادہ قربت ہوگئی۔

اظہر جاوید کو شکایت تھی کہ میں ''تخلیق'' کے لئے مضامین وغیرہ تو بھیجتا رہتا ہوں مگر افسانہ نہیں بھیجتا۔میرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح کے افسانے میں لکھتا ہوں، تخلیق کے قارئین اسے زیادہ پسند نہیں کریں گے، چنانچہ اظہر جاوید کے اصرار کے باوجود میں نے انہیں ایک طویل عرصہ تک افسانہ نہیں بھیجا۔وہ جب بھی ملتے، یاد کراتے، میں وعدہ بھی کر لیتا، اس دوران ''تخلیق'' مجھے باقاعدگی سے ملتا رہا۔پچھلے سال میں نے انہیں سندھ کے بارے میں رپورتاژ بھیجا تو انہوں نے پھر افسانے کا یاد کرایا۔یہ رپورتاژ قسط وار ''تخلیق'' میں چھپا۔میں نے ایک تازہ افسانہ بھی انہیں دیا۔ان کا خط آیا ''آج کا دن ''تخلیق'' کے لئے یادگار رہے کہ تمہارا افسانہ ملا ہے'' اگلے پرچے میں یہ افسانہ ''صحرا کہیں جسے'' چھپ گیا۔محمود شام سمیت کئی دوستوں نے تعریف کی۔

''تخلیق'' کا ایک خاص حصہ اس کی وہ انجمن ہے جہاں قارئین کے خطوط چھپتے ہیں۔ یہ ادیبوں کا ''ہائیڈ پارک'' ہے۔ اظہر جاوید کی وسعت نظری یہ تھی کہ اس حصے میں ہر طرح کے خط چھپتے تھے، خود اظہر جاوید کے خلاف بھی، لیکن وہ برا نہیں مانتے تھے۔ ان کے اداریے تو کمال کے ہوتے تھے، مختصر مگر چبھتے ہوئے، تازہ موضوعات پر، ادیبوں کے رویّوں کے بارے میں، ادبی موضوعات پر، ادبی اداروں کے ادب دشمن رویّوں کے سلسلہ میں۔ ان اداریوں میں اظہر جاوید کا خلوص لفظ لفظ سے جھلکتا ہے۔ وہ ادبی رویّوں، ادیبوں کی منافقتوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے تھے، دبنگ انداز سے، بغیر اس خوف سے کہ کوئی ناراض ہو جائے گا۔ وہ ایک سچّے اور کھرے انسان تھے، جسے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے میں کسی خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

''صحرا کہیں جسے'' ''تخلیق'' میں چھپا تو دو تین ماہ بعد میں نے انہیں دوسرا افسانہ بھیجا اور لکھا کہ اب میں باقاعدگی سے ''تخلیق'' کے لئے افسانہ بھیجا کروں گا، افسوس اس کا موقعہ ہی نہیں ملا کہ میں اپنے عزیز دوست سے اپنا وعدہ وفا کرتا۔

اظہر جاوید کے ساتھ میرے تعلقات میں کبھی ناخوشگواری کا پہلو نہیں آیا۔ میں جب بھی بھگوان سٹریٹ میں ان سے ملنے جاتا تو وہ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتے اور اگر کبھی کھانے کا وقت ہوتا تو کھانے پر اصرار کرتے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور دوستی کو وفاداری بشرط استواری کے مصداق سمجھتے تھے۔ پچاس سال کے طویل عرصہ میں ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی رنجش ہوئی۔ ہوا یوں کہ اکادمی ادبیات کے صدر نشین فخر زمان کے پہلے دور میں ضیاء الحق کے خلاف لکھے جانے والے مزاحمتی ادب کا انتخاب مرتب اور شائع کرنے کا پروگرام بنا۔ مجھے اردو کا حصہ دیا گیا۔ میں نے افسانے اور شاعری کے انتخاب کا کام شروع کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اظہر جاوید نے ضیاء الحق کے خلاف کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلے میں وہ معتوب بھی رہے ہیں۔ ملازمت سے جبری علیحدگی کے ساتھ ساتھ وہ کئی اور طرح سے بھی حکومت کے عتاب میں تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اس انتخاب میں ان کی فلاں نظم شامل کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا یہ نظم نکال دو میں اس سے بہتر نظم بھیج دیتا ہوں۔ دو تین دن میں نظم مل گئی۔ انتخاب چھپ گیا۔ چند دن بعد فخر زمان کا فون آیا کہ تمہارے دوست اظہر جاوید نے کورٹ میں مقدمہ کر دیا ہے کہ اس کی نظم بغیر اجازت کیوں چھاپی گئی ہے۔ اسی دوران ''تخلیق'' کا نیا شمارہ آیا تو اس کے اداریئے میں بھی انہوں نے بہت سخت الفاظ میں فخر زمان اور اکادمی کی خبر لی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اظہر جاوید نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے تو خود اپنی نظم مجھے بھیجی تھی۔ عدالت نے اکادمی کو نوٹس بھجوایا تو اکادمی کے ڈی جی نے مجھے کہا کہ میں سٹیمپ پیپر پر لکھ کر دوں کہ اظہر جاوید سے زبانی اجازت لے لی گئی تھی۔ میرے لئے بڑا مشکل ہو گیا کہ کیا کروں۔ ٹال مٹول کی کوشش کی لیکن اکادمی کے وکیل کا اصرار تھا کہ یہ حلف نامہ جلد سے جلد بھیجا جائے۔ میں نے اظہر جاوید کو فون کیا اور پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا ''مجھے نظم کی شمولیت پر اعتراض نہیں، اعتراض اکادمی کے رویّے پر ہے۔ میں نے یہاں لاہور میں ان کے نمائندے سے کہا کہ میری نظم ''مزاحمتی ادب'' میں شائع ہوئی ہے ایک کتاب بھجوا دیں۔ اس نے کہا۔ کتاب

کی قیمت اتنی ہے، خرید لیں۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ ادارہ ادیبوں کی بہبود کے لئے قائم کیا گیا ہے لیکن رویہ تجارتی اشاعتی اداروں سے بھی بدتر ہے۔ یار رشید میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں، تم تو میرے جگری یار ہو۔ ہاں تم حلفیہ بیان انہیں بھجوادو''۔

ساری رنجش دور ہوگئی۔ مجھے ساری بات سمجھ آ گئی۔ میں نے فخر زمان کو بتا دیا۔ پھر کچھ دوست درمیان میں آ گئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ دراصل اظہر جاوید کو دوستوں سے لڑنا اور انہیں ناراض کرنا آتا ہی نہیں تھا، وہ ایک کھرے سچے دوست تھے، جسے دوست بنالیا، اسے اس کی تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ قبول کرلیا۔

پچھلے چند برسوں سے ''تخلیق'' پاکستان میں بلکہ بھارت سے بھی نکلنے والا واحد ادبی جریدہ تھا جو نہ صرف باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا بلکہ ہر قسم کی گروہ بندی سے پاک تھا۔ ''تخلیق'' اظہر جاوید کی شخصیت کا عکس تھا، انہی کی طرح کھرا سچا اور معیاری، اس کے خطوط کی انجمن ایک پلیٹ فارم تھی، ہائیڈ پارک، جہاں ہر ایک کو اپنے خیالات ونظریات کے اظہار کی اجازت تھی۔ اظہر جاوید کسی کی تحریر کو سنسر نہیں کرتے تھے۔ جن باتوں سے ان کو اختلاف ہوتا تھا، انہیں بھی شائع کر دیتے، کبھی بہت ہی اختلافی بات ہوتی تو اپنا اختلافی نوٹ شامل کر دیتے اور وہ بھی بہت ہی نفیس لہجے میں۔ اظہر جاوید اور ''تخلیق'' ایک ہی شخصیت کے دو رخ تھے۔ اظہر جاوید تو اب نہیں رہے، خدا کرے ''تخلیق'' ان کی شخصیت کے ان شاندار پہلوؤں کا عکس بنا رہے۔

اظہر جاوید خوددار انسان تھے۔ اپنے حق کیلئے آواز اٹھاتے تھے لیکن مانگتے نہیں تھے۔ ضیاء دور میں انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ ترقی پسند ہونے کے حوالے سے ان کی ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں، جس کی انہیں سزا ملی۔ پیپلز پارٹی کا دور آیا تو انہیں بری طرح نظر انداز کیا گیا جس کا انہیں بڑا رنج تھا۔ دراصل پیپلز پارٹی میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جو اس سے عشق کرتے ہیں اور مصیبت کے زمانے میں جیل جاتے، کوڑے کھاتے، سڑکوں پر ڈنڈے کھاتے اور نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مصیبت کے وقت ملک سے باہر چلے جاتے ہیں یا گھروں میں دُبک جاتے ہیں۔ جب اچھے دن آتے ہیں تو سوٹ استری کرا کے اور نئی شیروانیاں بنوا کر باہر نکل آتے ہیں اور پہلے والے لوگوں سے کہتے ہیں کہ اب تمہارے آرام کا وقت ہے۔ ہم کچھ حکومت کرلیں، اتنی دیر میں آپ کے زخم بھی ٹھیک ہو جائیں گے، ہماری لوٹ مار کے بعد جب حکومت جائے گی تو پھر آپ کا کام دوبارہ شروع ہوگا۔ اظہر جاوید اس قسم کے لوگوں میں شامل تھے جو اپنی نظریاتی وابستگی کی وجہ سے اپنی ہمّت سے بڑھ کر خلوص کا مظاہرہ کرتے تھے۔

''جیندے رہو'' ان کا خاص جملہ تھا، محبت اور خلوص کے رس سے بھرا یہ جملہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ لیکن اب یہ جملہ کہنے والا ایک نئی زندگی کے پراسرار سفر پر رواں ہے، شائد وہ پیچھے مڑ کر ہمیں دیکھ سکتا ہو لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے، یہی انسانی زندگی کا المیہ اور ''انسان خسارے میں ہے'' کی معنویت ہے۔

◆◆◆

ادب کا ایک باا ثر رہنما

ظفر عظیم

اظہر جاوید آج ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن اردو ادب میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ ادب کی ایک پر اثر آواز تھے۔ جنہوں نے اپنے رسالہ "تخلیق" کے ذریعے با مقصد ادبی تخلیقات کو دوام بخشا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ادب تخلیق کریں اور اردو زبان کو وہ مقام دیں جو اس کا حق ہے۔

اگر ہم تخلیق کے پچھلے شماروں کی ورق گردانی کریں تو ہمیں پاکستان میں ادب کی تاریخ مرتب ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ادبی جریدے میں ہر چھوٹا اور بڑا نام نظر آتا ہے اور ایسے ایسے ادبی شاہکار تخلیق میں شائع ہوئے جنہیں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ بلاشبہ "تخلیق" بین الاقوامی اردو ادب کا نمائندہ رسالہ شمار ہوتا ہے اور جہاں جہاں بھی اردو ادب کے لکھاری موجود ہیں وہ نہ صرف اس رسالہ کو اپنی تخلیقات ارسال کرتے تھے بلکہ اس میں شائع شدہ مواد پر اپنے خیالات کا بھر پور اظہار کرتے تھے۔ یوں تخلیق اور اظہر جاوید اردو ادب کے لئے ایک لازم وملزوم کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔

آج کی مادی دنیا میں فن پاروں اور فن کاروں کے لئے جگہ نہیں ہے ہر طرف کمرشل ماحول نے محبت اور پیار کے نام کو دھندلا دیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اظہر جاوید ہمیشہ پیار اور محبت کا درس دیتے رہے ہیں۔ انہیں ہمیشہ ہی ایک باعمل صوفی گردانتا رہا کیونکہ انہوں نے ہر چھوٹے اور بڑے فنکار کو یکساں نگاہ سے دیکھا اور اپنے پیار کی زبان سے ماحول میں بھائی چارہ اور ہم آہنگی پیدا کی۔ "تخلیق" اس بات کا گواہ ہے کہ اظہر جاوید نے نفرت اور تفریق کی سیاست کو ہمیشہ دور ہی رکھا اور اپنے میٹھے بولوں سے دنیا کی ہر اور سے لوگوں کو اپنی تخلیقات اور عزم سے متوجہ کیا۔ "تخلیق" میں امریکہ، برطانیہ، جرمنی، بھارت، مشرق وسطیٰ، بنگلہ دیش، نیپال اور بھانت بھانت کی جگہوں کے لکھنے والوں نے اپنی شمع جلائی اور یوں اظہر جاوید کی ان تھک محنت کی بدولت "تخلیق" آسمانِ ادب پر چھا گیا اور یہ ممکن نہ تھا کہ آپ اردو ادب کی بات کریں اور اظہر جاوید کا ذکر نہ آئے۔ ان کی محبت اور ہم آہنگی نے ادب کو جو ماحول دیا ان کی جدائی سے ادب کا موسم ہمیشہ ابر آلود رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اظہر کے نہ ہونے سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جسے بھرنے کیلئے ایک عرصہ چاہیے۔ اظہر کی شخصیت میں ایک جادوگری تھی جو ان سے ایک دفعہ ملا ان کا ہی ہو کر رہ گیا اور یوں دبستان اظہر اور دبستان "تخلیق" وجود میں

آیا۔ آج ان کی غیر موجودگی میں اس بات کا احساس دلا رہی ہے کہ ادب کی سر زمین میں کام کرنا کتنا مشکل کام ہے اور آج کے ماحول میں ایک ادبی جریدے کو نکالنا کتنا کٹھن اور مشکل کام ہے جسے اظہر ہی پچھلی نصف صدی سے بخوبی انجام دے رہے تھے۔

ان کی غیر موجودگی رفتہ رفتہ ہمیں احساس دلائے گی کہ آج کا ادب اجڑ کر رہ گیا ہے اور ان کی شخصیت کے پر اثر حصار نے جن لوگوں کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا کیا یہ ممکن ہوگا کہ آنے والے جانشینِ ادب ان کی جگہ لے سکیں گے۔ میرے خیال میں یہ کوئی آسان بات نہ ہوگی۔ اور یوں ہماری ادبی دنیا یتیم اور بے آسرا ہو کر رہ گئی ہے اس پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے کیلئے جس حوصلے اور عزم کی ضرورت ہے وہ دکھائی نہیں دے رہا۔

جہاں ایک طرف تخلیق کی بات ہے دوسری جانب اظہر جاوید کی اپنی ایک ادبی حیثیت ہے اور اس جگہ کو آگے بڑھانے کیلئے آنے والے لوگوں کو اس راہ کو اپنانا ہوگا جس پر اظہر جاوید تا زندگی قائم و دائم رہے۔ انہوں نے جس انداز میں ادب کی آبیاری کی یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ایک طرف مالی مسائل کی موجودگی اور دوسری طرف بے حس دنیا میں زندگی کے گوناگوں مسائل سے نبرد آزما ہونا کوئی انہیں سے سیکھے اور ساتھ ساتھ ہی لوگوں کو پیار اور محبت کی تعلیم اپنی قربانیوں سے دینا بھی ایک فن تھا جو انہوں نے بخوبی نبھایا۔ وہ اپنی ذات میں ایک مکمل انجمن تھے، درحقیقت، ان پر قلم اٹھانا کوئی آسان بات نہیں کیونکہ ان کے چھپے ہوئے گوشے اتنی آسانی سے وا نہیں کیے جا سکتے۔ انہوں نے بے شمار کام پسِ منظر میں رہ کر انجام دیئے اور یقیناً یہ امر صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو ہی معلوم ہے اور آج ان پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ان گمنام صوفی کی اُن خصوصیات کو اجاگر کریں جن سے انہوں نے محبت کی جوت جگائی تھی۔

دراصل ایک ایسے ماحول میں جہاں جبر کی قوتوں نے اپنی قبضہ جمایا ہوا ہے وہاں حق اور انصاف کی نشان دہی کرنے والا مورِدِ الزام ٹھہرتا ہے اور کچھ ایسا ہی اس گمنام صوفی کے ساتھ ہوا جسے آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔ یہ شخص اپنی تمام قوت اور خوبیوں کے ہمراہ تن تنہا ہی اس جبر کے ماحول سے لڑتا رہا قصہ کچھ یوں ہے جو کہ کسی شاعر نے کہا تھا ۔

کیا پوچھتے ہو حال میرے کاروبار کا
آئینے بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

قدرت کے بنائے ہوئے یہ متوالے لوگ اس کی سر زمین پر خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک دن خاموشی سے ہی کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آج کا شور اس صوفی کے گزر جانے کے بعد کا شور ہے جو اپنی محبت اور یگانگت سے ہم آہنگی کے دیئے جلا کر ہمیں تنہا چھوڑ کر کہیں اور جا بسا ہے۔ آیئے آج ہم اس نیک روح کے لئے دعا گو ہوں۔

◆◆◆

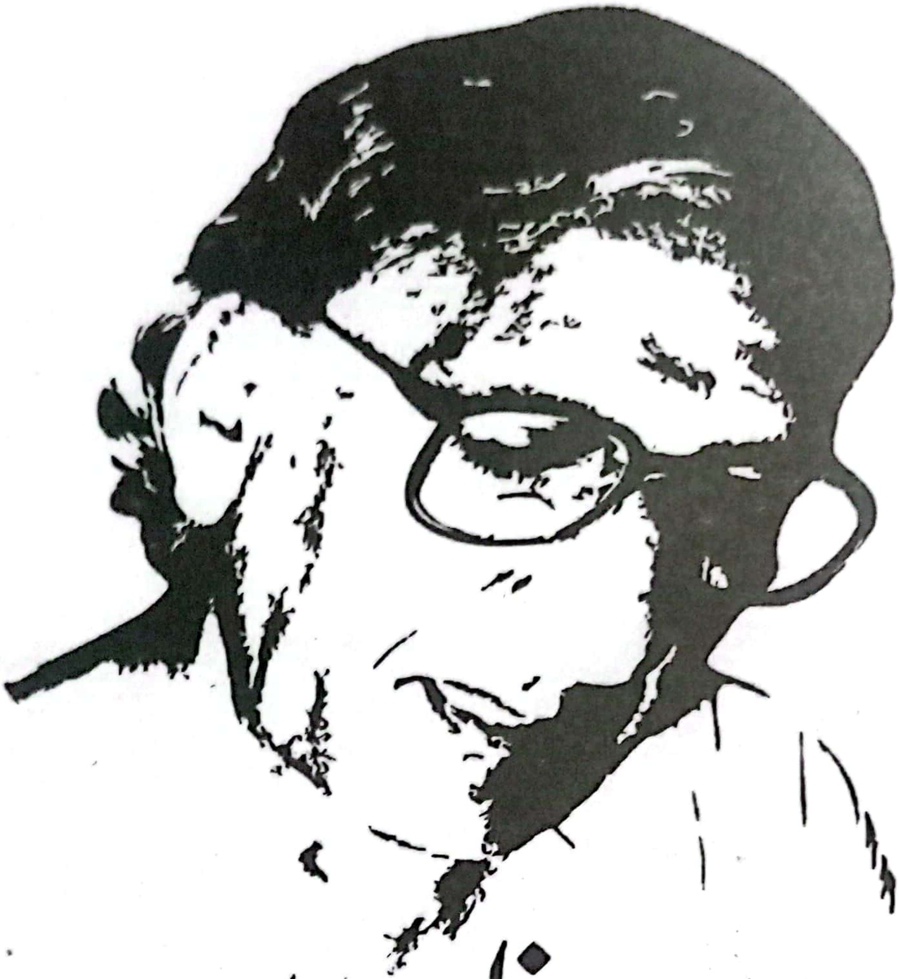

اظہر جاوید

درونِ خانہ

CamScanner

ایک خوشبو دور تک میرے تعاقب میں رہی

میں ابھی کچھ دیر پہلے چُھو کے آیا تھا اُسے

اظہر جاوید

CamScanner

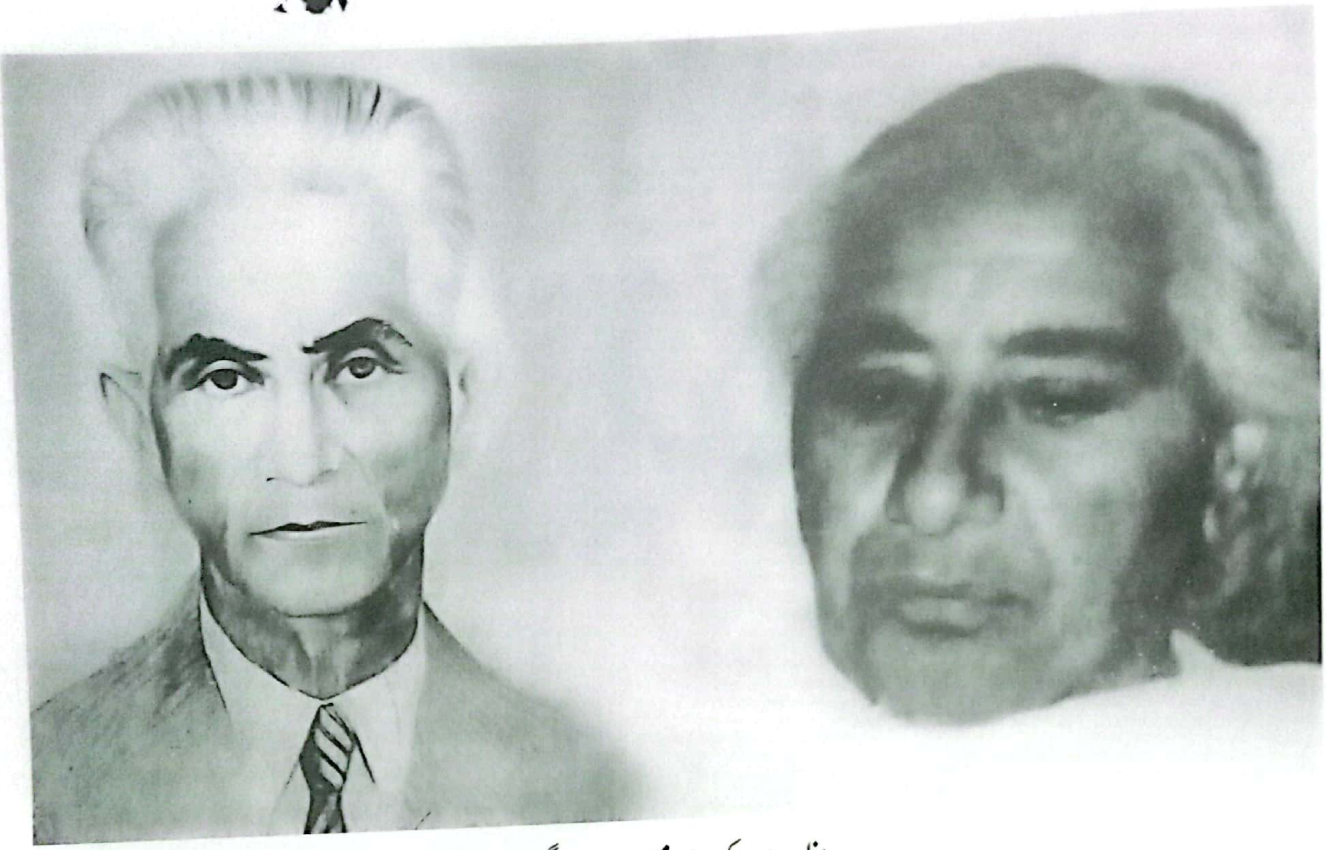

اظہر جاوید کی والدہ محترمہ اور والد گرامی

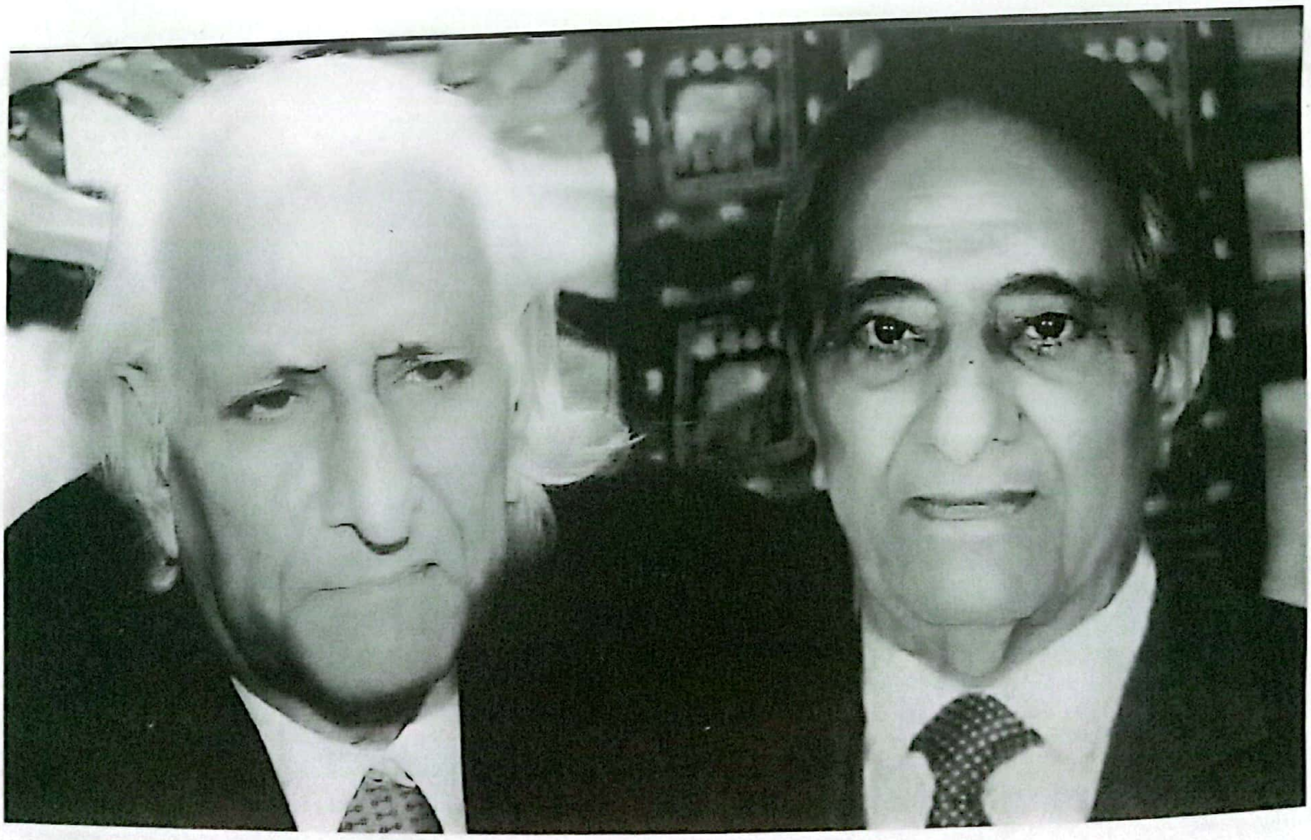

اظہر جاوید صاحب اور ان کے بڑے بھائی مظہر سہیل جو امریکہ میں مقیم ہیں۔

اظہر جاوید صاحب اپنی بیگم مسرت اظہر کے ساتھ

اظہر جاوید صاحب اپنی بیٹی سلمونیہ مسرت اور بیٹے سونان اظہر جاوید کے ساتھ

سونان اظہر جاوید اور ان کی اہلیہ سعدیہ سونان

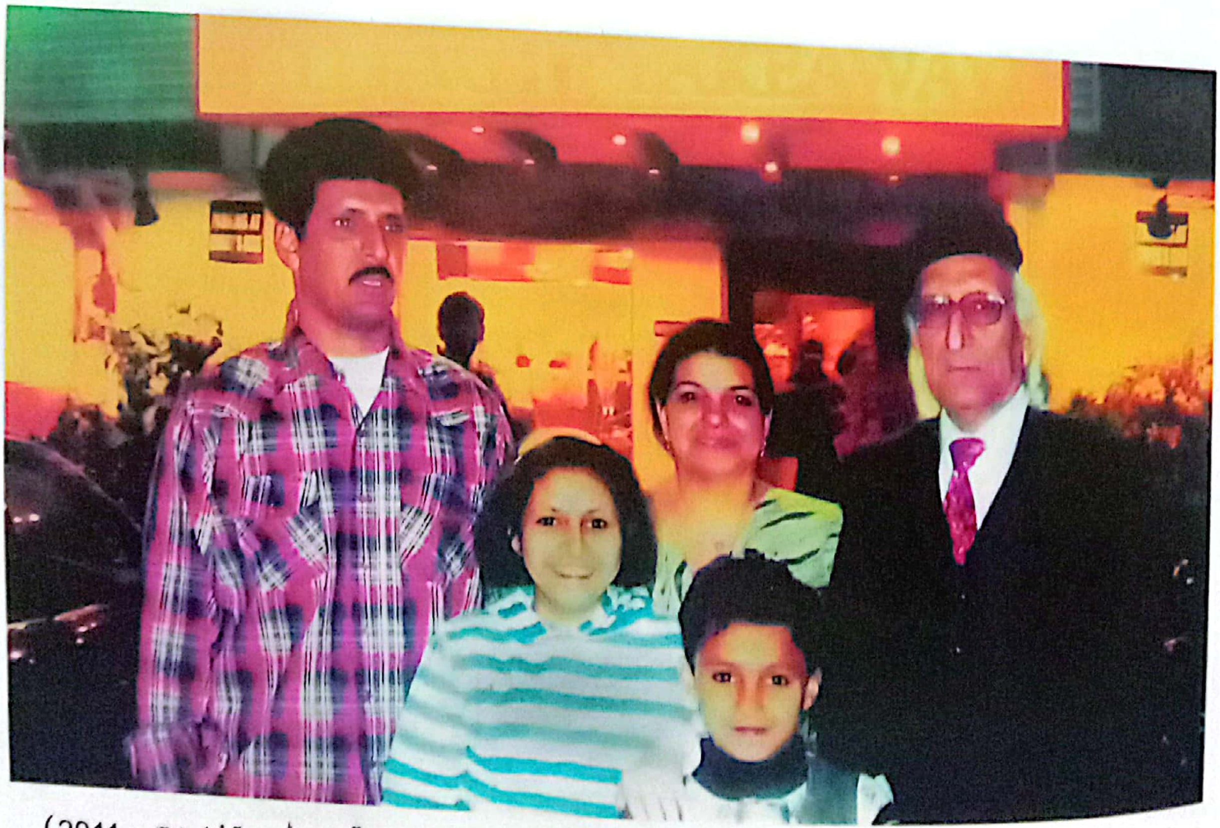

اظہر جاوید صاحب بیٹی سلمونیہ مسرت، بیٹے سونان اظہر، پوتا حذیفہ سونان اور پوتی آبگینہ کے ساتھ (کینیڈا میں مقیم اپنی بیٹی سے آخری ملاقات 2011)

اظہر جاوید صاحب اپنی بیٹی بہو اور بیٹے کے ساتھ آخری ملاقات کے موقع پر 2011

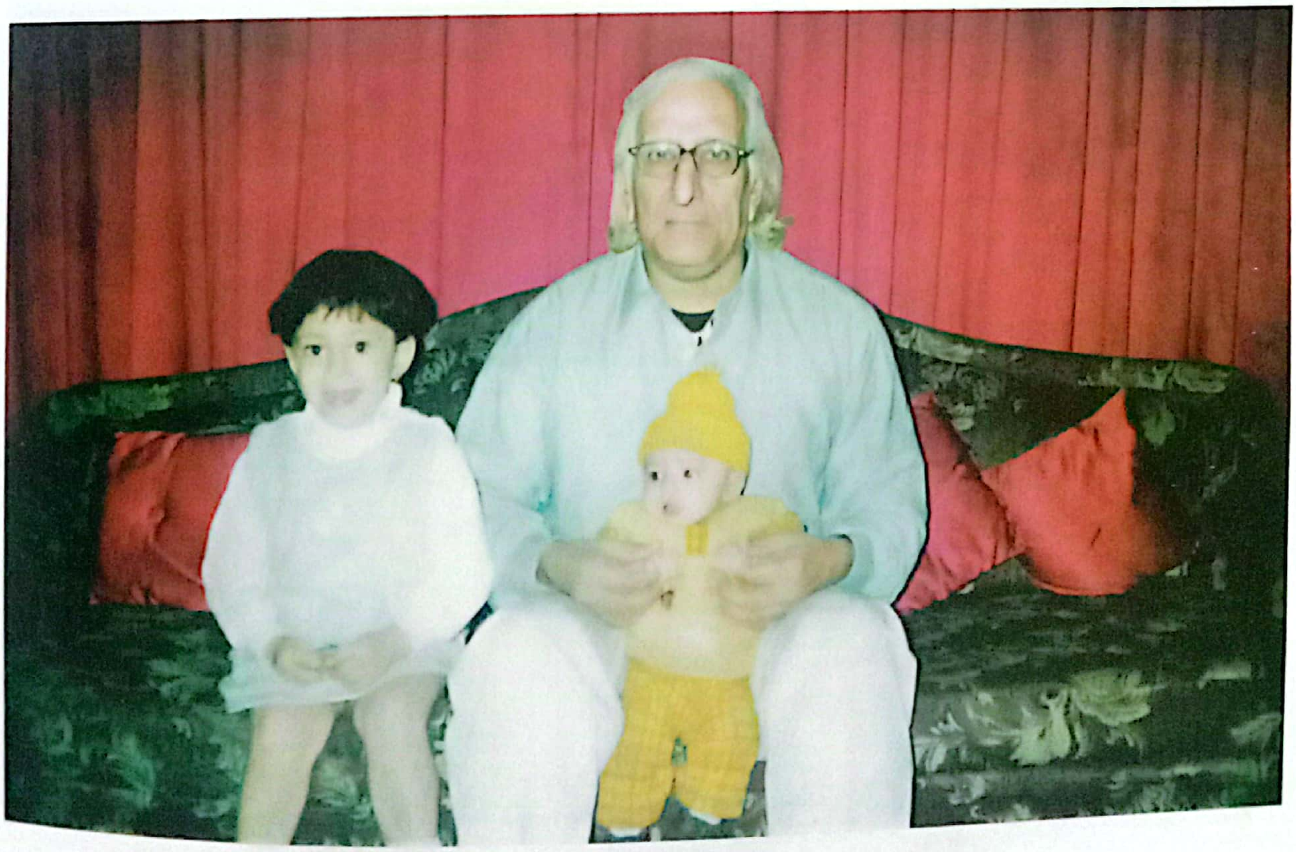

اظہر جاوید صاحب اپنے پوتے حذیفہ سونان اور پوتی آ بگینہ سونان کے ساتھ

ایک بوڑھے۔مریضِ دل کی فریاد

ماں، میری فریاد سُنو!
جب بھی میں بیمار ہوا ہوں
اکلاپے کے روگ میں پھنس کر
خود سے بھی بیزار ہوا ہوں
ماں، تم مجھ کو یاد آتی ہو
یوں دیکھوں تو
عمر کی آخری منزل کا میں راہی ہوں
پت جھڑ کا اِک پتّا ہوں
کسی بھی لمحے
شاخ سے ٹوٹ کے گر سکتا ہوں
مٹی میں رُل سکتا ہوں
کتنے سال گزارے میں نے
جانے کتنے باقی ہیں
دوہتوں، پوتوں والا ہوں میں
ہوتوں، سوتوں والا ہوں میں
ماں
میں پھر بھی بچہ ہوں
جب تم مجھ سے بچھڑی تھیں
تب بھی میں
محرومِ تمنا، دردوالم کا مارا تھا
تب بھی میں بے چارا تھا
تم اپنی ساری شفقت اور ساری ممتا
میرے بڑے بھائی پر نچھاور کرتی تھیں
تب میں ترسا کرتا تھا
یہ اب برسوں میں سمجھا ہوں
اُس کی صورت
میرے باپ سے ملتی تھی
اور تمہارے دل میں ماں
اپنے ماضی کی یادوں کی
دُکھ اور سُکھ کی رُت کھلتی تھی
اب بھی جب بچوں کے بچے
اپنی ماں سے لپٹتے ہیں
میرے زخم تڑختے ہیں
ایسا کر لو
نیند کے روپ میں آ کر ماں
میرے ماتھے کو چھُو لو
اپنی گود میں بھر لو ماں
جس دنیا میں چھوڑ گئی ہو
اُس سے پیار نہیں ملتا
ممتا کیسے ملتی ہے
جانے کب یہ سانس کی ڈوری
آخری مرتبہ ہلنی ہے
ماں، تم کتنی یاد آتی ہو

ایک نظم سعدیہ کے لئے

(اپنی بہو سعدیہ سونان کے نام)

وفا شعار، سلیقہ مند اور خدمت گار
خدا ہمیشہ ہی حفظ و امان میں رکھے
ملیں زمانے کی خوشیاں مسرّتیں ساری
تمام عُمر اسے آن بان میں رکھے
بہت لگن سے سنوارا ہے اُس نے گھر اپنا
بہت خلوص سے اس نے نبھائے ہیں رشتے

نہ کچھ غرض ہے، نہ مقصد، نہ کوئی لالچ ہے
محبتوں کی ضیا سے بنائے ہیں رشتے
ہے نام اُس کا مبارک، نصیب ہو اچھا
کوئی بھی غم نہ کبھی اس کے پاس تک پھٹکے
کھلیں گلاب اگر وہ اُٹھائے دامن کو
گریں گے موتی جو آنچل کو وہ کبھی جھٹکے

دعا ہے بچّے بھی اُس کے نصیب والے ہوں
ہمیشہ سر پہ سلامت بھی سر کا تاج رہے
جو اس میں صبر وتحمل ہے اس کی برکت سے
بھرم رہے گا! ہمیشہ ہی اُس کی لاج رہے

ایک نظم سونان کے لئے بھی!

(اپنے بیٹے سونان اظہر کے نام)

اپنی ہمت، محنت سے جو چڑھا ہے خود پروان
اس انمول سہانے شخص کو کہتے ہیں سُونان
جذباتی ہے لیکن اس کا دل اور نیّت صاف
کوئی اگر دھوکا بھی دے یہ کر دیتا ہے معاف
اس نے اپنے جینے کا ہر رستہ آپ بنایا
اس پہ خُدا کی رحمت کا رہے ہمیشہ سایا
بے پروا سا لگتا ہے وہ لیکن ہے حسّاس
اس کے دل میں رہی ہمیشہ اچھے دنوں کی آس
ماں کی خدمت اس کا مسلک، باپ کی عزت شیوہ
دونوں جہاں میں ایسے شخص کو رب دیتا ہے میوہ
دل میں اس کے پیار محبت کی بھرپور تجلی
کرتا نہیں اظہار، نہیں دیتا یہ حرفِ تسلی
بیوی بچے جان ہیں اس کی، گھر سُکھ کا گھوارہ
کبھی کبھی جھنجھلا کے چاہے بدلے وقت کا دھارا
سمجھوتہ نہیں کرنا آتا، ہے یہ عزم کا پکا
ہر مُشکل دیوار گرائی اس نے دے کر دھکا
رنگ برنگی تتلی پکڑنا اس کا نرالا شوق
کہتا ہے کہ جینز میں شامل ہے میرے یہ ذوق
اپنی رائے پہ جم جانا اور کبھی نہ سر کو جھکانا
اس کی خوبی ہے یہ سمجھے خود کو سب سے دانا
اس کو یارب دُنیا بھر کی عزت دولت دے دے
میری دُعا کو میرے مولا، اتنی وقعت دے دے
جیون میں خوش حالی ہو اور جینا ہو آسان
اپنے پرائے فخر سے بولیں، اپنا ہے سونانؔ

دل کے نہاں خانوں سے

سعدیہ سونان

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے ان کے بارے میں اپنی زندگی میں لکھنا پڑے گا جو میرے ایک مہربان باپ تھے۔ ہمدرد دوست تھے۔ شفیق بزرگ تھے۔ غم خوار ساتھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے ہم راز تھے۔ رسمی طور پر میں ان کی بہو تھی لیکن درحقیقت میں ان کی حقیقی اور سچی بیٹی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ میں اپنے سب دکھ ان کے سامنے آزادی سے بیان کرسکتی تھی اور وہ پوری یک سوئی سے میری بات سنتے اور ''راب راکھا''...... ''رب راکھا'' کہتے رہتے۔ حتیٰ کہ میرا دکھ ان کی دعا میں تحلیل ہوجاتا۔ وہ میرے لیے ایک شجر سایہ دار تھے اور انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں میں رکھا۔

یہ اظہر جاوید تھے، جنہیں لوگ رسالہ ''تخلیق'' کا ایڈیٹر کہتے ہیں لیکن میں انہیں دل کے نہاں خانوں سے اٹھتی ہوئی آواز میں ''ابو'' کہتی تھی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو میں محسوس کرتی کہ مجھے اس دنیا میں ہر طرح کا تحفظ مل گیا ہے۔

اب وہ مجھے روتا چھوڑ کر دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو وہ دنیا کی قید سے آزاد ہوگئے، سسر اور بہو کا تعلق ٹوٹ گیا۔ لیکن میں جوان کی محبت اور شفقت کے شیرے میں لتھڑی ہوئی ہوں، محسوس کرتی ہوں کہ میرا ابّو اور بیٹی کا رشتہ قائم ہے۔ وہ اس دنیا میں موجود نہ ہونے کے باوجود ہر وقت میرے پاس ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ ہے اور وہ مجھے اپنے محفوظ حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میرا ابّو سے چالیس یا پچاس برس پرانا تعلق نہیں ہے۔ صرف پندرہ برس پہلے انہوں نے شفقت کی پہلی نظر سے دیکھا اور پھر مجھے زندگی بھر کے لیے اپنے گھر کا حصّہ بنالیا۔ مجھے اپنے بیٹے سونان کے لیے قبول کرلیا۔ یہ پندرہ برس اب ایسے لگتے ہیں کہ ایک پَل میں گزر گئے ہیں۔ ماہ وسال ایک لمحے میں سمٹ گئے ہیں۔ اب یاد کرتی ہوں کہ ایک ایک لمحہ میرے سامنے مدتوں کے پھول کھلا رہا ہے۔ وہ ابرِ کرم ہیں۔ مسلسل برس رہے ہیں اور میں ان کی نوازشوں کی بارش میں مسلسل شرابور ہو رہی ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب تین چار سال پہلے ابّو کو پہلی دفعہ ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ یہ تکلیف کے دن تھے لیکن ابّو انہیں ایسے گزار رہے تھے جیسے پکنک منا رہے ہوں۔ میں چائے کی پیالی ان کے سامنے رکھتی تو ابّو اپنے ماضی کی یادوں میں کھو جاتے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان کی پرانی زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ لیکن اب وہ ہر بات خود ہی کھول رہے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ وہ گوجرانوالہ سے کس طرح سرگودھا آئے اور ان کی نانی نے ان کی کس طرح پرورش کی، انہیں تعلیم دلوائی۔ اس زمانے کی شرارتیں بیان کرتے تو میں انہیں روکتی کہ یہ باتیں بتانے کی ہیں؟ وہ ہنس کر کہتے ''ہاں یہی باتیں بتانے کی ہیں کہ ہم بوڑھے تو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہمارا بھی بچپن تھا اور ہم بھی شرارتیں کرتے تھے۔ سکول

کے ماسٹر سے مار کھاتے تھے۔ اور سبق یاد کرنے کی بجائے ''گلی ڈنڈا کھیلنے چلے جاتے یا گاؤں کے ساتھ بہتی ہوئی نہر میں چھلانگیں لگاتے چلے جاتے تھے۔''

انہوں نے اپنی زندگی کا ہر راز مجھ پر کھول دیا۔ ہر بات مجھے بتادی، جب وہ اس قسم کی باتیں کرتے تو مجھے ہول اٹھتا کہ ابّو کو کہیں یہ احساس تو نہیں ہو گیا کہ ان کا ہارٹ اٹیک خدانخواستہ خطرناک ہو سکتا ہے؟ اس حالت میں اپنی بیٹی اور بیٹے کو پاس بلا لیتی۔ دونوں کو دیکھ کر وہ کِھل اٹھتے اور کہتے...... ''میں ابھی مردوں گا نہیں...... لیکن اگر مر گیا تب بھی ان بچوں میں زندہ رہوں گا......'' اور پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے ''سعدیہ، میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم نے میرے مستقبل کو محفوظ کر دیا ہے۔ تم میرے پوتے پوتی کی ماں ہو۔''

ابّو بہت حسّاس انسان تھے۔ اپنے دوستوں کا ذکر محبت سے کرتے لیکن کبھی یک دم انہیں ''چپ'' لگ جاتی۔ میں پریشان ہو جاتی تو کہتے...... ''یہ دنیا ہے اور اسی میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ دوستوں کی صورت میں مطلب نکالنے والے۔ دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے'' اور پھر وہ اپنے دکھ میرے ساتھ شیئر کرنے لگتے۔ ''ہارٹ اٹیک'' ڈاکٹر سبزواری کے علاج سے درست ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب نے سختی سے کہا کہ وہ اب اپنے آرام کا خیال کریں۔ لیکن ان کی جان تو اپنے رسالہ ''تخلیق'' میں اٹکی ہوئی تھی۔ بستر استراحت سے اٹھتے ہی ''تخلیق'' کی ترتیب میں لگ گئے اور ایک پرچے کا ناغہ بھی نہیں کیا۔ میں خوش تھی کہ ابّو صحت یاب ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر انہیں ''ڈینگی بخار'' نے آ لیا۔ ہمیں پھر ان کی فکر پڑ گئی لیکن ابّو نے کمال ہمت سے مقابلہ کیا اور آخر ڈینگی بخار بھاگ گیا۔ اور وہ پھر ''تخلیق'' میں مصروف ہو گئے۔

انہیں ''پرائڈ آف پرفارمنس'' دینے کا اعلان ہوا تو ہم نے سمجھا بہت خوش ہوں گے۔ میں نے مبارکباد دی تو خوشی سے قبول کی۔ لیکن کہنے لگے ''مجھے پرائیڈ آف پرفارمنس ہر دو ماہ کے بعد ''تخلیق'' کے پڑھنے والے دیتے ہیں۔ اس ایوارڈ کی اس کے سامنے کیا وقعت ہے''...... اور پھر معمول کے مطابق بولے ''کڑیے، اب اسی خوشی میں اچھی سی چائے پلاؤ''...... باجی شائستہ نزہت نے ان کے اعزاز میں ہوٹل میں ایک شاندار تقریب کی تو میں اور سونان دیر سے پہنچے۔ ہمیں دور سے دیکھ کر بولے

''لو ہمارا ''پرائڈ آف پرفارمنس'' جوڑا آ گیا ہے۔''

اور پھر سب دوستوں سے میرا تعارف کرایا اور میری اتنی تعریف کی کہ میں خود اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ سونان گھر آ کر طعنہ دینے لگے کہ تم ابو کی بہت چہیتی ہو۔ اور میں نے بھی کہا ''ہاں...... چہیتی ہوں۔ آپ کیوں جلتے ہیں۔''

لیکن 14 فروری کو کیا ہوا کہ ابّو ہمیں بتائے بغیر ہی لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہم سے کبھی ناراض نہ ہونے والے آج شائد ہم سے ناراض ہو کر دُنیا ہی سے اُٹھ گئے۔ میری بیٹی پوچھتی کہ دادا ابو کہاں چلے گئے۔ بیٹا کہتا دادا ابو اب کیوں گھر نہیں آتے؟

میں ان معصوم بچوں کو کیا بتاؤں؟

میں یہ لفظ لکھ رہی ہوں تو دل ڈوب رہا ہے اور آنکھیں اشک بار ہیں!

پیارے ابّو الوداع...... پیارے ابّو الوداع!

◆◆◆

آخری دیدار

سونان اظہر جاوید

ابّو کو ہم سے جدا ہوئے آج پورے اڑتالیس دن ہو گئے ہیں لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ مجھے آج کے دن تک کسی بھی جگہ انھیں مرحوم لکھنے کی ہمّت نہیں ہوئی۔ بے شمار انتظامی امور، ان کا ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' نہ ہونے کی وجہ سے ادھورے پڑے ہیں مگر مجھ میں یہ سرٹیفکیٹ، جس کے ساتھ ''موت'' جڑی ہوئی ہے بنوانے کی ہمت ہی نہیں۔ ان سے ملنے کے لیے مسلسل قبرستان جانے لگا تو کسی بزرگ نے نصیحت کی کہ ''ان کے مزار پر زیادہ جانا اچھا نہیں'' میں ان کی بات سمجھ نہ سکا یا شاید نظرانداز کر دی۔ دل چاہتا تھا کہ وفات کے دن سے کم از کم چہلم تک روزانہ حاضری دوں۔

یہ سطور بادل نخواستہ لکھ رہا ہوں تو کئی لوگوں کی باتیں میرے کانوں میں پڑتی رہی ہیں۔ میں نے سب کچھ سنا، سب کو حیرت سے دیکھا، کسی کی تردید نہیں کی اور اب خدا کی قسم، جو کہوں گا سچ کہوں گا کیونکہ میری رگوں میں بھی اس شخص کا خون دوڑ رہا ہے جسے دنیا سچّا، اور کھرا ''جی اظہر'' کہتی ہے۔

میں نے ''ہے'' کا لفظ دانستہ استعمال کیا ہے۔ جس شخص کو دنیا سے جانے کے بعد اس قدر محبت کرنے والے دوست ملے ہوں وہ شخص کیسے مر سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اور ہر پل، ہر سانس لوگوں کے دلوں میں راج کر رہا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ابّو کو اپنی 74 سالہ زندگی میں جن دوستوں پر ناز تھا آج ان دوستوں میں سے اکثر نے ان کی سچی محبت کی گواہی دی۔

ابّو سے میرا رشتہ باپ سے زیادہ دوست کا تھا۔ مُوڈ میں ہوتے تو میرا بڑے سے بڑا مذاق برداشت کر لیتے اور اگر موڈ......؟ اور پھر روٹھتے تو ایسے جیسے محبوب روٹھ جاتا ہے۔ یہ بھی ان کا لاڈ تھا، جو میری تربیت میں معاون تھا۔

ایک زمانے میں، جب میں جوانی کی دہلیز عبور کر رہا تھا تو مجھے خوبصورت چیزیں اچھی لگنے لگیں، خاص طور پر حسین لڑکیاں جو تتلیاں نظر آتیں، بلبلیں دکھائی دیتیں اور کبھی کبھی میں محسوس کرتا کہ میں ''عشق'' میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ لیکن ہر چھوٹا موٹا عشق یا چاہت ناکامی کا پیغام لے کر آتا، تو دل صدمہ زدہ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو یوں ہوا کہ محبت کی ناکامی دل کا سب سے بڑا صدمہ بن گئی۔ میں اندر ہی اندر گھلنے لگا۔ ابّو نے میری حالت دیکھی تو تاڑ گئے اور اب جو مشورے دیئے وہ ''والد'' کے نہیں ایک دوست کے مشورے تھے۔ آخر میں کہنے لگے ''بیٹا...... یہ ہمارے تمہارے ڈی این اے میں شامل ہے۔'' اس کا مطلب تھا کہ میں

ان کا عکس ہوں۔ شاید یہ بات ان کے ایک دوست نے بھی پہچان لی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میرا نام سنا تو مشورہ دیا ''بیٹا میری خواہش ہے کہ اب آپ اپنا نام ''سونان اظہر جاوید'' لکھو۔ پورا اظہر جاوید آپ میں موجود ہے۔'' ''اللہ ایسے دوستوں کو سدا سلامت رکھے۔

ابّو کے بعد ان کے مخلص دوست میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ شاید میں اپنے اصل موضوع سے ہٹ گیا ہوں لیکن کیا کروں ابّو کی زندگی کو لفظوں میں سمیٹوں تو شاید دل کی دھڑکن بند ہو جائے (ویسے بھی ہارٹ اٹیک ہمارا خاندانی مرض بن گیا ہے) یا سانسوں کا یہ تسلسل ٹوٹ جائے، کاش! اب ایسا ہو ہی جائے......

ابّو میرے بے تکلف دوست تھے۔ ایک دن بیٹھے تو قصہء عشق چھیڑ دیا۔ ''ابّو یار۔ اب تو آپ ان تتلیوں کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' بوڑھے کے لفظ سے انہیں چڑ تھی۔ ''ساری زندگی آپ ان کے لئے پھول بنے رہے اور یہ شہد کی مکھیاں۔''

اچانک بالکل سنجیدہ ہو گئے۔ بولے ''بیٹا مجھے غلط مت سمجھنا۔'' تمہاری جان کی قسم! میں نے ان سب سے ہمیشہ پاک محبت کی ہے۔ آلودگی سے پاک......احساس کی پاکیزگی سے۔''

مجھے شاید اس جواب کی توقع نہ تھی اور میں بول اٹھا ''ابّو آپ تو صفائی دینے لگے۔''

''نہیں بیٹا آپ کو بتا رہا ہوں!''

اسی طرح میرے زمانۂ عاشقی میں ان سے بہتر میرا کون دوست تھا۔ چوٹ کھاتا اور دربار 'تخلیق' چلا جاتا۔ میری چوٹوں کی داستان آرام سے سنتے اور مسکرا دیتے۔ ایک دن میں بہت جذباتی ہو رہا تھا تو کہنے لگے ''بیٹا میں سرگودھا سے چلا تو ایک عشق، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور پھر تاریخِ عاشقی بے حساب ہو گئی۔ میں ان چوٹوں سے مر گیا؟ ان چوٹوں کے بعد بھی زندہ نہیں رہا؟ اپنے آپ کو سنبھالو' خدا کا شکر ہے کہ یہ دور بھی گذر گیا مگر اس مشکل وقت میں تمام کریڈٹ اپنی بیوی سعدیہ سونان کو دیتا ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ''کمپلیکس پرسن'' کو ہر طرح برداشت کیا۔ خود میری اپنے بارے میں اور گھر کے ماحول کے بارے میں یہ رائے تھی کہ شاید میرے ساتھ کوئی لڑکی ''ایڈجسٹ'' نہ کر سکے مگر سعدیہ غیر معمولی لڑکی نکلی۔ بے شمار طوفانوں کا اس نے تنہا مقابلہ کیا۔ اس نے ہر رشتہ وفاداری سے نبھایا۔ وہ اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی بہو اور اچھی ماں ثابت ہوئی۔ میری بے ترتیب زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔

خاص کر اچھی بہو اس لئے کہ ابّو نے آخری دفعہ بھی دل کی بات سعدیہ سے کی۔ ''بیٹا جانو! آج کل مالی حالات بہت خراب ہیں۔'' بات مجھ تک پہنچی تو فوراً ابّو کو کہا ''آپ مجھ سے............اُدھار لے لیں۔'' میں نے اُدھار پر خاص زور دیا کیونکہ ویسے وہ کبھی نہ لیتے (اور اس طرح شاید چانس نکل آتا)'' اور جب آپ کو 'پرائیڈ آف پرفارمنس' کے پیسے ملیں گے تو واپس کر دیں۔

''فوراً بولے ''بیٹا جانو اس عمر میں آپ سے ادھار لیتا اچھا لگتا ہوں؟''

پیسے کے معاملے میں تو ان کی انا اور خودداری ہمیشہ ہمارے پاؤں کی زنجیر بن گئی اور کسی سے پیسہ لینا تو وہ اپنی موت سمجھتے تھے! آج اتوار کا دن ہے۔غم تنہائی ہے اور اداسی۔ بچہ پارٹی کہیں باہر گئی ہے اور میں تنہا ابّو کی یادوں کے سنگ وقت گزار رہا ہوں۔

ابّو! آپ نے بھی تو بچپن میں میری ہر خواہش پوری کی تھی۔ مجھے یاد ہے آپ اکثر میری پسندیدہ کھیر اور بہت سے کھلونے انارکلی سے آتے ہوئے آدھی رات کو بھی ڈھونڈ کر لاتے۔ان دنوں میں تو آپ کے پاس نوکری بھی نہ تھی اور شاید پیسے بھی نہ تھے۔میں ان تمام چیزوں کو لاپروائی سے گم کر دیتا اور آپ پھر ان سب چیزوں کو خرید کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے جب میں سات آٹھ سال کا تھا تو آپ بے شمار نئے کپڑے مجھے لا کر دیتے، میری ضد کی وجہ سے مہنگے ''اسٹیمپ'' مختلف ممالک سے منگواتے۔تاکہ میں اپنی ''اسٹیمپ البم'' پوری کر سکوں۔آپ مجھے بے شمار بچوں کے رسالے خرید کر دیتے تھے کہ کہانیاں پڑھتا رہوں۔

آپ کو آخر مجھ سے اتنا پیار کیوں تھا کہ آپ نے ساری زندگی میری کسی بھی غلطی یا ضد پر مجھے ایک تھپڑ تک نہ مارا۔ میں نے تو اپنے نو سالہ بیٹے خذیفہ کو اس کی ناجائز خواہشوں اور غلطیوں پر کتنی دفعہ مارا حالانکہ میں ان سب خواہشوں کو پورا کرنے کی استعداد بھی رکھتا ہوں۔آپ یہ دیکھتے تو مجھے ہی نصیحتیں کرنے لگتے اور خذیفہ کو گود میں اُٹھا لیتے اور میری بیٹی آبگینہ کے معاملے میں تو آپ بہت حساس تھے۔اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے اور اکثر اس کے معاملے میں مجھے ڈانٹتے۔ مجھے ابّو آج تک آپ کے اس تھپڑ کا انتظار تھا اور اب تو یہ آرزو بھی ناکام ہو گئی ہے۔

ہماری زندگی میں ایک موڑ آ گیا تھا۔ ظالم وقت نے ہم کو جدا کر دیا تھا۔ میں ابّو کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ بچہ جو کبھی بھی رات کو ان کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھے بغیر نہ سونے کا عادی تھا، لمبی جدائی کے بعد ان کو پہلا فون کر رہا تھا۔

ڈر تھا کہ غصہ میں ہوں گے، ڈانٹیں گے مگر وہ میٹھی آواز!

''جی اظہر''

''ابو میں سونان!''

''جی بیٹا کیسے ہو۔''

جذبات سے بھرپور لہجہ۔''ابو آپ سے ملنا ہے۔''

''بیٹا دفتر تخلیق آ جاؤ۔''

''نہیں ابّو باہر کسی اور جگہ'' اور پھر مال روڈ پر واقع Y.M.C.A. ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوئی۔ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات اور میرے دل میں......

ان کو تو آج بھی یاد تھا کہ سونان بچپن میں فرائیڈ آلو کے چپس بڑے شوق سے کھاتا تھا اور آج بھی چائے اور آلو کے فرائیڈ چپس میرے منتظر تھے مگر یہ کیا آج تو ساتھ ٹماٹو کیچپ بھی تھی۔ یہ تو ابو ہمیشہ چھوٹے ہوتے میرے پاس سے اٹھا لیتے کہ اس

کے کھانے سے گلہ خراب ہو جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں بُرا مانتا۔ تو کیا آج انہوں نے مان لیا کہ اب سونان بڑا ہو گیا ہے۔

زمانے کی تلخیوں، مالی حالات اور بے گھری نے اس توانا شخص کو بھی کمزور کر دیا۔ ابّو پلٹ آؤ۔ محبوب کی زیادہ دیر جدائی میرے دل کی دھڑکن کی بے ترتیبی کا باعث بن سکتی ہے۔"

"بیٹا جو کچھ مرضی مانگ لو ایسا ممکن نہیں۔"

وہ شخص آج بھی میری ماں کے حق میں گواہی دے رہا تھا۔ میرا دل بیٹھ سا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور میں اجازت لے کر اٹھنے لگا تو پانچ سو کا ایک نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "جیتے رہو، آباد رہو اور اپنی دنیا میں واپس پلٹ جاؤ۔"

پھر خون نے جوش مارا اور لمحوں کے فاصلے برسوں میں پھیل گئے۔

اس دوران میری شادی ہو گئی اور میں نئی دنیا میں چلا گیا!

مگر اب بھی جب دنیاوی چوٹ کھاتا "دربارِ تخلیق" چلا آتا۔ ان میں بھی بلا کی حس تھی۔ آنے والے کے قدموں کی چاپ سے پہچان جاتے۔ طلب اور امید کا اندازہ لگا لیتے۔ فوراً مجھے کہتے "بیٹا کیا مسئلہ ہے، کچھ پریشان ہو؟" میں لاکھ کوشش کرتا کہ زخمی دل شخص کو اپنے درد میں شامل نہ کروں مگر اتنے پیار اور خلوص سے پوچھتے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ بتانا پڑتا، سُن کر وہ بھی خوش ہوتے کہ اس دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے مگر ابو آپ کا دل بھی تو دل ہے وہ بھی زخمی دل۔ آپ کس کس کا درد اپنے سینے میں دبا کر رکھیں گے۔ میں ان کا حوصلہ پا کر ہمیشہ "دربارِ تخلیق" سے ٹیپو سلطان بن کر نکلتا اور ہندوستان کو فتح کرتا چلا جاتا۔ یہ حوصلہ شاید ساری دنیا کی دولت دے کر بھی اب میں نہ پا سکوں گا۔

دلِ ناداں اب کے ٹوٹا تو کون حوصلہ دے گا۔ نہیں اب تو میرے نام کے ساتھ اظہر جاوید کا نام ہے۔ اظہر جاوید نے تو ہار مانی ہی نہیں۔ وہ تو ہم ہی خرگوش بنے تیز دوڑتے رہے اور وہ کچھوے کی چال چل کر بھی بازی جیت گئے۔ اب تو دنیا مانے کہ اظہر جاوید جیت گیا!

آخر اظہر جاوید اپنے گھر آ گیا اور پھر میری والدہ نے بھی تو نہ چاہتے ہوئے آخری دیدار کی خواہش کسی اور سے کی مگر دنیا سے چھپ چھپ کر۔ آخر دل تو بچہ ہے۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اظہر جاوید کو اس کے بیٹے سونان نے آخری غسل دیا۔ سفید کفن پہنایا۔ پھولوں سے لاد دیا اور پھر میری ماں کے گھر سے ہی ان کا جنازہ اٹھا اور ان کے دوست انہیں آخری منزل کی طرف لے گئے۔

پھر آواز آئی "کلمۂ شہادت"! یہ کسی عاشق کا جنازہ تھا جو میری ماں آبدیدہ ماں کے گھر سے دھوم سے اُٹھ رہا تھا۔"

میں زندہ رہوں یا نہ رہوں مگر اے تاریخ! تم گواہ رہنا کہ میرے قلم نے جو لکھا تھا کہ "جو کہوں گا سچ کہوں گا" وہ سچ میں نے کہہ دیا؟ اور اظہر جیت گیا ہے! اظہر جیت گیا ہے!

◆◆◆

اظہر جاوید۔ چند تاثّرات

بانو قدسیہ

ممتاز مفتی اور اظہر جاوید ایسے درویش تھے کہ جن کے خط کھولنے سے پہلے اور پڑھے بغیر میں بتا سکتی ہوں کہ کس کا خط ہے؟ کیونکہ ان درویشوں کی خوش خطی بھی ان کی پہچان بن گئی تھی۔ جب مسعود کو کتابوں کے ساتھ اظہر جاوید کے بیٹے کا لکھا ہوا خط موصول ہوا تو مجھے اس خط کو دیکھ کر یوں لگا جیسے اظہر جاوید جانے سے پہلے خود یہ خط لکھ کر بیٹے کو دے گیا ہو، جاتے ہوئے اسے یہ بھی کہہ گیا ہو کہ میرے جانے کے بعد یہ خط لے کر آپا جی کے پاس چلے جانا اور ان سے میرے لئے ضرور لکھوانا۔ شاید اس نے بیٹے سے یہ بھی کہا ہو کہ میں نے تو ساری زندگی عاجزی وانکساری کے باعث آپا جی سے نہ تو کبھی اپنی کسی کتاب کے لئے کوئی فلیپ لکھوایا اور نہ کسی دیباچے کے لئے ان کو زحمت دی لیکن تم ایسا نہ کرنا، آپا کے لکھے دو حرف بھی میرے لیے کافی ہوں گے۔

اظہر جاوید ساری زندگی مجھ سے اور خان صاحب سے کچھ اس ادا سے ملتا رہا جیسے پرستار ملتے ہیں۔ داستان سرائے آنے سے پہلے فون کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ شام کے وقت کبھی نہیں آتا تھا۔ وہ اکثر ''تخلیق'' کے دفتر جانے سے پہلے ہماری طرف آیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی آتا تو اکثر اس کے ہاتھوں میں پھول ہوتے تھے، جیسے کوئی عقیدت منداپنے کام پر جانے سے پہلے کسی درگاہ پر حاضری دینا ضروری سمجھتا ہے۔ ملاقاتی کے ہاتھوں میں پھول اور اس کے چہرے پر عقیدت دیکھ کر آپ کو ایک بار تو اپنا آپ ضرور ایسا لگے گا جیسے آپ کسی درگاہ کے مجاور ہوں۔ اظہر جاوید کچھ ایسا ہی پرستار تھا جس نے ہم دونوں کو مجاور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حالانکہ میں نے شوہر پرست عورتوں کے افسانے لکھ لکھ کر اور خان صاحب ''کھیل تماشا'' جیسا ناول تخلیق کر کے یہ ثابت کرنے کی بڑی کوشش کرتے رہے کہ ہم دونوں کسی درگاہ کے مجاور بننے میں ہرگز کوئی دلچسپی نہیں رکھتے لیکن اظہر جاوید اور ایسے ہی اور بہت سے عقیدت مند ہمیں گھیر کر اس طرف کھینچ لاتے تھے۔

میرے سامنے اس وقت اظہر جاوید کی پانچ کتابیں پڑی ہیں جنہیں میں اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے دوبارہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے یہ کتب اظہر جاوید کے ہونہار بیٹے سے مستعار لیں ہیں۔ اس کا بیٹا ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے میرے علاوہ پتہ نہیں اور کتنے لوگوں سے رابطہ کیا ہوگا؟ اور میں نہیں جانتی ان میں سے

کتنے لوگوں نے اظہر جاوید پر کچھ لکھنے کا صرف وعدہ ہی کیا ہوگا اور کتنوں نے اپنے وعدے کو نبھایا ہوگا۔ اظہر جاوید کیونکہ اپنی طرز کا ایک درویش تھا اور درویشوں کے پاس زندگی بھر صرف محبتیں بانٹنے کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں، اس لیے آج کی کمرشل زدہ زندگی میں درویشوں کی محبت کو بھلا کون یاد رکھتا ہے۔

اظہر جاوید کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو اس کا عجز وانکسار تھا۔ شاید اسی عاجزی کی بنا پر اس نے اپنی کتابیں بہت دیر سے شائع کیں۔ اس نے اپنی کہانیوں کی کتاب کا جو نام رکھا ہے، وہ بڑا حسب حال ہے ''بڑی دیر ہوگئی''۔ وہ تو شاید اور بھی دیر کر دیتا لیکن اللہ بھلا کرے سلیمہ ہاشمی کا اور ان دوستوں کا جنہوں نے اس کو اس عجز وانکسار سے اس حد تک تو نکالا کہ آج اس کا یہ ادبی اثاثہ کتابی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

میں اظہر جاوید کے بیٹے سے کبھی ملی تو نہیں لیکن اس کے بغیر میں دو باتیں جان گئی ہوں۔ ایک تو یہ کہ ادیب حضرات کو ایسے وارث کم ہی ملتے ہیں جو ان کے ادبی ورثے کی دیکھ بھال کا فریضہ ادا کرنے کے اہل ہوں۔ اور دوسرے اس کی خوش خطی اظہر جاوید سے اس قدر ملتی جلتی ہے جیسے کوئی بیٹا اپنی شکل وصورت میں ہو بہو اپنے باپ کا فوٹو کاپی ہو۔

قارئین! تخلیق 43 بہاریں دیکھ چکا ہے اور اب اس کی عمر کے 44 ویں برس کا آغاز ہے۔ لیکن اظہر جاوید کی صحافتی زندگی میں ''امروز'' بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں اسے شفقت تنویر مرزا جیسا راہنما ملا، جس کے ساتھ احترام کا ایسا رشتہ استوار ہوا جو ''امروز'' کے بعد بھی اسی طرح قائم رہا۔ تحقیق کرنے والے جب اظہر جاوید کے کام کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں گے تو ضرور اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تخلیقی سفر میں ''امروز'' اس کی ابتدائی محبت تھا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ پہلی تخلیق، پہلی محبت اور پہلا بچہ بہت پیارا سمیٹتا ہے۔ اسی لیے ''امروز'' کا جب بھی ذکر آیا تو اظہر جاوید ہمیشہ اس کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہوئے کہا کرتا تھا ''جب امروز کا قتل ہوا''۔ یعنی ''امروز'' کی بندش اس کیلئے کسی سفاک قتل سے کم نہ تھی۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے کہ ہر حادثہ کسی بڑے سفر کا آغاز ہوا کرتا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ ''تخلیق'' پر مرکوز کر دی تھی۔ اس نے تخلیق کو 43 برسوں تک اتنی محنت اور لگن سے شائع کیا جیسے اشفاق صاحب نے 49 برس تک تلقین شاہ لکھا اور نشر کیا۔ برس ہا برس تک اپنے کام کے معیار کو برقرار رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جو محنت پر یقین رکھتے ہیں۔

اظہر جاوید کا شمار بھی انہی جیالوں میں ہوتا ہے جو اپنی خدمات پیش کرنے میں سب سے اگلی صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن جب انعام لینے کا وقت آتا ہے تو وہ سب سے پیچھے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اس نے بے نظیر بھٹو پر کتاب بھی لکھی اور اس کے لئے نظمیں بھی۔ اظہر کی نظموں کے کئی مصرعے جیالوں کے من پسند نعرے بن گئے لیکن اس کے باوجود اس نے حکومت سے نہ کسی عہدے کی فرمائش کی اور نہ ہی کبھی کسی کرسی کے حصول کی دوڑ میں شامل رہا۔

''تخلیق'' نے اظہر کو پہچان بھی دی، نام بھی اور عزت اور شہرت بھی۔ لیکن ''تخلیق'' کی آبیاری کے لیے اسے کتنی قیمت چکانی پڑی یہ کوئی نہیں جانتا۔ ماہنامہ ''تخلیق''، جس میں اشتہارات برائے نام ہی ہوا کرتے تھے، پرچے کی اشاعت کے

مختلف مراحل کو طے کرنے کے دوران جب وہ بسوں، ویگنوں اور رکشوں میں دھکے کھاتے ہوئے اور پیدل چلتے مختلف کام سر انجام دیا کرتا تھا تو ہم اس کی دشواریوں کا احساس نہیں کر سکتے ہم تو صرف باتیں کر سکتے ہیں بالکل اس طرح جیسے اپنے سامنے رکھی چائے کی پیالی میں چینی ڈال کر چمچ ہلایا کرتے ہیں۔

''تخلیق'' کو ایک یہ خصوصی امتیاز بھی حاصل رہا کہ اس میں لکھنے والیوں کو جس طرح پذیرائی ملی اس طرح تو بڑی سے بڑی این جی او اور حقوق نسواں کا کوئی ادارہ بھی خواتین کو وہ عزت واحترام نہیں دے سکا جو ''تخلیق'' کی صورت میں ان کے حصے میں آیا۔

اظہر جاوید کی کہانیوں کا مجموعہ ''بڑی دیر ہوگئی'' پنجابی کہانی کے کھتیر میں بہت اہم اضافہ ہے کیونکہ اس کی زیادہ تر کہانیاں صیغہ واحد متکلم میں لکھی گئی ہیں۔ یہ بہت مشکل تکنیک ہے بڑے بڑے لکھاری بھی بہت سوچ بچار کے بعد صیغہ واحد متکلم میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ اظہر جاوید نے اپنی کوئی سوانح عمری تو نہیں لکھی لیکن اس کی کہانیوں کی کتاب پڑھتے ہوئے کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہم کوئی سوانح عمری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

اظہر کی پہلی پہچان تو اس کی شاعری ہے کہانیوں کی طرف وہ بعد میں آیا۔ اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے جو خوبی میں نے جانی وہ یہ کہ اس کے موضوعات ہجر وفراق تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے معاشرتی اور سیاسی صورتحال پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ یہ بات اس کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے جبکہ شاعر اور ادیب حضرات عموماً اپنی ہی ذات کے محور میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن اظہر جاوید اپنے ارد گرد کے سماجی اور سیاسی حادثوں سے بے خبر اور لاتعلق نہیں تھا۔

اظہر جاوید نے ساحر لدھیانوی پر بھی ایک کتاب لکھی ہے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے پتہ نہیں کیوں اے حمید بہت یاد آئے۔ دراصل انہوں نے اس طرح کی ایک کتاب ہمارے لیے بھی لکھی تھی جس کا نام تھا ''داستان گو'' چاہنے والوں کی بھی بہت سی قسمیں ہوا کرتی ہیں کچھ لوگ تعریفی خطوط لکھ کر اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں کچھ لوگ اپنی یادوں کو مضامین میں سمیٹ لینے کا فن جانتے ہیں لیکن ان میں سے چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی محبت کا دامن اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس کے اظہار کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح اظہر جاوید نے جس طرح ساحر لدھیانوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے اسے ایک کتاب کی صورت میں ہی سمیٹا جا سکتا تھا۔

میں نے شروع میں اظہر جاوید کو ایک درویش کے طور پر یاد کیا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ہماری ساری زندگی درویشوں کے ساتھ وابستگی میں گزری ہے اس لیے اب ہمیں ہر بندہ درویش ہی نظر آتا ہے۔ بلکہ جب آپ حضرت رابعہ بصریؒ پر لکھی ہوئی اظہر جاوید کی کتاب پڑھیں گے تو آپ بھی اس میں چھپے ہوئے ایک سچے اور کھرے درویش کو ضرور پہچان لیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اصل درویش تو وہی ہوتا ہے جسے درویش کہلوانے کا شوق نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ کتاب عقیدت مندی کا اظہار تو ہے ہی لیکن اس میں آپ کو اس کا تحقیقی کام بھی پڑھنے کو ملے گا۔ ایک مصری مصنفہ کی

رابعہ بصریؒ پر کتاب کا اظہر جاوید نے بڑا مدلّل جواب دیا ہے۔ جب کبھی ہمارے دینی و مذہبی حلقوں کی نظر سے اظہر جاوید کی یہ کتاب گزرے گی تو اس کے تحقیقی کام کو ضرور پذیرائی ملے گی۔

آخر میں آپ کی خدمت میں حضرت رابعہ بصری کے چند اقوال پیش کرتی ہوں جو اظہر جاوید کی کتاب کے آخر میں درج ہیں:۔

O ''آپ یہ دعا کیا کرتی تھیں یا اللہ میرا جو حصہ دنیا میں ہو اسے اپنے دشمنوں کو دے دیجئے اور جو میرا حصہ آخرت میں ہو وہ اپنے دوستوں کو دے دیجئے اور میرے واسطے تو آپ کافی ہیں۔ سبحان اللہ۔

O اللہ جل شانہ، جب کسی کو توبہ کی توفیق دیتے ہیں تو انسان توبہ کرتا ہے اور پھر قبول بھی فرماتے ہیں۔

O مجھے ثواب کی امید اس وقت ہوتی ہے جب اپنے نیک اعمال و عبادات کو کم خیال کرتی ہوں۔ کیونکہ اس وقت میرا اعتماد محض اللہ کے فضل پر ہوتا ہے۔

O خود بینی کی توبہ ایک دوسری توبہ کی محتاج ہے۔

O میں گھر میں اس ڈر سے چھری نہیں رکھتی کہ کہیں یہ اللہ سے میرا تعلق ہی نہ کاٹ دے۔

O پانی میں چلنا مچھلی کا کام ہے اور ہوا میں اڑنا مکھی کا۔ کرامت ان دونوں سے باہر ہے۔

O میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتی ہوں کہ حضرت رابعہ بصری پر لکھی ہوئی اظہر جاوید کی یہ کتاب اس کیلئے آخرت کا بہترین وسیلہ ثابت ہوگی۔

◆◆◆

ڈاکٹر وزیر آغا

''اظہر جاوید صاحب! ''تخلیق'' آتا ہے تو اپنے ساتھ تازہ ہوا کے کئی جھونکے لاتا ہے۔ ''انجمن خیال'' کے خطوط اس کی بے پناہ مقبولیت کو ثابت کرتے ہیں۔ میں اسی کی ایک ایک سطر...... ایک ایک لفظ غور سے پڑھتا ہوں۔ بہت سے مطالب و معانی بین السطور چھپے ہوتے ہیں۔ اور یہ زیادہ لطف دیتے ہیں۔ آپ سے ایک شکایت ہے کہ ''اوراق'' کے لیے کچھ نہیں بھیجا۔ پرچہ رکا ہوا ہے۔ کرم کیجئے۔

اظہر جاوید کا تخلیقی عہد!

بشریٰ رحمٰن

جب سونان نے مجھے فون کر کے کہا۔ہم ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' نکال رہے ہیں۔آپ اپنے تاثرات بھیجیں تو مجھے عجیب سا دھچکا لگا...... کیوں لگا......؟ جبکہ میں ان کے بارے میں کئی خبریں پڑھ چکی تھی اور ایک تعزیتی ریفرنس میں شرکت بھی کر چکی تھی۔دنیا میں کچھ کام کتنی جلدی ہونے لگتے ہیں مثلاً فوتیدگی کے بعد تجہیز و تکفین کا کام اور باقی رسومات......

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے!!

اظہر جاوید زندگی سے بھرپور ایک متحرک انسان تھے۔بیمار ہو کر ٹھیک ہو جاتے تھے۔ٹھیک ہو کر پھر رسالہ نکالنے لگتے تھے۔چالیس سال تک انہوں نے اپنا ایک الگ سا دربار لگائے رکھا جس میں سب کی درجہ بدرجہ پذیرائیاں، شناسائیاں، دل نوازیاں اور کج ادائیاں تھیں۔دادوستد کے مقامات تھے۔کہنے کو بہت کچھ تھا اگر کہنے پہ آتے......مگر وہ یوں کھڑے کھڑے چل دیئے جیسے کوئی صدا آئی اور وہ لپکے...... پوچھا بھی نہیں......کون......اس وقت کیوں ......؟ جانے کا سہولت آسا انداز تو یہی ہے...... بہ نسبت اس کے کہ بستر گریز کرنے لگے اور سلوٹیں دہائیاں دینے لگیں......اور رشتے ناطوں کی اصلیت بھی کھلنے لگے...... دوسرا موڑ اس اچانک سے زیادہ اندوہناک ہوتا ہے گویا اظہر جاوید بھاگتے بھاگتے...... جاگتے جاگتے...... بیزار ہو گئے تھے۔تلملا کر میٹھی نیند سو گئے......

بظاہر انہیں تلملاتے اور بل کھاتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔یہ سب کس بل ان کے اداریے میں نظر آجاتے تھے۔ بہت ست رنگی اداریے ہوتے تھے ان کے......انہیں Pieces of Literature (ادب پارے) کہیے......کبھی نثری نظم...... کبھی عصری ظلم......کبھی اخلاقی قدروں کا نوحہ،کبھی سیاسی بیوپاریوں کے منہ پر طمانچہ......کبھی دوستوں کی ریاکاری کا چٹھہ کبھی ادبی ٹھیکیداروں کا ٹھٹھہ......کبھی آنسو......کبھی نشتر!

میں ہمیشہ رسالہ آتے ہی سب سے پہلے ان کا اداریہ پڑھا کرتی تھی۔اداریہ پورے رسالے کا نبّاض ہوتا تھا۔80ء کی دہائی میں جب سائرہ ہاشمی کے ساتھ مل کر ہم نے 'بزمِ ہم نفساں' کے ادبی اجلاسوں کا سلسلہ شروع کیا تھا تو وہ ان میں باقاعدگی

سے شرکت کرتے تھے۔ جب اجلاس میرے گھر ہوتا تھا وہ ضرور آتے تھے۔ تب ان سے مکالمہ بھی ہوتا تھا۔ ان کی بات چیت میں ہمیشہ ایک احترام کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ خواتین کو احترام سے بلاتے تھے۔ انہیں ادبی محفلوں میں اپنی شاعری یا نثری چیزیں سنانے کا جنون نہیں تھا۔ نہ وہ مدیروں والا دبدبہ اپنے اوپر طاری رکھتے تھے۔ ان کا انداز فقیرانہ اور اعتراف خسروانہ ہوتا تھا۔ انہوں نے اس عہد کے کئی نو آموز قلم کاروں کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ ادب کے رستے پر لگایا۔ ان کی تحریروں کی نوک پلک سنوار کے اپنے مجلّے میں بٹھایا۔ اپنے سامنے ان کا عروج دیکھا۔ بعد ازاں کبھی احسان نہ جتایا۔ نہ ان کی کج روی کا گلہ کیا۔

جب تک وہ جیتے رہے ''تخلیق'' ہی کے لئے جیتے رہے۔ تخلیق ان کا مشن تھا، ambition تھا یا ان کا عشق تھا ؎

عشق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں؟

آج کے دور میں ادبی پرچہ نکالنا اور تواتر کے ساتھ نکالنا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور ادبی پرچے میں چھپ جانا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز کون بخشتا ہے جو خود آدھی روٹی پر گزارہ کرتا ہے۔ اظہر جاوید اس جان جوکھم کام کو کرتے رہے۔ پرچہ بڑی حیرت انگیز پابندی کے ساتھ چھپتا رہا...... ہر چھوٹے بڑے ادیب کو اس میں جگہ ملتی رہی۔

کیا بغیر جنون کے یہ کام ہو سکتا ہے......؟

ذرا سوچیئے...... وہ ایک کل وقتی مدیر تھے۔ اداریے سے لے کر پروف ریڈنگ تک...... جز بندی سے لے کر پوسٹ کرنے تک......سارا کام خود کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں کرواتے تھے۔ لفافے کے اوپر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایڈریس اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے طبعی اخلاص کا ذکر بڑے درد اور بڑی محبت سے کیا گیا۔ وہ خود بھی درد والے اور محبت والے انسان تھے۔

کبھی ساری ادیب برادری مل کر بیٹھے اور سوچے کہ وہ ایک دوسرے کو کیا دیتے ہیں، جو پرچے ان کی شہرت اور عزت کا باعث بنتے ہیں۔ کیا وہ سب مل کر اس کے زندہ رہنے کے لئے آکسیجن مہیا کرتے ہیں؟ سب مل کر بہت سے بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ بہت سی مسافتیں طے کرا سکتے ہیں؟ وہ سارے کام ایک شخص کی زندگی میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کا مقصد اس کے جانے کے بعد کیا جاتا ہے۔ وہ سارے قرض، جو اظہر جاوید اپنے دوستوں پر چھوڑ گئے......قرضِ حسنہ ہیں۔ جو اب دوستوں کو فرضِ حسنہ کی طرح ادا کرنا ہوں گے۔

ان کی خودی اور خودداری ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئی ہے......

کوئی بھی کام ہو اس کی کامیابی کا راز مستقل مزاجی میں ہے۔ اللہ کو بھی عبادت اور ریاضت میں استقلال پسند ہے......

یہ استقامت اور استقلال اظہر جاوید میں دیکھا۔ یہ ان کی قابلِ رشک قوتِ ارادی کا مظہر بھی ہے۔ مرنے سے چند دن پہلے بھی دوستوں کو رسالہ پوسٹ کرنا نہیں بھولے ؎

چہرہ تراشی کھیل نہیں ہے، ہاتھ لہو ہو جاتے ہیں!

دنیا میں کبھی کسی جانے والے کی کمی پوری نہیں ہوئی۔ اس جیسا کوئی اور آیا ہی نہیں۔ خالق نے اس جیسا کوئی بنایا ہی نہیں۔

یہ راز اس نے اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔

ایک زندگی جیتا ہے انسان اور اس میں بھی سو ہزار دکھ سہہ لیتا ہے۔ پھر بھی بہت سی باتیں بندہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ بھلا شرکتِ غمِ دل کا مجاز کون ہُوا ہے۔ کون سنتا ہے وہ باتیں جو لہو کی بوندوں کی طرح دل کے آس پاس اکٹھی ہوتی رہتی ہیں اور ایک دن دل کو خاموش کر دیتی ہیں۔

''محفل محفل'' رونق بننے والا شخص دل کی محفل میں کتنا تنہا ہے۔ کون جان سکتا ہے؟ بہت سی باتیں ہیں جو چلتا پھرتا شخص کہتا رہتا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

خون کے رشتوں کو بھی اس کے جانے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ انہیں سمجھانے کے لئے جانا ناگزیر ہے۔ زندگی کا رُخ وہ نہیں ہوتا جو اکثر نظر آتا رہتا ہے۔ زندگی گھٹتے بڑھتے چاند کی طرح ہے جو روشنی کہیں اور سے مستعار لیتا ہے۔

کچھ اپنی فطری اُلجھنیں ہوتی ہیں۔ کچھ دوسروں کی پیدا کردہ رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی زندگی کا اپنا بھید ہے۔ یہ بھید کھولنے کی مہلت کسے ملی ہے......؟

ایک شخص تن تنہا ایک کمرے میں کیوں رہتا ہے؟......

اور کوئی بھرے گھر میں بھی تنہا کیوں ہو جاتا ہے......

کون سی چوٹ ہے جو پندار کے بت کو چور چور کر دیتی ہے؟

کون سی تلوار ہے جو تعلق کی طنابوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے......؟

کیا بندہ سب کچھ بتا سکتا ہے۔ انسان کی فطرت پردوں میں چھپی رہے تو دلکشی رہتی ہے؟

جس نے پردے اٹھائے، منصور ہوُا، مفرور ہوُا...... مطعون ہوُا......

سچ پورے کا پورا بتایا نہیں جا سکتا......

اور جھوٹ سارے کا سارا چھپایا نہیں جا سکتا......

یہ دل جو حشر کا دیوان ہے۔ اس کی ڈوری بھی تو کہیں اور ہے...... کیا کسی کا اس پہ زور ہے......

بندہ چلا جاتا ہے۔ کہانیاں رہ جاتی ہیں۔ اچھا وہی ہے جس کے جانے پہ احباب کی آنکھیں اشک بار ہوں۔ جس کے لئے اچھا کہا گیا۔ اچھا بولا گیا اور اچھا لکھا گیا......

کامیاب انسان بھی وہ ہے جس نے ایک مشن چنا...... اور اس کی تکمیل میں لگا رہا۔ جاتے ہوئے دوسروں کے لئے راستہ بناتا گیا۔

بے شک اظہر جاوید کا تخلیقی عہد ایک ادب پرور عہد کی طرح یاد رکھا جائے گا۔ وہ ایک مشنری جذبے کے ساتھ ادب کی تخلیق، ترویج اور تبلیغ میں لگے رہے۔

انہوں نے اپنی زندگی کا سفر ایک شانِ استغناء سے کاٹا......

خود کفالت ایسی کہ آخری رات بھی کمرے میں تنہا بسر کی......

مستعد اتنے کہ انجکشن کا بھی انتظار نہیں کیا......

بہادر اتنے کہ پہلی صدا پر لبیک کہہ دیا......

ادھر بھگوان گلی کے اندر......حرف و آگہی کا بھاگوان لکھتے لکھتے سو گیا......

زِیر زَبر کھو گیا، خود پیش ہو گیا۔

سارے ادھ کھلے لفافے......لکھے ہوئے اداریے......تازہ منتظر خطوط......

غیر مطبوعہ مسودے......ڈائریاں......ٹیلی فون......قلم دوات......کرسی......میز......ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر کہتے رہتے ہیں۔

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
اور کیا اب بھی نہ جاتا لوگو؟

◆◆◆

ضیا نیر

''تخلیق''......بوقلموں رنگوں کا گلدستہ جو طبیعت کو بشاشت اور روح کو استہزاز کا باعث بنتا ہے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ''تخلیق'' نوجوان قلمکاروں کا اپنا پرچہ ہے اور اس اپنائیت کا بے ساختہ اظہار ''انجمن خیال'' کی سطر سطر سے مترشح ہوتا ہے۔

''مشک آں است کہ خود بگوید'' نہ کہ عطار بگوید''

ع　جانے کدھر سے آتے ہیں کدھر جاتے ہیں یہ لوگ

عطیہ سیّد

اظہر جاوید کی وفات کی اچانک خبر نے لاہور کے ادبی حلقوں کو دم بخود کر دیا۔ اظہر جاوید کے بغیر لاہور اور لاہور کے ادبی حلقوں کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ وہ لاہور میں کہاں سے وارد ہوئے...... مجھے معلوم نہیں لیکن اس شہر سے ایسا دل لگایا، ایسا ڈیرا جمایا کے لاہور کی پہچان بن گئے اب لاہور ان کے بغیر یقیناً سوگوار ہے۔

انھوں نے جوانی میں چند خواب دیکھے اور ساری عمر ان خوابوں کے سہارے بتا دی۔ ان خوابوں میں سے کوئی کم ہی شرمندۂ تعبیر ہوا مگر وہ خواب میں گم رہے اپنے حال میں مست اپنی تنہائی میں سرمست۔ ان کی شخصیت مجموعہ اضداد تھی۔ ترقی پسند مگر پکے نمازی۔ مجال ہے کہ کسی وقت کی نماز قضا ہونے دیں۔ کسی محفل میں ہوں کسی مجلس میں ہوں، کسی تقریب میں ہوں چاہے سرکاری ہو کہ غیر سرکاری، دوستوں کی پاسداری ہو یا کسی بت کی دلداری ہو مگر اذان سنتے ہی وہ چپکے سے محفل سے چلے جاتے تھے اور نماز ادا کرتے تھے۔ اس سے نہ صرف مجھے بلکہ اور لوگوں کو بھی بے حد حیرت تھی کیونکہ ترقی پسند ہونے کے ناطے ان کا مذہبی فرائض سے کوئی تعلقِ خاطر ہونا حیران کن اور متضاد عمل تھا۔ ☆

وہ مجلسی تھے مگر تنہا، محفل کو گرما دیتے تھے۔ لیکن سب باتوں کے بعد ایک سرد آہ! نہ جانے کیوں ان کے منہ سے نکلتی تھی وہ ترش بھی اور شیریں بھی بیک وقت صابر و شاکر بھی تھے مگر کبھی کبھی صبر کا پیمانہ چھلکنے لگتا تھا۔ بظاہر پُرسکون، دھیمے مزاج کے مگر کبھی کبھی اندر سے لاوا ابلنے لگتا اگرچہ یہ کبھی کبھار ہوتا تھا ورنہ حوصلہ بلند تھا وسیع القلب تھے اور بہت سی باتوں کو پی جاتے تھے۔ شاید ناگوار بھی گزرتی ہوں گی لیکن وہ اپنے خوشگوار موڈ کو قائم رکھتے تھے۔

بت تراش تھے، بہت سے بتوں کو نکھارا سنوارا مگر ان کے ہاتھوں کُشتہ تیغِ ستم ہوئے...... بہت سی بے وفائیوں کو انھوں نے برداشت کیا مگر اپنے مسلکِ عشق سے اپنے آپ کو جدا نہ کر سکے کیونکہ بنیادی طور پر فطری طور پر وہ ایک عاشق تھے۔ انھوں نے نظریات سے بھی عشق کیا، ادب سے بھی کیا اور انسانوں سے بھی کیا، اور کئی مرتبہ دکھ اٹھانے کے باوجود اپنی ڈگر پہ گامزن

☆ ترقی پسندوں پر مذہب سے بےزاری بھی ایک الزامِ محض ہے جس کی روشن مثال مولانا حسرت موہانی ہیں جو عالمِ باعمل تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسند، سیکولر ہونے کی وجہ سے اپنے نظریات کسی پر نہیں ٹھونستے اور نہ ہی اپنے تقوے کی نمائش کرتے ہیں۔ (ادارہ)

رہے۔اس لحاظ سے انھیں ایک وفا شعار شخص کہا جا سکتا ہے۔

انھوں نے اردو اور پنجابی دونوں میں شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے لیکن وہ ان شاعروں میں سے تھے جنھیں عجوبہ روزگار کہا جا سکتا ہے۔شاعروں کی روش عموماً یہ ہوتی ہے کہ کوئی کہے نہ کہے وہ اپنے اشعار سناتے ہیں اور داد کے خواہاں ہوتے ہیں۔اور ہر کھانے کے بعد وہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے کلام کو سنا جائے گا اور سراہا جائے گا۔خصوصاً وہ کھانا اگر انھوں نے خود کھلایا ہو۔

مگر اظہر جاوید وہ عجب شخص تھے۔وہ عجیب و غریب شاعر تھے جو نہ اپنے کھلائے ہوئے کھانے کے بعد اور نہ دوسروں کے کھلائے ہوئے کھانے کے بعد اپنا کلام سنانے کو تیار تھے۔بلکہ بارہا دوستوں کے اصرار کے باوجود وہ اپنے اشعار سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔یہ ان کا قول تھا کہ ''میں شاعر ہوں میراثی نہیں کہ ہر کسی کہ کہنے پر یعنی ہر کسی کی فرمائش پر ہر وقت گانے سناتا پھروں یا غزلیں گا کے لوگوں کا دل بہلاؤں''

وہ شاعری کو سنجیدگی سے لیتے تھے اور اسے ایک اعلیٰ چیز سمجھتے محفلوں میں تفریح کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو ادارت تھی انھوں نے ''تخلیق'' سے بھی عشق کیا اور بے شمار دشواریوں کے باوجود اور اقتصادی مجبوریوں کے باوجود اس کی اشاعت جاری رکھی اور اس کو قارئین تک پہنچانے کا کام اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ ہم میں سے شاید بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے کبھی ڈاک کے پیسے یا رسالے کی قیمت باقاعدگی سے ادا کی ہوگی۔لیکن وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز ہم تک اچھی ادبی تخلیقات کو پہنچاتے رہے یہ ان کی وضع داری تھی اور ادب دوستوں سے رشتہ وفا کی استواری تھی لہٰذا اپنی اَن تھک محنت اور بے پایاں خلوص کے باعث انھوں نے دنیائے ادب میں ''تخلیق'' کا ایک مخصوص مقام بنایا اور ہم امید کرتے ہیں کہ ورثاء، ان کے دوست اور ادب کے شائقین ''تخلیق'' کے قارئین ان کی اس ساری عمر کی کمائی کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔آمین!

◆◆◆

ڈاکٹر یونس بٹ

''اظہر جاوید عاشق مزاج آدمی ہیں۔گفتار میں ترنّم......اور کردار میں ملکہ ترنّم ہے۔اس نے ''تخلیق'' کے زور پر کئی شاعرات پیدا کیں۔جن میں اکثر بڑی ہوگئی ہیں مگر صرف عمر میں۔اردو ادب کے لیے اس نے جب عملی کام کیا ہے کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔یعنی جتنے عشق اس اکیلے بندے نے کیے ہیں کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔ جتنے لمبے وہ عشق کرتا ہے اتنی لمبی تو لوگ دشمنیاں بھی نہیں کرتے۔عورتوں کے کام آنا اعزاز سمجھتا ہے۔اسی لیے کسی نہ کسی خاتون کا اعزازی مدیر ہوتا ہے۔''

آبرومند شاعر اظہر جاوید

کشور ناہید

بہت سے رسالے نکلے بند ہوئے پھر نکلے، آہستہ آہستہ غروب ہوتے گئے۔ گزشتہ بیالیس برس سے ''تخلیق'' نکل رہا تھا۔ اوسطاً درجے کا پرچہ تھا مگر ہر مجبوری، مالی تنگی، حالات کی ناآسودگی کے باوجود اپنا وقار قائم رکھے ہوئے تھا۔

زندگی اور دوستوں نے اظہر جاوید کو بہت زخم دیئے، وہ سب کچھ سہہ کر ہنستا رہا۔ کمرشل بلڈنگ کی فٹ پاتھ پہ چلتا رہا۔ اپنے دفتر کو قہقہوں سے آباد رکھے رکھا۔ اشتہار نہ ملنے کی صورت میں بھی ''تخلیق'' باقاعدگی سے نکالتا رہا۔

صرف یہی نہیں، جو مہمان آیا گیا، اپنی بساط کے مطابق اظہر جاوید نے اس کے لیے استقبالیہ کا اہتمام ضرور کیا۔ صہبا لکھنوی کی طرح سرکار سے گلہ نہ کیا کہ پرچہ نہیں خریدتے، اشتہار نہیں دیتے، بس جو کچھ تھا اسی پر اکتفا کیا۔

زندگی نے اُسے بہت زور کا جھٹکا دیا۔ ازدواجی تعلقات میں زہر شامل ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ نے یہ زہر بھی پی لیا۔ ''تخلیق'' جاری رہا۔

وہ ایک اچھا غزل گو شاعر تھا۔ نظم بھی لکھتا تھا مگر اپنا ڈھول نہیں پیٹتا تھا۔ نئی سے نئی مہوشوں کو لکھنے پہ آمادہ کرتا تھا۔ ان کی تصویریں شائع کرتا تھا مگر کسی کے ساتھ اس کا سکینڈل نہیں بنا۔ وہ ایک شریف فقیر منش شاعر تھا۔ زندگی نے اس کی عزت کو مرتے دم تک سنبھالے رکھا۔ اُسے کسی لمحے بے آبرو نہیں ہونے دیا۔

◆◆◆

جعفر شیرازی

''تخلیق'' کا اس دور میں اس انداز میں زندہ رہنا آپ کی عالی ہمتی کی واضح دلیل ہے......
اس کی باقاعدگی کے ساتھ ساتھ آپ اس کے معیار کو بھی بلند سے بلند تر کیے جارہے ہیں۔
آپ کی ادبی زندگی ''تخلیق'' کے بلند معیار کے ساتھ ہی وابستہ ہے''۔

حسّی لطافت کا شاعر

عذرا اصغر

کسی اپنے بہت قریبی دوست یا عزیز کے لئے کچھ لکھنا یا اظہار خیال کرنا کتنا جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ بات کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس دشوار مرحلے سے کبھی گزرے ہوں۔ ایسے موقعے پر یہ مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے جب وہ شخص، وہ ہستی زندگی کی بازی ہار کے امکانی حدوں سے بہت دور جا چکی ہو۔

سانس کی ڈوری چلتے چلتے یکدم ٹوٹ جاتی ہے اور پیچھے رہ جانے والے صرف یادوں کے کھنڈر پر بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ بے بس۔ ہراساں......

اظہر جاوید کم و بیش چودہ پندرہ برس سے دل کے مریض بن چکے تھے۔ مگر وہ اتنے چاق و چوبند اور زندہ دل تھے کہ ان کے بارے میں بھول کر بھی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اچانک یوں اٹھ کر عدم کو چل دیں گے۔ اظہر جاوید کی ذات ایک انجمن تھی۔ وہ شعر و ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ جیتی جاگتی لُغت اور ڈائریکٹری تھے۔ کسی ادیب یا شاعر کا نام پتہ پوچھنا ہو یا کسی لفظ کا مطلب، کوئی ادھورا شعر یا کسی جاننے والے کا فون نمبر معلوم کرنا ہو فون پر رابطہ کیا اور مقصد حاصل کر لیا۔ کبھی مصروف ہوتے تو بے تکلفی سے کہتے۔

''بی بی! ایک تو آپ نے بڑا تنگ کیا ہے۔ میں آپ کا پی اے لگا ہوا ہوں؟''

لیکن پھر فوراً بتا دیتے۔ سوچتی ہوں اب میں کس کو فون کر کے پوچھوں گی؟ بنیادی طور پر انسان ہر رشتے ناتے میں خودغرض واقع ہوا ہے۔ زندگی کے سفر میں لوگ آتے رہتے ہیں۔ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ کچھ احباب ذہن کے پردے پر دھندلا جاتے ہیں اور کچھ درِ دل پر جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ اخلاص کار، نظریہ ساز، بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ اگرچہ وقت نے جیتے جی اظہر جاوید کو ڈاکٹر وزیر آغا یا احمد ندیم قاسمی جیسا مرتبہ نہیں دیا لیکن ان کا کام کچھ اتنا کم بھی نہیں ہے کہ کسی شمار میں نہ آ سکے۔ وہ اپنے بیشتر ہم عصروں میں اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

اظہر جاوید پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ محبت کرنے والے، ہمدرد، ملنسار لیکن تنک مزاج، صاف گو اور کھری

بات کہنے والے۔ اسی کھڑتل بات پر روزنامہ ''امروز'' سے علیحدہ کئے گئے۔ مقدمے کا عذاب جھیلا، بے روزگاری کاٹی، مگر اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے۔ صحافت میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ پنجابی میں افسانے تصنیف کئے اور مجموعہ چھپوایا۔ عمدہ کالم نگاری کی۔ ساحر لدھیانوی کے فن و شخصیت پر ایک کتاب مرتب کی۔ بلغارین افسانوں کے ترجمے کئے جو برسوں پہلے کتابی شکل میں چھپ کر صاحبانِ ذوق کی تسکین کا باعث بن چکے ہیں۔ رابعہ بصریؒ پر بھی ایک بصیرت افروز کتاب قلمبند کی۔ اس کے علاوہ ''امروز'' کی ادارت کے دوران مختلف ممالک کے افسانوی ادب کو اردو میں منتقل کیا۔ گزشتہ بیالیس برس سے ماہنامہ ''تخلیق'' نکالتے رہے ہیں۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور کسی حد تک ذریعہ معاش بھی۔ اظہر جاوید ایک خوددار اور خود کفیل انسان تھے۔ آخری سانس تک نہ کسی سے خدمت کرائی نہ کسی کا احسان اٹھایا۔

عبدالغفور صاحب کے یہاں اظہر جاوید کی ولادت 4 جنوری 1938ء کو ہوئی۔ ان کی پرورش ان کے نانا جان نے کی۔ ان کی والدہ کونونیٹ کی فارغ التحصیل تھیں۔ شگفتہ مزاج، نرم خو اور شفیق ہستی تھیں۔ نفاستِ طبع اور ظرافت اظہر جاوید نے شاید والدہ سے وراثت میں پائی تھی۔ گھر میں علم و ادب کا چرچا تھا چنانچہ اظہر جاوید کمسنی سے ہی شعر کہنے لگے۔ ذرا ہوش سنبھالا تو سرگودھا آنا جانا ہوا اور شاعرِ شباب الطاف مشہدی سے ناتا جڑ گیا۔ بعد ازاں جوہر نظامی صاحب سے رابطہ بن گیا چنانچہ فن میں نکھار، شخصیت میں وقار بڑھتا گیا۔ اظہر کا بہت سا کام بکھرا ہوا ہے۔ ان پر ایم فل اور ایم اے کے لیول کے متعدد مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ انہیں صدارتی انعام ''پرائڈ آف پرفارمنس'' ملنے کا اعلان ان کی زندگی میں ہو چکا تھا۔ افسوس کہ یہ اعزاز وہ خود حاصل نہیں کر سکے اور 14 فروری 2012ء عین ویلنٹائن ڈے پر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اللہ مغفرت کرے۔

اظہر جاوید بے حد منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ اپنے شعری مجموعے ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' کے دیباچے میں اپنے متعلق یوں اظہار کیا۔

> ''میرے ساتھ عجیب ہوا۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی شعر و ادب کے بلند مرتبت اور بلند قامت لوگوں سے نیازمندی ہوگئی۔ اس سے میں نے بہت کچھ پایا لیکن کچھ کھویا بھی۔ اور وہ تھا اعتماد...... یا شاید یہ احساس میں نے خود سے پیدا کر لیا تھا کہ اتنے عظیم لوگوں کے ایسے باکمال کلام کے سامنے میں اپنا کھردرا اور روکھا پھیکا اثاثہ کیا رکھوں اور کیوں رکھوں؟''

اس امر کا اظہار وہ اپنے اِس شعر میں یوں کرتے ہیں:

ذہین گویوں کا دوست ہوتا حسین لوگوں کے ساتھ رہتا
اگر میں ساحرؔ سی نظم لکھتا جو فیضؔ جیسی غزل میں کہتا

اگر ہم ان کی شاعری پر نظر ڈالیں تو فیضؔ نہ سہی ساحرؔ کے ہم پلہ ہی نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں ساحرؔ

جیسے حالات میّسر نہ آسکے۔ یوں ہمارا وطیرہ ہی ناقدری کا ہے۔ برسوں پہلے میں نے اپنے ماہنامے ''تجدید'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' نکالنا چاہا۔لیکن مجھے افسوس ہوا کہ خواتین نے تو یکسر اظہر پر لکھنے سے معذرت کر لی۔ مردوں نے بھی بہت کم تعاون کیا۔ چنانچہ ''تجدید'' اظہر جاوید نمبر کی بجائے گوشہ کی صورت ترتیب پا سکا۔افسوس اور تعجب یہ ہے کہ یہ سب وہ لوگ تھے جنہوں نے ''تخلیق'' سے نام ومقام پایا اور تواتر سے ''تخلیق'' میں چھپتے رہے۔اب آپ اسے ایک جملہ معترضہ سمجھئے[1]

اظہر نے غزل بھی کہی اور نظمیں بھی لکھیں۔ان کی نظموں میں ساحرؔ کی نظم کا پرتو تو نہیں ہے مگر کچھ مماثلت ضرور ہے۔ ساحر اور اظہر دونوں ہی رومان پسند اور جمال پرست شاعر تھے۔ایک نظم دیکھئے عنوان ہے ''سفر''

زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں/ دربدر گھومتے ، بے خبر گھومتے/ اپنی راہوں کے سنگ سفر چومتے/عمر گزری مری/ وقت کی گرد بالوں میں جمنے لگی/ دھڑکنوں کی جوانی بھی تھمنے لگی/ میرے چہرے کو ویرانیاں کھا گئیں/ میری آنکھوں میں حیرانیاں چھا گئیں/منزلوں کا نشاں پھر بھی پایا نہیں/اور میں لوٹ کر گھر بھی آیا نہیں''

ان کی ایک اور نظم کی چندلائینیں......عنوان ہے ''خود فریبی''

''مجھے تم نے بھلانے کے جتن سب کر لئے ہوں گے/ بہت کوشش سے تم نے دل کو اب سمجھا لیا ہوگا/ میری چاہت کا ہر اک نقش اب دھندلا گیا ہوگا/ بہت ہمّت سے تم نے ذہن کو راغب کیا ہوگا/ نئی سوچوں کے سارے رنگ دل میں بھر لئے ہوں گے/ بھری محفل میں پھر مجھ کو برا تم نے کہا ہوگا/ ''وہ پاگل ہے، تعلق کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے/ یونہی بدنام کرنے کو فسانے ڈھونڈ لیتا ہے/ مرا اس سے تعلق کیا، مرا ہے اس سے کیا ناتا/ نہ کوئی دوستی اس سے نہ کوئی پیار کا رشتہ/تمہاری بات آخر کار سب نے مان لی ہوگی/تمہارے جھوٹ پر سچ کی ردا بھی تان لی ہوگی/مگر اے جانِ ماضی، اے گئے لمحوں کی شہزادی......کبھی یہ تم نے سوچا ہے/کبھی جب کوئی تم کو اپنی بانہوں میں سمیٹے گا/چٹکتی آرزوؤں کے مہکتے پھول نوچے گا/تمہاری جاگتی آنکھوں سے جب سپنے چرائے گا/تمہارے لمس کی خوشبو سے کوئی کسمسائے گا/سویرے اٹھ کے جب کوئی نیا اخبار دیکھو گی/ مری تصویر دیکھو گی، مرے اشعار دیکھو گی/کبھی جب ریڈیو پر کوئی ایسا گیت سن لوگی/ کہ جس میں بے وفائی کی کہانی کا بیاں ہوگا/ کہ جس کے ایک اک مصرعے سے دردِ دل عیاں ہوگا/ تو پھر کس کو پکارو گی؟ /تم اپنی روح کا جو بوجھ ہے کیسے اتارو گی؟/تم اپنے آپ سے انکار کی جرات نہ پاؤ گی/ یقیناً ہار جاؤ گی/'' ......

یہ ایک طویل نظم ہے جس کے اختتامی مصرعے یوں ہیں......

''نہ جانے اس سمے تک کتنے موسم ڈھل چکے ہوں گے/ اس اپنی بے بسی کی کس پہ پھر تہمت دھرو گی تم/ بتاؤ کیا کرو گی تم؟/''

---

[1] مدیرہ ''ادبِ لطیف'' صدیقہ بیگم کی طرف سے کیے گئے تعزیتی ریفرنس میں بھی ان کے متعدد احسان مند شریک نہیں ہوئے۔(ادارہ)

اظہر کی نظمیں پڑھتے ہوئے ساحر ضرور یاد آتے ہیں۔لیکن ساحر کی طرح اظہر کے یہاں بھی صرف رومانس ہی نہیں ہے زندگی سے جڑے ہوئے دوسرے حالات کا تذکرہ بھی ہے۔خوشی، غم، دکھ سکھ، عشق ومحبت اور نفرت زندگی کا لازمی جزو ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ اظہر جاوید بنیادی طور پر رومان پرور شاعر ہیں۔وہ زندگی بھر محبت کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اس کے نام سے غزلیں لکھ لکھ پرچوں میں چھپوائیں گے
شاید وہ ایسے خوش ہو جائے شاید ایسے مان سکے

ان کی شاعری کی اساس اسی مفروضے سے مشتق ہے۔ان کی ایک خوبصورت نظم ''خزاں کے پتو، مرے رفیقو'' بڑی دلگداز اور مترنم ہے۔اس نظم میں محبوب کو جو سندیسہ بھیجا جارہا ہے وہ کسی روائتی پرندے کے توسط سے نہیں بھیجا جارہا بلکہ خزاں کے ان پتوں کے وسیلے سے بھیجا جارہا ہے جن کی قسمت میں ہی بکھرتے رہنا ہے۔شاعر خود ایک خزاں کے پتے کی مانند ہے۔نظم کے چند مصرعے دیکھئے۔''خزاں کے پتو! بکھرتے رہنا/ کبھی جو میرے چمن سے اڑکر/ کسی کے آنگن میں جاکے گرنا/ تو اس سے کہنا/''

اظہر جاوید کی ایک نظم کا عنوان ہے ''کون بتائے'' یہ نظم ماں سے متعلق ہے۔ماں! جو ہر قوم وملت میں بلند مقام ہی نہیں رکھتی، محبت کا استعارا بھی ہے۔نظم کے چند مصرعے دیکھئے۔

''مائیں کیوں مرجاتی ہیں/ شفقت رحمت، برکت والے، پیار کے گھر میں/ سکھ آنگن میں/ چاہت سے مہکے گلشن میں/ پت جھڑ کیوں بھر جاتی ہیں/''

ساحر کی طرح اظہر کو اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور شاید ساری زندگی وہ اسی محبت کی کھوج کرتا رہا۔وہ ایک محروم شخص تھا۔باپ بچپن میں بچھڑ گیا ماں جوانی میں ساتھ چھوڑ گئی، اور وہ اپنی ذات میں تنہا ہو گیا۔ذرہ ذرہ ہو کر بکھر گیا۔چنانچہ تنہائی ہمیشہ کے لئے اس کی رفیق بن گئی۔اور وہ محفل میں بھی اکیلا ہی رہا...... یوں اسے بہت محبتیں ملیں اور لاتعداد محبتیں انہوں نے بانٹیں۔لیکن اندر کی تنہائی نے اسے چین نہ لینے دیا۔

اور اب...... ! جبکہ وہ اس محفل آرائی سے رخ موڑ چکا ہے تو ہم...... اس کے سب احباب، دوست خود کو تنہا تنہا محسوس کر رہے ہیں۔اس کے بغیر ادب کی بھری پری دنیا سونی پڑی رہ گئی ہے۔اس کی یہ جگہ کبھی پُر نہ ہو سکے گی۔بقول خود

دھند لا گئی ہیں شہرِ نگاراں کی رونقیں
کالک سی کون وقت کے چہرے پہ مل گیا

◆◆◆

اب وہ آواز گم ہوگئی ہے!

بشریٰ اعجاز

جس روز شہر میں لوگ، سرخ گلابوں کے تحفے ایک دوسرے کی جانب روانہ کررہے تھے، سرخ گلاب جس روز نایاب تھے، چھوٹی چھوٹی محبتیں گرم جوش معلوم ہورہی تھیں اور بڑی محبتوں کی کمی زیادہ شدّت اختیار کرگئی تھی، اس روز اظہر جاوید ہم سے رخصت ہوگئے، اتنا اچانک کہ جب معلوم ہوا تو زبانیں گنگ ہوگئیں! ہاں آنسو...... کہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر، بڑھ کر مدد کو پہنچتے ہیں، سہارا دیتے ہیں، زیادہ دیر تنہا نہیں رہنے دیتے، یہی وجہ ہے کہ سب روئے اور خوب روئے، کہ الفاظ گریہ کی شدت تک رسائی سے معذور تھے۔ اس کے بعد پُرسے اور تعزیت کا موسم۔ ریفرنس، اور ایک دوسرے سے اظہارِ غم، جس کے بعد ٹھہراؤ کی ایک ایسی کیفیت، جو اس اچھے انسان کی کمی برابر محسوس کراتی ہے، مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں، ایسا کیوں ہوا؟

بھگوان سٹریٹ میں تو اب بھی کوئلوں کے چورے میں دبے بُھٹے نکال کر، ان پر سرخ مرچ اور لیموں نچوڑتا، بُھٹے والا صدائیں دیتا ہے، قلفی والا تنکے پر سرخ کڑھے ہوئے دودھ کی تازہ مہک والی قلفی اب بھی اپنی ریڑھی سے نکال نکال کر بچوں کو کھلاتا ہے، اور وہ فروٹ کے چھابے والا، جس کے چھابے میں موسم کے اچھے اور تازہ پھل ہوتے تھے، اب بھی ''تخلیق'' کے دفتر کے سامنے سے گزرتا ہے، ''پھل لے لو، پھل لے لو'' کی آواز بھی آتی ہے، مگر وہ نیلے روغنی دروازے کے اندر سے پردہ اٹھا کر، جو وضعدار شخص مسکراتا ہوا نکلتا تھا، اب وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گلی آباد ہے، معمول کی آمدورفت جاری ہے، ادھر موڑ کے پاس مین روڈ پر ٹریفک بھی معمول کے مطابق چل رہی ہے، قریبی تھانے میں، اسی طرح چھوٹے مجرموں پر گرفت اور بڑے مجرموں کی چاپلوسی کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر اس کے باوجود سنّاٹا کیوں ہے۔ گلی میں اس قدر ویرانی کیسی؟ روغنی نیلا دروازہ اور اس کے پیچھے چھپا ہوا پردہ کھلتا کیوں نہیں؟ کوئی پھل والے کو آواز دے کر روکتا کیوں نہیں؟ کوئی بھٹے والے کے پاس ٹھہر کر، اس کے کندھے پر تھپکی دے کر نرم بھٹے نکالنے کی فرمائش کیوں نہیں کرتا؟ کوئی کتابوں میں گلے گلے ڈوبا ہوا، اچانک دروازے پر دستک ہونے پر لپک کر باہر کیوں نہیں آتا؟ کیا ہے یہ سب؟ فون کے چونگے سے آنے والی ''جی اظہر'' کی آواز کیا واقعی قبر میں گم ہوگئی؟ آخر کتنا بڑا پیٹ ہے ان قبروں کا، جو بھرتا ہی نہیں؟ وہ ''تخلیق'' کی آئے روز برپا ہونے والی محفلیں، اور ان میں چمکتا مہکتا اک بھید بھرا شخص، وہ جو خواتین کے کانوں میں خواہ مخواہ سرگوشیاں کرتا تھا اور حضرات سے گرم

جوش معانقے، وہ جسے ہم ادب کا خاموش سپاہی کہا کرتے تھے، جس کا دفتر، ہر سطح کے شاعر، ادیب اور تخلیق کاروں کا اڈا ہوا کرتا تھا، جہاں خوبصورت پیالیوں سے آنے والی گرما گرم چائے کی مہک میں، پیش کرنے والے کا خلوص بھی شامل ہوتا تھا، کیا آنکھیں اب وہ منظر نہ دیکھ پائیں گی؟ دکھ شاید اتنا ہی سوالیہ اور عجیب ہوتا ہے، بعض اوقات ''کیوں'' پر ایسا اٹکتا ہے کہ ہلنے کا نام نہیں لیتا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں، دنیا میں رہنے کیلئے صرف بچوں جیسی طبیعت رکھنے والے خوش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ یہاں ناخوش لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے...... وہ جن کے چہروں پر دور سے ناخوشی لکھی دکھاتی دیتی ہے، مگر اظہر جاوید کا چہرہ تو ایسا نہ تھا وہ تو ہمہ وقت ایک بھری پری مسکراہٹ سے آباد رہتا تھا، جس پر دور دور تک ناخوشی کا سایہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا،

لگتا ہے ساری ناخوشیاں وہ اپنے گھر کے کسی گوشے میں ڈھیر کر کے، باہر نکلتے تھے، جہاں ان کی خاموشی، سناٹا اور تنہائی ان کے ہمراہ قیام پذیر تھی۔ اس مکان اور اس کے مکینوں کی بابت ان کے بہت قریبی دوست بھی کچھ نہیں جانتے تھے، یہی وجہ ان کے چہرے کا اطمینان، ایسی ساری ناخوشیوں پر نقاب کی طرح پڑا رہتا تھا، اس نقاب کے پیچھے کیا ہے؟ شاید یہ جاننے کی کسی کو کوئی حاجت نہ تھی نہ فرصت، کہ سب کے درمیان قہقہے لگاتا، شائستہ لہجے میں ہلکے پھلکے فقرے اچھالتا، چھوٹی چھوٹی غیر رسمی باتیں کرتا، وہ شخص بظاہر اتنا بھرا پرا، اتنا پُر مسرت دکھائی دیتا تھا، کہ کسی کو اس کی ناخوشی، تنہائی اور سناٹے کی خبر تک نہ ہو سکی، جو اس کے اندر لبا لب بھرا ہوا تھا، اور جس نے اسے زیادہ مسکرانے، زیادہ مصروف رہنے، اور زیادہ کام کرنے میں لگا رکھا تھا۔

لاہور، ست رنگا شہر ہے، زیادہ بڑا، زیادہ پر شور، زیادہ ہنگامہ خیز اور زیادہ گرم جوش! یہی وجہ جو، یہاں آتا ہے، اس خوف سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کہ کہیں پتھر کا نہ ہو جاتے! یہاں کی روشنیاں آنکھوں کو تو بھاتی ہی ہیں، مگر دل کو بھی اس لیے بھلی لگتی ہیں، کہ وہاں بھی کسی بند پھاٹک، کسی مقفّل دروازے کے کھل جانے کی آہٹیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جو بھی آتا ہے، پہلے پہل حیرت میں مارا جاتا ہے، اور اس کے بعد ایک ایسی وحشت کا اسیر ہو جاتا ہے، جو اسے ٹکنے نہیں دیتی۔ ہر دم بھگائے رکھتی ہے، جگائے رکھتی ہے......! اظہر جاوید، چوکی بھاگٹ ضلع سرگودھا کا پینڈو، جو سائیکل چلا کر، پکے تیس میل کا فاصلہ، طے کر کے شہر جاتا تھا، ادب کی ''چندر اوتی''، ڈاکٹر وزیر آغا سے روزانہ ملنے اور اس ملاقات کے نشے میں ڈوبا، شام ڈھلے، سائیکل کے پیڈل گھماتا، دوبارہ اپنے پنڈ جا پہنچتا تھا، اگلی صبح دوبارہ، ''چندر اوتی'' سے ملنے کا ارادہ باندھ کر چل پڑتا۔ شنید ہے، یہ وہی زمانے تھے، اور وہی شہر، جہاں اک اجنبی حسینہ سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں، اور پھر وہ تجربہ، وہ واردات، ان کے شعری سفر، اور تخلیقی ارتقا کا حصہ بن کر ہمیشہ ان کے ساتھ رہا!

پہلی محبت، وہ شہر، جس کا ذائقہ، اور چپ چپ، دل کی زبان سے کبھی نہیں جاتی، یہی وجہ، بعد میں وہ تجربہ، وہ واردات، اپنے رنگ تو بدلتی ہے، مگر کیفیت نہیں، اور یہی وہ کیفیت ہے، جو ہمیشہ دل کو، اجلا، پاک اور خوبصورت رکھتی ہے، کہ محبت ہی وہ پوتر پانی ہے، جو ساری کثافتوں، اور گندگیوں کو دھونے کی اپنے اندر صفت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن

کے دل اس پانی سے دھل جاتے ہیں، ان کی روحیں اجلی اور ہلکی ہو جاتی ہیں، اور وجود مجلتی! وحدت الوجودی صوفیا اس کی کیفیت کو کثرت میں وحدت کے نام سے جانتے ہیں اور عشقِ حقیقی کی پوڑھی چڑھنے کا ذریعہ بھی۔ اظہر جاوید پنجگانہ نماز بھی ادا کرتے تھے، اور حضرت رابعہ بصریؒ سے عقیدت بھی رکھتے تھے (یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قلندر بی بیؒ پر ایسی کتاب تصنیف کی، جو بلاشبہ اس محترم ہستی کے متعلق ایک ایسی دستاویز ہے، جو معتبر بھی ہے اور مستند بھی) عشقِ حقیقی کی پوڑھی چڑھے یا نہیں، یہ نہیں معلوم، ہاں اتنا جانتی ہوں، وہ جوان کے اندر اک خاص قسم کی بے غرضی اور بے نیازی پائی جاتی تھی، وہ کوئی درویشی وصف ہی تھا، جسے کسی صلہ وستائش سے غرض تھی، نہ لین دین سے کوئی معاملہ، بس محبت، کہ بے لوث خدمت، اس کے بغیر ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی پلٹ کر کسی سے نہ پوچھا، ''جھولی میں پتھر ہیں یا پھول''؟ ادب میں انہوں نے کتنے لوگوں کو متعارف کروایا، اور انہیں معتبر بنایا، ''تخلیق'' کا چار عشروں پر پھیلا سفر، اس کا گواہ ہے، کتنے نئے ادیب اس کے ذریعے نامور ہوئے، اور کتنے نامور ہو کر ''تخلیق'' کو ماننے سے انکاری ہوئے، مگر عجب بات ہے کہ اس کے باوجود اڈیٹر ''تخلیق'' کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نہ ابھری، نہ وہ دلبرداشتہ ہوئے، بدستور اسی لگن سے پرچہ نکالتے رہے، نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، انہیں راہ دکھاتے رہے، اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی، مجھ جیسے شکریے کی رسید نہ بھیجنے والوں کو بھی وقت پر ''تخلیق'' پہنچاتے رہے! اسی لیے کبھی معلوم نہ ہو سکا دفتر ''تخلیق'' میں کتابیں، پہن اور اوڑھ کر بیٹھا ہوا، ایک کمٹڈ شخص، اس مہنگائی کے دور میں، کیسے وقت پر پرچہ نکالتا ہے، اور اس کی پرنٹنگ اور ترسیل تک، کن مشکل مراحل سے گزرتا ہے، اور ان مراحل سے گزرنے کے بعد، تعریفِ کم اور تنقید کا زیادہ سامنا کرتا ہے......!

وہ یقیناً ایک عجیب شخص تھا، جس کا نام اظہر جاوید تھا۔ روٹین کی یکسانیت اور تسلسل کے اندر سے بھی وہ زندگی کے گرم جوش لمحے نکال لیتا تھا، اور کسی نہ کسی بہانے ''تخلیق کے خاندان'' کو جمع کر کے، ایک ایسی شام اپنے دوستوں کی یادداشتوں میں محفوظ کر دیتا تھا، جو روٹین کی ادبی سماجیات سے کشید نہیں کی جا سکتی، پہلے ''تخلیق'' کے زیادہ تر پروگرام شیزان میں ہوتے تھے، جب اک ہنگامے میں شیزان کو جلا دیا گیا، تو اس کے بعد، ''تخلیق کا خاندان'' کبھی پنجابی انسٹی ٹیوٹ میں اور کبھی ڈیفنس کلب میں جمع ہونے لگا، بے تکلف محفل اور ماحول میں کشادگی اور اس قدر آسانی ہوتی کہ سبھی دیر تک بیٹھتے اور دیر تک ہی یاد رکھتے۔

سنا ہے، وہ رات، جس کی صبح، مسافر کو کوچ کرنا تھا، اس رات بھی ایک ایسی ہی محفل جمی تھی لاہور جم خانہ میں، جہاں چاہنے والوں کے درمیان یہ مسافر ہمیشہ کی طرح چہک رہا تھا، موت کا روپ اتنا کہ چہرے کی تازگی قابلِ رشک تھی، کہیں فقرے کہتا، کہیں جملے اچھالتا، کہیں چٹکلے، کہیں لطیفے اڑاتا، مسافر اتنی موج میں تھا، کہ اس قیامت کا سایہ بھی اس کے گرد کہیں نظر نہ آتا تھا، جو صبح دم کوچ کا نقارہ بجاتی اظہر جاوید کے چاہنے والوں کے دلوں پر ٹوٹنے والی تھی۔ ایسی جدائی جس کی نہ کوئی مدت ہے نہ میعاد، نہ کوئی اطلاع نہ منادی......! بس آنے والا آتا ہے، اور جانے والا واپسی کے نشان مٹاتا، سر جھکائے، ہاتھ

باندھے، ان کے ساتھ چل دیتا ہے رضا سراسر رضا کہ وعدہ یہی ہے...... ! مگر وعدے کا یہ دن، کتنا مشکل، کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، یہ کوئی ان دلوں سے پوچھے، جن پر جدائی گہری خراشیں ڈال دیتی ہے، اور صدمہ پھیل کر بیٹھ جاتا ہے...... بہت اچھے تھے اظہر جاوید...... کھرے اور سچے، گزرے دو عشروں پر پھیلی، یادوں کو دہرانا، اور وہ بھی مختصر وقت میں، ممکن کب ہے؟ بس ایک تاثر کہ فی الوقت، اسے رقم کرنا بھی آسان نہیں، وہ محبت جو اس بے لوث شخص نے دی، اس کا قصہ طویل ہے، اور سرِ دست اس طوالت کو کھینچنا، میرے بس سے باہر ہے؟

بس یہی کہ یہ شہر لاہور اور اس کی روشنیاں جو پردیسیوں کی آنکھوں میں حیرت اور سراسیمگی کی چکا چوند بھر دیتی ہیں، اب کچھ ماند، کچھ پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پرانے لاہور کی وہ سمت، جہاں ایک نیلا روغنی دروازہ کھول کر، پردہ ہٹا کر، اک مہربان شخص باہر نکلتا تھا، اور گلی میں جھانکتا تھا، نگاہ ڈالنے پر وہ سمت پوری کی پوری ویران معلوم ہوتی ہے۔ اب وہ آواز گم ہوئی، اور وہ چہرہ اوجھل ہوا، جو اس گلی میں آئے بغیر، انار کلی سے گزرنے پر محبت بھرا شکوہ کرتا تھا اور آئندہ آنے کا وعدہ لیے بغیر نہ مانتا تھا۔

یاد تھیں اظہرؔ جتنی دعائیں، میں نے آج پرو ڈالی ہیں
یہ نذرانہ شعروں کا، یہ میری سوچ کے مان کا سہرا

یہ شعر اس سہرے کا ہے، جو اظہر جاوید نے میرے بیٹے کی شادی پر، بڑے شوق سے از خود لکھا، اور شادی سے چند روز قبل سہرے کو خوبصورت فریم میں جڑوا کر بمعہ سلامی کے لفافے اور مٹھائی، میرے گھر از خود آئے اور مجھے، میرے بیٹے کی شادی کی پیشگی مبارک باد دی!

وہ سہرا میرے سامنے رکھا ہے، لفظوں کے موتی جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔ دعائیں اور محبتیں، چھلک چھلک کر باہر آتی ہیں، مجھے وہ شام، وہ ساعت وہ پل نہیں بھولتے، جب یہ خوبصورت سوغات مجھے پیش کی گئی تھی، میرا مان بڑھایا گیا تھا۔

اچھے لوگ، وہ جو بے غرض اور بے لوث ہوتے ہیں، شاید ان کی عمر بھی خوشیوں کے نایاب لمحوں کی طرح مختصر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد گزر جاتی ہے۔ مگر ان گزری خوشیوں کی گزرگاہ پر بیٹھے لوگ اور ان کی تنہائی، پھیلتی جاتی ہے، اپنا حجم بڑھاتی جاتی ہے، معمول کی رونقوں کو نگلتی چلی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مہیب جانوروں کی چنگھاڑوں کی طرح پھیلتے شہروں میں ہم اکیلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس اکیلے پن میں آج بھگوان سٹریٹ کا سناٹا بول رہا ہے، بولتا چلا جا رہا ہے، حالانکہ گلی آباد ہے، معمول کی آمد و رفت بھی جاری ہے مگر؟؟؟

◆◆◆

اظہر جاوید۔ جو نہ جاتا کچھ دن اور......

سلمیٰ اعوان

یہ تیرہ فروری کی خوبصورت لطیف سی خنکی میں ڈوبی ہوئی شام تھی۔ ''الحمرا'' کے مدیر جناب شاہد علی خان نے ڈاکٹر سعید اختر درّانی اوران کی اہلیہ انگے درّانی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا جم خانہ کلب لاہور میں اہتمام کررکھا تھا۔

گھر سے نکلنے سے قبل میں نے یونہی کیمرہ پرس میں ڈال لیا کہ چلو کچھ تصویریں بنالوں گی۔

میں جس وقت کمرے میں داخل ہوئی اس وقت تک بہت کم لوگ آئے تھے۔ اظہر جاوید نے نیم ایستادہ ہوکر چہرے پر بکھری مسکراہٹوں سے خوش آمدید کہا۔ اُس شام مجھے اُس کا چہرہ غیر معمولی روشن، نکھرا اور مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ سوٹ بھی بڑا خوبصورت تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ باتوں میں مگن تھے۔

میں نے دیکھا تو تصویر بنانے کا خیال آیا۔

''چلو سیدھے ہو جاؤ اور میری طرف دیکھو''۔ میں نے ''حکم'' جاری کیا۔ اپنی نشست سیدھی کرتے ہوئے اُس نے اپنے ہمیشہ کے معمول کے انداز میں فقرہ کسا۔

''پہلے تصویر کھینچنی سیکھ لو۔''

ہم لوگ اس کی فقرے بازیوں کے عادی تھے۔

''تم اپنے دانت اندر کرو۔ ابھی تمہیں رزلٹ دکھاتی ہوں۔''

اس کے دوتین پوز کھینچ کر میں انگے درّانی کی تصویریں بنانے لگی۔ جب فارغ ہوئی تو دیکھا وہ نیلم احمد بشیر کے پاس بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ نیلم اپنی نئی کتاب ''چار چاند'' اُسے دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کچھ خوفِ خدا کرو۔ کبھی ہماری کتاب کا بھی اشتہار اپنے رسالے میں دے دیا کرو۔''

میں نے قریب جا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ صرف یونس جاوید کی کتابوں کے اشتہار دیتے ہیں کہ وہ اس کا جگری یار ہے۔ ہماری کتابوں کی وہاں پذیرائی نہیں۔''

''اشتہار چھپنے پر پیسے لگتے ہیں۔ کنجوس عورتیں جیب ڈھیلی نہیں کرتیں اور اشتہاروں کیلئے مری جاتی ہیں۔''

وہ چہک رہا تھا۔ ''چلو بولو کتنے پیسے دیں۔'' نیلم نے پرس کی زِپ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''جتنے دے سکتی ہو دو''۔

پانچ سو کا نوٹ نیلم نے دینا چاہا تو وہ پھر برسا۔

''شرم کرو کچھ۔ یہ سلامی دے رہی ہو۔''

اُس کا ہاتھ پھر پرس میں گیا اور ہزار کا نوٹ نکال کر پیش کیا۔ لیکن اظہر جاوید نے لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس سارا وقت وہ ہنستا رہا، قہقہے لگاتا اور باتیں کرتا رہا۔

کیا ایک پل کیلئے اُسے یا ہمیں یہ خیال آیا تھا کہ وہ کل اس وقت قبر میں ہوگا۔ اُف! ایسی کسی سوچ کا تو ہمارے ذہنوں میں کہیں دُور دُور تک کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ہم رخصت ہونے لگے تو نیلم نے مجھ سے کہا۔

''پلیز تسنیم منٹو تمہیں فون کرتی رہی ہے، وہ جمعہ کے دن اظہر جاوید کے اعزاز میں کھانا دے رہی۔ اس سے بات کر لینا۔''

واپسی پر میں سوچتی ہوں کہ یار مجھے بھی اظہر جاوید کے لیے کھانا کرنا ہے۔ چلو 23 مارچ کے بعد رکھوں گی۔''

گھر واپسی ہوئی۔ تسنیم کو فون کیا۔ وہ شاید گھر پر نہیں تھی۔ اگلے دن آفس سے دس بجے اس کے ہاں فون کھڑکایا۔

''معافی چاہتی ہوں تسنیم۔ ہاں تو بتاؤ اظہر جاوید کے ساتھ ظہرانہ ہے یا عشائیہ؟

اور تسنیم منٹو کی رُندھی ہوئی آواز نے مجھے سکتے کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔

''سلمیٰ وہ تو چلا گیا۔'' اور پھر تسنیم رونے لگی۔

میں نے بہتے آنسوؤں سے سسکی بھری۔ وہ کیسے جا سکتا ہے۔ کل شام جم خانہ میں ہمارے ساتھ تھا اور ابھی تو اُس نے اسلام آباد جا کر اپنا ''پرائڈ آف پرفارمنس'' لینا ہے۔''

مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ چلا گیا تھا۔ ہنستا، قہقہے لگاتا، مذاق کرتا۔

اظہر جاوید رنگوں، خوشبوؤں اور رنگین محفلوں کا رسیا تھا۔ اُس نے دنیا سے رخصت لی تو کس دن جب محبت کرنے اور چاہنے والے سرخ گلاب بانٹ رہے تھے۔ اُس کا محبت پر ایمان اتنا قوی تھا کہ اس نے افتخار عارف کے اس شعر کی نفی کر دی کہ ''جس دن میرا جنازہ ہوگا اُس دن پھولوں کی دکانیں بند ہوں گی۔'' اس کی موت کے دن ہر گلی کوچے میں پھول بٹ رہے تھے اور وہ چاہنے والوں کا دن تھا۔ وہ بھی محبتوں کا سفیر تھا۔

''تخلیق'' اس کی زندگی تھا۔ اس کا پیشن Passion تھا۔ اس کی چاہت تھا۔ وہ ہر حال میں دو ماہ بعد پرچہ نکال لیتا۔ پرچے کی قیمت بھی بیس 20 روپے تھی اور مہنگائی کے زمانے میں بھی 20 روپے ہی رہی حتیٰ کہ مستنصر حسین تارڑ چیخ اٹھا کہ اگر تم نے

اِس کی قیمت نہ بڑھائی تو میں تمہارا پرچہ پڑھنا چھوڑ دوں گا۔اور جب حمید اختر صاحب نے سنجیدگی سے اظہر جاوید کو قائل کیا تب وہ مجبور ہو گیا، پچاس روپے قیمت کرنے پر۔

پرچے کے معیار پر وہ کبھی کمپرومائز Compromise نہیں کرتا تھا۔لمبی کہانیوں پر ناک بھوں چڑھاتا اور بولتا تھا۔ مجھے آج بھی اُس کی فون پر گفتگو یاد ہے۔عراق پر ایک کہانی ''آسمان چُپ رہا'' لکھی۔''تخلیق'' کیلئے بھیجی تو چند دنوں بعد اُس کا فون آیا۔آواز میں میرے طولِ بیان کا شکوہ تھا۔

میں نے کہا۔''اظہر جاوید میں اُسے ذرا مختصر کر دیتی ہوں۔'' اب میں دفتر گئی۔ پھر جہاں غیر ضروری تھا وہاں کانٹ چھانٹ کی۔ پھر بھی کہانی چھ سات صفحوں پر پھیلی رہی۔اب اظہر جاوید کی طویل بڑبڑاہٹ۔ڈاکٹر شائستہ نزہت نے اظہر جاوید کے اعزاز میں ڈنر Dinner دیا۔وہاں بیس بندوں کے درمیان اُس نے میری کہانی کی طوالت پر لتاڑا۔میں نے ذرا بُرا نہ مانا۔ ہم لوگ بھی اس کے مزاج سے آشنا ہو چکے تھے۔کب اِس کی کسی بات کا بُرا مانتے تھے۔اس کی بات کو مائنڈ Mind نہیں کرتے تھے۔

نیلم نے کہا۔

''بی بی تیری خاطر ہو رہی ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔''ہاں بھئی۔اظہر کو خوش ہو لینے دو''۔

کیسی کیسی یادیں ہیں جو اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہی ہیں۔ مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد آتی ہے۔

اگر آپ کا ادبی پس منظر نہ ہو اور آپ تخلیقی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہوں تو بہت دیر کے بعد آپ کو ادیبوں اور ان کے روّیے سمجھ آتے ہیں۔اور پھر مجھ جیسی بونگی عورت کو۔

مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی جانے والی میری کتاب ''تنہا'' 1978ء میں چھپی تو کسی نے اُس کی تقریب رونمائی کیلئے کہا۔تخلیقی اعتبار سے یہ میری چوتھی کتاب تھی مگر پہلی کتابیں شاید فضول سی کاوش تھیں۔''تنہا'' موضوع، تجربات اور ٹریٹمنٹ Treatment کے اعتبار سے ایک منفرد ناول تھا۔ بڑے ادیبوں نے اُس کی کافی پذیرائی کی، تو مجھے بھی حوصلہ ہوا۔اب میں نے تقریب میں مدعو کرنے کیلئے ادیبوں کے آستانوں پر خود حاضری دینی اور ذاتی طور پر درخواست کرنی ضروری سمجھی کہ اُنہوں نے تقریب میں شرکت کرنی ہے۔

داتا دربار کی کسی گلی میں ''تخلیق'' اور ''ادب لطیف'' کا مشترکہ دفتر تھا۔اب یادداشت کچھ اتنا ساتھ نہیں دے رہی ہے کہ وہ کونسی گلی تھی۔ بہر حال دفتر میں کرسی پر بیٹھے اظہر جاوید کو میں نے کارڈ دیا۔ساتھ میں ''تنہا'' کی تقریب میں حاضری کی درخواست کی۔

''جی ضرور حاضر ہوں گا۔'' اظہر جاوید نے سنجیدگی سے کہا۔

اب میرے جیسی احمق عورت کی حماقت ملاحظہ کریں کہ چائے پینے کے بعد میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔''آپ نے تقریب میں ضرور آنا ہے۔''

اظہر جاوید کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کا گہرا پھیلاؤ تھا۔

''محترمہ! آپ کہتی ہیں تو میں ابھی جا کر وہاں بیٹھ جاتا ہوں۔''

مجھ جیسی ناسمجھ کو اس وقت سمجھ نہیں آئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے جملے میں چھپا طنز میرے اوپر آشکار ہوا تو میں شرمندگی کے پاتال میں گر گئی۔

''اللہ جانے! کیا سوچتا ہوگا کہ یہ کیسی بیوقوف عورت ہے۔''

پھر وقت کے ساتھ ساتھ تعلّق بڑھتا گیا۔ جب بھی اُسے فون کرتی۔

''جی اظہر'' وہ کہتا۔

ساتھ ہی مذاق شروع ہو جاتا۔ بہت سے کھانے اس کے دفتر میں کھائے۔ ہم سب تسنیم منٹو، سیما پیروز، نیلم احمد بشیر، عمرانہ مشتاق، امینہ عنبرین، فیصلہ کر لیتے کہ کِس کِس نے کیا کیا لانا ہے۔ ہر ایک اپنا حصہ ڈالتا۔ بہت سے نئے چہرے اظہر جاوید کے دفتر میں دیکھے۔ اب یادیں اُمنڈی آ رہی ہیں۔

بس کہیں میرے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش اظہر جاوید کچھ وقت اور جی لیتا۔

◆◆◆

سیّدہ نسرین نقاش (سری نگر)

''اظہر جاوید جو عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں، حسن و جمال اور عشق و عاشقی کے رنگین جہانوں کے رومانی شاعر ہیں۔ چونکہ اس دشت کی سیاحی میں انہوں نے اک عمر بتائی ہے اور لبوں سے محبت اور مہ لقاؤں اور مہہ جبینوں کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہ کر ان سے چار چار عشق بھی کیے ہیں، اور اس میدان کے تجربہ کار اور ماہر کھلاڑی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری فرضی معاملات کی بجائے حقیقی قلبی واردات، باہمی معاملات، فطری جذبات و احساسات کی آنچ میں تپی ہوئی ایسی سچائیوں کی اثر انگیز شاعری ہے جو فکر کو ہلچل اور دریائے دل کو طغیانی و طلاطم سے ہم آہنگ کر کے قارئین کو مسحور کر دیتی ہے۔''

تنہا راستوں کا تنہا مسافر

سیما پیروز

اظہر جاوید پر کیسے لکھوں اور کیا لکھوں؟ پہلے تو مجھے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا پڑے گا کہ اظہر جاوید اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں کیونکہ 13 رفروری کی شام جم خانہ میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ محفل ''الحمرا'' کے شاہد علی خان نے ڈاکٹر سعید درّانی کے اعزاز میں سجائی تھی۔ اظہر جاوید نک سک سے تیار حسبِ معمول چہک رہے تھے۔ اپنے اسی پرانے انداز میں فقرے بازی، لطیفے، چٹکلے، شائبہ تک نہ ہوا کہ وہ صبح بڑی خاموشی سے آخری سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ زندگی بھر محبتیں بانٹنے والے نے دن بھی چنا تو کون سا۔ ویلنٹائن ڈے۔

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گمان تک نہ ہوا کہ وہ بچھڑنے والا ہے

اظہر جاوید کو پرائڈ آف پرفارمنس ملنے پر سب دوست احباب خوش تھے۔ اُن کے اعزاز میں دو چار کھانے ہو چکے تھے۔ اُن کے وفات پانے سے ایک دو روز قبل میرے ہاں اُن کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ دوستوں کے ساتھ بیٹھے بے انتہا خوش تھے اسی طرح ہنستے مسکراتے رخصت ہوئے۔

14 رفروری کو صبح کوئی ساڑھے دس کے قریب تسنیم منٹو کا مجھے فون آیا کہ سلمیٰ اعوان کا فون نمبر نہیں مل رہا۔ میں نے کہا نیلم سے کہیں پیغام پہنچا دے گی۔ تسنیم منٹو نے بھی آنے والے جمعہ کو ان کے اعزاز میں کھانا رکھا ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد تسنیم کا دوبارہ فون آ گیا۔ میں سمجھی فون نمبر نہیں ملا ہوگا۔ سیما ایک بُری خبر ہے، تسنیم بولیں...... خدا کے لیے جلدی سے بتا دیں۔ کہنے لگیں اظہر جاوید چلے گئے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اظہر جاوید کے موبائل پر فون کیا کہ شائد جھوٹی خبر ہو کیونکہ کچھ عرصہ پہلے کسی ادیب کی موت کی خبر اخبار میں چھپ گئی تھی اور وہ صاحب حیات تھے۔ یہ خبر اظہر جاوید نے ہی ہنس ہنس کر بتائی تھی۔

موبائل سونان نے اٹھایا اور خبر کی تصدیق کر دی۔ چشم زدن میں پچھلے بیس بائیس برسوں کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے

لگی۔ یہ ملاقات نوے کی دہائی میں ہوئی تھی۔ جب ہم سرگودھا سے لاہور آئے تھے۔ میرے لیے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ ملاقات کب اور کیسے دوستی میں ڈھلی۔ پھر یہ دوستی ایسی مستحکم ہوئی کہ اظہر جاوید گویا ہمارے فیملی ممبر تھے۔

اظہر جاوید کی وفات بظاہر تو ایک فرد کا اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ لیکن اظہر جاوید کے جانے سے ایک عہد ختم ہو گیا۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ بھگوان داس سٹریٹ میں رسالہ ''تخلیق'' کا دفتر دوستوں کے لیے ایسی جگہ تھی جہاں وہ دوپہر ایک بجے سے رات آٹھ نو بجے بلا تکلف بیٹھ کر چائے پانی کا لطف اُٹھا سکتے تھے اور ساتھ ساتھ اظہر جاوید کی گفتگو سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ ان کے دفتر میں ہم کچھ دوست مہینے دو مہینے میں ایک بار کھانا کرتے تھے۔ تسنیم منٹو، امینہ عنبرین اور میں گھر سے سالن اور میٹھا وغیرہ بنا کر لے آتے تھے۔ ان ڈنرز میں عطیہ سیّد، عابد حسن منٹو، پیروز بخت قاضی ایک آدھ بار عمرانہ مشتاق، سلمیٰ اعوان اور چند دوسرے احباب بھی شامل ہوئے تھے۔

''تخلیق'' ایک ادبی پرچہ تھا۔ ادبی پرچہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ لیکن اظہر جاوید اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود بیالیس سال تک تخلیق باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ آج تک کبھی کسی سے سالانہ خریداری کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ پروف ریڈنگ سے لے کر ٹکٹوں کے لگانے، ایڈریس لکھنے اور پوسٹ کرنے تک تنہا سارا کام کرتے تھے۔ ''تخلیق'' جیسے اظہر جاوید کا Passion تھا اور...... ''تخلیق'' کا دفتر ان کا گھر۔

انہیں اپنے بچوں سے بے انتہا محبت تھی، بیٹی کو تو میں نے دیکھا نہیں البتہ بیٹا سونان ابھی زیر تعلیم تھا۔ جب اظہر جاوید سے ملاقات ہوئی۔ ہمیشہ اس کے لیے سراپا محبت اور شفقت ہوتے۔ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر پریشان ہوتے۔ باپ بیٹے کے درمیان بہت ہی خوبصورت رشتہ تھا جس میں باپ کی شفقت اور دوست جیسی بے تکلفی تھی۔ بہو آ جانے کے بعد اس کا ذکر بھی بہت پیار سے کرتے۔ ہمیشہ سعدیہ بیٹی کہہ کر بات کرتے۔

اظہر جاوید مجلسی آدمی تھے جس محفل میں موجود ہوتے وہ محفل باغ و بہار ہوتی۔ ہنسنا ہنسانا، لطیفے سنانا کسی پر فقرہ کسنا محفل پر چھا جانے کا گُر اظہر جاوید کو آتا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے لوگوں کو اکٹھا کرتے رہتے تھے۔ کبھی چائے پر کبھی کسی کی آمد پر کھانا رکھ لیا۔ ان کی وجہ سے ''تخلیق'' کا ایک کنبہ تھا ہم سب انہی کی وجہ سے آپس میں مل بیٹھتے تھے۔ کتنے ہی شاعر ادیب ''تخلیق'' کی شاخ سے اڑے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو یہ اعتراف بھی کرتے ہوں گے کہ انہیں سیڑھی مہیا کرنے والے اظہر جاوید تھے۔ لیکن وہ اتنے عالی ظرف تھے کہ کبھی کسی کا گلہ شکوہ نہ کیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ''تخلیق'' سے شہرت پانے والے کسی فنکشن میں اظہر جاوید کے پاس سے آنکھ ملائے بغیر گذر جاتے تو ہم جیسے دوست انہیں احساس دلاتے کہ فلاں کو دیکھیں آپ کو سلام تک نہیں کیا۔ فوراً کہتے ''چھوڑو بی بی مینوں کوئی صلہ نئیں چائی دا او ہناں دا کم ہو گیا۔ خوش رہن''۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ادبی دنیا میں مجھے متعارف کروانے والے اظہر جاوید اور رسالہ ''تخلیق'' تھا۔ اس سے پہلے میں ''حنا ڈائجسٹ'' اور ''پاکیزہ ڈائجسٹ'' وغیرہ میں چھپتی تھی۔ میری پہلی کتاب کی اشاعت میں بھی انہوں نے میری

معاونت کی۔

یہ غالباً 1992ء کی بات ہے۔ اظہر جاوید نے پیروز کو تجویز پیش کی کہ باہم مل کر پبلشنگ کا ادارہ قائم کریں۔ لیکن پیروز کی دفتری مصروفیات اور کچھ میری سستی کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی لیکن اظہر جاوید نے جو لیٹر پیڈ چھپوایا تھا وہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پبلشنگ کے ادارے کا نام ''سیماب'' تجویز ہوا تھا۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ وہ کاغذ کا ٹکڑا محفوظ ہے لیکن اس کو چھپوانے والا چلا گیا ہے۔

اظہر جاوید ایک بڑا انسان تھا۔ جو بلا تخصیص مذہب، عقائد، عہدہ، چھوٹا بڑا سب میں پیار بانٹتا تھا۔ ''تخلیق'' میں اپنی بات میں ہر قسم کے استحصال، ظلم، ناانصافی، معاشی اور معاشرتی تضادات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اپنے لیے کبھی کچھ نہیں چاہا۔ دوسروں کے غم کو اپنا غم اور خوشی کو اپنی خوشی سمجھا۔ اظہر جاوید نے اپنی ذاتی زندگی کے دوران کبھی کسی کو جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسروں کے دُکھ اور پریشانیاں بانٹنے والے نے اپنے دُکھوں کو بہت کم بانٹا۔ بس کبھی کبھار اس اظہر جاوید کی جھلک نظر آجاتی تھی جو اندر سے تنہا اور دُکھی تھا۔ کبھی یاسیت کا موڈ طاری ہوتا بھی تو ایک دو باتوں اور ٹھنڈی آہوں کے بعد پھر وہی ہنسی مذاق ''چھڈ وی تُسی ایویں ای مینوں دُکھی کر چھڈیا'' یہ کہہ کر بات اُڑا دیتے۔

اُن جیسا وضع دار انسان اور اب کون ہوگا جب بھی کسی کے گھر جاتے کیک یا پھول لے کر جاتے۔ کوئی دن تہوار ہوتا اُن کا فون ضرور آتا۔ اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود مستحق لوگوں کی مالی اعانت اکثر کرتے رہتے تھے۔ اگر کبھی کسی کو ان کے وسائل سے بڑھ کر مالی مدد کی ضرورت ہوتی تو چند قریبی دوستوں سے درخواست کرتے لیکن آفرین ہے اس بندے پر اپنی ذات کے لیے کبھی کچھ نہیں چاہا۔

اظہر جاوید سب کا دوست تھا جو شخص دو چار بار ملتا وہ یہی تاثر لے کر اُٹھتا کہ وہ اظہر جاوید کا سب سے گہرا دوست ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کا یہ دعویٰ ہوگا کہ وہ ان کا گہرا دوست تھا۔ دراصل وہ محبت کا سمندر تھا جس کی محبت سب کے لئے بے پایاں تھی۔ اظہر جاوید نے زندگی بھر نہ کسی سے خدمت لی نہ احسان لیا حتیٰ کہ موت کے وقت بھی چپ چاپ چلا گیا۔ اس کی خاموش نیکیاں اس کے کام آئیں کیسی اچھی موت گیا وہ ؎

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

◆◆◆

رَب راکھا

تسنیم منٹو

شادی کے چند سال بعد سیاست میں دلچسپی لینا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قائداعظم کی مسلم لیگ میرے گھر میں موجود تھی اور میں اس کے اصول وضوابط سے مانوس تھی۔ پھر بائیں بازو کی سیاست کے بارے میں سُنا اور بالتفصیل سنا۔ بائیں بازو کی سیاست اپنے اندر بہت سے سہانے خواب رکھتی تھی۔ اس کی تمام جہتیں انسان نواز تھیں اور کیا چاہیئے تھا یوں آنکھیں کھلیں کہ گویا ایک مشن ہاتھ آ گیا ہو لہٰذا میں نے بہت سنجیدگی سے اس نئے خیال سے رشتہ باندھا اور جی جان سے ہر جگہ موجودگی کو اہم جانا۔ میٹنگ وغیرہ اور جلسوں کے لیے دریاں بچھا کر اور کرسیوں کی ترتیب لگا کر بھی کسی ذمہ داری کو سرانجام دینے کا احساس ہوتا تھا۔ مسیحی خواتین اور نوجوان لڑکیاں عام ورکرز کی حیثیت سے کام کرتیں۔ یہ کاوش کئی سالوں پہ محیط ہے اور واقعات در واقعات کی ایک طویل داستان ہے۔ ''انجمن جمہوریت پسند خواتین'' کی سیاست میں اُس زمانے کی معتبر اور پختہ ذہن رکھنے والی خواتین شامل تھیں۔ ''انجمن جمہوریت پسند خواتین'' کی سیاست میں زمین تو خیر نرم خُو تھی ہی، مٹی بھی نمو پذیر تھی اور کھاد بھی خالص۔ محلوں، گلیوں میں چھوٹی چھوٹی کونپلیں پھوٹیں بھی۔ لیکن انجمن کا یہ درخت بے ثمر رہا۔ مخالف ہوائیں اور ٹڈی دل کی صورت میں نمودار ہونے والی۔-N-4 کا سامانِ حرب بہت خیرہ کُن تھا۔ بہت سے ذہین ذہن اِدھر اُدھر لپک گئے۔

اِس صورتِ حال میں مَیں ذہنی طور پر مایوس اور بیکار تھی۔ بچے بڑے ہو چکے تھے جبکہ مجھے اپنا وجود چھوٹا لگنے لگ گیا تھا۔ گھر داری (میرے خیال میں) بجز ایک بیگار کیمپ کے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

قلم سے ایک مدت سے رشتہ ٹوٹا ہوا تھا سُو ہم دونوں (قلم) کے درمیان خیال اور الفاظ کا رشتہ پھر سے استوار ہو۔ اب میں لکھنے کے لیے جاگی تھی اور جاگتے رہنا چاہتی تھی۔

میں نے ''سلامت رہو'' لکھی اب اسے چھپوانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ سعید انجم ہمارے دوست تھے (ناروے میں آباد ہوئے......اور وہیں کی مٹی سے پکی دوستی کر لی) اُن کی وساطت سے ''تخلیق'' ہمارے ہاں پہنچتا تھا۔ چنانچہ ''سلامت رہو'' کو میں نے ایڈیٹر کے نام ایک مراسلہ کے ساتھ ''تخلیق'' کے لیے روانہ کر دی۔ تخلیق کا ایڈریس بھگوان سٹریٹ، بھی مجھے بھلا بھلا سا لگا تھا۔

کہانی چھپ گئی برسوں بعد کہانی کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر عجیب خوشگوار مسرت کا احساس ہوا، جیسے برسوں سے کچھ بھولا ہوا تھا جو یاد آ گیا۔ میرا قلم بھی چل پڑا اور قلم کے وسیلے سے ایڈیٹر ''تخلیق'' کے ساتھ ملنے، ملانے کا سلسلہ بھی چل نکلا۔

اظہر جاوید کی شخصیت کے بہت سے رنگ اور انگ تھے۔ وہ محفلیں رچانے کا رسیا تھا۔ وہ فون کرتا، مختلف احباب کو اکٹھا کرتا اور اپنے دفتر میں محفل جماتا۔ اِن دعوتوں کی میزبان امینہ عنبریں، غزالہ نثار اور سیما پیروز تھیں۔ مجھے بھی پکانے کا کچھ درک ہے (اَب نہیں) سُو میں بھی میزبان بن گئی۔ اظہر کو کریلے، کچنار اور مچھلی پسند تھے۔ کھانے کا یہ اہتمام میں اور سیما اپنے گھروں میں بھی کرنے لگے کہ زیادہ دوستوں کو مدعو کیا جا سکے۔ ان محفلوں میں لطیفہ، پھبتی، چوٹ اور مزاح چلتا۔ آپس میں جواب بھی برابر کا دیا جاتا۔

پنّا کی موجودگی محفل کو چار چاند لگاتی۔ (میں پنّا کو زریں نہیں مانتی میرے لیے اُس کی شناخت اُس کی دلکش صورت اور فن کے حوالے سے ہے نہ معلوم وہ اس ہُنر کو کیوں سنبھال نہ سکی؟) میں اِس جاندار حلقے میں نئی نئی آئی تھی۔ یہاں عورتوں کی بہت پذیرائی تھی۔ عورتوں کے ہجوم کو دیکھ کر ایک فربہ اندام شاعر نے اپنا اظہارِ خیال یوں کیا تھا کہ ''تخلیق'' کے دفتر میں ''ستر، ستر برس کی حوریں ہیں''، خیر۔

انہیں دنوں اظہر جاوید کراچی گئے تو میرے لیے نیپکن ہولڈرز کا تحفہ لائے۔ میں ساؤتھ افریقہ گئی تو میں بھی کچھ لائی۔ اولیں روابط میں تحفے کا وجود آپ ہی آپ شامل ہو جاتا ہے۔ اظہر جاوید کو محفلیں برپا کرنے کا ایک بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ اُنہوں نے روٹری کلب جائین کیا تو مجھے بھی اُس کا ممبر بنوایا۔ جگہ جگہ اس کی میٹنگیں ہوتیں لہٰذا موجودگی ضروری تھی۔ بے شمار اکٹھ ہوئے کہ تفصیل محض طوالت ہوگی۔ انہی محفلوں میں لبنیٰ جاوید اور بینا طاہر سے بھی کچھ مراسم بنے۔ کہنے کو بہت کچھ ہے اور اس بہت کچھ کا عنوان یہی ہے کہ وہ تنہا، تنہا سا شخص اپنے اندر بہت سی زندگیاں رکھتا تھا، بے حد متحرک انسان تھا۔

فیض صاحب نے ''فیض نامہ'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا سے گفتگو کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا ہے: ''عورت خدا کی بہترین تخلیق ہے۔ وہ ہر رشتے میں خوبصورت ہے''۔ ہوسکتا ہے کہ آج اس وقت فیض صاحب کا یہ خیال رقم کرتے ہوئے مجھ سے کچھ آگے پیچھے ہو گیا ہو۔ بہر حال مفہوم ستائش بقول اقبال یہی ہے کہ ع

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

نہیں جانتی کہ اظہر جاوید کا اپنا بھی کوئی گھر تھا کہ نہیں۔ کسی سے کوئی لگاوٹ کبھی تھی کہ نہیں۔ لیکن اُن کی بظاہر زندگی میں عورت کی اہمیت بے حد و بے حساب تھی۔ ہر عورت اُن کے لیے ایک حسینہ تھی اور ان حسیناؤں کی زندگیوں کے مسائل حل کرنے میں اُنہوں نے تا مقدور ساتھ بھی دیا۔ محبت، شفقت، ہنسی مخول سب روا رکھتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میری اُن سے ملنے ملانے کی ابتدا ہی تھی کہ ایک دوپہر فون آیا کہ کل شیزان آ جائیں، کراچی سے ایک حسینہ آئی ہیں۔ اُن سے ملاقات کا اہتمام ہے۔ دوسرے روز میں شیزان پہنچی۔ اب میری نظریں کسی حسین چہرے کی تلاش میں تھیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں نے مہمان خاتون

کہ جن سے میرا تعارف نہیں تھا اُن کے سامنے ہی پوچھ لیا کہ وہ حسین شاعرہ کہاں ہیں؟ بعد میں جو ہوا سو ہوا۔

اُنہیں اپنی محفل میں موجود کوئی خاتون اچھی لگتی تو برملا کہہ دیتے ''اَج تے تُسی بڑے چمک رہے او''

ریت، رسم یا رواج کہہ لیں کہ جانے والے کے لیے دل میں پہلے سے موجود نرم گوشہ زیادہ گداز ہو جاتا ہے اور ہم سب ''سب اچھا ہے'' کہنا ضروری سمجھتے ہیں جبکہ مرنے والے کی شخصیت کو اُس کی جبلت کی اچھائی اور برائی نے ہی متوازن کیا ہوتا ہے۔ سب اچھا کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اظہر انا پرست تھا وہ بدلحاظ بھی تھا اور اپنی اِن عادات کے ذریعے وہ اپنی انا کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ ویسے بھی زندگی کی مختلف سمتوں میں ایک محروم شخص کتنا روادار رہ سکتا ہے؟

انسان کو فرشتہ سمجھ لینا انسان کی توہین ہے۔ انسان زندگی کرنے کے لیے جس مشقت اور جانفشانی سے گزرتا ہے فرشتے محنت کی اس لذت سے محروم ہیں۔ آسمانوں کی بصیرت رکھنے والے ایک بڑے شاعر غالبؔ نے بڑے تحمل سے خدا سے یہ سوال کیا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

اظہر جاوید اکیلا تھا۔ اُس نے اپنی بے تفنن زندگی کو خود ہی سمیٹا۔ نین نقش بنائے، اُس کو سجایا، سنوارا......تنہا آدمی کے لیے زندگی ایک جنگل بن جاتی ہے۔ اظہر جاوید سے فون پر دوستانہ گفتگو کی بہت سی یادیں ہیں۔ مضمون کی طوالت کا خدشہ موجود ہے اس لیے ایک دو واقعات پر ہی اکتفا کروں گی۔ اسلام آباد سے عزیزہ عامرہ نے فون پر پوچھا:

''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو'' اِس مصرع کا پہلا مصرع کیا ہے؟ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے فون پر اظہر جاوید سے پوچھا ''بولے لکھیں ''قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو'' میں نے مزید تسلی کے لیے خواجہ زکریا صاحب سے بھی پوچھ لیا۔ اُنہوں نے کہا لکھیں!

''قیس جنگل میں ہے اکیلا مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

خواجہ صاحب سے میں اکثر و بیشتر اشعار کی تصحیح لیتی رہتی ہوں اور اس شرط پر کہ اگر شاعر کا نام غلط ہوا تو ذمہ دار بھی آپ ہی ہوں گے۔ اُنہوں نے میری یہ شرط مان رکھی ہے۔

اظہر جاوید کی یادیں تتلیوں جیسی ہیں کوئی تتلی پکڑی جا رہی ہے اور کوئی ذہن سے بہت دُور اوجھل ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ پہچان کے دس بارہ سالوں پہ پھیلی بہت سی باتیں بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں، لطیفے ہیں۔ اظہر کے دوسرے چاہنے والے بھی بہت کچھ لکھیں گے۔ اظہر کی شخصیت کا اس قدر پھیلاؤ تھا کہ ایک ایک جملے کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ، اشارہ، کنایہ اور واردات ہوتی۔ بے شمار باتیں اور واقعات ذہن میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن میں یہ سب سنبھال نہیں سکوں گی۔ کہہ نہیں

پاؤں گی۔ اظہر جاوید وقتاً فوقتاً یاد آئے گا تو اُس کی سی ڈی چلے گی۔ احباب اُس کی شخصیت کے بخیئے بھی اُدھیڑیں گے اور رفو بھی کر لیں گے۔ بات ختم کرنا چاہتی ہوں لیکن پھر کچھ یاد آ جاتا ہے۔ ایک روز فون آیا۔ حال احوال پوچھا گیا۔ فوراً ہی کہا ''کی گل اے نہ کہانی لکھ دے او، نہ کہانی پاندے او۔'' اگلے ''تخلیق'' کے لیے جلدی سے کہانی بھیج دیں۔

پرائیڈ آف پرفارمنس کا سُنا تو میں نے فون پہ مبارک باد دی۔ بڑی فراخ دلی سے قبول کی اور کہا تسنیم جی! میں نے اکٹھے چھ لکھ کدی نئیں ویکھے'' چلیے اب دیکھ لیں گے ان میں حسیناؤں کا حصہ بھی ہے۔''

انسان اپنے محاسن سے زندگی سنبھالتا ہے۔ وہ خود اکیلا تھا لیکن بھری محفل میں کسی اُداس چہرے سے ضرور پوچھ لیتا کہ تم اُداس کیوں ہو۔ شائد نہیں جانتا تھا کہ بھری محفلوں میں اُداس نظر آنے والے لوگ پیدا ہی اُداس ہوتے ہیں۔ اُس نے زندگی کی پری کا آنچل ہاتھ سے نہ جانے دینے کی بہت تگ و دو کی۔ لیکن وہ بدلحاظی پہ اُتر آئی تو ایک جھٹکے سے منہ موڑ لیا۔

اظہر جاوید کی وفات کے اگلے ہی روز الحمرا میں اعزاز آذر نے اظہر کا ہی لکھا ہوا ایک پنجابی جملہ پڑھا تھا جس میں اپنے کسی پیارے کے چلے جانے پر ''ہونج'' کا لفظ استعمال کیا ہوا ہے۔ سو اظہر جاوید کی موت بھی اُس کے دوستوں کا، اُس کی محبت کا دم بھرنے والوں کا سب کچھ ''ہونج'' کر لے گئی ہے۔

وقت، قدرت یا خدا کے ہاتھوں منظر کس سرعت سے پس منظر میں بدل جاتا ہے کہ آج اُس کی زندگی کی ہماہمی اور اُس کے وجود سے جو رونقیں تھیں اُن کا ذکر ماضی قریب کے صیغہ میں کرنا پڑ رہا ہے تو اظہر کے دوستو سچ یہی ہے کہ

میں ہوں پُتلی کاٹھ کی
ڈور پیا کے ہاتھ

ہسدے روؤ
وسدے روؤ
شاد آباد روؤ
رب راکھا!

◆◆◆

حمید اختر

''حیران ہوں، ''تخلیق''، تمھارے دم سے زندہ ہے یا تم اس کے سہارے؟ تمھاری ایک نظم کے مصرعے کو مَیں اپنی آپ بیتی کا عنوان بنانا چاہتا ہوں۔ تمھیں اعتراض ہے یا خوشی۔ بتا دینا۔ عنوان ہے۔ ''زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں۔''......

اظہر جاوید......ایک زندہ جاوید شخصیت

امینہ عنبریں

اظہر جاوید کو مرحوم کہتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے میں جھوٹ بول رہی ہوں کیونکہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ نوجوانوں سے زیادہ زندہ دل، خوش مزاج، خوش پوش اور خوش گمان شخص یوں اچانک چٹا سفید لباس پہن کر پرفیوم کی بجائے کافور لگا کر، مٹی کی چادر اوڑھ کر سو جائے گا۔ دل مانتا ہی نہیں کہ اب شہر کے بیچوں بیچ ''تخلیق'' کے دفتر کا وہ تالا اب ہم سب کے لیے کبھی نہیں کھلے گا جو شہر بھر کے ادیبوں، شاعروں بلکہ بہت سے غیر ادیب شاعر خواتین و حضرات کے بیٹھنے، ہنسنے بولنے اور ایک دوسرے سے ملنے ملانے کا گویا ایک ڈیرہ تھا، جواب نہیں رہا۔

اس شہر میں بڑے بڑے شاعر ادیب بستے رہے اور اب بھی بستے ہیں جنہیں لوگ مل کر خوش ہوتے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ انہی بڑے ناموں میں میرے مطابق ایک نام اظہر جاوید بھی تھا۔ جس نے کبھی خود کو بڑا سمجھا، نہ مان کیا۔

اظہر جاوید بہت سال پہلے اپنی نوجوانی کے وقت اپنا آبائی شہر سرگودھا چھوڑ کر لاہور میں اپنا مقام اور پہچان بنانے کے لیے آئے اور پھر پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بہت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کیا لیکن اپنا ایک مقام بنا ہی لیا۔ نہ صرف اپنا صحافتی و ادبی کیرئیر بنایا بلکہ بے شمار نئے لکھاریوں کو راستہ دکھایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر لکھنا پڑھنا سکھایا، انہیں اپنے سامنے بڑے شاعر ادیب بنتے ہوئے دیکھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ انہوں نے کئی انتہائی غیر ادبی مزاج رکھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو شاعر اور ادیب بنا دیا، تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ممکن ہوا کہ اظہر نے ابتدا میں مکلیگن روڈ پر اپنے پرچے ''تخلیق'' کا دفتر بنایا۔ جو آہستہ آہستہ ایک ڈیرے کی شکل اختیار کر گیا۔ بڑی بڑی ادبی شخصیات کے علاوہ وہاں نئے اور نوجوان لکھاری بھی آنے لگے اور یوں وہاں بڑی خوبصورت ادبی محفلیں سجنے لگیں۔ سارا سارا دن چائے کا دور چلتا اور لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی، ایک دوسرے پر فقرے اچھالے جاتے اور قہقہے بکھرتے رہتے۔

میرا اظہر جاوید سے غائبانہ تعارف 1968 میں اس وقت ہوا جب وہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے نائب مدیر تھے اور میں ایف اے کی سٹوڈنٹ تھی۔ ان دنوں ڈائجسٹ پرچوں میں لکھنا میرا شوق اور مشغلہ بھی تھا اور پاکٹ منی بنانے کا ایک ذریعہ بھی۔ لیکن اظہر صاحب سے، میرا باقاعدہ تعارف اور ملاقات 71ء میں ہوئی جب میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم

میں داخلہ لیا۔ روز نامہ ''کوہستان'' میں ڈیلی کالم لکھنا شروع کیا اور دیگر پرچوں میں کہانیاں اور مضامین وغیرہ......ایک دن مکلیگن روڈ سے گزرتے ہوئے ''تخلیق'' کا بورڈ دیکھا تو سیڑھیاں چڑھ کر اندر چلی گئی۔ وہاں زبردست محفل جمی تھی۔ بہت گرمجوشی اور اخلاق سے میرا استقبال کیا گیا۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔ بعد میں ادبی دنیا کی بڑی بڑی شخصیات سے وہیں میری ملاقات ہوئی۔ میں اکثر یونیورسٹی سے سیدھا ''تخلیق'' آجاتی اور پھر شام کو گھر جاتی۔ اکثر میری اسائمنٹ بھی رہ جاتی جسے میں بعد میں مکمل کرتی۔ پھر 75ء میں میرا ''تخلیق'' کے ڈیرے پہ آنا جانا یوں کم ہو گیا کہ مقبول جہانگیر صاحب سے میری شادی ہو گئی تھی اور میں تقریباً ہاؤس وائف بن گئی۔ لیکن جب 1985ء میں میرے ساتھی مقبول جہانگیر کا برین، ہیمرج سے انتقال ہو گیا تو مجھے اپنی دو بچیوں کی پرورش کے لیے دوبارہ صحافت کے میدان میں اترنا پڑا اور میں نے روز نامہ ''جنگ'' میں جاب شروع کر دی۔

اس وقت ''تخلیق'' کا ڈیرہ مکلیگن روڈ سے اٹھ کر پرانی انارکلی بھگوان سٹریٹ میں آچکا تھا۔ لیکن اس کی رونق کا وہی عالم تھا۔ میں آفس سے واپسی پر اکثر ادھر سے ہو کر گھر جاتی۔ اس وقت اور ان کے انتقال کے دن تک میں نے اظہر جاوید کو بے حد اچھا انسان پایا۔ اچھائی برائی ہر انسان میں ہوتی ہے لیکن اظہر جاوید مجموعی طور پر اعلیٰ پائے کا انسان تھا۔ انہیں ''تھا'' کہتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ وہ حاضر جواب، زندہ دل شخص، دوستوں کا دوست اور سب کے کام آنے والا انسان تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی شخص کو مدد کی ضرورت ہو اور اظہر جاوید نے پہلو تہی کی ہو۔ دوسری طرف یہ قابل تعریف بات کہ شدید مالی مشکلات اور کٹھن حالات کے باوجود اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے چھپنے میں کوئی ناغہ یا رکاوٹ نہیں آنے دی۔ یہ بڑے دل گردے اور حوصلے کی بات ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کر ادب کی خدمت بجا لاتے رہے۔ اظہر صاحب نے بیالیس سال کے اس عرصے میں ''تخلیق'' کے کئی خاص اور اہم ضخیم نمبر نکالے جو ہمیشہ ادب کی دنیا کا بہترین سرمایہ سمجھے جائیں گے۔ ایک اور خوبی جو اظہر جاوید کی شخصیت کا خاصہ تھی کہ ان کے تمام خواتین وحضرات دوست یہ سمجھتے تھے کہ وہ بس انہی کے ہمراز اور بہترین دوست ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی بے شمار محرومیوں اور مشکلات کے باوجود دوسروں کے ہمدرد وغمگسار رہے۔ ''تخلیق'' کا ڈیرہ پریشان دوستوں کے لیے جائے پناہ اور ان کی ذات گویا ''دیوار گریہ'' تھی۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے اور ان کو اگلی زندگی میں آسانیاں عطا کرے۔ آمین ثم آمین!

◆◆◆

علی سفیان آفاقی

''خیال تھا اور مشاہدہ بمعہ تجربہ بھی کہ اب ہمارے معاشرے میں وضعداری ختم ہوتی جا رہی ہے اور بہت حد تک ہو بھی چکی ہے۔ صرف پرانے لوگوں میں ہی باقی رہ گئی ہے۔ مگر آپ کی وضعداری دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آپ کی عمر کا حساب لگایا اور سفید بالوں کی گنتی کی تو معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ آپ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اب بھی وضعداری باقی ہے۔ آگے تو عزیزو! بس اللہ ہی اللہ ہے۔''

اظہر جاوید۔اچھا دوست،اچھا انسان

ڈاکٹر مرحب قاسمی

سیماب اکبرآبادی نے کہا تھا۔

عمل بقا ہے، فنا ہے سزائے بے عملی
حیات و موت سب انساں کے اختیار میں ہے

اردگرد نگاہ ڈال کر دیکھ لیجئے، آپ کو دو طرح کے لوگ نظر آئیں گے......ایک وہ جو مر مر کے جیتے ہیں دوسرے جو جی بھر کے جیتے ہیں۔اول الذکر کی اکثریت مسائل کی بہتات کے باعث زندگی کے بوجھ تلے سسک سسک کر، اور لامحدود مسائل کی کثرت تلے پچک پچک کر جیئے جاتے ہیں۔ ہر دو کیلئے زندگی عذاب سے کم نہیں ہوتی اسی کو مر مر کے جینا کہتے ہیں۔ دوسری قسم لوگوں کی وہ ہوتی ہے جو زیست کو مسائل اور وسائل سے اوپر اٹھ کر دیکھتے ہیں چنانچہ ان کی کمی یا بیشی کو حرز جاں بنائے بغیر، اللہ کا انعام سمجھ کر زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے ہیں۔انجوائے کرنے کیلئے وسائل کی ضرورت سے انکار نہیں،لیکن وسائل سے کہیں زیادہ اس رویے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے کہیں مست ملنگی،تو کہیں قناعت پسندی کہا جاتا ہے۔اس رویّے سے زندگی میں ایک الگ سا بانکپن آتا ہے۔جس پر زیست خود اپنی بھید کھولتی چلی جاتی ہے۔ایک فقیر منش انسان جس کے پاس کھانے کو کچھ ہوتا ہے نہ اوڑھنے بچھونے کیلئے کچھ، پھر بھی بادشاہ اس کے در کے منگتے ہوئے ہیں۔اس کی دیگر وجوہ بھی یقیناً ہوتی ہیں لیکن سب سے بڑا سبب میرے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ ہر گھر و ہر در فقیر قناعت کی دولت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے وسائل و مسائل کو خاطر میں نہیں لاتا۔لالچ و طمع سے دور رہتا ہے چنانچہ زندگی اس پر اپنے بھید کھول دیتی ہے۔اندر کی بات معلوم ہو جائے تو زندگی کبھی بوجھ نہیں لگتی اور انسان تونگر ہو جاتا ہے ایسا ہی ایک تونگر داتا کی نگری میں ہو گزرا ہے، جسے جاننے والے اظہر جاوید کے نام سے جانتے اور مانتے ہیں۔

ملک عزیز پاکستان کے ادبی و ثقافتی دارالحکومت ،شہر زندہ دلانِ لاہور کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی، ''تخلیق'' اور اظہر جاوید کا ذکر اس میں لازماً ہو گا میں اظہر جاوید کو اپنے زمانہ طالب علمی سے جانتی ہوں یہ وہ دور تھا جب تخلیق فلمی ستاروں، کھلاڑیوں کی تصاویر کے سہارے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات میں نے دانستہ لکھی ہے......

صرف یہ بتانے کیلئے کہ اظہر جاوید کوئی تارک الدنیا شخص تھا نہ ان کا پرچہ ''نیک پروین'' وہ تب بھی ''اسٹر یگر'' تھا اور آخر دم تک ''اسٹر یگر'' رہا۔، زمانہ طالب علمی میں تخلیق کی باقاعدہ قاریہ اور کسی حد تک قلمی معاون بھی رہی ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ لٹریچر کی دنیا میں (خاص طور پر لاہور کے حلقے میں) مجھے ''تخلیق'' اور اظہر جاوید نے ہی متعارف کروایا تھا۔ تخلیق میرے سامنے تخلیق بنا۔ بننے کا یہ پروسیس، ہفتوں یا مہینوں پر نہیں بلکہ دہائیوں پر مشتمل تھا۔ ایک عینی شاہد کی حیثیت میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اظہر جاوید ایک اہم شاعر، ادیب اور مترجم تھا، لیکن......اس کی بڑی وجہ شہرت تخلیق کی ادارت بنی۔

واقفانِ حال خوب جانتے ہیں کہ فی زمانہ ادبی پرچہ نکالنا کس قدر کٹھن کام ہے یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب لکھے ہوئے لفظ کو قاری اور پرچے کو اشتہار نہ ملیں، ایسے میں اچھے اچھوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ (میں نے حکومتی سر پرستی میں نکلنے والے پرچے دم توڑتے دیکھے ہیں) اس کے باوجود رب جانے کون سی مٹی کا بنا ہوا تھا اظہر جاوید کہ اس نے نہ صرف ماہنامہ ''تخلیق'' کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھا، بلکہ کئی اہم اور ضخیم نمبر بھی نکالے۔ ان میں ''سندھی ادب و ثقافت نمبر'' انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس نمبر کی ترتیب میں میں بھی شامل تھی بلکہ اس لئے کہ وہ نمبر ایک ایسے دور میں منظر عام پر آیا جب لسانی، تفرقہ بازی کے ذریعے ملک کے فکری اتحاد کو پارہ پارہ کرنیوالی قوتیں شدومد کے ساتھ سرِ عام مذموم کارروائیاں کر رہی تھیں، ''تخلیق'' کے ''سندھی ادب وثقافت نمبر'' نے سندھی اور اردو زبان کے بیچ پل کا کردار ادا کیا۔ اردو اور سندھی ادیب، شاعر و دانشور ایک دوسرے کے قریب آئے اور یوں فکری انتشار کا مذموم منصوبہ ناکام ہوا۔ (نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب پھر سے ایسے نمبروں کی اشد ضرورت ہے میرے اختیار میں ہوتا تو محولہ بالا نمبر نکالنے پر اظہر جاوید کو واجب سرکاری اعزاز کا حقدار ٹھہراتی۔ بقول کسے ؎

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر قیامت کی طرح
یہ الگ بات کہ ہم نے سخن آرائی کی

تخلیق کا ہر شمارہ اٹھا کر دیکھیں۔ اظہر کا اداریہ ہمارے سماجی مسائل اور درپیش ہولناک حقائق کا اظہاریہ ہوتا تھا۔ ان کے قلم سے ٹپکے لہو بیز الفاظ، تمام تر حساسیت، روحانی تڑپ احساسِ محرومی سے پھوٹتی ننھی سی امید کی کرن پر مشتمل ہوتے تھے۔ لسانی اور علاقائی سرحدوں کی حد بندیوں سے بے نیاز، اس کی آواز معاشرے کے سخت گیر اصولوں، نام نہاد حکمرانوں سماج کے ٹھیکیداروں کے خلاف ایک باغیانہ لحن ہے۔ وہ دنیا داری سے دور نہ تھا، پر شر میں بھی خیر، تلاشتا تھا۔ یہ اس کا کمال تھا کہ لاہور کے ادبی ''قدر آوروں'' اور گروہوں میں اس نے اپنی شناخت پیدا اور قائم رکھی جو اس کی وفاداری بشرط استواری کی ٹھوس دلیل ہے۔ منکسر المزاجی، ادب ولحاظ، روایتی پاسداری، مستقل مزاجی اور انوکھا بانکپن اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ انہوں نے ساری زندگی دوستیاں نبھائیں، بساط بھر نوازا۔ فکر کو عمل میں ڈھالا۔ آج جب وہ ہم میں نہیں تو بے شمار واقعات یاد آرہے ہیں۔ جن کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ ان کی روح سے شرمندہ ہیں۔ ہم ادب کی وہ بے لوث خدمت کر ہی نہیں

پائے جس کے وہ ہم سے متقاضی تھے۔

ماضی کے اوراق پلٹتی ہوں تو کئی واقعات قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔1984ء میرے ادبی کیئریر کا ''ٹرننگ پوائنٹ'' تھا۔ جب تین ماہ کیلئے مجھے اسلام آباد قیام کرنا پڑا۔ جہاں میرے پروجیکٹ کے ساتھ ساتھ بقول حسرت موہانی چکی کی مشقت اور مشق سخن بھی جاری وساری تھی۔ مختلف ادباءشعراء اور محققین کی محافل میں یہ احساس جڑ پکڑتا گیا کہ سندھ کی ادبی وثقافتی علمیت کے بارے میں یہاں مکمل معلومات نہیں ہیں۔ یہ فاصلے بُعد مٹانے کیلئے طبیعت میں عجب بے چینی وانتشار بڑھتا گیا۔ مجھے پلیٹ فارم چاہیے تھا۔ ابتداً محترمہ صدیقہ بیگم اور اظہر جاوید کے رسائل کیلئے چند تراجم بھیجنے سے دوستی وخیر سگالی کا یہ سلسلہ آخر ''تخلیق'' کی تدوین وترویج سے جاملا۔ تین ماہ مسلسل اس خاص نمبر کیلئے میں نے دن رات لکھا۔ ادباء وشعرا سے تراجم کروائے۔ اس دوران اظہر جاوید نے جامشورو کا چکر بھی لگایا۔ میں ان کی ہمت کو سلام کرتی ہوں۔ کیونکہ یہ نمبر اب ''ریفرنس نمبر'' کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ مجھے سندھ اور پنجاب کے درمیان پل بنانے کا سہرا اظہر جاوید کو جاتا ہے۔ یہ اعتراف میں تادم حیات کرتی رہوں گی۔

اظہر جاوید کی شخصیت کو وہ مقام نہ مل سکا جس کی متقاضی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا وہ وفاداری بشرطِ استواری کی مکمل تصویر تھے۔ دوستیاں نبھانا، ادبی سفر کی کٹھنائیوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا انہی کا وطیرہ تھا۔ انہوں نے ادب کیلئے انتہائی قربانیاں دیں۔ یقیناً وہ ہر قسم کے اعزاز کے مستحق ہیں۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

◆◆◆

جاوید اقبال (آرٹسٹ)

''اظہر جاوید کو مرحوم کہنا بہت سی محرومیوں کا احساس دلاتا ہے اس سے دوستی سن اور وقت سے آزاد تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس سے کب ملاقات ہوئی تھی، نئے شہر میں وارد ہوتے ہی یا ''امروز'' اخبار کے برآمدوں میں۔ ہر شخص پہلی ہی ملاقات میں اپنا تاثر چھوڑ جاتا ہے جو سالہا سال اس کی شخصیت کا ہالہ بن جاتا ہے اس کی خلوص بھری مسکراہٹ خوبصورت جملہ کھنکھناتی، ہنسی ملنے والوں کو اپنے حصار میں لے لیتی۔ تھی ادبی پرچہ نکالنے اور مسلسل نکالنے میں اس نے اپنی دشواریوں کا واویلا نہیں کیا۔ صدارتی ایوارڈ ملا تو دوستوں نے اس طرح خوشی منائی جیسے ان کو ملا ہو۔ اظہر کا دل کشادہ تھا اتنی محبتوں کا بوجھ شائد نہ سہار سکا۔ ایک دفعہ ٹھیک ہو گیا لیکن دوسری دفعہ زندگی ساتھ چھوڑ گئی۔ جاتے جاتے صدارتی ایوارڈ کی عزت بڑھا گیا۔ اظہر کی جدائی کا اتنا دکھ تھا کہ میں اس کے جنازے میں شامل نہیں ہوا کیونکہ مجھے اپنے آنسو دکھانے کا حوصلہ نہیں......!

ہم نے کیا کھویا

لبنیٰ جاوید

سونان نے کہا اظہر جاوید کے لئے کچھ لکھو۔ وہ اپنے دُکھ اور پیار میں یہ بھول گیا کہ عظیم شخصیات پر لکھنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ اظہر جاوید کی شخصیت کی اتنی جہتیں تھیں کہ انہیں سمجھنا خاصا مشکل تھا۔

تو پھر میں کیا صرف یہ لکھوں کہ اظہر جاوید ہمیں بہت عزیز تھے یا وہ ہمیں بہت پیار کرتے تھے لیکن وہ تو بہت سے لوگوں کو عزیز تھے اور بے شمار لوگوں سے پیار کرتے تھے۔

تو پھر کیا میں یہ کہوں کہ اظہر جاوید ہمارے بچوں سے حد درجہ محبت کرتے تھے اور انہیں اپنے بچوں کا درجہ دیتے تھے لیکن یہ تو میں نے بہت سے دوستوں کو کہتے سُنا ہے کہ اظہر جاوید اُن کے بچوں سے بہت لاڈ، دُلار کرتے تھے اور ہمیشہ ان کو چاکلیٹ اور ٹافیاں دیتے تھے۔ کرسمس کے موقع پر کنول فیروز صاحب کے گھر ان کی بیٹی شمائلہ کو ملنے ضرور جاتے۔ عمرانہ کی بیٹی کو اپنی بیٹی جانتے تھے۔ سیما پیروز کے گھر گئے تو دیکھا ان کے بچوں سے بھی وہی پیار کا انداز تھا۔ میری بہو ثنا اور بھانجی عائشہ سے بھی ان کو بہت لگاؤ تھا۔ بینا طاہر کی بیٹی غزل کے لئے بھی ہمیشہ پھول لے کر جاتے۔ بیٹیوں کو پیار کرتے نہ تھکتے۔ انہیں شائد سلمونیا بہت یاد آتی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تمام بچے بھی اُن کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے اور عمروں کے فرق کا تو اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے تینوں بیٹے وقاص، عمر اور احسن اُن کی بہت عزت کرتے تھے لیکن فقرہ بازی دونوں طرف سے جاری رہتی تھی۔ اظہر جاوید ان بچوں کے ہر جملے کو محبت سے برداشت کرتے اور مزیدار جواب دیتے تھے۔ میں لطف اٹھاتی تھی۔

اظہر جاوید کی ایک اور عادت تھی کہ کبھی کسی کے گھر خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے اور وہ اپنے گھر بھی کبھی خالی ہاتھ نہیں گئے۔ بہو اور پوتے پوتی کے لیے ہمیشہ نئی نئی چیزیں لے کر جاتے اور بچوں کو گود میں بٹھا کر سونان سے کہتے ''ہماری تصویر بناؤ''۔ میرے بچوں کے ساتھ بھی انہوں نے کئی تصویریں بنوائی تھیں اب یہ ان کی یادگاریں ہیں۔

اظہر جاوید اپنے آپ کو اس زمانے کے لئے Misfit قرار دیتے تھے۔ اُن سے خوشامد نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ دنیاداری کی سیڑھی نہیں چڑھ پائے۔ البتہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو اوپر لے جانے کے لئے سیڑھی کا کام ضرور کیا۔ انہیں معلوم ہی نہیں

تھا کہ آج کل اپنے آپ کو "Market" کرنے کے کیا گُر ہیں اور کیسی کیسی بے ضمیری کرنی پڑتی ہے۔ ان کا ہر انداز معصومانہ تھا۔

اپنی ذات پر ایک نظم لکھنا چاہتے تھے۔ اس کا عنوان انگریزی میں تو انہیں معلوم تھا لیکن بصد کوششِ بسیار اُس کا موزوں اُردو ترجمہ ان سے نہ بن پایا۔ مجبوراً انہوں نے انگریزی عنوان "Misunderstood" سے ہی کام چلایا:

''پیار کا میں مخزن ہوں، مجھے سمجھا نہیں کوئی۔''

اظہر جاوید دوستی میں بھی کمال کرتے تھے اور ان کی دشمنی کا ڈھب بھی نرالا تھا۔ یہاں ''دشمنی'' شائد صحیح لفظ نہیں۔ دشمنی کا ڈنک ان کی لغت میں نہیں تھا اور یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز تھا۔ دراصل وہ بے اصولی اور بے انصافی کو سخت ناپسند کرتے تھے اور جب ان کا کوئی دوست دانستہ یا نادانستہ اس کا ارتکاب کرتا تو کئی کئی دن مضطرب رہتے اور حفیظ جالندھری کے ایک شعر کا یہ مصرعہ دہراتے رہتے۔

''کھا کے جو تیر دیکھا کمیں گاہ کی طرف''

لیکن اس کا دوسرا مصرعہ کبھی نہ پڑھتے۔ اس مصرعے میں جو بات مذکور ہے وہ انہیں پسند نہیں تھی۔

اظہر جاوید کا دل اتنا بڑا تھا کہ آپ اپنے سب دُکھ اس میں انڈیل دیں تو انتہائی حوصلے سے سب کچھ اپنے اندر سمو لیتے تھے اور پھر پورے وثوق سے یقین دلاتے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ واقعی سب ٹھیک ہو بھی جاتا تھا اور دُکھ کی ساری واردات ان کے دل کے کنویں میں ہی غرق ہو جاتی۔

واہ! اظہر صاحب! آپ بھی بڑی شے نکلے! اتنی راز داری سے سُدھار گئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ آپ کی عظمت کا اعتراف تو اب ہوا تھا۔ ابھی تو بہت سی دعوتیں آپ کے اعزاز میں ہونا تھیں۔ بینا طاہر، زرین سلیمان، تسنیم منٹو، سیما پیروز آپ کی اس خوشی میں شریک ہونے کے لئے بے تاب تھیں۔ آپ نے ہماری باری ہی نہیں آنے دی۔ اور تمغۂ اعزاز لینے بھی نہیں گئے۔ اپنے بیٹے سونان کو یہ کام سونپ کر خود میٹھی نیند سو گئے۔ آپ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ بس میرے ساتھ یہ ہی مسئلہ ہے کہ میں ہر کام میں دیر کر دیتا ہوں لیکن اس دفعہ تو آپ نے کمال کی جلدی دکھائی۔ سب کو حیران کر دیا۔ آپ کو پتہ ہے جب 14 فروری کی صبح جاوید منظور (آپ کے چہیتے 'شاہ جی'!) آپ کو بار بار کال کر رہے تھے۔ یہ ''محبتوں کا دن تھا'' وہ پوچھتے تھے کہ کتنے گلاب کے پھول جمع ہوئے اور کتنے پھول تقسیم کرنے کا پروگرام ہے۔ آپ کا فون مصروف ہی ملا۔ اُنہیں کیا معلوم تھا کہ عین اُن لمحوں میں آپ دنیا سے اگلے جہان کے لیے رختِ سفر باندھنے میں مصروف تھے۔

آپ کو احساس بھی ہے آپ نے کتنے لوگوں کو دُکھی کیا ہے؟ کتنے لوگوں کو رُلایا ہے۔ جن دوستوں کی آنکھ میں آپ ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے وہ زار زار روئے۔ یہ بھی کوئی دوستی ہے؟ یوں بھی کوئی دوستوں کو چھوڑ کر جاتا ہے؟

اظہر صاحب! آپ کو پتا ہے کہ جب ہم ۱۴ فروری کو سونان اور سعدیہ کے گھر جمع ہوئے تو آپ انتہائی سکون سے لیٹے

ہوئے تھے اور ہم سب اپنے رونے پر قابو نہیں پا رہے تھے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں اور ہم بے اختیار ایک دوسرے کے گلے لگ کر روئے جا رہے تھے۔ سونان اور سعدیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ اندر باہر گھومے جا رہے تھے۔ سعدیہ باتیں کرتے کرتے رونے لگتی اور روتے روتے کام میں لگ جاتی۔ آپ نے اُس کے ساتھ لاڈ بھی بہت کئے۔ وہ بہو نہیں بیٹی تھی اور آپ کو دل سے ابو مانتی تھی۔ آپ کی خدمت کو عبادت سمجھتی تھی۔ آپ ٹھیک ہی اُس کی تعریف کرتے تھے۔ ''بہت ہی پیاری بچی ہے۔ اللہ سب کو ایسی بہو دے۔'' اور وہ سونان جسے آپ ہمیشہ ''نالائق بچہ'' کہتے تھے۔ اگر اب اس کو دیکھیں تو فخر سے آپ کی چھاتی پھول جائے گی۔ اس نے انتہائی صبر اور حوصلے سے آخری رسومات پوری کیں اور اب ہر روز آپ کی بھگوان سٹریٹ والی بیٹھک سجائے رکھتا ہے۔ آپ کے تمام دوست حسبِ معمول ''تخلیق'' کے دفتر آتے ہیں اور دروازہ کھلا دیکھ کر آپ سے ملنے کے لیے اندر آتے ہیں، آپ کی کرسی پر سونان کو بیٹھا دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اظہر جاوید زندہ ہے۔ تخلیق زندہ ہے۔ ادب کا یہ باوقار صحیفہ اب سونان اظہر جاوید مرتّب کرے گا۔ کئی مدیران کے بچوں نے اپنے باپ کی نشانی مٹا دی۔ لیکن سونان ''تخلیق'' کو زندہ رکھے گا۔ انشاء اللہ۔ انشاء اللہ!

◆◆◆

اظہر جاوید

''حضرت علیؓ کا قول ہے...... ''دوستوں کو آزماؤ نہیں...... ورنہ اکیلے رہ جاؤ گے''
میں بھی بہت اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس لیے اصولوں کی کسوٹی پر دوستوں کی آزمائش کرتا آیا ہوں
خدا کا شکر ہے...... تنہا ہونے کے باوجود کسی کا محتاج نہیں۔ کسی ادیب، شاعر کے زیر احسان نہیں۔
''تخلیق'' پر کچھ لوگوں کی عنایات ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ چھپنے کی للک ہے نہ ناموری کی۔
نہ تشہیر کا چسکا ہے نہ شہرت کا لپکا۔'' (اپنی بات)

....

اظہر جاوید

مرنا اپنے بس میں نہیں، جینا ہم کو راس نہیں
کہنے کو مختار ہیں لیکن کوئی بھی حق پاس نہیں

محبتوں کے سفیر اظہر جاوید کی یاد میں

عمرانہ مشتاق

سقراط نے کہا تھا کہ دنیا عاقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر صبح قیامت تک آنسو بہاتی رہے گی۔اس میں بالکل شک نہیں ہے کہ یہ بات اکیسویں صدی میں بھی اتنی ہی تازہ ہے جتنی سقراط فلسفی کے حلق سے نکل کر خلق تک پہنچی تھی۔ ہمارے بہت ہی اچھے شاعر، ادیب اور صحافی جنہوں نے ادب کی نصف صدی تک بے پناہ خدمت کی اور اپنے پیچھے لاتعداد چاہنے والوں کو چھوڑ گئے، میری مراد اظہر جاوید سے ہے......وہ محبتوں کو تقسیم کرنے والے محبتوں کے سفیر تھے اور محبتوں کے سفیر اظہر جاوید بھی اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔اظہر جاوید ایک آزاد منش، درویش صحافی، جس نے صحافت کو اس لیے خیر باد کہہ دیا تھا کہ میتھیو آرنلڈ کا قول انہوں نے پڑھ لیا تھا کہ صحافت ادب کی عاجلانہ تخلیق ہے اس کے الفاظ میں (Journalism is a litrature in a hurry) یعنی صحافت وہ ادب ہے جو عجلت میں تخلیق کیا گیا ہو اور اظہر جاوید عاجلانہ ادب کے قائل نہ تھے اس لیے انہوں نے ادب کی جو طرح ڈالی، وہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور تھا، انہوں نے یہ شاندار روایت ڈال کر ادب کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ان کا شعر و ادب کے حوالے سے کیا ہوا کام کوہ ہمالہ سے بلند اور بڑا مستند ہے۔وہ دوسروں کے لیے جیتے رہے اور دوسروں کے لیے مر گئے۔دوسروں کی ترقی کے لیے اس محسن کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

بقول حبیب جالبؔ

دنیا کا جن کو درد ہے معدودے چند ہیں باقی تمام اپنی ترقی پسند ہیں

کیسے کیسے جلیل القدر، عظیم المرتبت، انسان ہمارے درمیان سے اٹھتے جا رہے ہیں تاہم یہاں نہ بڑے ادیبوں کی کمی ہے اور نہ ہی شاعروں کے وجود سے یہ کائنات خالی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے حاذق طبیب بھی موجود ہیں اور ڈاکٹر سائنسدان، صحافی، مقرر و خطیب بھی اس گلستان میں چہک رہے ہیں۔مگر مجھے ان میں کوئی ایسا شاعر و ادیب دکھائی نہیں دیتا، جسے اس دور کا عظیم المرتبت مسیحا کہا جا سکے۔ہماری اس بستی سے بڑے انسان دبے پاؤں نہ صرف ہماری محفلوں سے بلکہ بزمِ خیال سے بھی بھاگے جا رہے ہیں۔اظہر جاوید کا شمار بھی انہی بڑے انسانوں میں ہوتا ہے جو غم و اندوہ کے سمندر اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے رہے۔اپنا غم تو انہوں نے کبھی کسی سے بھی Share نہیں کیا۔مگر

دوسروں کے درد وغم میں ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔

14 فروری کا دن میری زندگی میں ایک عظیم انسان کی موت کا پیغام لے کر آیا۔ یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جو ہنستا ہنساتا، اپنے دفتر میں مہمان نوازی کرتا تھا، وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائے گا۔ اظہر جاوید کے دوستوں نے اس کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور خاص طور پر محترم انور سدید کی تحریر میں اظہر جاوید کی زندہ و جاوداں ہونے کی تفصیل موجود ہے۔ 40 سال سے زائد عرصے پر محیط ''تخلیق'' کا شاندار ریکارڈ موجود ہے۔ کتنے گمنام ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں کو اظہر جاوید نے شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا اور خود ہمیشہ کی طرح بھگوان سٹریٹ تک محدود ہی رہے۔ ویسے وہ پوری دنیا کے شاعروں اور ادیبوں سے رابطے میں تھے۔ ان کے رابطے اور ضابطے بڑے ہی حسین و جمیل ہوا کرتے تھے۔ سمندر پار شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی کرنا تو کوئی اظہر جاوید سے سیکھے۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

حفظ مراتب کا خیال رکھنا اور اپنے سے بہت چھوٹوں کو بھی بڑا بنانا، اس آسمان ظرف انسان سے کوئی سیکھے۔ وہ اپنے حسنِ اخلاق کی بدولت دوستوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ شخص جس نے کبھی بھی اپنے ذاتی دکھوں کا اظہار نہ کیا ہو بالآخر ایک وقت آتا ہے کہ اندر سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے اندر کے انسان کو باہر سے بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے مگر کب تک؟ کاش ہم اپنے زندوں کے درد وغم کو بھی کبھی کبھی کرید لیا کریں۔ مگر ہمیں تو اس وقت ان کا خیال آتا ہے جب ہم ان کے جنازے میں شریک ہو کر یہ دیکھتے ہیں کہ سارا شہر اس کے جنازے میں موجود ہے اور وہ شخص جو تنہائیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا وہ جان سے چلا گیا۔ اظہر جاوید کے دفتر میں ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں کی آمد ورفت لگی رہتی تھی۔ صدارتی ایوارڈ جسے 23 مارچ 2012 کو انہوں نے خود وصول کرنا تھا وہ ان کے بیٹے سونان نے وصول کیا۔ دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے تھے، تو اظہر جاوید اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ وہ ایوارڈوں سے بلند ہو گئے۔ لیکن اپنے مرنے کے بعد بھی وہ فیوض و برکات کی کتنی خوبصورت طرح ڈال گئے کہ ان کے بیٹے کو اپنے باپ کی عزت، شہرت اور دولت ملی ہے۔

اظہر جاوید اپنے مالکِ حقیقی کے پاس چلے گئے۔ اب اظہر جاوید کے لیے دورِ خزاں یا فصلِ بہار دونوں موسم اس اس دنیا میں نصیب نہیں ہوں گے، اظہر جاوید جس کی تخلیق تھا اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اظہر جاوید کا اپنا ''تخلیق'' جس میں اس کا خونِ جگر صرف ہوتا تھا وہ اب اس شان و شوکت سے شاید منظر عام پر نہ آسکے لیکن ان کے بیٹے کے ولولے زندہ ہیں اظہر جاوید کے دفتر میں کئی سفید پوش خواتین وحضرات آتے تھے اور وہ ان کی ماہانہ مدد کیا کرتے تھے کئی خواجہ سرا آتے اور اپنا ماہانہ لے جاتے۔ اظہر جاوید کسی کو معلوم بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ بات بڑی خوش آیند ہے کہ ان کے بیٹے نے باپ کی میراث کو سنبھال لیا ہے اور ''تخلیق'' باقاعدگی سے شائع ہوگا اور احباب کو ملتا رہے گا۔ اظہر جاوید جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، بے شمار محاسن کا مجموعہ تھے، ان کے پاس اب اور کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی سوائے دعائے مغفرت کے، مولا کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پوری دنیا میں لاتعداد چاہنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

◆◆◆

میرے عشق کے کئی سلسلے

دُردانہ نوشین خان

زندگی عناصر کی ترتیب ہے۔ ترتیب کا منتشر ہونا موت ہے۔ موت مہارت سے وقت کی تشخیص ہے۔ موت زندگی کا کبھی مسئلہ نہیں رہا البتہ موت کا ٹھکانہ زندگی ہے۔ موت قدسی بھید ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا فرمان ہے:

''لوگوں سے اس طرح ملو کہ اگر مر جاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق رہیں۔''

ہر انسان اپنے حصے کی حیاتی اپنے متعین کردہ حلقے میں بسر کرتا ہے۔ ہر زندہ انسان کے گزر جانے کے بعد اسے کچھ لوگ یاد کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ کسی کے نصیب میں چند، کسی کے نصیب میں ہزاروں، لاکھوں یا اَن گنت...... یہ وہ نصیب ہے جسے دوران زندگی انسان خود بناتا ہے۔

1938ء کو پیدا ہونے والے اور 1969ء میں تخلیق کو جاری کرنے والے اظہر جاوید 2012ء کو زمینی رین بسیرا چھوڑ کر ہم سے دور چلے گئے۔ ہماری یادوں کا حصہ بن گئے۔

آج ان کے یاد کرنے والوں کا حلقہ اپنے اپنے تعلق کی پٹاری کھولے مغموم ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اظہر جاوید روزنامہ ''امروز'' سے وابستہ رہے تھے۔ حریّت، میں کالم نگاری کرتے تھے، پنجابی کہانیوں کی کتاب پر ایوارڈ حاصل کیا۔ بلغارین افسانوں کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ سب ان کی زندگی کے روشن ستارے ہیں۔ اظہر جاوید نے اپنی کتاب ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' میں اپنی مزاجی کیفیات کا ذکر خود کیا ہے۔ اپنے لااُبالی پن اور اضطرار کے ساتھ اپنے رکھ رکھاؤ، گفتگو اور سلیقہ مندی کے عنوان بھی جمائے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے مزاج اور فطرت کے بہترین جان کار تھے۔ اس کتاب سے مزید تعارف ان کے نسب نامے سے ہوا کہ اظہر جاوید کی والدہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ خالائیں اور ماموں ڈگری ہولڈر تھے۔ شائد اس بہترین ماحول کے اثرات تھے کہ وہ خواتین کو برابر کا درجہ دیتے اور رومانوی اعتماد سے بات کرتے تھے۔

میرے لئے اظہر جاوید زندہ ''تخلیق'' تھے۔ ''تخلیق'' کے مدیر کی حیثیت سے اُن سے غالباً 2007ء میں پہلا رابطہ ہوا مگر بعد میں یہ رابطہ تعطل کا شکار ہو گیا کہ میں اپنے عائلی فرائض میں کھو گئی تھی۔ 2010ء میں یہ رابطہ پھر بحال ہوا۔ انھوں نے میرے

مکتوب کا والہانہ استقبال کیا۔اُن کا جوابی خط آج بھی محفوظ ہے۔لکھتے ہیں:

''آپ اچھا لکھنے والی ہیں۔یہ تو میں مانتا ہوں مگر آپ اتنا ''دل نشین'' خط بھی لکھ لیتی ہیں، یہ نہیں جانتا تھا، واقعی......دل نشین خط جو دل میں چوکڑی مار کر بیٹھ گیا ہے...... جسے پنجابی میں ''نِٹھ کے بیٹھنا'' کہتے ہیں۔ میں نے یہ خط فائل میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

اظہر جاوید فون پر بالعموم سنجیدہ اور ''ٹو دی پوائنٹ'' بات کرتے تھے مگر کبھی کبھی بذلہ سنجی سے بھی کام لیتے اور کبھی لفظوں کا کیچ/ تھرو شروع ہو جاتا مگر اُن کا کیچ کبھی ڈراپ نہ ہوتا تھا۔وہ 19 سال کی عمر میں ادب کے سمندر میں اُترے تھے۔انہوں نے ادبی چہروں کو دیکھتے پرکھتے اور لاکھوں لفظوں کو جانچتے تولتے زندگی بسر کی تھی۔وہ لفظوں کے بہاؤ کے ہر رُخ پر چپوار چلانا جانتے تھے۔میں اُن کے سامنے ''اَن گھڑ اناڑی'' تھی۔لیکن وہ اپنی باتوں سے یہ احساس زائل کر دیتے اور مجھے احساسِ وقار سے سرشار کر دیتے۔میں 2010ء میں ایک علمی کانفرنس میں لاہور گئی تھی۔لیکن اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔وہ چائے کے وقفے میں اُٹھ کر چلے گئے تھے۔جب میں نے فون کر کے اپنی آمد کا بتایا تو انھوں نے نہایت اصرار سے دفتر ''تخلیق'' آنے کی دعوت دی۔یہ میری سپیشلٹی نہ سہی اور یہ اُن کے مزاج کا حصہ سہی مگر مجھے اچھا لگا......

''تخلیق'' بیالیس سال سے جاری ہے۔یہ مقبول ادبی پرچہ کاغذ اور چھپائی کے معیارات سے بالاتر ہے۔اس کے مضامین نظم و نثر دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور پھر ان پر ''انجمنِ خیال'' میں پڑھنے والے بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''تخلیق'' رسالہ نہیں ادبی محفل ہے۔حلقۂ اربابِ ذوق ہے۔

اظہر جاوید شاعر، کالم نگار، مترجم اور پنجابی کہانی نویس بھی تھے لیکن اگر وہ یہ سب کچھ نہ بھی ہوتے تو اُن کے تعارف کی تکمیل اور تعظیم کے لیے 42 سال کی کٹھنائیوں اور نشیب و فرازِ حیات کے باوجود ایک ادبی پرچہ نکالتے رہنا بہت بڑا اعزاز تھا۔معلوم نہیں کتنے نئے لکھاریوں کو اُنھوں نے بامِ شہرت پر پہنچایا اور انہیں ادب کا ستارہ بنا دیا۔گذشتہ برس انھیں ادبی خدمات پر اعلیٰ سول ایوارڈ سے نوازا گیا۔اللہ کا شکر ہے یہ اعلان اُن کی زندگی میں ہو گیا تھا گو بہت تاخیر سے ہوا۔

ع رموزِ مملکت خسرواں دانند

میں جب ''الف۔جیم'' کی یادیں تازہ کرنے بیٹھی ہوں تو ایک سوال (جس کا جواب مجھے کل معلوم تھا نہ آج) اُبھرتا ہے...... کہ اب کچھ عرصہ سے اُن کی جانب سے میرے لیے ایک بے سبب سی سرد مہری کیوں پیدا ہو گئی تھی؟ میری تحریروں سے وہ کیوں بے اعتنائی کر رہے تھے۔لیکن میں ان کی مدیرانہ شفقت کا اعتراف کرتی ہوں۔اُن کے لئے صدقِ دل سے دُعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی رضا، مغفرت اور ابدی راحت سے نوازے۔

◆◆◆

دیکھا اِس بیماریٔ دل نے......

منور سلطانہ بٹ

بہت سال پہلے جب میری آنکھیں میری سوچوں کا دامن تھام کر ادب کے روشن سفر پر گامزن ہوئیں تب میں گوجرنوالہ میں رہائش پذیر تھی۔ یہ 1984 کی بات ہے۔ میں بی۔اے کی طالبہ تھی اور ادبی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اُن دنوں جان کاشمیری (مدیر 'قرطاس') دوسرے احباب کے ساتھ مل کر ادبی تقاریب منعقد کرواتے تھے۔ ایسے میں ایک مشاعرے میں اظہر جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مشاعرے کی صدارت فرمائی، میں نے اپنا کلام ترنم سے سنایا۔ اظہر جاوید صاحب نے مجھے مشقِ سخن جاری رکھنے کی تلقین کی اور آنے والے ''تخلیق'' میں میری غزل شائع کی۔ اُس کے بعد 1989ء میں جب میں لاہور منتقل ہوئی تو پھر اُن سے بھگوان سٹریٹ میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو اُن کی رحلت تک جاری رہا۔

اظہر جاوید صاحب کے چاہنے والے یوں تو ہر ملک، ہر شہر میں موجود رہے ہیں لیکن بھارت میں بسنے والے دوستوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ شاید اس لیے وہ متعدد بار وہاں گئے۔ بھارت کا ذکر آیا تو وہ سب سفر ایک ایک کر کے یاد آ رہے ہیں جو اُن کی رہبری میں کیے۔ 1998ء میں پہلی مرتبہ جناب قتیل شفائی کی رہنمائی میں اظہر جاوید صاحب، محترمہ نجمہ خاں اور راقم نے رامپور رضا لائبریری کے دوسو سالہ جشن میں منعقدہ مشاعرے میں شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت جناب کیفی اعظمی نے کی تھی۔ یہ ایک یادگار مشاعرہ تھا اور کیفی اعظمی سے اکلوتی ملاقات اسی مشاعرے کی مرہونِ منت ہے۔ اس سفر کے وسیلے سے جناب کشمیری لال ذاکر، جناب نارنگ ساقی، ڈاکٹر ڈبلیو۔ ایچ صدیقی، کیول سوری مرحوم، ظہیر ناصر مرحوم اور بہت سے دوسرے احباب سے پہلی بار ملنے کا شرف حاصل ہُوا۔ 2001ء میں آگرہ کانفرنس کے موقع پر دہلی دریا گنج کے ایم۔ ایل۔ اے شعیب اقبال صاحب نے دہلی کے وائیکا ہال میں انڈو پاک مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت سابق وزیر اعظم بھارت آنجہانی وی۔ پی۔ سنگھ کر رہے تھے۔ پاکستان سے جناب احمد فراز (مرحوم)، جناب محمود شام، اظہر جاوید صاحب اور مجھے بلاوا تھا۔ مجھے یاد ہے اُس وقت انڈیا جانے کا یہ پروگرام صرف چار پانچ دنوں میں طے پایا تھا۔

11 جولائی 2001ء کو جناب قتیل شفائی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۳ جولائی کو ہماری فلائیٹ تھی۔ اظہر جاوید صاحب کو قتیل صاحب سے بے حد محبت تھی۔ اس غم نے اُنھیں اتنا بے حال کر دیا کہ انھوں نے کہا اب اس موقع پر جانا اچھا نہیں لگتا۔ جب یہ بات نوید قتیل (قتیل شفائی کے بیٹے) کو معلوم ہوئی تو اُنہوں نے کہا کہ انسان اللہ کی رضا کے آگے بے بس ہے۔ آپ نے دہلی والوں سے وعدہ کر رکھا ہے آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ پھر 14 جولائی 2001ء میں اس انڈو پاک مشاعرے میں ایک منٹ کی

خاموشی اختیار کر کے جناب قتیل شفائی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔2004ء میں آخری مرتبہ اظہر جاوید صاحب کی رہبری میں پھر بھارت یاترا کا موقع ملا (کیونکہ اس کے بعد اظہر جاوید صاحب اور میں الگ الگ پروگراموں میں انڈیا جاتے رہے)۔اس مرتبہ اُن کے قافلے میں میرے علاوہ جناب سلطان رشک اور تسنیم کوثر اُن کے ہمراہی تھے۔انبالہ میں جناب شفق، لدھیانہ میں جناب کیول دھیر اور شملہ میں جناب شباب للت اور شرما صاحب سب اظہر جاوید کے چاہنے والے تھے۔اظہر جاوید صاحب بھی اُنھیں دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔اظہر جاوید کے دل میں محبتوں کے لیے بڑی وسعتیں تھیں۔اُن کے ایک دل پر بے شمار محبتیں براجمان تھیں۔شاید اس لیے اُن کا دل اس بات کو سہتے سہتے دل کے درد (انجائنا) میں مبتلا ہو گیا تھا۔

آج سے تقریباً دس برس پہلے میں اُن کے دفتر میں بیٹھی تھی جب اُنہیں پہلی بار دل کا اٹیک ہُوا تھا۔میں نے لبنیٰ جاوید کو فون کیا تو وہ بڑی تیزی سے صرف چند منٹوں بعد اپنے شوہر جناب جاوید منظور کے ہمراہ دفتر ''تخلیق'' پہنچ گئیں۔ہم نے انھیں فوراً پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں پہنچایا۔تھوڑی دیر میں اُن کا بیٹا سونان اور بہو سعدیہ بھی پہنچ گئے۔

اظہر جاوید صاحب دل کے پہلے حملے سے دامن بچانے میں کامیاب ہو گئے اور چند دن ہسپتال میں گزار کر گھر واپس آ گئے۔مگر اب اُن کی زندگی کے سفر میں دوائیں بھی مستقل طور پر شامل ہو گئیں تھیں۔اظہر جاوید صاحب اگرچہ بڑے حوصلہ مند تھے لیکن دِل کی اس چھیڑ چھاڑ نے اُنھیں کچھ فکر مند ضرور کر دیا تھا۔پھر اُنہوں نے اپنی بکھری ہوئی شاعری کو سمیٹا اور اُن کی شاعری مجموعہ ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' منظرِ عام پر آیا۔دو تین برس قبل انہیں دوسری بار دل کے حملے سے نبرد آزما ہونا پڑا۔اُنہوں نے کچھ دن ڈاکٹر جاوید سبزواری کے کلینک میں گزارے اور پھر تقریباً ایک ماہ تک اپنے بیٹے اور بہو کے پاس مکمل آرام کیا۔مگر وہ بستر کی بجائے ''تخلیق'' اور ''محبانِ تخلیق'' کے ساتھ وقت گزارنے میں زیادہ آرام اور راحت محسوس کرتے تھے۔چنانچہ وہ پھر اپنے ''تخلیق کدہ'' میں آ کر بیٹھ گئے۔میرؔ نے کہا تھا ؂

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا!

میرؔ کا اشارہ تو غالباً محبت جیسی بیماری دل کی جانب تھا لیکن اظہر جاوید صاحب کو دل کی یہ بیماری حقیقتاً اپنے ساتھ لے گئی۔دل کے تیسرے حملے میں کوئی مسیحا اُن کا درد کم نہ کر سکا، کوئی دوا اُن کے کام نہ آ سکی اور جب تک ڈاکٹر اُن کے پاس پہنچا وہ زندگی کی پہنچ سے بہت دُور جا چکے تھے۔اظہر جاوید جب سے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے ہیں تب سے کتنی آوازیں، کتنے فون، کتنی تحریریں بھگوان سٹریٹ کی جانب سفر کر رہی ہیں۔

بھگوان سٹریٹ جہاں ''تخلیق'' کا مندر آباد تھا اور بقول آپا بانو قدسیہ، اظہر جاوید بھگوان سٹریٹ کے کرشن کنہیا تھے۔کرشن کنہیا (اظہر جاوید) بھگوان سٹریٹ سے نکل کر اپنے پیارے پیارے رب جی کے پاس جا چکے ہیں۔''تخلیق'' کا مندر اب سُونا ہو چکا ہے۔وہاں بجنے والی نقرئی قہقہوں کی گھنٹیاں اب خاموش ہیں۔آنے جانے والوں کا رش ماند پڑ چکا ہے۔اب وہاں اُن کا بیٹا سونان اظہر بیٹھا آنے والوں سے پرسہ وصول کر رہا ہے اور اپنے والد کی یادوں کو اکٹھا کر رہا ہے جو کہ اظہر نمبر کی صورت میں سب کے سامنے آئیں گی۔ خداوند تعالیٰ روحِ اظہر جاوید کو جنت الفردوس میں پر سکون رکھے۔آمین!

◆◆◆

جناب اظہر جاوید......سفیرِ محبت

صائمہ نورین بخاری

وضع داری، سرشاری اور چمنستانِ محبت کی آب یاری یہ سب عناصر یکجا ہوئے تو جناب اظہر جاوید کی زندہ دل، ہمہ جہت، جوہر شناس اور عہد ساز شخصیت وجود میں آئی۔ اظہر جاوید......ایسی شخصیت جو محبتوں کو نئے عنوان بخشنے اور فنِ تخلیق میں مسرت انگیز حیرت کے دریچے سجانے کے ماہر تھے......اظہر جاوید......ایسی شخصیت جس کا فرض اولین قلمکاروں اور تخلیق کاروں کے خوابوں کو صفحۂ قرطاس میں آباد کرنا تھا...... جسے شہرت، دولت اور نمود ونمائش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی......کیوں کہ ان کا دل، دلِ ساحر...... ان کا اندازِ خیال...... خیالِ فیض اور ان کا تصوف، حضرت رابعہ بصریؒ کے صوفیانہ رنگ کا عاشق تھا...... اظہر جاوید......ایسا کاریگر......جو تخلیق کے جواہرات تراشتا تھا......ایسا ایڈیٹر جو تحریر کے سامنے اپنی انا (Ego) کا سر قلم کرنا جانتا تھا......ایسا سچا اور کھرا قلم کار......جس کے ہاں قلم کی حرمت ہی سب معنی رکھتی تھی۔ ایسا بے لاگ تبصرہ نگار جو اپنی بات بھی کہتا تھا اور دل گرفتگی، تہذیب وشائستگی کا دامن کبھی نہ چھوڑتا تھا۔

زندگی سے محبت کا شاعر، صنفِ نازک سے عشق کا شاعر، رنگ خوشبو کو ہمراہ لئے شب سیاہ میں، صبح امید کی پہلی کرن کا انتظار کرنے والا قلم کار اظہر جاوید......جن کی صبح امید ان کے اشعار سے جھلکتی تھی......ے

ہمارے نور سے نکھریں گے آفتاب سبھی
ہمیں سے دہر میں آئے ہیں انقلاب سبھی
خدا سکون کی دولت تمہیں نصیب کرے
ہمارے نام پہ لکھ دو نئے عذاب سبھی

اظہر جاوید کی سب سے اعلیٰ وارفع خوبی ان کی عاجزی وانکساری تھی۔ ان کی سب سے بڑی لگن، فن تخلیق سے عبادت کی حد تک عقیدت تھی......اپنی زندگی کے سب سے بڑے سرمائے یعنی ماہنامہ ''تخلیق'' کے لیے بہترین ادب کی تلاش، نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ان کا مقصدِ حیات تھا......اظہر جاوید کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''اسے احساس ہے کہ وہ ''نمرود کی خدائی'' میں سانس لے رہا ہے اور بندگی میں کبھی بھلا نہیں ہوتا......

ایکسویں صدی میں آتش نمرود نے اسے جھلسا دیا تھا......لیکن وہ اس آگ سے کندن بن کر نکلا......اور اب پہلے سے زیادہ عزم وہمت اور استقلال وایثار سے ادب کی خدمت کر رہا ہے اور اپنی ادبی شخصیت کے سب زاویوں سے منور کر رہا ہے۔اظہر جاوید......اردو دنیا آپ کو سلام کرتی ہے۔''

اور یہ سلام اور یہ اظہار عقیدت اس لیے بھی کہ اظہر جاوید نے اردو ادب کی ایسی بے نیاز خدمت کی کہ اس ہوش رُبا مہنگائی کے دور میں ایک ادبی صحیفہ صرف بیس روپے میں میسر رہا۔

متاعِ فکر سخن، جاں نثارِ علم، وسیع المشرب، محبتوں کے سفیر، اظہر جاوید 4 جنوری، 1938ء کو سرگودھا شہر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔تایا اور چچا نامور لکھنے، پڑھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ماحول کا اثر اور گھریلو فضا، ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ شخصیت کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔نویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے نثر لکھنے اور شعر کہنے لگے۔پرائمری تک گوجرانوالہ میں پڑھا۔پھر سرگودھا منتقل ہو کر شاعرِ شباب الطاف مشہدی سے اصلاح ومشورے کی فضا ہموار کی۔

اظہر جاوید کی والدہ انہیں دنیا کی تقریباً تمام ماؤں کی طرح سرکاری افسر یا ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔مگر انہوں نے ''فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا'' کے مصرعے کو حرزِ جاں بنایا اور انسان بننے کی تلاش وجستجو میں جو ہر نظامی سے رابطہ قائم کیا......مگر کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے اور کچھ ''سانوں مرن داشوق وی سی'' کے مصداق، ظالم شہر، نوجوانی اور مزاج شاعرانہ نے انہیں ایک زوردار عشق کرنے پر مجبور کر دیا......مگر قسمت نے ہمیشہ اچھے عاشقوں کا ساتھ دیا ہے۔میرے اس جملے پر شاید بہت سے محبت کرنے والوں کو اعتراض ہو مگر میرے خیال میں ایک ناکام عشق ہی اچھا عشق ہوتا ہے......محبت کی موت وصال ہے عشق ومحبت کی پختگی، پائیداری اور ہمیشگی......ہجر وفراق کی لمبی مسافتوں میں ہی پوشیدہ ہے۔بہرحال جناب اظہر جاوید نے بھی ایک ناکام عشق کیا۔اور یہ غمِ عشق، ناکام محبت کی صورت میں انھیں بہت سی کامیابیاں اور حوصلہ عطا کر گیا۔وہ حسینہ تو شہر بدر ہوئی سو ہوئی۔جناب اظہر نے بھی شہر چھوڑ دیا۔چناب ایکسپریس میں بیٹھ کر دربدری کے سفر پر روانہ ہوئے۔آخری اسٹیشن کوئٹہ میں جا کر ٹرین ٹھہری۔خدا کا شکر ہے کہ خالہ جان کا گھر وہیں تھا ورنہ بقول ان کے ''ایران وزاہدان جانکلتے''۔منشی فاضل کا امتحان بخوبی دیا۔مگر دنیا میں یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو امتحان دیا جائے اسے پاس بھی کیا جائے۔دنیا تو خود امتحان گاہ ہے بس یہی سوچ کر 61-1960ء، میں شادی کر لی۔خود فرماتے تھے ''ان دنوں بیوی اور بے روزگاری بیک وقت ہم رکاب رہیں۔''

صحافت کی دنیا میں، بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کی مدبر شخصیت کو آئیڈیل بنایا اور ان کی طرح اصولوں کی صحافت پر عمل پیرا ہوئے۔''امروز'' میں صحافتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔69ء میں ''تخلیق'' کی ابتداء کی۔''تخلیق'' باقاعدہ ماہنامہ بننے سے پہلے مجموعہ نظم ونثر کے طور پر بھی شائع ہوتا رہا۔جناب اظہر جاوید کی مدیرانہ فنی صلاحیتوں نے اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔اس دوران بھی ''تخلیق'' کا سرمایہ ان کے ساتھ رہا۔جب مارشل لاء حکومت نے ''امروز'' کی صحافتی ذمہ داری ان سے جبراً چھین لی۔شدید دلی صدمے کی حالت میں سات سال بے روزگاری کے دن جبر سے اور جبر کے دن صبر سے

کاٹے......مگر تخلیق شائع ہوتا رہا......شاعر، ادیب اور تخلیق کار ''تخلیق'' کی بدولت ادبی سیڑھیاں چڑھتے گئے اور نامور ادیب وشاعر کے سانچوں میں ڈھلتے گئے۔ ''امروز'' بحال ہوا اور کچھ عرصے کے بعد 1991ء میں اسے ہمیشہ کیلئے بند کر دیا گیا۔ مگر اظہر جاوید پر اس وقت تک تصوف اور صبر برداشت کی نئی دنیا آشکار ہو چکی تھی۔ وہ بادلوں سے دور، فاصلوں سے پرے، من کی دنیا کو انجانی خوشیوں کے تصور سے اجال چکے تھے ؎

بادلوں سے پرے روشنی کا گماں
فاصلوں سے پرے زندگی کا نشاں

....

وہ نظر کیا تھا کہ جس کے کھو گئے سارے افق
یہ زمیں کیسی ہے جس کو آسماں ملتا نہیں
ذہن کہتا ہے کہ چل مرشد کے در پر بیٹھ جا
اور دل بے چین ہے، وہ جانِ جاں ملتا نہیں

اور جب یہ کیفیت دلِ مضطرب میں جاگزیں ہو جائے تو وہ صرف کیفیت نہیں رہتی بلکہ معرفت کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہی معرفت اسے عشق کی ان منازل تک لے جاتی ہے جب تمام نارسائی کے غم، دکھوں سے لبریز زخم، آگہی کے چراغ بن کر دلِ بے تاب کو سکون فراہم کرنے لگتے ہیں۔ سبز پتوں، ہری شاخوں اور سرخ گلابوں کے موسم، خزاں رُت میں بھی شاخِ دل پر چٹکنے لگتے ہیں اور نامہربانی، درد کی راحت بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو وہ کہتے ہیں۔

ذہن کہتا ہے کہ چل مرشد کے در پر بیٹھ جا

اظہر جاوید نے لاہور کے ایک ادبی ماہنامے ''عکسِ نو'' کی ادارت بھی کی۔ اس سلسلے میں کراچی بھی گئے۔ سال بھر میں واپسی ہوئی۔ اور لاہور واپس آ کر پنجابی فلم کی کہانی، گانے اور اسکرین پلے لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے دو گانے نور جہاں اور مہدی حسن کی آواز میں ریکارڈ ہوئے۔ مگر فلم نہ بن سکی۔ روزنامہ ''جمہور'' میں کالم نگار کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے۔ روزنامہ ''امروز''، لاہور اور روزنامہ ''حریت'' کراچی میں تقریباً ایک ہی موضوع پر (علمی، ادبی ثقافتی وسماجی) بیک وقت کالم لکھنے کا منفرد اعزاز حاصل کیا۔ ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کراچی ہفت روزہ تقاضے میں کالم لکھے۔ ادبی کالم (امروز) میں ''محفل محفل'' سیاسی وسماجی کالم ''دیدبان'' کے عنوان سے باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔

تصنیفات واعزازات

☆ اردو شاعری مجموعہ ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' ☆ بلغارین افسانے (انگریزی سے ترجمہ) ☆ پنجابی (شاہ مکھی)

کہانیوں کا مجموعہ (ایوارڈ یافتہ) ''بڑی دیر ہوگئی''...... ☆ حضرت رابعہ بصریؒ کی شخصیت پر کتاب ☆ ''ناکام محبت'' ساحر لدھیانوی (دو ایڈیشن بھارت میں بھی شائع ہوئے) ''موت میرے تعاقب میں ہے''...... ☆ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر پہلی طبع زاد کتاب...... ☆ تخلیق کا سندھی ادب وثقافت نمبر...... چھ سو صفحات...... ☆ اردو زبان میں منفرد اور واحد کام...... ☆ تخلیق خلیجی ریاستوں میں اردو...... چھ سو صفحات...... ☆ سفیر پاکستان متعینہ دوحہ (قطر) کی طرف سے تقریب پذیرائی...... ☆ 2004ء ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ (لدھیانہ) 2005ء ساحر گولڈ میڈل (لدھیانہ) ☆ 2005ء اردو مرکز انٹرنیشنل (لاس۔ اینجلس) لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، نقد دو ہزار ڈالر) ☆ اردو اکیڈمی۔ کیلیفورنیا، اری زونا ایوارڈ ☆ پنجابی مجلس (امریکا) شیلڈ۔ ☆ 2008ء ''مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ'' میں مدیر مطبوعات ☆ لائف فیلو اکادمی ادبیات پاکستان۔ 2012ء کو 23 مارچ کی صدارتی ایوارڈ کی تقریب میں تمغہ حسن کارکردگی کا ایوارڈ حاصل کرنا تھا مگر ۔

جلا کے کشتیاں دریا کے ہم بھی پار گئے
ہمارے ساتھ مگر یہ ہوا کہ ہار گئے

بظاہر ہنس مکھ نظر آنے والے اظہر جاوید ''اپنی بات''، اپنی غزلوں اور نظموں میں بے حد اداس نظر آتے تھے۔ نظموں میں ان کی کیفیت مایوسی اور پژمردگی کی حامل رہی۔ بے بسی، دربدری، بے گھری اور اکیلے پن کی زنجیریں ان کے احساس کو جکڑتی رہیں۔ بے نام نغموں، بے نام گیتوں کے ہمراہ وقت کے تصور میں تعبیر کے پیکر تراشنا، ستائش کی تمنا لئے، سکونِ فردا کی تلاش میں بھٹکنا اور بے کیف چاندنی میں سرسراتی ہوئی ہوا کے الجھے ہوئے پیغام سمجھنا ان کا مرغوب مشغلہ رہا۔

غزل میں ان کی چاہت، تمنائیں اظہار کے سارے وسیلے، کائنات کے ایک ہی حسن، ایک ہی رنگ کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ حسن، وہ رنگ ہے تصویر کائنات کا رنگ یعنی صنفِ نازک...... ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی غزلیات میں جب اپنی بے چارگی، بے بسی اور آشفتگی کو غزل کا پیراہن عطا کرتے ہیں تو محسوس یہی ہوتا ہے ان کی ساری زندگانی محض ایک ہی چاند چہرے کی محبت سے عبارت تھی......

پت جھڑ کے زرد پتے، بہاروں کے حسین پھول، لہجے سے چھلکتی راگنی، غزل خواں ارمان اور نگاہوں میں حرارت بھری شرارتیں ایک ہی چہرے سے محبت کے فسانے کہتی تھیں......ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں......

لوگ جب کہتے ہیں برباد سے کیوں رہتے ہو
نام اک یاد تو آتا ہے لیا جاتا نہیں

....

یہی ہے بس مری عرض تمنا
تمہی کو میں دوبارا مانگتا ہوں

اس کو بھی محبت میں سیم و زر کی خواہش تھی
ہم تو صرف شاعر تھے، ایک دل ہی رکھتے تھے
ہار تھی مقدر میں، کیسے جیت سکتے تھے
ہم وہ خوش گماں تھے جو پھر بھی خواب تکتے تھے

اظہر جاوید کو محبت کے سفارت خانے میں تمام زندگی سفیر ہونے کا اعزاز حاصل رہا انہیں دنیائے عشق کے بے تاج بادشاہ ہونے کی نعمت کا بخوبی احساس تھا۔

ے میں وہ سائل ہوں کسی در پر کبھی ٹکتا ہی نہیں
نعمتیں پھر بھی مجھے میرا خدا دیتا رہا......

اپنی بے بسی کی خامیاں، شہرتیں اور بدنامیاں تسلیم کرنا ہر قلم کار کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اظہر جاوید اپنی خامیوں، اپنی بدنامیوں، زیست کی ناکامیوں کو نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ان سب کا، سبب صرف اور صرف اپنی ذات ہی کو ٹھہراتے تھے......اپنی نظم ''فیصلہ'' میں کہتے ہیں۔

''ہم اپنی بے بسی کی خامیاں تسلیم کرتے ہیں
یہ شہرت ہے کہ ہیں بدنامیاں تسلیم کرتے ہیں
حقیقت مان لیتے ہیں
لپکتے، دوڑتے بڑھتے ہمارا پاؤں رپٹا ہے......
اِدھر وکٹوں کے پیچھے سے کوئی انگلی بھی اٹھی ہے......
ہماری عمر کی لمبی اننگز اب ختم ہوتی ہے......
ستارے بجھ گئے ہیں اب
شرارے بجھ گئے ہیں اب
اکیلے پن کی اب کوئی نئی تعبیر کیا ہوگی
کسی بھی عشق کی پاؤں میں اب زنجیر کیا ہوگی
ستم پرور بھلا اب اور بھی تدبیر کیا ہوگی
تو اب ہم ایسا کرتے ہیں......
ہم اپنی خودکشی کا آپ ہی اعلان کرتے ہیں
قلم کاغذ کو دھرتے ہیں

بہت کچھ لکھ لیا ہم نے
بہت دن جی لیا ہم نے
یہ رشتہ توڑ دیتے ہیں
سبھی کچھ چھوڑ دیتے ہیں!!!!

اپنی ایک غزل میں محبت کو شریعت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ے کیا مفتیانِ دہر سے لینا تھا مشورہ
ہم نے تو مہ وشوں میں شریعت تلاش کی
ان کو سلام ہو کہ جنھوں نے بہ فیضِ دل
ناکام ہو کے عشق میں رفعت تلاش کی

بہر حال مفتیانِ دہر ہوں یا مہ وش و پری وش، بلند خیال شاعر ہوں یا کہنہ مشق ادیب، نوجوان قلم کار ہوں یا نو آموز شاعر، آدم بے زار نوحہ خواں ہوں یا محفلوں میں رنگ بکھیرتے سنگیت کار، عظیم ترین نقاد ہوں یا قابل ترین مفکر سب ہی کے لئے ''تخلیق'' پڑھنا اور اس میں چھپنا باعثِ فخر و انبساط تھا۔ ''بھگوان سٹریٹ کے کنہیا'' کی انجمنِ خیال روشن ستاروں سے جگمگاتی رہتی تھی اور جناب اظہر جاوید کا ذہن کسی کمپیوٹر کی مانند سب کی یادوں اور باتوں کے فولڈرز نہایت مہارت اور خوب صورتی سے سنبھالے رکھتا تھا۔ انہیں فون پر کہی چھوٹی سی بات سے لے کر 'انجمن خیال' میں شائع ہونے والے طویل ترین خطوط کی تمام تر گل کاریاں سب یادوں کے البم میں سجانے کا شوق تھا۔ محبت ہی ان کی شریعت تھی۔ اسی لئے 14 فروری کا دن قدرت کی جانب سے ان کی رحلت کے لئے مختص ہوا۔ کہساروں کی برف پر جلتا سورج، آنچلوں کی قطار، جگنوؤں کے قافلے اور پھول بانٹتی ہوئی 14 فروری کی مہکتی ہوا...... جناب اظہر جاوید کی یاد ہمیشہ دلاتی رہے گی...... وہ تخلیق سے وابستہ ہر دل میں رہتے تھے اور ہر دل میں رہیں گے...... ان کی زندہ دلی، خوش مزاجی اور تخلیق سے بے پناہ محبت نے عصری آگہی و ادبی شعور کو معرکہ زیست میں بدل کر رکھ دیا...... ''تخلیق'' کی لوحِ ہستی میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

کسی نے یوں میرے احسان کا بدلہ چُکایا ہے
نئے اِک زخم کا تمغہ مرے دل پر سجایا ہے

تمام عمر بسر کی تو......

تسنیم کوثر

یہ عمر عزیز جو...... بظاہر ہمیں بہت طویل دکھائی دیتی ہے لیکن حادثہ یہ ہے کہ...... پل بھر میں بیت جاتی ہے اور زندگی موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور......رنج والم کی پرچھائیاں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

موت کی آغوش میں دبک جانے والے تو شاید آسودہ ہو جاتے لیکن بہت سے دلوں کو...... دائمی ملال میں ڈال جاتے ہیں۔

لاہور کی ادبی فضا......ان دنوں حزن و ملال سے بھر گئی ہے۔''تخلیق'' کا زرّیں عہد ختم ہوا۔اظہر جاوید سے چالیس بیالیس برس کی رفاقت چھوٹ گئی ہے۔آسمان ادب پر جو ستارہ بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا......وہ اپنی روشنی میں گُم ہو گیا ہے۔الم ونشاط سے گندھی یہ شخصیت راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔آہ!اظہر جاوید چل بسے۔

اظہر جاوید جیسے لوگ ایسے شہابِ ثاقب ہوتے ہیں جو......اپنی ہی تابانی کی زد میں رہتے ہیں......آسمان ان ستاروں سے عموماً نامتفق ہی رہتا ہے۔انہیں ایک عمر......آسمان در آسمان نقل مکانی کرنا ہوتی ہے۔

نقل مکانی......اظہر جاوید کا مقدر ٹھہری مگر......ان کا مقصدِ اولیٰ ہمیشہ ''تخلیق'' رہا۔اس مقصد سے انہوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ یہ ان کے وجود کا دوسرا حصّہ تھا جو بے ثبات نہیں۔

زندگی کو کسی خاص مثبت مقصد کے تحت گزارنے اور پھر......ساری زندگی اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کے جینے والے لوگ خوش قسمت بھی ہوتے ہیں کہ......طمانیت انہیں میسر آ جاتی ہے اور......اپنے کام اور کارکردگی کے حوالے سے وہ اپنا ایک منفرد مقام بنا لیتے ہیں۔

اظہر جاوید بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔

''تخلیق'' سے انہیں عشق تھا۔

''تخلیق''ان کی زندگی تھی۔

ان کی ''تخلیق'' سے لگن......اس کے ادبی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہش میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر وہ اس

مقام پہ آ گئے جہاں دل و جان کی کاوشیں، سرزمینوں کو نمو اور شادابی بخشتی ہیں۔ اظہر جاوید نے 'تخلیق' کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور پھر...... جیسے اپنی عمر ''تخلیق'' کے ساتھ ہی بسر کی...... خود کو وقف کر دیا 'تخلیق' کیلئے۔ اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ جی جان سے انہوں نے اس پودے کی آبیاری کی...... اسے ایک تناور...... گھنا شجر بنایا اور نئے اور پرانے سب لکھنے والوں کو اس کی چھاؤں سے مستفید کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ''تخلیق'' کا کنبہ بڑھتا ہی رہا۔ بزرگوں کے گزر جانے کے باوجود ایک کارواں مرتّب ہوتا چلا گیا۔

فرد سے کارواں بننے تک کا سفر آسان نہیں ہوتا کہ یہ...... راہیں کٹھن اور طویل ہوا کرتی ہیں مگر...... اظہر صاحب نے اپنا یہ سفر بڑے تحمل سے طے کیا...... وہ آبلہ پائی پر بلبلائے نہ مژگاں جنوں آثار سے کبھی کوئی آنسو ٹپکنے دیا...... ہاں یہ ضرور ہوا کہ رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو میں کرب کی آمیزش ہوتی گئی...... لیکن پھر بھی ان کی باتوں سے خوشبو پھوٹتی تھی اور شاعری سے درد چھلکتا تھا۔ ''اپنی بات'' ہمیشہ دُکھ میں بھیگی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' اور ''بڑی دیر ہو گئی اے'' پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں...... ہر سُو کرب ہی کرب بکھرا ہوا ہے۔ دُکھوں کو چھپا کر، لب پہ ہنسی سجا کے جینا مشکل ہوتا ہے مگر...... اظہر جاوید ایسے ہی جیئے۔

اظہر جاوید کو مختلف لوگ، مختلف حیثیتوں سے جانتے ہیں جیسے...... ان کی ایک باعظمت عمارت جو ہر زاویے سے اپنی ایک جداہئیت اور انداز رکھتی ہے اور ہر نگاہ اس عمارت کے مشترک حسن کا احاطہ کرتی ہے۔ اُن کی وضع داری، ملنساری، مہمان نوازی اور انسان دوستی، ان کے ہر ملنے والے کو اپنے حصار میں لئے رکھتی تھی۔

ان کی طویل ادبی خدمات کی قدر زمانے پہ واجب ٹھہری۔ انہیں جیتے جی بھی سراہا گیا...... ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں پرائڈ آف پرفارمنس دینے کا اعلان ہوا مگر...... صد افسوس، یہ ایوارڈ لینے تک وہ جیئے ہی نہیں۔

جھٹ پٹ سناؤنی آ گئی اور...... وہ اپنے دائمی گھر کو چل دیے۔

قریبِ قبر ہم آئے، کہاں کہاں پھر کے
تمام عمر بسر کی تو اپنا گھر دیکھا (انیس)

ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک اس فرشِ خاکی نے ان گنت انسانوں کے نقشِ پا اپنی جھولی میں سمیٹے اور پھر...... انہیں اپنا رزق بنایا۔ اظہر جاوید بھی اب ان میں شامل ہو گئے ہیں مگر...... ''تخلیق'' ان کے نقشق کو معدوم نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس دنیا میں تخلیق کے وسیلے سے جگمگاتے رہیں گے۔

اپنے لفظوں میں، اپنے دوستوں کے دلوں میں اپنے ''تخلیق'' میں اور...... اپنے ''تخلیقیئن'' میں۔

◆◆◆

باعثِ عقیدت ’’اظہر جاوید‘‘

سحر حفیظ

اظہر جاوید اس دنیا میں نہیں رہے۔ مسلسل دو ماہ سے یہ بات سنتے رہنے کے باوجود میں اب تک اس پر یقین نہیں کر سکی۔ اب بھی روزانہ ’’تخلیق‘‘ کے دفتر جاتی ہوں۔ دروازہ کھولتے ہی معمول کے مطابق جواب کی اُمید کے ساتھ باآواز بلند سلام کرتی ہوں تو آنکھیں ان کی تلاش میں خالی کرسی کا طواف کرنے لگتی ہیں اور کان سلام کے جواب کے منتظر ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے نہ ہونے کا یقین پھر بھی نہیں ہو پا رہا۔

میری اُن سے نہ تو سالوں کی شناسائی تھی اور نہ ہی تعلق چالیس پچاس برس پر محیط تھا۔ فقط چند سال کا تعلق اور کچھ ماہ کی رُوشناسی تھی۔ اظہر جاوید صاحب کی شخصیت، فن ان سے وابستگی اور تعلق کے بارے میں اُن کے دوستوں نے تفصیلاً نہایت عمدگی کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے۔ میں تو ادب کی محض ایک طالبِ علم ہوں اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے بھی شاید قاصر ہی رہوں۔

اظہر جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات چند سال پہلے ایک دلچسپ انداز میں ہوئی۔ میری سہیلی کے ایم۔اے کے مقالہ کا موضوع ’’اظہر جاوید کی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ‘‘ تھا۔ اس سلسلے میں اظہر جاوید صاحب سے ملاقات ضروری تھی۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کو ہم تین سہیلیاں کافی تلاش بسیار کے بعد آخر ’’تخلیق‘‘ کے دفتر پہنچیں۔ اُس دن مجھے بخار تھا، کچھ بخار کی نقاہت اور کچھ سہیلی کے جلدی جلدی کے چکر میں ہم بھوکی پیاسی ہی ’’تخلیق‘‘ آ گئی تھیں۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو اظہر جاوید صاحب نے چائے کی پیشکش کی اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے ’’بھئی آپ لوگ پئیں گی تو میں بھی پی لوں گا‘‘ اس سے پہلے کہ میری سہیلی کی طرف سے مزید انکار ہوتا بھوک پیاس کی شدت سے مغلوب ہو کر میں نے کہہ دیا ’’ٹھیک ہے سر! ہم بھی پی لیں گے لیکن ہم خالی چائے نہیں پیتے‘‘ اس کے بعد اظہر جاوید کا قہقہہ اور میری شرمندگی بیک وقت امنڈ کے آئے تھے۔ پھر منٹوں میں کیک، نمکو اور بسکٹ میز پر سج گئے۔ ہم سب نے چائے پی۔ اظہر جاوید صاحب کا انٹرویو لیا اور جب ہم نے واپسی کا قصد کیا تو اظہر جاوید صاحب ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ’’کڑیو! کل جب آپ آئیں گی تو میں آپ لوگوں کے لئے پیزا لے کر آؤں گا‘‘ اگلے دن میں بخار کی وجہ سے جا نہیں سکی لیکن اپنی سہیلیوں کے بقول دفتر تخلیق میں حسبِ وعدہ پیزا بھی موجود

تھا۔ میرے نہ آنے کے بارے میں استفسار بھی کیا گیا اور ڈاکٹر کیول دھیر سے جو اُن دنوں لاہور آئے ہوئے تھے سے اظہر صاحب نے ایک دن پہلے کا قصہ بھی بیان کیا'' بھئی ان لڑکیوں کے ساتھ ایک اور لڑکی آئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی اس نے کہا کہ چائے تو پئیں گے پر ہم خالی چائے نہیں پیتے'' سہیلی سے یہ جملہ سُن کر میں شرمندہ تو بہت ہوئی لیکن اس سے اگلے دن شرمندگی اور سوا ہوئی کہ کیول دھیر صاحب ہمارے جانے سے پہلے دفتر ''تخلیق'' میں موجود تھے۔ تعارف کا سلسلہ شروع ہوا تو میرے باقاعدہ تعارف کے ساتھ اظہر صاحب نے اِن الفاظ کا اضافہ کیا'' یہ وہی لڑکی ہے جس نے خالی چائے پینے سے انکار کیا تھا'' اور پھر یوں ہوا کہ اس کے بعد جب بھی دفتر ''تخلیق'' جانا ہوا کچھ کھائے پئے بغیر اظہر صاحب واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمارے منع کرنے پر کہتے'' مجھے پتہ ہے تم لڑکیاں سیدھی یونیورسٹی سے یہاں آتی ہو اور تمہاری یونیورسٹی میں کھانے کے لئے اچھی چیزیں نہیں ملتیں۔''

ہر بار جب ہم دفتر جاتیں، تو عمر اور مرتبے میں اُن سے کہیں کم ہونے کے باوجود، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ہمارا استقبال کرتے اور واپسی پر دروازے تک چھوڑنے آتے۔ ان کے ہر انداز سے عزت، مان اور شفقت جھلکتی تھی جو ہمیں بار بار ''تخلیق'' کے دفتر لے جاتی تھی۔

اظہر جاوید صاحب کی ذات سے باقاعدہ شناسائی کا در مجھ پر چند ماہ پہلے وا ہوا۔ تعلیمی سلسلہ آگے بڑھانے اور کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بیدار ہوا تو مجھے ''تخلیق'' سے بہتر کوئی اور درس گاہ نظر نہ آئی۔ یہاں اس قدر رہنمائی ملی کہ میں جو شوق کے باوجود قلم اُٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی، تھوڑا بہت لکھنے کے قابل ہوگئی۔ ڈر کم اور حوصلہ بلند ہوا۔ ''تخلیق'' میں روزانہ گزرنے والے چند گھنٹے میرے تمام دن کا حاصل ہوتے تھے۔ اظہر جاوید صاحب کی نصیحتیں، ''لڑکی یہ کتاب پڑھو''۔ ''یہ لفظ ایسے نہیں بولتے'' وغیرہ وغیرہ اب بھی یاد آتی ہیں اور آتی رہیں گی۔ اتنی دعائیں تو مجھے زندگی میں شاید میرے ماں باپ سے بھی نہیں ملی ہوں گی جتنی دعائیں اُن سے ملیں ان کی بہت سی عادتیں جو مجھے اس دوران معلوم ہوئیں، ان میں ایک دوسروں مدد کرنے کا جذبہ ہے ''تخلیق'' کے دروازے پر آنے والا ہر وہ شخص جو اپنا دست سوال دراز کرتا تھا خالی ہاتھ کبھی نہیں گیا۔ ماتھے پر شکن لائے بغیر اظہر صاحب دن میں دسیوں ایسے لوگوں کی مدد کرتے۔ دفتر ''تخلیق'' میں ہر وقت دوست احباب کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور میں برملا کہتی تھی ''دفتر تخلیق اور صاحبِ تخلیق میں ایک مقناطیسی قوت ہے کہ ہر ایک اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے'' اظہر جاوید صاحب میری اس بات پر مسکرا دیتے۔ خوشبو اور پھول ان کی کمزوری تھے۔ گل نرگس ان کے پسندیدہ پھول تھے۔ میں نے ایک دن بھی دفتر پھولوں سے خالی نہیں دیکھا۔

میری ان سے آخری ملاقات 12 فروری کو ہوئی میں نے مذاقاً کہا'' سر میرا کوئی ویلنٹائن نہیں ہے آپ تو میرے دوست بھی ہیں آپ 14 فروری کو میرے لئے پھول ہی لے آئیں'' جواب میں بولے ''اچھا بھئی لڑکی! آپ کا یہ شوق بھی پورا کر دیتے ہیں میں پھولوں والے کو کہہ دوں گا وہ 14 فروری کو پھول دے جائے گا'' اور 14 فروری کو واقعی پھول آئے تھے ڈھیر

سارے، پر وہ سارے پھول......

ان کے دنیا سے اُٹھ جانے کے چند دن بعد جب میں دفتر گئی تو گلدانوں میں گل نرگس سجے ہوئے تھے جو انھوں نے 13 فروری کو منگوائے تھے۔ اتنے دنوں بعد بھی پھول تازہ لگتے تھے۔ انھوں نے پھر اپنا وعدہ پورا کیا پر ملاقات کا وعدہ...... اُن سے میرا کیا رشتہ یا تعلق تھا، وہ تو میں بھی سمجھ نہیں پائی۔ کبھی وہ میرے، ہم عمر، میرے بہترین دوست بن جاتے اور میرے چہرے سے ہی میری پریشانی جان جاتے اور کبھی وہ میرے بزرگ بن کر مجھے زمانے کے سرد گرم کے بارے میں نصیحتیں کرنے لگتے۔ کبھی لگتا وہ چھوٹے سے بچے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر منہ پُھلا لیتا ہے اور خود ہی مان بھی جاتا ہے۔ رہنما اور استاد تو وہ میرے تھے ہی جنہوں نے صحیح معنوں میں مجھے قلم پکڑنا سکھایا اور لفظوں کی پہچان کرائی۔ یہ سلسلہ لمبے عرصہ تک تو نہ چل سکا لیکن بہت کم عرصہ میں بھی اُنھوں نے میری بہت رہنمائی کی۔ وہ میرے دوست، ہمدرد، غمگسار رہنما، ہمراز اور استاد تھے۔ لیکن جو رشتہ میری نظر میں سب سے بڑا ہے وہ عقیدت کا ہے۔ مجھے اُن سے عقیدت ہے، ایسی عقیدت جو ایک بہترین استاد، مشفق بزرگ، خیال رکھنے والے دوست اور سچا راستہ دکھانے والے رہنما سے ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ یہ باہمی تعلقات کا حق ہے۔ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے باوجود ہر وقت اور ہر موقع پر جب مجھے ان کی رہنمائی کی ضرورت درکار ہوتی ہے تو مجھے وہ اپنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی نصیحتیں میرے ساتھ سرگوشی کرتی ہیں، میرا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور ہمیشہ بڑھاتی رہیں گی اور اُن کی یادوں کو میرے دل میں ہمیشہ تازہ رکھیں گی۔ کیونکہ جو لوگ دلوں میں رہتے ہیں وہ دنیا میں موجود ہوں نہ ہوں ہمیشہ ان کی موجودگی کا احساس قائم رہتا ہے۔

اظہر جاوید صاحب کی بہت سی یادیں اور باتیں میرے لئے تو اہم ہیں، شاید پڑھنے والوں کی نظر میں ان کی اہمیت اس قدر نہ ہو۔ اس لئے اس ذکر کو موقوف کرتی ہوں، بس اتنا کہوں گی کہ ''تخلیق'' میں اظہر جاوید صاحب کی رہنمائی میں گزرنے والا وقت میری اب تک کی زندگی کا شیریں حاصل ہے۔

میں اُن کی یادوں کو اپنے دل میں ہمیشہ زندہ رکھوں گی۔ دعا ہے کہ ربِّ کریم انھیں دنیا کی طرح آخرت میں بھی بہترین مقام اور اپنی اور اپنے پیارے نبیؐ کی خاص شفاعت و محبت عطا فرمائے۔ آمین! اللہ تعالیٰ! میری دعا قبول کر!

◆◆◆

﴿اظہر جاوید﴾

میں نے کب دامن پھیلایا، کب لے کر کشکول پھرا
شکر ہے دُنیا داروں کو بھی ذات مری تسلیم ہوئی

جی اظہر!

عافیہ جہانگیر (جینا)

آج میں جس شخصیت کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا لکھوں؟ کتنا لکھوں۔ قلم میرے ہاتھ میں ہے اور میری آنکھیں نم ہیں۔ کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو خود تو تمام عمر الفاظ کو اپنا بے دام غلام بنائے رکھتی ہیں۔ مگر جب ان ہستیوں پر ہم جیسے لوگ کچھ لکھنا چاہیں تو الفاظ نہیں ملتے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا، اپنے اردگرد ہمیشہ ادبی ماحول دیکھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت یہ ادب، یہ رسالے، یہ کتابیں مجھے بہت اجنبی اور عجیب لگا کرتی تھیں۔ بہت خشک ماحول، جیسا کہ ایک نالائق بچے کو لگنا بھی چاہیے۔ میرے ابو، مقبول جہانگیر مرحوم، اور ادب کی دنیا کے جانے مانے بے تاج بادشاہ۔ (ایسا میں سنتی تھی) اور میری والدہ امینہ عنبرین، جن کے بارے میں آج تک میں فیصلہ کر ہی نہیں پائی کہ وہ بہترین بیوی تھیں، بہترین صحافی، بہترین ماں یا بہترین انسان ہیں۔ شائد تمام اولادوں کو اپنی ماں، دنیا کی بہترین ماں ہی لگتی ہے۔

مجھے یاد ہے میں بہت چھوٹی تھی جب میں نے پہلی بار اظہر انکل کو دیکھا۔ اور اُس کے بعد سے آج تک جب بھی دیکھا، ویسا ہی دیکھا۔ ذہین آنکھیں، لمبے سفید بال، سیاہ بال میں نے اُن کے کبھی دیکھے ہی نہیں۔ خوش رہنے والے اور ہمیشہ دوسروں کو خوش رکھنے والے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا جب تک میں نے ادب کو، ادبی ماحول کو سمجھا تب تک تو میں ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پائی۔ مگر جب سمجھا تب تک بہت دیر کر دی میں نے۔ ورنہ شائد پہلے ہی اُن کے لئے اُن کی زندگی میں بہت کچھ ان کی شخصیت پر لکھ ڈالتی۔ انسان کا دنیا سے چلے جانا، بذاتِ خود جانے والے کے لئے ایک نیا تجربہ ضرور ہوتا ہوگا۔ مگر پیچھے ہم جیسے لوگوں کو بھی بہت کچھ سِکھا دیتا ہے۔ جانے والے کی یادیں، قدر، اس کی اچھائیاں، اُس کی ذات کے وہ تمام پہلو جھپاک سے ہمارے ذہن کی فلم پر چلنے لگتے ہیں۔ ہماری تمام حسیات جاگ جاتی ہیں۔

میں نے اظہر انکل کو جب بھی دیکھا، جب جب ان سے بات کی مجھے وہ شفیق بزرگ کے روپ میں ہی نظر آئے۔ انکل کی ایک خاص عادت تھی۔ جب وہ کسی بات پر خوش ہوتے یا میں کچھ ایسا کہتی جس پر انکل بھرپور طریقے سے مزا لیتے، تو وہ کھل کر ہنسنے کی بجائے کہتے ''جیتی رہو بیٹا''! گویا یہ ان کے خوش ہونے کی سند تھی جو دعائیہ الفاظ میں مجھے ملتی۔

میرے پیارے انکل کی حس مزاح کمال کی تھی۔ لاجواب کر دینے والی، حاضر جوابی، جو کسی بھی قسم کی دل آزاری سے کوسوں دور تھی۔ نجانے اتنے manners اپنے اندر وہ کہاں سے سمو کر بیٹھے تھے۔ میں نے کبھی مذاق میں بھی ایسا کوئی جملہ اُن کے منہ سے نہیں سنا جس سے سامنے والے کی دل آزاری ہو۔ عاجزی وانکساری کا اعلیٰ پیکر اظہر انکل کی شخصیت تھی۔ میں ان کی نظم پڑھ رہی ہوں۔ ''پیغام''، لکھتے ہیں:

ابھی فون کی گھنٹی بجی تھی
بہت مضطرب ہو کے چونکا اٹھایا
بہت شوق سے میں نے حسبِ روایت
''جی اظہر کہا تھا''......

اور نظم پڑھتے پڑھتے مجھے یاد آیا کہ میں نے واقعی کبھی اُن کے منہ سے ''جی اظہر'' کے سوا اور کچھ نہیں سنا۔ ایک دن مجھے بھی شرارت سوجھی۔ میں نے ''تخلیق'' کا نمبر ملایا۔ دوسری بیل پر انکل نے فون اٹھایا حسبِ عادت کہنے ہی والے تھے ''جی اظہر'' کہ میں نے فوراً کہہ دیا ''جی عافیہ!'' انکل نے جواب میں کہا ''تے فیر میں کی کراں''! اور اُن کے انداز میں بہت محبت تھی لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میری اس شرارت سے بہت محفوظ ہوئے ہیں۔

مجھے یاد آ رہا ہے میں ناصر شہزاد صاحب کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُس کتاب کی پشت پر اظہر انکل نے ناصر انکل کو مخاطب کر کے لکھا ہوا ہے کہ

''ناصر! آپ نے اب کہاں آنا ہے؟ ہم کو ہی آنا ہوگا۔ تمہارے پاس (اظہر جاوید)

لو انکل جی۔ تُسی تے ایویں ٹُر گئے او۔ پاویں ناصر انکل نے تہانوں سدیا وی نہ ہووے۔

اظہر انکل کو ایک دفعہ میں نے بتایا ''انکل میں آپ کی معلومات میں اضافہ کر رہی ہوں۔ میں شاعری بھی کرتی ہوں۔ انکل بے ساختہ بولے۔ ''الٰہی خیر۔ کی حال اے فیر''؟ میں نے جواب دیا کہ ٹھیک ہوں۔ انکل نے کہا، ''او میں تے شاعری نوں پچھیا اے! تیرے ہتھے جو چڑھ گئی وچاری!''

مجھے بہت خواہش تھی کہ کبھی میں ''تخلیق'' میں کچھ لکھوں۔ شاعری، افسانہ، مگر یہ میری ازلی سستی تھی کہ میرا ''تخلیق'' کے لئے لکھنا ٹلتا ہی رہا۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ہرگز نہ تھا کہ جب میں ''تخلیق'' میں کچھ لکھوں گی تو وہ ''تخلیق'' کا ''اظہر نمبر'' ہوگا۔

''انکل دیکھیں! گرمیاں آ گئی ہیں۔ کریلوں کا موسم آنے والا ہے۔ اور آپ کو کریلے گوشت بہت پسند ہیں نا؟ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہر گرمیوں کی طرح اس سال بھی آپ کو کریلے گوشت کی دعوت دوں گی۔ مگر آپ کو واپس آنا پڑے گا۔ یا میں بھی آپ کی طرح لکھ دوں کہ ''اب آپ نے کہاں آنا ہے۔ ہم کو ہی آنا ہوگا۔''

اظہر انکل سب کے ساتھی تھے۔ خواہ ان کے دوستوں کی فہرست میں ان سے عمر میں بڑے صاحبان ہوں، اُن کے

ہم عمر ہوں یا میرے جیسے بچے۔ جوان کو دیکھتے ہوئے پروان چڑھے۔ وہ ہر دلعزیز اور ہر عمر کے طبقہ میں یکساں مقبولیت رکھتے تھے۔ با خدا بار بار اُن کو ''ہیں'' کی جگہ ''تھے'' لکھتے ہوئے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر بار بار ایک سوال میرے دل میں آتا ہے کہ اتنے دوستوں کے باوجود وہ اندر سے بہت تنہا کیوں تھے؟

زندگی سے بھرپور اظہر انکل کی شخصیت میں ہمیشہ ایک دکھی، تنہا اور ٹوٹے ہوئے انسان کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔

جب اظہر انکل کی کتاب ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے بے حد اشتیاق سے پڑھی۔ اُس کتاب میں انکل کی ایک غزل مجھے بے حد پسند آئی۔ اور میں نے بہت دفعہ اسے پڑھا۔

؎ میری بے چارگی کی انتہا ہے
میں بچوں سے غبارا مانگتا ہوں

جب یہ شعر میری نظروں سے گزرا تو میں نے انکل سے فون پر از راہِ مذاق اس شعر کا تذکرہ کیا اور کہا ''کیا انکل! آپ کی عمر ہے غباروں سے کھیلنے کی؟ اظہر انکل نے حسبِ عادت ہنس کر کہا، ''بس ویکھ فیر۔ میں بڈھا نہیں ہویا۔''

مگر آج اس شعر کی گہرائی کو میں شائد سمجھ سکتی ہوں۔ میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں اظہر انکل! میں آپ سے بھی بہت باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میں بھی ان بے عقلوں میں شامل ہوں جو اس دنیا میں زندہ انسانوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے گزر جانے کے بعد کرتے ہیں۔ کاش میں نے آپ کے سینے میں اور ذہن میں محفوظ ادبی خزانے میں سے کچھ موتی اپنے علم کے لئے بھی چن لیے ہوتے۔ اپنے خزینۂ الفاظ میں اضافہ کرلیا ہوتا۔ بات کہنے کا، بات سننے، تنقید و تعریف کو برداشت کرنے کا، سراہنے کا، کسی کا دل رکھنے کا، کسی کی خوشی میں خوش ہونے کا ہنر آپ سے سیکھ لیا ہوتا۔ بزرگ تو بچوں میں ادبی معلومات بہت خوشی سے بانٹ دیتے ہیں۔ کاش میں نے بھی آپ کی شفقت و محبت میں سے اپنے لئے کچھ مفید دنیاوی و علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کیا ہوتا۔ ایسے بہت سے ''کاش'' ہیں۔ جواب یاد آتے ہیں۔ میرے پیارے انکل ایک ''کاش'' یہ بھی ہے کہ میں تخلیق کا نمبر ڈائل کروں اور آپ کی زندگی سے بھرپور آواز ایک بار پھر میری سماعتوں سے ٹکرائے۔

''جی اظہر''۔

بقول آپ کے۔

؎ تمام عمر یونہی آنسوؤں سے کھیلا ہوں
میرے لئے بھی کبھی کوئی اشکبار رہے

انکل آپ کی یہ بیٹی آپ کے لئے اشکبار رہے۔

◆◆◆

اظہر جاوید

فن، شخصیت اور تاثرات

(مزید پاکستانی مصنّفین)

CamScanner

نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہوں، میں آرزو سے اُلجھ رہا ہوں
کوئی تو میری بھی بات سنتا، کسی سے میں بھی تو اپنی کہتا

اظہر جاوید

CamScanner

خالق اور تخلیق

عزیز میرٹھی

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اس دنیائے فانی سے باری باری جانا تو ہم سبھی کو ہے مگر وہ ایسا جاں دادۂ دردِ دل تھا کہ سفرِ آخرت پر روانہ بھی ہوا تو دردِ دل کے ہمراہ، دھڑکنیں دل کی نالۂ جرسِ کارواں بن گئیں۔ میرے لئے ایک ساتھ دو دکھوں کا مداوا بہت مشکل ہے۔ ایک تو یہ کہ اظہر جاوید مرحوم سے شناسائی بہت دیر میں ہوئی اور دوسرے یہ کہ جدائی بہت جلد ہوگئی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

اب جسے مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ میں اسے خط میں اکثر ''مظہرِ حق وصداقت اظہر جاوید'' کے القاب وآداب سے مخاطب کیا کرتا تھا اور اس امر میں ذرہ برابر بھی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ موصوف جس بے باکی اور صاف گوئی سے لگی لپٹی کے بغیر اپنے دوست احباب اور معاصرین کا ذکر کیا کرتے تھے، منافقت اور مصلحت آمیز معاشرے میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ حوالے اس لئے نہیں دیتا کہ اس حقیقت کو ہر ادب نواز جانتا اور اظہر جاوید کو جاننے والا ہر قلم کار مانتا ہے۔

اظہر جاوید سے میری پہلی ملاقات پچاس کی دہائی میں اس وقت ہوئی جب روزنامہ ''امروز'' میں ادبی صفحے کی ترتیب وتدوین اس کے ذمے تھی۔ میرا کبھی کبھار ''لیل ونہار'' اور ''امروز'' کے دفتروں میں جانا ہوتا۔ ایک بار کوئی گیت یا غزل برائے اشاعت دینے کیلئے اور دوسری بار معاوضہ وصول کرنے کے لیے، جو مبلغ دس روپے ملا کرتا۔ میں اس خطیر رقم سے اس لمحے چائے پیسٹری وغیرہ منگا کر دفتر میں موجود عملے کو کھلا پلا دیتا اور خالی ہاتھ جھاڑ کر، دامن میں فخر ومسرت کے پھول بھر کر، میدانِ ادب سے نگارستانِ فلم کی سمت روانہ ہو جاتا۔ یہاں اس تلخ حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ بازارِ ادب میں دس اشعار کی غزل کا ہدیہ دس روپے ملتا جب کہ فلمی منڈی میں گیت کی ایک استھائی اور دو انتروں یعنی چھ مصرعوں کی قیمت تین سو سے چھ سو روپے تک تھی۔ میری ایک مشہورِ زمانہ فلم ''سسی'' (۱۹۵۳ء) میں لالچی فلم سازوں، چوہدری عید محمد اور جگدیش آنند نے میرے پرزور احتجاج اور منّت سماجت کے باوجود ''زورا زوری'' انڈین فلم کا ایک ''سٹریٹ سانگ''۔

''نہ یہ چاند ہو گا نہ تارے رہیں گے　　مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے''

شامل کرلیا۔ میں نے کہا آپ کی اس مذموم حرکت سے مجھ غریب پر سرقے کا الزام آئے گا اور یوں نام کی بجائے بدنامی مجھ ناکردہ گناہ کے پلّے پڑے گی۔ ہوسِ زر کے ماروں کا کہنا تھا۔ ''آپ کو آپ کے کام کا پورا معاوضہ مل چکا۔ ہم نے فلم پر لاکھوں روپیہ صرف کیا ہے۔ فلم میں کیا ڈالیں یا نکالیں ہمیں پورا اختیار ہے۔'' وہ کسی طور نہ مانے تو اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کی بجائے، میں نے نغمہ نگاری کا قلم ہی توڑ ڈالا۔ اور عہد کیا کہ آج کے بعد فلم کے لئے گیت نہ لکھوں گا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر گیا، خاصا مالی نقصان برداشت کیا مگر فلمسازوں کے اصرار کے باوجود فلمی گیت نہیں لکھا، گذر اوقات کے لئے اپنی تمام تر صلاحیت اور توجہ کہانی، منظر نامہ اور مکالمے لکھنے پر مرکوز کردی، چند ایک فلموں کی پے در پے کامیابی سے اتنا مقبول ومصروف ہوا کہ کسی اور سمت دیکھنے کی نہ ضرورت محسوس ہوئی نہ وقت نے مہلت ہی دی۔ ادبی دنیا کا راستہ ہی بھول گیا۔ ''جس پنڈ جانا نئیں اوہدا رستہ کی پچھنا''؟ یہاں تک کہ اظہر جاوید جیسے قدردان اور مہربان کا نام تک نذرِ طاقِ نسیاں ہوگیا۔ ماسوائے اس کے کہ بھولے بھٹکے احمد راہی، قتیل شفائی، منیر نیازی اور سیف الدین سیف کے ساتھ کبھی حلقہ اربابِ ذوق یا کبھی حلقہ اربابِ علم میں ہو آتا۔ پاک ٹی ہاؤس میں مبارک احمد، اسرار زیدی کے ساتھ چائے پر گپ شپ لگالیتا یا ظہیر کاشمیری، حبیب جالب، اکمل علیمی اور مظفر محمد علی کے ہمراہ کافی ہاؤس میں جا بیٹھتا۔ وہاں بڑے بڑے...... ادیب، شاعر، دانشور، صحافی، سیاست دان اور وکلاء جمع ہوتے مگر میں سوائے مذکورہ بالا چند احباب کے جن کا براہ راست فلم سے بھی تعلق تھا، کسی اور سے بے تکلف نہ ہوا۔

وقت کا دریا بہتا رہا کہ بہتے رہنا ہی اس کا مقدر ٹھہرا تا آں نکہ ۲۰۰۹ء آ پہنچا۔ فلمی صنعت شدید بحران کا شکار ہوکر دم توڑنے لگی اور میں ضیق النفس اور وجع المفاصل جیسے موذی امراض میں مبتلا ہوکر گوشہ نشین ہوگیا۔ ان دنوں میرے اسمِ بامسمیٰ دوست احمد شریف گاہے گاہے میری مزاج پرسی کے لئے آجایا کرتے، میں بیکار تھا۔ وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے باوجود صاحبِ کار تھے۔ حسنِ اتفاق مارچ کی ایک سہانی صبح ملنے آئے تو خوبصورت ماہ نامہ ''تخلیق'' ان کے ہاتھ میں تھا۔ رسالہ مجھے دے کر بولے۔

''میرٹھی صاحب! یہ ایک بڑا معیاری ادبی پرچہ ہے، اس میں میرا ایک گیت چھپا ہے، پڑھ کر اپنے رائے دیجئے گا''۔

میں نے ان کے ہاتھ سے اظہر جاوید کا ''تخلیق'' لے لیا اور سرسری نظر ڈال کر اپنے پوتے ذی شان اکبر کو چائے لانے کیلئے کہا۔

شریف صاحب نے کہا ''میں ناشتہ کرکے آیا ہوں، چائے کا تکلف نہ کریں مجھے یہ بتائیں، اس تنہائی اور گوشہ نشینی سے آپ کا دل نہیں گھبراتا، آپ تو بڑے مجلسی آدمی ہوا کرتے تھے''۔

میں نے کہا ''شریف صاحب! میں تو اس زندگی سے سخت بور ہوں مگر کیا کروں، چلنے پھرنے سے معذور، کہاں جاؤں، کیسے جاؤں؟''

وہ بولے ''تین بجے تیار رہنا، مجھے نیا گیت دینے کے لئے ''تخلیق'' کے دفتر میں جانا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ ذرا تفریح ہوجائے گی''۔

میں نے کہا ''واہ جان نہ پہچان، بڑی خالہ سلام، یار نہ اظہر جاوید سے میری صاحب سلامت نہ اس کے ''تخلیق'' سے کوئی واسطہ تعلق اور پھر بن بلائے شامل باجے کی طرح اس کے دفتر میں، بے مقصد، بلا وجہ جا دھمکنا، مجھے تو اچھا نہیں لگتا''۔

''آپ چلیں تو سہی'' شریف صاحب نے اصرار کیا ''جان پہچان بھی ہو جائے گی، اظہر بڑا ایبا آدمی ہے۔ اہل قلم کی بڑی قدر کرتا ہے''۔

''مگر یار میں تو فلمی......شریف نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''قبلہ فلم اور قلم میں زیادہ نہیں صرف ایک نقطے کا فاصلہ ہے اور میرا تو یہ خیال ہے آپ واقف ہوں یا نہ ہوں، وہ آپ کے نام اور کام دونوں سے خوب واقف ہوگا۔ فلمیں شلمیں دیکھتا رہتا ہے۔ بلکہ ایک زمانے میں تو وہ فلمی کالم بھی لکھا کرتا تھا''۔

تین بجے بعد از دوپہر شریف صاحب کی کار پرانی انارکلی کی بھگوان سٹریٹ میں دفتر ''تخلیق'' کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ہم دونوں کار سے نکل کر دفتر میں داخل ہوئے۔ اظہر جاوید کچھ لکھنے میں مصروف تھا احمد شریف کے ہمراہ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو سرعت سے کرسی سے اٹھا۔ دروازے تک آیا۔ بڑی گرم جوشی اور کمال محبت سے استقبال کیا۔ اور سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ اس حسن سلوک سے پہلا نقش جو میری لوحِ دل پر ابھرا وہ بے پناہ خلوص ومحبت اور عزت واحترام کا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ عظیم شخصیت جس کی شکل وصورت اور نام وکام تک میں فراموش کر بیٹھا تھا، میں صدیوں سے، اس کا جانا پہچانا ہوں اور وہ میرا والہ وشیدا ہے۔ ''تخلیق'' کے چپڑاسی سے لے کر ایڈیٹر اور مالک تک پورا عملہ ایک شخص میں سمایا ہوا تھا اور اس وجود کا اسم گرامی ہے اظہر جاوید، کمرے میں بائیں ہاتھ پر ایڈیٹر کی میز کرسی، آمنے سامنے دو پرانے صوفہ سیٹ، سامنے والے صوفے پر دو خوبصورت تعلیم یافتہ خواتین براجمان۔ صوفوں کے درمیان ایک سینٹر ٹیبل جس پر ایک بلّوریں طشتری، تازہ موسمی پھلوں سے بھری، موجود پائی۔ کمرے کی دائیں بائیں دیواروں پر حسین اداکاروں اور ماڈلز کی دلکش سیکسی تصاویر آویزاں، رائٹنگ ٹیبل پر دوسرے ضروری لوازمات کے علاوہ چاندی اور سنگ اسود کے دو نایاب نیوڈ مجسمے محو استراحت جو کتابوں اور رسائل کے مطالعہ سے تھکی ہوئی آنکھوں کے لئے تازگی وطراوت اور ذہنی راحت وسکون میں مدو معاون ثابت ہوتے ہوں گے۔ علم وادب سے گہری وابستگی کے علاوہ ہر فنکار کی طرح محترم مدیر جناب اظہر جاوید صاحب رحمت اللہ علیہ حسن وجمال کے شیدائی بھی تھے۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ کچھ عشق وعاشقی بھی کی یا نہیں، البتہ مزاج اور شاعری دونوں لڑکپن سے رومانی تھے۔ نیز در دِل بھی ان کے اس شوق فضول کی غمازی کرتا تھا۔ جملہ اصنافِ ادب کی تبصرے کے لئے آئی ہوئی بے شمار کتب اور ''تخلیق'' کے پرانے شماروں اور دوسرے رسالوں سے کمرہ اٹا اٹ بھرا پڑا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ادھر سے ادھر آنے جانے کے لئے کتابوں رسالوں کے بے ترتیب انبار کو الانگنا پڑتا تھا۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط　　بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ایک شاعر ومدیر کے گھر اور کیا کرنسی نوٹوں کے بنڈل اور سونے چاندی کی اینٹیں نکلتیں؟

ہماری کمرے میں اچانک آمد کے باعث میز پر زیرِ تحریر مضمون کی ادھوری سطور کو مکمل کرنے کے بعد احمد شریف سے کہا۔

''شریف صاحب! آپ نے غالباً زندگی میں پہلی بار ایک نیک کام کیا ہے''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''؟ قدرے حیران ہو کر شریف صاحب بولے۔

''ارے بھئی یہی جو آج آپ میرٹھی صاحب کو بھی ساتھ لے آئے، ورنہ کسی انکم ٹیکس آفیسر سے تو کسی نیکی کی توقع عبث ہے''۔

اظہر صاحب کے اس کمینٹس پر احمد شریف صرف مسکرا دیئے۔ اب نگاہ التفات مجھ پر مرکوز ہوئی، حال احوال پوچھنے کے بعد نصف صدی پرانی یادوں کو بڑے اشتیاق اور ولولے سے تازہ کرتے ہوئے روزنامہ ''امروز'' میں اکثر ہونے والی ملاقاتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔

''میرٹھی صاحب! آپ کی چائے پیسٹری کی دعوتیں آج بھی یاد آ کر لذت کام و دہن کا باعث بنتی ہیں۔ کاش وہ زمانہ ایک بار پھر لوٹ آتا۔ جب آتش و انشاء دونوں جوان تھے''۔

میں نے کہا، ''چشم بددور، آپ تو اب بھی جوان ہیں، بس ان سفید ریشمی زلفوں کو ڈائی کرنے کی دیر ہے''۔

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ان کے ساتھ ہی وہ دونوں میک اپ سے مزّین خواتین بھی جو مختلف رسالوں کی ورق گردانی میں مصروف تھیں، مسکرا دیں۔

''عزیزمن! میک اپ سے عمرِ رفتہ واپس آسکتی تو کوئی عورت کبھی بوڑھی نہ ہوتی''۔ اظہر جاوید نے اظہارِ حقیقت کیا۔

''عورتیں تو اب بھی سدا جوان رہتی ہیں''۔ میں نے عرض کی، ''عورت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، ان محترماؤں سے ان کی عمریں پوچھ کر میری بات کی تصدیق کر لیں''۔

''ہاں، دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''۔ ہنستے ہوئے محترم اظہر جاوید نے ارشاد فرمایا۔ اور کرسی سے اٹھ کر مستورات کے عقب میں الماری کھولی، چائے دانی کا سوئچ لگایا، بیلو لیبل ٹی بیگز، نیڈو ملک کا پیکٹ، چینی دانی، نفیس کراکری اور چمچے خواتین کے سامنے پڑی سینٹر ٹیبل پر سجا دیئے، تاکہ ''رائٹ مین رائٹ جاب'' کے مقولے پر عمل ہو جائے۔ گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اظہر جاوید بولے:

''میرٹھی صاحب! میرا خیال ہے فلموں سے تو اب فراغت ہو چکی۔ ''تخلیق'' کیلئے کچھ لکھئے''۔

میں ان کی ذرّہ نوازی اور حسنِ طلب پر انکار کی جرأت نہ کر سکا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ایک پرانا گیت لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور اگلے شماروں کے لئے اپنی خودنوشت سوانح حیات 'عکس ماضی'' کے چند ابواب ارسال کرنے کا وعدہ کر لیا۔ جو تخلیق میں قسط وار شائع ہونے لگے۔ پیارے اظہر جاوید کی وفات حسرت آیات سے چند روز پہلے ۲۰۱۲ء کے شمارہ فروری میں چھٹی قسط ''نکلے ہوئے جنت سے'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور پھر التفات اتنا بڑھا کہ ذرا دیر ہو جاتی تو بذریعہ خط یا فون پر اصرار کرتے ''میرٹھی صاحب! وقت ختم ہو گیا ہے۔ جلد کچھ بھیجئے آپ کی عدم توجہی سے پرچہ لیٹ ہو رہا ہے۔ اور تخلیق کی روایت پابندی اوقات کی ضامن ہے''۔

میری تخلیقی کاوش کو عام قارئین کرام اور عہدِ حاضر کے مقتدر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے پسندیدگی سے نواز کر میری حوصلہ افزائی کی۔ جس کے لئے میں ان سب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خصوصاً جناب اعزاز احمد آذر، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب اور دنیائے علم وادب کے ہمہ جہت قد آور شخصیت جناب ڈاکٹر انور سدید کے تعریفی کلمات میرے لئے باعث فخر ومباہات ہیں اور یہ سب محترم اظہر جاوید کے طفیل ہے جو اپنے کارواں سے بھٹکے ہوئے ایک راہی کو اس کا ہاتھ تھام کر راہ راست پر لے آئے۔ خدائے قدوس مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

جناب اظہر جاوید کا ادبی ذوق زمانہ طالب علمی ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دولت وجدان وعرفان خالق کائنات کی طرف سے موصوف کی فطرت وجبلّت میں روز ازل ہی سے ودیعت کر دی گئی تھی۔ وہ دبنگ و بے باک مدیر اعلیٰ، مالی منفعت اور حکومتی امداد سے بے نیاز تھے۔ دھان پان سی جان میں قادر مطلق نے اتنی ہمّت اور حوصلہ عطا کیا تھا کہ ''تخلیق'' جیسے ضخیم، عظیم، علمی ادبی اور معیاری مجلّے کا بارگراں چالیس بیالیس برس تک تن تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھا۔ ماہ نامہ ''تخلیق'' وہ آئینہ ہے جس میں محترم اظہر جاوید کی صورت وسیرت اور فن وشخصیت کو اپنے تمام تر جمال وکمال کے ساتھ مفصل صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جانِ عزیز اظہر جاوید میں مقابل کو اسیر کر لینے کی ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جو ایک بار ان سے ملا ہمیشہ کے لئے ان کا ہو رہا اور اس ضمن میں مرد وزن کی کوئی تخصیص نہ تھی۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

دل بدست آوری، میز بانی اور اخلاق ووضع داری کا یہ عالم کہ چاہے جتنے مصروف ہوں، قلم چھوڑ کر کرسی سے اٹھتے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر مہمان کو بڑے چاؤ سے پیش کرتے۔ دوست احباب کی تواضع کر کے خوش ہوتے۔ آہ! اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر لیکن اس جہان سے اٹھ جانے والے ڈھونڈنے سے کہاں ملتے ہیں۔

جناب اظہر جاوید کا شعری اور نثری سرمایہ میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن ان کے علمی ادبی مقام ومرتبے سے جانکاری کے لئے ان کا بڑا کارنامہ، ماہنامہ ''تخلیق'' ہی کافی ہے۔ جس کے معیاری مضامین نظم ونثر کے علاوہ ان کا اداریہ ''اپنی بات'' ہمیشہ سلگتے ہوئے مسائلِ حیات پر بڑا اثر انگیز اور چشم کشا ہوتا تھا۔ فروری ۲۰۱۲ء میں انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے عمر بھر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ ساتھ ہی محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کو بھی پرائیڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔ دونوں دانشوروں نے چند احباب کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کیلئے شیزان ریسٹورنٹ واقع فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں پر تکلف دعوت دی، مجھے گمان بھی نہ تھا کہ آج کے بعد پھر کبھی باہم ملاقات نہ ہو سکے گی، مرحوم سے ہم نوالہ وہم کلام ہونے کا یہ سنہری موقع آخری ثابت ہوگا۔ بہت سی ان کہی اہم اور ضروری باتیں دل ہی میں رہ گئیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

◆◆◆

اظہر جاوید کی یاد میں

طارق محمود

دفتر سے نکلا تو ایل ڈی اے پلازہ کے قریب پہنچ کر خیال آیا کیوں نہ ''تخلیق'' کے دفتر کا رخ کیا جائے۔ گرم چائے کی طلب بھی ہو رہی تھی۔ برادرم اظہر جاوید کے ساتھ خاصے عرصہ سے بات بھی نہ ہو پائی تھی۔ سوچا آج یونہی انہیں سرپرائز دوں۔ دفتر نہ بھی ہوئے تو پیغام چھوڑ جاؤں گا۔ حاضری لگ جائے گی۔ ان سے ملاقات یوں بھی ضروری تھی، میں اکتوبر، نومبر کے دوران ملک سے باہر تھا، لوٹا تو کئی قسم کی فروعی مصروفیات نے آن گھیرا۔ ان دنوں ''تخلیق'' میں میری خودنوشت کا ایک باب قسط وار چھپ رہا تھا۔ اظہر بھائی سے بات بھی کی کہ اسے دو اقساط میں چھاپ دیں۔ عمومی تاثر زائل ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ ایڈیٹر کی رائے مقدم تھی، لہٰذا ''سفیرِ شمال'' نامی باب کو وہ کئی مختصر اقساط میں شائع کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ خیال آیا موبائیل پر اپنی آمد کی اطلاع دے دوں۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوا کہ وہ دفتر سے قدرے فاصلے پر ہوتے۔ آفس فون کرنے سے مناسب وقت مل جاتا اور وہ اپنی مصروفیات ادھوری چھوڑ کر بھی دفتر پہنچ جاتے۔ اظہر صاحب کے نمبر پر فون کیا۔ دو گھنٹوں کے بعد کسی نے فون ریسیو کیا۔ نامانوس آواز تھی۔ میرے استفسار پر کہ کیا یہ اظہر جاوید صاحب کا ہی نمبر ہے؟ جواب اثبات میں ملا۔ میں نے نام بتایا اور پوچھا کہ ''کیا، اظہر جاوید صاحب سے بات ہو سکتی ہے''۔ دوسری طرف سے بڑی رنجیدہ آواز میں جواب ملا ''ان کا تو صبح انتقال ہو گیا ہے'' غیر متوقع جواب سنتے ہی میں سکتے کے عالم میں تھا۔ میرے اگلے سوال پر جواب ملا کہ ''اسی روز صبح ساڑھے نو بجے''۔ میں نے ان کی تدفین اور جنازے کے بارے میں جاننا چاہا۔ وہ صاحب اس حالت میں نہ تھے کہ میرے ان سوالات کا جواب دے پاتے۔ اظہر صاحب کے چند قریبی دوستوں کا نام لیا اور بولے کہ ''ان سے پتہ کر لیں''۔ میں ان اصحاب میں سے کسی سے واقف نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی تشویش اور برہمی میں یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ صاحب کون تھے؟ پل بھر کے لئے یوں محسوس ہوا یہ خبر کسی دشمن نے اڑا دی تھی،۔ ہال روڈ سے ہی ڈرائیور کو گھر کی طرف لوٹنے کیلئے کہا۔ گھر سے فون کیا تو ''تخلیق'' کے دفتر کا فون بھی بند پڑا تھا۔

خیالات کا تانتا بندھا رہا، گھر آ کر ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا رہا، شاید کوئی خبر نظر آ جائے لیکن اس وقت ایسی کوئی اطلاع بھی نہ تھی۔

اظہر جاوید مرحوم کے ساتھ میری گذشتہ تیس برسوں کی شناسائی تھی۔ ہماری ملاقاتیں اگرچہ کم ہوتیں لیکن مختصر سی ملاقات کے دوران بھی قہقہے گونج اٹھتے۔ فقرہ بازی، ہنسی مذاق اور پیار سے بھری باتیں ہونے لگتیں۔ فون کرتے تو ایک ہی جملہ بار بار ادا کرتے ''سر جی! ملاقات ہونی چاہیے''۔

اظہر جاوید کو جس قدر میں نے جانا وہ ایک آزاد منش اور بے باک انسان تھا۔ خیالات کا کھلے بندوں اظہار کا قائل تھا اسے اس آزادیٔ فکر کی قیمت بھی چکانا پڑی جب جنرل ضیاء الحق کے مارشل لائی دور میں اسے ''امروز'' سے فارغ کر دیا گیا۔ ''امروز'' اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ''امروز'' سے اس کا روزگار وابستہ تھا۔ اس نے ہار نہ مانی اور اپنی لگن میں نت نئے راستے استوار کرتا رہا۔

مجھے اکثر خیال آتا کہ اظہر جاوید جیسے حسّاس اور اہلِ درد انسان سے حکمرانوں کو کس قسم کے خطرات لاحق تھے؟ عمر بیت گئی لیکن پھر بھی سمجھ نہ پایا۔ کبھی فیض کی شاعری نے حکمرانوں کے لئے پہاڑ کھڑے کر دیئے، کبھی حبیب جالب کی بے باکی سے وہ نالاں ہوئے۔ یہ تو فقیر منش لوگ تھے اپنی راہ سے گزر گئے، اظہر بھی یقیناً ایک ایسے ہی قبیلے کا فرد تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات اَسّی کی دہائی کے اوائل میں ہوئی۔ میں ان دنوں اوکاڑہ میں تعینات تھا۔ اظہر جاوید، محترمہ صدیقہ بیگم کی معاونت سے ماہنامہ ''تخلیق'' کو ایک نئے انداز سے چھاپنے کے خواہاں تھے۔ خطوط کے ذریعے رابطہ رہتا۔ لاہور آیا تو اظہر جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ محترمہ صدیقہ بیگم کی گلبرگ میں واقع رہائش گاہ میں ان سے ملانے لے گئے۔ صدیقہ بیگم ان دنوں قدرے علیل تھیں۔ بستر کے سرہانے دوائیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ بستر سے اٹھیں، بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ چائے سے تواضع کی۔ ہم ''تخلیق'' کے فارمیٹ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے میں ان دنوں ملتان میں تھا۔ ٹیلی فون پر اطلاع ملی ''اظہر جاوید بات کرنا چاہتے ہیں''۔ فون پر رابطہ ہوا تو معلوم ہوا ملتان آئے ہوئے تھے اور اس وقت ''ماورا'' ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ماورا ہوٹل کا رخ کیا۔ بڑی محبت سے ملے۔ میں نے اصرار کیا کہ میرے ہاں ٹھہر جائیں۔ نہ ناں کی نہ ہاں کی اور زوردار قہقہے میں بات اڑا دی۔ میں نے اپنی رہائش گاہ کے قریب ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا عندیہ دیا۔ اور وہ زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی میں ایک پیغام تھا ''تھینک یو، ویری مچ، میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں''۔

لاہور پوسٹنگ ہوئی تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ نوّے کی دہائی کے وسط میں ''تخلیق'' میں میرا ایک طویل افسانہ ''پام کے پیڑ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس افسانے کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ بعض نقّادوں کو اس افسانے میں ناولٹ کا شائبہ نظر آیا اور کسی کو اس کی طوالت پر اعتراض تھا لیکن عمومی طور پر یہ افسانہ پسند کیا گیا۔ مجھے یاد ہے اظہر صاحب میرے ہاں رسالہ دینے خود آئے، باہر ہی ملازم کو رسالہ تھما کر نکل گئے، میں نے ان کا پیچھا کیا لیکن ان کی موٹر سائیکل کی رفتار کا مقابلہ نہ کر پایا۔ معلوم نہیں کس کے ساتھ تھے۔

میں جن دنوں گورنر ہاؤس میں تعینات تھا وہ برادرم یونس جاوید کے ہمراہ آ جاتے ۔ یونس جاوید ان دنوں ''مجلسِ ترقّیِ ادب'' میں تھے۔ مجلس کے حالات اور معاملات سے پریشان رہتے تھے۔ سرکاری سطح پر مدد چاہتے تھے تاکہ مجلس کے معاملات کو بہتر انداز سے چلایا جا سکے۔ مرحوم احمد ندیم قاسمی صاحب مجلس کے ناظم تھے اور وہ پیرانہ سالی اور بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیشِ نظر بڑی مشکلات سے دوچار تھے۔ اس دور میں ادبی اداروں کے بارے میں حکومتی سرد مہری کا بھی بڑا چرچا رہا۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکتا تھا حتیٰ المقدور کوشش کرتا رہا۔

اس واقعہ سے ایک یہ بات تو واضح تھی کہ جہاں کہیں کسی ادیب کو مشکل درپیش آتی تو اظہر جاوید اس کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے۔ اپنی صحت، وقت، سب کچھ قربان کر دیتے۔ پنجاب میں سابق وزیرِ اعلیٰ جناب غلام حیدر وائیں کے دور حکومت میں رائیٹرز فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔ میں اپنے سرکاری منصب کے حوالے سے اس فنڈ کا پہلا چیئرمین مقرّر ہوا۔ اظہر جاوید کئی بار بے حد مستحق ادیبوں کی معاونت کے بارے میں کیس لے کر آتے جس میں ان کی کوئی غرض و غایت نہ ہوتی۔

ایک بار جم خانہ کی پارکنگ میں ملاقات ہوگئی۔ ان کے ہمراہ امریکہ سے ان کے شاعر دوست ظہیر تاشی تھے۔ پُر جوش معانقہ سے فارغ ہوکر تاشی صاحب سے بھرپور تعارف کرایا اور ان کی شاعری کا مجموعہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے انہیں آخری بار ''ادبِ لطیف'' کی ۷۵ ویں سالگرہ کی تقریب میں سنا۔ آواری ہوٹل میں صدیقہ بیگم نے بڑی خوبصورت محفل سجا رکھی تھی۔ دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ اظہر صاحب بھی روایتی گرم جوشی سے ملے۔

اظہر جاوید اس دنیا میں نہیں۔ آفیسر کالونی، کیولری گراؤنڈ کی سٹریٹ نمبر سات میں شامیانے کے نیچے میں اس شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مسکراتا مسکراتا اس جہان سے چلا گیا۔ اس روز اظہر جاوید کے قُل تھے۔ ان کے بیٹے سونان اظہر کو بڑے حوصلے میں پایا۔ معلوم ہوا موبائل پر سونان اظہر جاوید سے ہی بات ہوئی تھی۔ پُرسے کے لئے دوست احباب جمع تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، جناب اعزاز احمد آذر، جناب کنول فیروز اور جناب عقیل روبی سبھی انہیں یاد کر رہے تھے۔

اظہر جاوید اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کی یادیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ''تخلیق'' کو انہوں نے بڑی محنت سے پروان چڑھایا۔ اسے اب ایک یادگار کی صورت میں جاری رکھنا ہوگا۔ اظہر مرحوم سے عقیدت اور محبت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی مظہر نہیں ہوسکتا۔

◆◆◆

وضعدار اظہر جاوید

علی سفیان آفاقی

پرانے دور کے وضع دار لوگوں کے بارے میں تو بہت پڑھا اور سنا ہے لیکن آج کے دور میں ایسے وضعدار لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اظہر جاوید کو ہم نے جب بھی دیکھا ایک ہی انداز میں دیکھا۔ نہ طور طریقوں میں نہ بول چال اور گفتگو کے انداز میں کوئی فرق دیکھا۔ اظہر جاوید میں گذشتہ چالیس پینتالیس سال میں ہم نے صرف یہ فرق دیکھا کہ ان کے بال سفید ہو گئے مگر چہرے کے تاثرات اور نقش و نگار میں کوئی فرق نہ پایا۔ اظہر جاوید جس چیز کو اپناتے تھے بس اس کو اپنا ہی بنا لیتے تھے۔ آج کے زمانے میں جب بڑے بڑے سرمایہ دار بھی باقاعدگی سے ادبی پرچہ نکالنے کی جرأت نہیں رکھتے اظہر جاوید 42 سال تک بڑی باقاعدگی سے ''تخلیق'' نکالتے رہے اور کبھی اس کی اشاعت میں ناغہ نہ ہوا۔ خدا جانے وہ ''تخلیق'' کے لئے بارہ چودہ گھنٹے ہر روز کیسے نکال لیتے تھے اور پھر فکرِ معاش اس کے سوا۔ لیکن نہ ان کے رہن سہن میں فرق دیکھا نہ ان کو کبھی ہمت ہارتے دیکھا''۔ سچ تو یہ ہے کہ ''تخلیق'' لاہور کا وہ ادبی جریدہ ہے جس میں بیرونی ملکوں کے لکھنے والوں کی تحریریں بھی شائع ہوتی ہیں اور انتہائی معیاری۔

اظہر جاوید کو ہم نے پرچے کے لئے اشتہار حاصل کرنے اور لکھنے والے شوقینوں سے باقاعدہ چندہ وصول کرنے کی بہت سی ترکیبیں بتائیں لیکن انھوں نے اپنی روش نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ ڈاک خرچ بھی خود ادا کرتے تھے۔ اللہ جانے اس انسان کے پاس عمر عیار کی زنبیل تھی یا حاتم طائی کا خزانہ جس میں کبھی کمی آتے نہیں دیکھی۔ اظہر جاوید پہلی بار دل کے مریض ہوئے تو چند ہی روز کے بعد ویسے ہی ہنستے کھیلتے نظر آئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں مگر جب ان کی صحت کی طرف سے مکمل اطمینان تھا تو اچانک اٹھے اور سب کو چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ اظہر جاوید کم گو اور خاموشی پسند تھے لیکن انہوں نے جتنی بھی باتیں کیں ان کے دوستوں اور لکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ جو بھی ان سے ملا وہ کبھی انہیں فراموش نہ کر سکے گا۔ انھوں نے ''تخلیق'' کو ایک تخلیقی ادارہ بنا دیا اور پھر یہ بوجھ اپنے بیٹے کے سپرد کر کے چل دیئے۔ خدا کرے ''تخلیق'' کی روایات ان کا بیٹا بھی اسی لگن اور خلوص سے جاری رکھے۔ ''تخلیق'' کے پرانے پرچوں کو انہوں نے شاہکار بنا دیا جسے ڈاکٹر انور سدید نے ادبی تاریخ کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔

لوگ عموماً کہتے ہیں کہ مرنے کے دن تو نہ تھے مگر اللہ نے بلا لیا۔ اظہر جاوید کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بقول غالب

موت کا ایک دن معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

◆◆◆

اظہر جاوید اور مَیں

کنول فیروز

برصغیر پاک و ہند میں اظہر جاوید نہ صرف گذشتہ 43 سال سے اشاعت پذیر اپنے ادبی جریدہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے بلکہ شعروادب کے لئے اُن کی گراں قدر خدمات کا اعتراف اُن کے سینئرز نے بھی برملا کیا ہے۔ حکومتی حلقے سے اگرچہ صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی کے ذریعے اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف دیر سے کیا گیا لیکن دیر آید درست آید کا محاورہ یہاں صادق نہ آیا بلکہ ؎ ''بہت دیر کی مہرباں آتے آتے'' کے مصداق اُن کی عمرِعزیز نے وفا نہ کی اور وہ یہ اعزاز حاصل کرنے سے 19 روز قبل اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ منگل 14 فروری عالمی ویلن ٹائن ڈے یوم محبت اُن کا یوم وفات ٹھہرا لہٰذا صدارتی تمغۂ حُسنِ کارکردگی کا ایوارڈ اُن کے بیٹے سونان اظہر نے جمعہ 23 مارچ 2012ء کو گورنر پنجاب سردار محمد لطیف کھوسہ کے ہاتھوں گورنر ہاؤس لاہور میں وصول کیا۔

اظہر جاوید نے بدھ 4 جنوری 2012 کو دفتر ''تخلیق' میں 74 سال کا ہونے پر اپنی سالگرہ منائی تھی جس پر معروف شاعرہ منور سلطانہ بٹ نے کیک کا اہتمام کیا تھا۔ اُس روز کسے خبر تھی کہ 34 دن کے بعد یہ ہنستا کھیلتا اور قہقہے بکھیرتا شاعر ہمیشہ کے لئے ہمیں داغِ مفارقت دے جائے گا لیکن ہم سب الہامی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے کاموں میں کسی کو کیا دخل؟ ''تخلیق'' کا دفتر جب میکلگن روڈ سے بھگوان سٹریٹ پرانی انارکلی لاہور میں منتقل ہوا تو اس سٹریٹ کو بھگوان سٹریٹ ہی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اسے رحمان سٹریٹ بنا دیا گیا اور اسی حوالے سے اس عہد کی عظیم ڈرامہ نگار، ناول نگار اور افسانہ نویس خاتون بانو قدسیہ نے اظہر جاوید کو بھگوان سٹریٹ کے کرشن کنہیا کا خطاب دیا تھا۔ اور اظہر جاوید نے بھی ''تخلیق'' کے ایڈریس میں بھگوان سٹریٹ ہی رہنے دیا۔

اظہر جاوید واقعی کرشن کا دوسرا روپ تھا۔ اُس سے محبت کرنے والوں میں ہر عمر کی خواتین وحضرات شامل تھے۔ اُس سے محبت کرنے والی ہر خاتون اور ہر شخص یہ تصور کرتا تھا کہ وہ صرف اُسی سے محبت کرتا ہے کیونکہ اظہر جاوید کے ہر ایک سے ملنے کا انداز اتنا ہی والہانہ اور پُرتپاک ہوتا تھا کہ ہر کوئی اُس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کی اشاعت کے گذشتہ 43 سال کے سفر میں کتنے ہی خواتین وحضرات کو دنیائے ادب

سے روشناس کرایا اور بہت سوں کو تخلیق کاری کے ہنر سے آگاہی کے لئے اُن کی راہنمائی بھی کی۔ اُن میں سے آج بہت سے نام ادبی حلقوں میں اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اِن میں سے کئی اظہر جاوید کی تخلیقی محبتوں کا آج بھی اعتراف کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے لیکن ان میں سے کئی منحرف بھی ہو چکے ہیں۔ بقولِ روحی کنجاہی:

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

اظہر جاوید نے شاعری بھی کی تو وہاں بھی اپنی پہچان الگ بنائی۔ اُن کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' کے یکے بعد دیگرے دو ایڈیشن شائع ہو کر عوامی مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اظہر جاوید کے پنجابی کے افسانوں کا مجموعہ ''بڑی دیر کر دی'' پنجابی افسانوی ادب میں وہ مقام حاصل کر چکا ہے جو بہت کم ادیبوں کو حاصل ہوا ہے۔ یہ افسانے دراصل اظہر جاوید کی اپنی ہی زندگی کی کہانیوں پر مشتمل ہیں اور یوں اُس نے افسانوں کے روپ میں آپ بیتی لکھ کر گویا اپنا کتھارسس کرنے کی سعی کی۔

اظہر جاوید کے متعلق بلاخوف تردید اور بلا شک وشبہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بیک وقت، شاعر، صحافی، کالم نویس، ایڈیشن انچارج، مترجم، مزاح نگار تھا۔ مزاح کے حوالے سے وہ اس قول کا قائل تھا کہ ''بندہ ضائع ہو جائے تو ہو جائے فقرہ ضائع نہیں ہونا چاہیے'' فقرہ چست کرنے میں اُس کا شاید ہی کوئی ہم عصر اُس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔

اظہر جاوید کی ''تخلیق''، روزنامہ ''امروز'' لاہور کے ادبی ایڈیشن اور دیگر اخبارات و جرائد کی ادارت کے دوران پھیلی ہوئی ادبی اور صحافتی خدمات کا احاطہ اس مختصر سے مقالہ میں ممکن نہیں بلکہ محولا بالا تمام تر تحریر اُن کی ادبی خدمات اور شخصیت کا محض اجمالی جائزہ اور پرتو ہے اُن کی ادبی خدمات پر ایم۔ اے اُردو اور ایم فِل کے تھیسس بھی ہو چکے ہیں جبکہ ''تخلیق'' کے ادبی مقام کے تعین کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات میں بھی تحقیقی مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہندو پاک کے کئی ادبی جرائد، اظہر جاوید نمبر اور اُن کے لئے الگ گوشہ بھی شائع کر چکے ہیں۔

اظہر جاوید مشاعروں کے شاعر نہیں تھے۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ وہ معاوضہ والے مشاعروں میں بھی جانے سے گریز کرتے تھے اور نہ ہی اُنہیں ادبی محفلوں اور مشاعروں میں صدر یا مہمانِ خصوصی بننے سے رغبت تھی۔ اس اعتبار سے وہ مستغنی اور بے نیاز شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن بااِیں ہمہ شہرت و عظمت کی دیوی حسیناؤں کی طرح ہمیشہ اُس کے ہم آغوش رہی اور اُس کی وفات پر جس قدر ادبی ریفرنس ہوئے اور ان میں اُن کی شخصیت اور ادبی خدمات کو جن تفصیلات اور محبتوں سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا وہ اِس امر کا بین ثبوت ہے اور ایسی پذیرائی بہت کم ادیبوں اور شاعروں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہاں میں اظہر جاوید کے بارے میں جتنا کچھ جانتا ہوں لکھتا جاؤں تو اُس کے لئے سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ یہاں تو مجھے اپنے یارِ غار اظہر جاوید کو جو میرے لڑکپن کا دوست تھا، کی یادوں کو تازہ کرنا ہے۔ میری اظہر جاوید سے پہلی ملاقات ہفت روزہ

''پیامِ قائد'' سرگودھا کے دین ہوٹل کچہری بازار سرگودھا کے دفتر میں 'پیام قائد' کے پبلشر اور چیف ایڈیٹر ملک عمر دراز خان اعوان کے توسط سے ہوئی۔ اظہر جاوید 'پیام قائد' کے نامہ نگار تھے اور اپنے گاؤں بھاگٹانوالہ سے خبریں دینے وہاں آیا کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ یہ 1954-1953 کی بات ہے۔ میں اُن دنوں ہفت روزہ ''پیام قائد'' سرگودھا اور ہفت روزہ ''خودی'' سرگودھا کا مدیر تھا۔ ان ہی دنوں اظہر جاوید شاعر شباب الطاف مشہدی کے جریدہ ہفت روزہ ''خلوص'' سرگودھا میں مدیر ہو گئے۔ ان دنوں ہم دونوں کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ اظہر جاوید مجھ سے ٹھیک تین ماہ بڑا تھا۔ ہم دونوں نے نوعمری میں صحافت اور شاعری کا آغاز کیا اور الطاف مشہدی کی شاگردی اختیار کی۔ بعدازاں اظہر جاوید بعض وجوہات کی بنا پر استادِ محترم الطاف مشہدی کو چھوڑ کر ممتاز الشعرا جوہر نظامی کے شاگرد ہو گئے۔ ان ہی دنوں ہمارے قریبی دوستوں میں ایم ایم خان پرویز (خان پرویز)، پرویز بزمی، جاوید قریشی، ایرک رابنسن، ضامن علی حیدری اور کلیم انبالوی شامل تھے۔ ہم اکٹھے مشاعرے پڑھتے اور زیادہ وقت اکٹھے گزارتے۔ میں لاہور سے اپنی والدہ جو لیڈی ہیلتھ وزیٹر تھیں کے لاہور سے لالیاں ضلع جھنگ تبادلہ کے دوران پہلے لالیاں اور پھر سرگودھا آ گیا تھا۔ سرگودھا میں قیام کے دوران صفدر بخاری، پرویز بزمی، چوہدری اصغر علی، کوثر وڑائچ، تاج الدین حقیقت، احمد بخش قریشی، زیڈ یوخان، ارشد بھٹی، شاکر نظامی، وزیر آغا، عاشق جعفری، اثر چوہان، رشک انقلابی بعد میں (رشک ترابی)، انگر سرحدی، فیض لودھیانوی، غلام حسین قیصر، محمد حسین شوق، عصمت علیگ، عرفان غزالی، تاج دار دہلوی، عبدالرشید اشک، حکیم عبدالمجید راہی، صوفی فقیر محمد، یوسف گوئندی، انور گوئندی، مفتی محمد طفیل گوئندی، مرزا مبارک، کامریڈ حمید، ڈاکٹر مسعود انصاری، مجید افضل پراچہ، کریم بخش مضطر دھریمہ، عاصم صہبائی، کنول صدیقی بعد میں فراز صدیقی، نظیر اکبر آبادی، اعجاز ترمذی، اظہار ترمذی، عبدالرزاق جنجوعہ، غلام جیلانی اصغر ایسی شعر و ادب سے متعلق شخصیات اور احباب سے ملاقاتیں رہیں۔

مَیں 1959ء میں لاہور منتقل ہو گیا جبکہ اظہر جاوید 1962 میں ایک مخصوص صورتِ حال کے تحت کوئٹہ چلے گئے اور وہاں فوج میں بھرتی ہو گئے بعدازاں 1964-1963ء میں وہ بھی لاہور منتقل ہو گئے۔ اس دوران اظہر جاوید نے مختلف جرائد و اخبارات میں سلسلہ روزگار کا آغاز کیا جن میں ہفت روزہ ''پارس'' روزنامہ ''جمہور''، روزنامہ ''امروز'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ روزنامہ ''امروز'' میں ضیاالحق کے مارشل لاء کے خلاف صحافتی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے اُنہیں دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ''امروز'' سے فارغ کر دیا گیا۔ اس دوران اُنہوں نے ''تخلیق نو'' اور بعدازاں 1969ء میں ماہنامہ ''تخلیق'' کا آغاز کیا۔ ''تخلیق'' کی ادارت کے ابتدائی عہد میں صدیقہ بیگم اور عذرا اصغر نے مختلف اوقات میں اظہر جاوید کی معاونت کی۔ اور اب ایک طویل مدت سے ''ون مَین شو'' کے تحت ہی ''تخلیق'' شائع ہو رہا تھا۔ ''تخلیق'' کی ادارت، مضامین، نظم و نثر کی نوک پلک سنوارنے، پروف ریڈنگ، احباب کے خطوط کے جواب اور کاروباری خطوط کا کام یہاں تک کہ پوسٹنگ کے لئے تمام پتے وہ خود اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ ادارت کے تمام مرحلے سے ڈسپیچ یعنی ڈاک خانے

تک پہنچانے اور پرچہ پوسٹ کرنے کے لیے وہ خود جایا کرتے تھے۔اُن کی یہ لگن اور کمٹمنٹ اپنی مثال آپ تھی۔

ان مراحل میں کبھی کبھی وہ اپنے قریبی احباب اور متعلقین سے بھی مدد لے لیا کرتے تھے۔ دفتر میں آنے والے ہر شخص کی چائے اور کم از کم بسکٹوں سے تواضع اُن کا معمول تھا۔اُنھوں نے کئی مستحق بیوہ، ضرورت مند خواتین، خواجہ سراؤں و رحاجت مندوں کا ماہانہ مقرر کر رکھا تھا۔ایک پالش والا پٹھان روزانہ آتا وہ اُس سے پشتو میں بات کرتے۔ بند مٹھی میں اُس کا مسئلہ حل کر دیتے کہ اُنہوں نے کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔نماز کے سختی سے پابند تھے۔اس ضمن میں پابندی اوقات کا خاص خیال رکھتے، سگریٹ، شراب یا دیگر کسی منشیات کو ہاتھ تک نہ لگایا۔سوائے ایک موقعہ کے۔ یہ ''وقوعہ'' یوں ہوا کہ قیام سرگودھا کے دوران ہمارے مالک اخبار اور دوست ملک عمر دراز خان اعوان نے ایک دن ایک بوتل بیئر کی ہمیں دی۔لڑکپن کی عمر تھی، الکوحل پینے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔مَیں نے اور اظہر جاوید نے ایک گلاس لیا اور ریماؤنٹ ڈپو سرگودھا کے قریب نہر کنارے چلے گئے اور سادگی کا اندازہ لگائیں ہم نے بیئر نہر کا پانی ملا کر پی۔ وہ دن اور تاحیات اُنہوں نے پھر کبھی منشیات کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ وہ ہر دور میں صاحبِ عشق رہے۔ بیواؤں، یتامیٰ اور ضرورت مندوں کی خدمت وہ رسول کریمؐ کی سنت کی پیروی قرار دیتے تھے۔ جو تا عین حیات جاری رہی اور اب اُن کے بیٹے سونان اظہر اپنے والد کے زمانے کے ضرورت مندوں کی حتی المقدور ضرورتیں پوری کرنے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

''تخلیق'' کی شاید ہی کوئی اشاعت ہو جس میں میری غزل شامل نہ ہوئی ہو۔ جب ''تخلیق'' تکمیل کے مراحل میں ہوتا تو مجھے کہتے لاؤ تمھاری غزل کہاں ہے میں نے خود پر ''تخلیق'' اور ''شاداب'' کے لئے ہر ماہ نئی غزل کہنے کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ وفات سے ایک روز قبل یعنی سوموار 13 فروری 2012ء کو حسبِ معمول تقریباً اڑھائی بجے مَیں اپنے دوست سید شاہ حسین کے ہمراہ اُن کے دفتر گیا تو اُنہوں نے پھر غزل کا مطالبہ کیا جو مَیں نے اُنہیں دے دی۔ یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی وہیں مَیں نے ''تخلیق'' اور ''شاداب'' کے کمپوزر رسید تصور حسین کو بلوا لیا تھا جو سیکرٹریٹ میں اسسٹنٹ ہیں وہ جب آئے تو اظہر جاوید نے اُنہیں کہا کہ ''تخلیق'' کا ''میٹر'' تیار ہے کل آ کے لے جانا۔ کسے خبر تھی کہ ''کل'' آئے گی کہ نہیں؟؟ وہ ہم سے ساڑھے تین بجے جدا ہو کر جم خانہ کلب کی کسی ادبی تقریب میں چلے گئے اور دوسرے دن جب تمام دنیا عالمی یوم محبت ویلن ٹائن ڈے منا رہی تھی تو ایک صاحبِ دل سراپا محبت شخص اس کارگاہِ مکر و فن سے مُنہ موڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ ع
''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' یہ مصرعہ اظہر جاوید پر خوب صادق آتا ہے۔

میری اظہر جاوید سے تقریباً ہر روز ملاقات طے تھی جس دن کسی مصروفیت کی وجہ سے اُس کے پاس نہ جا سکتا دوسرے دن ٹیلی فون پر جواب طلبی ہو جاتی کہ ''کل کہاں تھے''؟ اور اگر کسی دن شام کو ذرا دیر سے گھر جاتے ہوئے اُسے دفتر ملنے چلا جاتا تو مجھے دیکھتے ہی یہ فقرہ اُچھال دیتے ''چھاپا'' اور پھر ہم دونوں بغل گیر ہو کر قہقہے مارتے ہوئے بیٹھ جاتے۔

اظہر جاوید کی بظاہر زندگی خوشیوں، مسرتوں اور خوش حالی سے معمور تھی لیکن بااین ہمہ محرومیوں، ناآسودگیوں اور

ہجر و وصال کی داستانیں الگ ہیں جس کے متعلق ہم جب تنہا ہوتے آپس میں شیئر کیا کرتے تھے۔ کئی احباب کے لئے وہ کسی حد تک پراسرار بھی تھے۔ اُنہوں نے میری بیٹی کو اپنی بیٹی بنا رکھا تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ شمائلہ بیٹی میری ہے رہتی کنول فیروز کے گھر ہے اور اکثر شمائلہ سے انگلینڈ میں ٹیلی فون پر رابطے میں رہتے۔

اظہر جاوید سے ذاتی اور ادبی حوالے سے ان گنت یادیں اور واقعات وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقریباً 58 سال کے گہرے تعلقات اور بے لوث خلوص مندانہ دوستی کی یادوں کو چند صفحات میں تو سمویا نہیں جا سکتا۔ میرے سرگودھا سے لاہور آنے اور پھر اظہر جاوید کے بھی لاہور آ جانے کے بعد زندگی مختلف مراحل سے گزری، میرے بعد اُن کی بھی شادی ہوئی۔ اُن کے دو بچے ہوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم ہے اور بیٹا سونان اظہر لاہور میں جو ''تخلیق'' کو جاری رکھنے اور ''اظہر جاوید نمبر'' کی اشاعت کے لئے جدوجہد میں مصروفِ عمل ہے۔ ہمارے ابتدائی عہد کے قریب ترین احباب میں ڈاکٹر یونس جاوید، خان پرویز، علی شہزاد رضوی المعروف ابوالعانی، ناصر زیدی، ڈاکٹر محمد خواجہ زکریا، غلام حبیب سبحانی، ڈاکٹر تبسم رضوانی، احمد منیر بشیر، خلش ہاشمی (سالار مسعودی)، اقبال ساجد، ستار طاہر، پروفیسر ایم وائی دلیلی، علامہ محمد افضل طور، علامہ لطیف انور، نسرین انجم بھٹی، ارشاد فرحت، گوہر نوشاہی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، عباس اطہر، ڈاکٹر اسد اریب، سلمان بٹ، قاضی اقبال اسلم آرٹسٹ، سلیم رضا (افسانہ نگار) اور دیگر کے نام یاد آ رہے ہیں۔

اِن کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ہے جس کا اندراج ممکن نہیں۔ آج چوہتر سال کی بھرپور صحافتی اور ادبی زندگی بسر کرنے کے بعد ہمارا یہ یارِ عزیز ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا جس کی یادیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں آباد رہیں گی۔

◆◆◆

پرویز بزمی

''ادبی وابستگیوں کے اس دور میں ''تخلیق'' ایک ایسا رسالہ ہے جس کے صفحات اہلِ قلم اور قارئین کے اختلافِ اظہار کے لیے ہمیشہ حاضر رہتے ہیں اور آپ کی ذاتی پسند اور ناپسند ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس صحت مند ادبی رویہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔''

اظہر جاوید......یارِ طرحدار

اعزاز احمد آذر

اظہر جاوید میرا دوست، مونس و ہمدم اور بھائی تھا۔ وہ بھائی جن کی عمروں میں تین سال کا فرق، انہیں تعلقِ خاطر کے بے پناہ گہرے رشتے میں جوڑ دیتا ہے۔ احترام بھی، محبت بھی اور بے تکلفی بھی......سو میں بہت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اظہر جاوید کے ساتھ اپنے تقریباً نصف صدی پر محیط محبتوں کے اس عرصہ کا ایک ایک لمحہ خوب لطف اندوز ہوتے ہوئے گزارا۔ اور اس سارے عمل میں، زندگی کے اس حیات آمیز اور حیات آموز عرصہ کو پل پل انجوائے (Enjoy) کرنے کے عمل میں زیادہ تر حصہ اظہر جاوید ہی کا رہا ہے۔ وہ دوستوں کی دلداری کا فن جانتے تھے...... مجھے یہ قطعی دعویٰ نہیں ہے کہ اس تعلقِ خاطر کے حوالے سے اظہر جاوید پر صرف میری اجارہ داری تھی......مگر ایک احساسِ تفاخر اور اپنی نوعیت کا ایک اندازِ یکتائی اس تعلق کے ضمن میں ضرور موجود ہے۔ مجھے علم ہے وہ اپنے ہر ملنے والے کے مزاج، دلچسپی، ذوق وشوق اور آمد و رفت کے تمام زاویوں سے بخوبی واقف ہوتے تھے اور متعلقہ فرد (عورت یا مرد) کو اس کی سوچ اور توقع کے پس منظر میں کبھی دل برداشتہ یا مایوس نہیں کرتے تھے۔ یوں اظہر جاوید کا ہر ملنے والا انہیں اپنا ذاتی دوست قرار دیتا تھا اور یہ اظہر جاوید کی وضع داری ہی کا اعجاز تھا۔

اظہر جاوید وضع دار تو اس قدر تھا کہ بعض معاملات میں وہ قطعی باوسیلہ نہ ہونے کے باوجود دوستوں کی غمی خوشی میں پورے سماجی رکھ رکھاؤ، رسم و رواج کے پاسدار اور روائیتوں کے امین کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ وہ ایک بھرپور فعال زندگی کا استعارہ تھا، وہ محفل آراء، سخن طراز، دوست نواز اور دلبر و دلدار شخص تھا۔ اس سے مل کر زندگی سے محبت ہو جاتی تھی۔

اظہر جاوید کی پنجابی کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہوگئی'' پڑھیں تو ان کی زندگی کی بہت سی وہ گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں جنہیں عام حالات میں وہ سات پردوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ یہ ان کی ذاتی زندگی کا حوالہ تھا۔ کمال یہ ہے کہ وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر جب لکھنے بیٹھتے تھے تو اس موضوع کی سات تہوں تک نیچے اتر جاتے۔ میری ذاتی طور پر سوچ یہ تھی کہ ان کے ناپسندیدہ موضوع کو کبھی چھیڑا نہ جائے......سو ہماری نشستیں دنیا کے ہر ہر موضوع کا احاطہ کرتیں۔ علم، ادب، سیاست، حالات حاضرہ، حالات غیر حاضرہ، لطیفے، ذاتی تجربے، مشاہدے، گفتنی ناگفتنی، زندگی کی کامیابیاں،

خوشیاں، ناکامیاں، دکھ، محرومیاں، لوگوں کے مثبت اور منفی رویے...... بلکہ یہاں تک کہ ''تخلیق'' میں اگر کوئی بے وزن شاعری چھپ گئی تو وہ اس کی پردہ پوشی اور دلیل بازی نہیں کرتے تھے۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ وہ شاعر تو آپ کا بے حد گہرا دوست ہے آپ بے تکلفی میں اسے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ مسودہ ایک بار پھر دیکھ لے...... ہنس دیتے اور کہتے، ''تھک گیا ہوں کہہ کہہ کر......اب ہونے دیں اسے ایکسپوز'' ...... بے شک لوگ یہی سمجھیں کہ یہ کمپوزنگ اور پروف کی غلطی ہے......''

اظہر جاوید...... دوسروں کو اپنی خوشیوں میں چاہت کے ساتھ شریک کرتے تھے اور خود دوسروں کے دکھوں میں (اپنے سو کام چھوڑ کر) شریک ہوتے تھے لیکن انہیں کوئی دوسرا اگر اپنی ذاتی، گھریلو، خاندانی......کسی بھی طرح کی خوشی میں شریک کرتا تھا تو یہاں ان کی شرکت سماجی قدروں کے بے پناہ اظہار کے جلو میں ہوتی تھی۔ وہ حسب موقع کیک، مٹھائی، پھول یا باقاعدہ تحفے کے ساتھ اس خوشی میں شریک ہوتے تھے......وہ ایک مکمل وضع دار انسان تھے ایسے وضع دار...... جو انسانی رشتوں کے احترام کو تیقّن اور تقدّس عطا کرتے ہیں۔

اظہر جاوید ایک نفیس طبیعت اور نفیس شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہو گئی'' اور شاعری کے مجموعہ ''غم عشق گر نہ ہوتا'' میں ذاتی قلب وجاں پر گزرنے والی وارداتوں کا روانی اور فراوانی سے بیان پیش کرنے والے اظہر جاوید ''اپنا آپ لوگوں پر آشکار'' کر گزرتے ہیں مگر سماجی زندگی میں وہ دوستوں کے راز اپنے سینے میں دفن کر لیتے اور پردہ پوشی کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔

نازک طبع اظہر جاوید عزتِ نفس کے حوالے سے بہت حسّاس تھے۔ اپنے رسالے میں ایک سے ایک بڑے ادیب اور شاعر کو انھوں نے چھاپا مگر مجال ہے جو اس چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ میں ''حفظِ مراتب'' کے حوالے سے کوئی ایک آواز بھی کسی جانب سے سنی گئی ہو۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو اس کے نام اور مقام کے لحاظ سے جگہ دیتے تھے اور بجا طور پر امید رکھتے تھے کہ ''ان کے ساتھ بھی یہی منصفانہ سلوک'' کیا جائے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو وہ اس مشاعرے میں شرکت سے انکار کر دیتے تھے جہاں دعوتی کارڈ میں ان کا نام ترتیب کے لحاظ سے غلط مقام پر چھاپا گیا ہوتا تھا۔ منتظمین خواہ لاکھ معافیاں مانگیں اور معذرتیں کریں...... بلکہ ملفوف اعزازیہ کو ''مزید بھاری'' کر دینے کا بھی لالچ دیں لیکن وہ مشاعرہ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔

دوستوں کا احترام اظہر جاوید کی سرشت میں شامل تھا مگر دوستوں کی کسی ناپسندیدہ حرکت پر بچوں کی طرح روٹھ جانا بھی اظہر جاوید کی طبیعت اور ان کے مزاج کا خاصا تھا۔ بڑا لطف آتا تھا ان کو روٹھا ہوا دیکھ کر۔ ان کو منانے کے حربے اور حیلے بہانے بہت مزہ دیتے تھے۔ اس دوران ان کے چہرے کا سفید سفید رنگ ہلکا سرخی مائل ہو جاتا تھا۔ ''اللہ دی قسمے'' ......اور ''بخدا، بخدا'' کہہ کر وہ اپنی ناراضی کی دلیل دیتے تھے۔ اس کا جواز مہیا کرتے تھے، اس طرح ان کے چہرے کی لالی انہیں اور خوبصورت بنا دیتی تھی۔

ہمہ وقت ہنستا مسکراتا رہنے والا شخص...... جسے میں نے کبھی بُرے سے بُرے حالات میں بھی ٹوٹتے......بکھرتے

نہیں دیکھا، یارِ طرح دار افضال شاہد کے جنازے پر میرے گلے لگ کے خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور میرے ضبط کے بندھن کو بھی ریزہ ریزہ کر گیا۔ ہم دونوں کتنی دیر اس کیفیت میں رہے۔ مجھے کچھ علم نہیں شائد بھائی طفیل اختر ہمارے درمیان آ گئے تھے۔ اظہر جاوید اس روز بہت نڈھال تھے۔ میں نے بعد میں انہی کے مشورہ سے پنجابی کمپلیکس میں افضال شاہد کے تعزیتی ریفرنس کا اعلان کیا تھا۔

اسی دوران فروری کا ''تخلیق'' بھی آ گیا۔ جھنگ سے طاہرہ بخاری کا فون آیا۔ ''میری نظم کیسی ہے؟'' میں نے حسبِ موقع تعریف کی تو طاہرہ نے کہا ''یہ ''تخلیق'' میں میری آخری شمولیت ہے۔'' جواز اگرچہ از خود میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا کہ لڑکیوں کا مسئلہ یہی ہوتا ہے، شادی ہو گئی، سب لکھنا لکھانا، شاعری واعری ختم...... ہو سکتا ہے یہی سبب ہو مگر نہ جانے کیوں میں نے پوچھ لیا ''کیوں، خدانخواستہ اظہر صاحب سے کوئی بات تو نہیں ہو گئی؟'' انہوں نے ہنستے مسکراتے ہوئے کسی ناخوشگوار واقعہ کی تردید کر دی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ 12 فروری کو میں افضال شاہد کے حوالے سے ایک مضمون ''تخلیق'' کے لیے دینے بھگوان سٹریٹ پہنچا۔ حسبِ معمول ہنستے مسکراتے، جملہ بازی کرتے، سیٹ سے اٹھے۔ عادت کے مطابق مجھے گلے لگایا اور اپنی بائیں جانب بیٹھی سحر حفیظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''اَیناں نُوں ملو، سحر حفیظ ایڈیٹر ''تخلیق''۔ میں نے بھی بلا توقف، بے ساختہ کہا ''تے فیر ایتھوں اٹھو، ایہہ سیٹ ایڈیٹر واسطے خالی کرو۔ میں اوہنوں اپنا مضمون پیش کراں'' ......

14 فروری کو صبح ساڑھے دس بجے کے اردگرد میرا موبائل بولا۔ سکرین پر ڈاکٹر جاوید سبزواری صاحب کا نام تھا...... میں اس وقت پی ٹی وی میں افتخار مجاز (ایگزیکٹو پروڈیوسر۔ انچارج کرنٹ افیئرز) کے آفس میں تھا۔ ٹی وی پروگرام (ٹاک شو) کے لیے مہمان آ چکے تھے، چائے کی پیالی پر، تبادلہ خیال ہو رہا تھا، میں ڈاکٹر سبزواری صاحب کو فون پر سلام کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ''آذر صاحب ایک ستارہ اور ٹوٹ گیا''، اس صبح کی پچھلی رات ہمارے مشترکہ دوست عباس نجمی کی خبر بھی آ چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ان کا ذکر کیا مگر وہ بولے ''آذر صاحب وہ خبر پرانی ہو گئی...... تازہ خبر...... اظہر جاوید......'' اور پھر دونوں جانب خاموشی ہو گئی...... پتہ نہیں کتنی دیر بعد میں واپس گھوما تو افتخار مجاز مجسم سوالیہ نشان کی صورت میرے سامنے تھا۔ میرے منہ سے صرف یہ نکلا......

''افتخار!...... اظہر جاوید......''

اسی رات طاہرہ بخاری فون پر بار بار کہہ رہی تھیں ''آذر صاحب ''تخلیق'' میں آخری بار چھپنے کا میرا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ...... (وہ سسکیاں لیتی رہیں) اور میں آج تک اپنے خدا سے بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ جب 12۔ تاریخ کو میں نے اظہر جاوید سے یہ کہا تھا کہ ''اٹھو، سیٹ خالی کرو...... تو اس کا مطلب یہ کب تھا کہ 14 فروری کو واقعی یہ سیٹ خالی کر دی جائے......

یہ کیا ہوا کہ اسے دیکھے عمر بیت گئی
ابھی ابھی تو مرے پاس ہی وہ بیٹھا تھا

◆◆◆

محبت فاتحِ عالم

پروفیسر جمیل آذر

غالباً1960ء کا عشرہ تھا۔ میری ملاقات سلطان رشک، ایڈیٹر 'نیرنگِ خیال' کے مکان واقع ڈی۔اے۔وی کالج روڈ، راولپنڈی میں دونو جوانوں سے ہوئی۔ دونوں کا اُٹھتا ہوا قد، سر پر لمبے بال جو گردن تک پھیلے ہوئے تھے، دونوں کے لمبے چہرے اور لمبے ناک، البتہ ایک کا رنگ قدرے براؤن گندمی دوسرے کا سفید گندمی، ایک کی زبان ٹھیٹھ پنجابی دوسرے کی زبان نستعلیقی اُردو، دونوں شاعر، ہنس مُکھ، لطیفے سنانے اور قہقہے لگانے والے۔ میری پہلی ہی ملاقات ان سے انمٹ یگانگت اور یادوں میں بس گئی۔ یہ پنجابی بولنے والے اور لمبے بالوں والے اظہر جاوید تھے اور دوسرے ناصر زیدی۔ اظہر جاوید سے تو یاداللہ اُن کے ادبی مجلّہ 'تخلیق' کے ذریعے سے ہوتی رہی جو وہ نہایت مشکل حالات میں بڑی باقاعدگی سے نکالتے اور دوستوں کو ارسال کرتے تھے۔ ناصر زیدی چونکہ راولپنڈی ہی میں آباد ہو گئے تھے اُن سے بہ نفسِ نفیس ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ ویسے بھی ناصر زیدی ادبی کالم نگار ہونے کی حیثیت سے جب ادبی مجالس میں شرکت کرتے تو اُن سے مصافحہ اور سلام ودعا کا سلسلہ جاری رہتا۔ البتہ اظہر جاوید سے ملاقات زیادہ عرصہ ''تخلیق'' ہی کے توسط سے رہتی۔ مجھے معلوم تھا کہ اظہر جاوید اس ادبی مجلّہ کو بڑی محنت اور جانفشانی سے نکالتے تھے اور ان کے مالی وسائل بھی محدود تھے لہٰذا میں حتی المقدور انہیں زرِ سالانہ اس کی قیمت سے زیادہ ہی ارسال کر دیتا تھا۔ اس پر وہ مجھے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے تھے۔

ایک مرتبہ مری میں ہمارے دوست انجم نیازی نے کسی خاص تقریب کے حوالے سے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ اِس مشاعرہ میں شرکت کے لیے جہاں وزیر آغا اور دیگر شعرائے کرام تشریف لائے تھے اُن میں اظہر جاوید بھی شامل تھے۔ یہ غالباً اسّی کی دہائی کا زمانہ تھا اور اس وقت اظہر جاوید پورے عالمِ شباب میں تھے۔ وہی لمبی زلفیں، وہی قہقہے اور وہی لطیفہ گوئی اور مختلف دلچسپ واقعات کے سنانے کا سلیقہ۔ میں خود بھی نہ صرف سیر کرنے کا رسیا تھا بلکہ وراثت میں ملی ہوئی ورزش کرنے کا عادی بھی تھا۔ اس وقت یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اظہر جاوید بھی ورزش کرنے کے شوقین ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے مسلز (مچھلیاں) بھی دکھائے جنہیں مضبوط اور خوبصورت دیکھ کر میں نے انہیں داد دی جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے جس طرح انہیں پہلے خوش مزاج اور ہنس مکھ دیکھا تھا وہ اب بھی ویسے ہی خوش طبع تھے۔ پھر ایک مرتبہ میں ڈاکٹر وزیر آغا سے ملنے لاہور آیا ہوا تھا۔ میرے ساتھ مشتاق قمر بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب ان کے ہاں باہر سے کوئی ادیب یا شاعر ملنے آتا تھا تو وہ

لاہور کے اپنے قریبی دوستوں کو بھی مدعو کرلیا کرتے تھے لہٰذا اظہر جاوید سے وہاں بھی ملاقات ہوئی اور اُن کی زبانی لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔

میں اپنی پیشہ ورانہ تدریسی فرائض میں زیادہ مصروف رہا اس وجہ سے میں ادبی مجلسوں میں زیادہ حصہ لینے سے قاصر ہی رہا۔ نہ صرف ادبی مجالس سے بلکہ ادبی اور شخصی چپقلش اور ادبی گروہ بندی سے بھی دور رہا۔ میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ہفتہ وار میٹنگوں میں بھی زیادہ نہیں جاتا تھا۔ ہاں البتہ میں ایک آدھ میٹنگ میں اس لیے شرکت کر لیتا تھا کہ کہیں میرا نئی نسل سے رابطہ منقطع نہ ہو جائے بس اپنی موجودگی کا احساس دلانا مقصود ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ لاہور میں مشتاق قمر کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کی میٹنگ میں اپنا ایک انشائیہ پڑھنے آیا تھا۔ انشائیہ کا عنوان تھا ''مارکوپولو'۔ اس اجلاس میں سعادت سعید نے میرے انشائیے کے حوالے سے کم اور میرے دوست ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے زیادہ سخت تنقید کی تھی۔ میٹنگ کے بعد میں اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس کی تنقید کی تعریف کی۔ چونکہ میں حلقہ کی تنقید کے مزاج سے واقف تھا۔ بُرا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی انشائیہ نگار کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ تنقید کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کرے بلکہ اس تنقید سے فائدہ اٹھائے اور اس سے ہرگز دل برداشتہ نہ ہو۔ شرط یہ ہے کہ انشائیہ نگار کو اپنی تخلیق پر بھروسہ ہو اور بھرپور اعتماد ہو۔ میں نے اپنا ایک انشائیہ جس پر مجھے بڑا ناز تھا ایک صفحۂ اوّل کے ادبی رسالہ میں بھیجا۔ ایڈیٹر نے انشائیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ انشائیہ کے مزاج پر پورا نہیں اُترتا۔ اس میں گہری سنجیدگی ہے۔ لیکن جب وہی انشائیہ میں نے مشفق خواجہ کے رسالہ تخلیقی ادب کے لیے بھیجا تو انہوں نے نہ صرف اِسے شرفِ قبولیت بخشا بلکہ شائع بھی کیا اور اس ایک انشائیہ کی وجہ سے میری اُن سے قربت بڑھ گئی۔ لاہور میں حلقہ کی میٹنگ کے بعد بھی میں اظہر جاوید سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکا، اور واپس راولپنڈی آ گیا۔

اظہر جاوید سے گذشتہ چند برس سے میرا قریبی ادبی رابطہ ہو گیا تھا اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ڈاکٹر وزیر آغا اپنی بیماری اور بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث 'اوراق' جاری نہ رکھ سکے دوسرے میرے روحانی دوست ملک مقبول احمد صاحب نے مجھے 'تخلیق' میں اپنی تحریریں بھیجنے کی طرف اشارہ کیا۔ اِس تعلقِ خاطر میں ڈاکٹر انور سدید کا بہت دخل تھا۔ میری اور ملک مقبول احمد اور ڈاکٹر انور سدید کی ایک ایسی تکون سی بن گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ روحانی اور ادبی طور پر منسلک ہو گئے تھے۔ اظہر جاوید پہلے ہی سے ڈاکٹر انور سدید اور ملک مقبول احمد کے ساتھ محبت کے رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اب میری تحریریں ''تخلیق'' میں چھپنے لگیں۔ میں نے اُن کی شخصیت میں ایک نہایت زیرک ایڈیٹر پایا۔ وہ ہر چیز کو بغور پڑھتا اور جہاں مناسب سمجھتا اس میں ترمیم یا اصلاح کرتا جس سے مصنّف کی تحریر میں اور نکھار پیدا ہو جاتا۔ میں نے انہیں دبئی کے چند واقعات پر منحصر اپنے تاثرات لکھ کر بغرضِ اشاعت بھیجے۔ اس مضمون کا عنوان ذرا طویل تھا۔ انہوں نے اس طویل عنوان کی جگہ نہایت مختصر عنوان سے میرا مضمون شائع کیا۔ مجھے اُن کا عطا کردہ عنوان بہت پسند آیا۔ یوں انہوں نے نہ صرف میرے سفرنامہ کو ''رپورتاژ'' کا نام دے کر شائع کیا بلکہ بڑا جامع عنوان دے کر میری ایک غیر ضروری طوالت کی کمزوری کو بھی دور کر دیا۔ ایک اچھا ایڈیٹر وہی ہوتا ہے کہ وہ کھلی آنکھ اور کشادہ دلی کے ساتھ اپنے رسالہ کے مصنفین کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کو دور کر دیتا ہے اور اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ مجھے اُن کی یہ

ادا بہت پسند آئی۔ صائمہ نورین بخاری بڑی عمدہ شاعرہ اور خوبصورت افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے ایک افسانے کے بارے میں میں نے ''تخلیق'' میں ایک دو تحسینی کلمات لکھے تو اظہر جاوید نے میری رائے کی توثیق کی اور دل کھول کر اُن کے افسانے اور شاعری کی تعریف کی۔ وہ دوستوں کی دل جوئی اور محبت میں بہت دور تک جاتے تھے۔ میں نے انہیں گذشتہ دو تین ماہ میں یکے بعد دیگرے چار مضامین ارسال کر دیئے اور یہ سارے مضامین دوستوں کی کتابوں پر تھے۔ ایک مضمون کے بارے میں انہوں نے مجھے لکھا کہ اِس پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے لہٰذا اس کے چھپنے میں اَب ذرا وقت لگے گا۔ آخری مضمون پر انہوں نے کہا کہ آپ نے مجھے فوٹو سٹیٹ کاپی بھیج دی ہے جو میرے اصول کے خلاف ہے۔ اس پر میں نے انہیں لکھا کہ برادرِ محترم میں نے اپنے مضمون کی دو کاپیاں کرائی تھیں۔ ایک میرے ہاتھ کا لکھا ہوا مضمون تھا اور دوسرا نسخہ فوٹو سٹیٹ والا تھا۔ پتہ نہیں غلطی سے میرا فوٹو سٹیٹ والا مسودہ آپ کے لفافہ میں چلا گیا اور اصل مسودہ مصنف کو بھیج دیا۔ اب میرے پاس اس مضمون کی کوئی کاپی نہیں۔ آپ مدیر ہیں اسے شائع کریں یا نہ کریں یہ آپ کا استحقاق ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ سمجھے کہ شاید میں ناراض ہو گیا ہوں۔ انہوں نے فوراً معذرت سے بھرپور خط لکھا اور کہا ''کاش میں انشائیہ نگار ہوتا تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی!'' ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جو بات انہیں پسند نہیں آتی تھی وہ بلا جھجک کہہ دیتے تھے اور جس بات سے انہیں یہ احساس ہو جاتا تھا کہ اِس سے دوست کو رنج پہنچا ہے تو فوراً اُسے منانے کی کوشش کرتے اور اس کی دل جوئی کرتے۔ میری ایک بُری عادت ہے کہ میں عام خطوط کو سنبھال کر نہیں رکھتا عام تو کیا بعض اوقات میں خاص خطوط بھی احتیاط سے نہیں رکھتا۔ میں نے اس آخری خط کو اگرچہ سنبھال کر رکھا تھا، لیکن بسیار کوشش کے باوجود تلاش نہ کر سکا۔ میرا اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوستوں کی دل جوئی اور اُن کے جذبات کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

14/فروری 2012ء میں وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس وقت میں اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس دبئی گیا ہوا تھا۔ ملک مقبول احمد صاحب نے اس سانحہ ارتحال کی خبر مجھے اپنے موبائل فون پر نہایت دل گرفتگی کے ساتھ بتائی۔ اس روز میں بڑا غم زدہ ہوا اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ اُن کی مغفرت کی، اللہ رب العزت سے دعا کی۔ جب واپس اپنے وطن عزیز آیا تو ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ میرا منتظر تھا۔ اس پرچے میں میرا مضمون شامل تھا وہ جاتے ہوئے یہ قرضہ بھی اتار گئے۔ اس سے پہلے والے مضامین بھی وہ شائع کر چکے تھے۔ وہ دوستوں سے سچی اور کھری محبت کرتا تھا اور روٹھے دوستوں کو منانے کا فن جانتا تھا۔ اس کے اندر غرور و نخوت کا دور دور کوئی نشان نہیں تھا۔ امین راحت چغتائی میرے بڑے پیارے دوست ہیں بعض اوقات باتوں باتوں میں وہ ناقابلِ فراموش باتیں کر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے یہ جملہ ادا کیا ''جمیل صاحب! روزی کمانا بہت مشکل کام ہے'' مجھے اُن کا یہ جملہ اکثر یاد آ جاتا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ قلم سے روزی کمانا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ اظہر جاوید نے سدا اپنے قلم سے روزی کمائی، اپنے لیے مشکل ترین راستہ اختیار کیا اور رزقِ حلال کمایا۔ دوستوں کو اپنی محبت اور خلوص کے گل دستے پیش کیے، قہقہے لگائے، لیکن اپنے اندر کے غم کو اپنے دل ہی میں رکھا جو زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکا اور عین اس وقت اُس کا ساتھ چھوڑ گیا جب وہ کامیابی، شہرت اور محبت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا اور ہمارے سامنے: ''یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم'' کی مثال بن کر نمودار ہوا تھا۔

◆◆◆

اظہر جاوید کے بارے میں ایک بے ربط تحریر

سرفراز سیّد

برخوردار سونان اظہر جاوید نے عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے۔ایک مراسلہ میں کہا ہے کہ اظہر جاوید کے فن اور شخصیت کے بارے میں اپنی کوئی نثری یا شعری تخلیق بھجوادوں جسے 'تخلیق' کے خصوصی ''اظہر جاوید نمبر'' میں شائع کیا جائے گا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے اور کیسے شروع کروں؟ ایک دو ملاقاتیں ہوں تو اور بات ہے مگر جو ملاقات 45 برسوں پر پھیلی ہو اور اس میں کوئی وقفہ بھی نہ آیا ہو، اس کو ایک مضمون میں کیسے سمیٹا جائے جب کہ یہ یقین بھی نہ آ رہا ہو کہ وہ شخص جو ابھی ابھی ادھر تھا، بہت زندہ تھا، اب دکھائی نہیں دے رہا!

چند روز قبل '15 مارچ' کو معروف بزرگ صحافی، فوٹو گرافر چاچا ایف ای چودھری کی 103 ویں سالگرہ تھی۔کئی برسوں سے میں اور اظہر جاوید ہر برس اکٹھے چاچا کی سالگرہ پر پھول اور کیک لے کر ان کے گھر جایا کرتے تھے۔اس بار 15 مارچ کو میں اکیلا پھول لے کر چاچا کے پاس گیا۔انہوں نے پہلا سوال کیا کہ آج اظہر جاوید کیوں نہیں آیا؟ میں خاموش کھڑا رہ گیا، چاچا کو نہ بتا سکا کہ آج مجھے اکیلے ہی آنا تھا۔آج اظہر جاوید کے لئے آنا ممکن نہیں تھا۔چاچا نے کہا کہ اظہر جاوید کو بھیجنا، اس سے ایک بات کرنی ہے۔میں نے کہا کہ اچھا جی! بھیج دوں گا......! مگر......!! آنکھ میں نمی ہو، دل بوجھل ہو تو الفاظ ساتھ نہیں دے پاتے۔ بہت سی باتیں، بہت سے واقعات......اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب 1966ء کے لگ بھگ وہ 'سیارہ ڈائجسٹ' میں تھا۔

میں نے اور اظہر جاوید نے تقریباً ایک ہی وقت اخباری صحافت میں قدم رکھا۔اسے ''امروز'' میں اور مجھے ''مشرق'' میں جاب مل گئی۔ ہفتہ میں ایک آدھ بار ملاقات ہو جاتی۔اس نے ''امروز'' میں بہت خوبصورت اور جاندار ادبی ایڈیشن نکالنے شروع کئے۔ضیاء الحق کی سیاہ آمریت کے دور میں سندھ میں ہاریوں کی حالتِ زار بہتر بنانے کے بارے میں ایک قرارداد لاہور کے صحافیوں کے پاس بھیجی گئی۔اظہر جاوید سمیت 'امروز' اور 'مشرق' کے 17 صحافیوں نے اس قرارداد پر دستخط کر دیئے۔ان میں سے بیشتر نے قرارداد پڑھی بھی نہیں تھی۔پاک ٹی ہاؤس میں مستقل بیٹھنے والا ایک شاعر دوست اپنے قریب سے گزرنے والے ہر شخص کو روک کر اس پر دستخط کرا لیتا تھا۔اظہر جاوید نے بھی ایسے ہی پاس سے گزرتے ہوئے کوئی تفصیل پوچھے اور پڑھے بغیر دستخط

کر دیئے تھے۔ یہ ایک بالکل بے ضرر سی قرارداد تھی مگر اس کے خطرناک ہونے کا اس وقت اندازہ ہوا جب یک بیک نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے اُن تمام 17 صحافیوں کو جبری طور پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ یہ کام روزنامہ ''مشرق'' کے شریف النفس چیف ایڈیٹر اقبال زبیری کو برطرف کرا کے خود یہ عہدہ سنبھالنے والے صحافی ضیاء الاسلام انصاری نے کرایا تھا جو جنرل ضیاء الحق کے بہت نزدیک تھا۔ اس نے ایک سادہ کاغذ پر اپنے قلم سے لکھا کہ ان لوگوں کی موجودگی میں پریس ٹرسٹ اخبارات صحیح طور پر صدرِ مملکت کی پالیسیوں کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ضیاء الاسلام انصاری کا تعلق صرف ''مشرق'' سے تھا، ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر ضیاء الحق نے اس کی اس تحریر کی بنا پر پورے نیشنل پریس ٹرسٹ کا چیئرمین اس کو بنا دیا۔ ضیاء الحق کے انجام کے بعد ان صاحب کی جو حالت زار میں نے دیکھی وہ ایک الگ داستان ہے۔

اظہر جاوید نے میکلیگن روڈ پر نیشنل بنک کی عمارت کے عقبی حصے میں ''تخلیق'' کا دفتر قائم کیا۔ یہ پاک ٹی ہاؤس سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم لوگ ٹی ہاؤس سے اٹھتے تو اظہر کے پاس چلے جاتے۔ اظہر کے پاس سے اٹھتے تو ٹی ہاؤس میں آ بیٹھتے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان سڑک کے کونے پر ایک پہلوان پان فروش کی دکان تھی۔ وہ پان بنا کر ہاتھ میں نہیں دیتا تھا بلکہ خود پان خریدنے والے کے منہ میں ڈال دیتا تھا۔ اس کی دکان کے باہر الحمرا کے مختصر ہال میں ڈرامے پیش کرنے والے فن کار بنچوں پر بیٹھے رہتے۔ یوں یہ جگہ بیک وقت ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے میل جول کا مرکز بن گئی تھی۔ اظہر جاوید کو ہمیشہ ہر جگہ اچھے ہمسائے مل جاتے تھے جو اظہر کی خاص دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

واقعات تو بہت سے ہیں مگر ایک دو واقعات کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔ یہ 1990ء کے عشرہ کی بات ہے۔ میرا ایک اخبار کے مالک سے کوئی اختلاف پیدا ہو گیا۔ میں نے استعفا لکھا اور خاموشی سے نکل کر اظہر جاوید کے پاس دفتر میں جا پہنچا۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے بتایا کہ استعفا دے آیا ہوں۔ وہ ہنسا۔ کہنے لگا ''تم نے اس شخص کا اخبار چھوڑنے میں دیر کر دی۔ یہ نیک کام بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔ خیر اب یہ کارِ خیر ہو گیا ہے تو دیکھو گھر جا کر کسی کو نہیں بتانا کہ تم نے جاب چھوڑ دی ہے۔ تم روزانہ معمول کے مطابق گھر سے تیار ہو کر نکلا کرو، یہاں میرے پاس دفتر میں آ جایا کرو، اور واپسی کے وقت تک یہاں بیٹھ کر جو بھی چاہے لکھتے پڑھتے رہا کرو۔ شام کو گھر چلے جایا کرو۔ باقی تمہارے مالی معاملات کا مسئلہ ہے تو یہ مجھ پر چھوڑ دو، اللہ بہتر کرے گا۔!'' یہ معمولی بات نہیں تھی۔ یہ اور بات کہ مجھے اگلے ہی روز ایک دوسرے اخبار والوں نے بلا لیا۔ میں وہاں جانے سے پہلے اظہر کے پاس آیا اور بتایا کہ دوسرے اخبار میں جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہاں بھی استعفا دینا پڑے تو پھر ادھر ہی آ جانا، اللہ بہتر کرے گا۔

دوسرا واقعہ اس مقدمے کا تھا جس میں اظہر جاوید کے ساتھ مجھے بھی پیش ہونا پڑا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اظہر جاوید نے ان دنوں کے ایک بڑے نامور ادیب و شاعر کے بارے میں، ''تخلیق'' میں اداریہ چھاپ دیا کہ اُن صاحب نے حکومت سے ایک چیک وصول کیا ہے اور اس بارے میں اپنے ہی بیان کردہ اصولوں کی نفی کی ہے۔

یہ بات جزوی طور پر درست تھی کہ دوسری طرف کی وضاحت کے مطابق چیک آیا تو تھا مگر وصول نہیں کیا گیا تھا۔ یہ وضاحت اظہر جاوید تک آ جاتی تو شائد وہ ''تخلیق'' کے اگلے شمارہ میں وضاحت کے ساتھ معذرت بھی کر دیتا (اس نے ایسا کرنے کا عندیہ بھی دیا تھا) مگر ''تخلیق'' کا آئندہ شمارہ آنے میں ابھی بہت دن باقی تھے۔ اس کا انتظار کرنے کی بجائے ان بزرگ ادیب نے براہ راست اظہر جاوید کو ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمہ کا نوٹس بھجوا دیا اور اس کے ساتھ مجھے اخبار میں اس بارے میں تحریری خبر بھیج دی گئی۔ میرے لئے یہ خبر خاصی بوجھل تھی۔ میں نے اظہر جاوید کو فون کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا کہ ''ہاں 50 لاکھ روپے ہرجانے کا نوٹس ملا ہے، میں عدالت میں اس کیس کا سامنا کروں گا۔'' میں نے اس کے اس جواب کو اُن بزرگ ادیب کی تحریر کے ساتھ ہی چھاپ دیا۔ اس خبر میں دائیں طرف اس بزرگ ادیب کی اور بائیں طرف اظہر جاوید کی تصویر چھپ گئی۔ اس انداز میں خبر کی اشاعت پر دو اہم واقعات ہوئے، ایک تو یہ کہ اس خبر کو بنیاد بنا لیا گیا کہ اظہر جاوید نے قانونی نوٹس کے جواب میں یہ کیس عدالت میں لڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اور پھر ایک مقامی عدالت میں اظہر کے خلاف 50 لاکھ روپے کے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ اس مقدمہ میں اس خبر کے اخباری ناشر کے طور پر مجھے مرکزی گواہ نامزد کر دیا گیا اور مجھے ایک ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں طلبی کا نوٹس آ گیا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ اخبار میں اپنی خبر اور تصویر کے ساتھ اظہر جاوید کا بیان اور تصویر شائع ہونے پر وہ بزرگ ادیب انتہائی مشتعل ہو گئے۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے والی ایک خاتون (خدا تعالیٰ مغفرت فرمائے) کا فون آیا۔ وہ مجھ پر برس پڑیں کہ ''آپ نے اظہر جاوید جیسے ''چھوٹے'' شخص کی تصویر بابا کی تصویر کے ساتھ چھاپ کر ان کی سخت توہین کی ہے۔ بابا اتنی بار آپ کے گھر آ چکے ہیں۔ آپ کی عزت کرتے ہیں مگر آپ نے یہ کیا حرکت کی ہے؟''

میں نے اس بی بی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ''آپ کے بابا خود ملک کے نامور صحافی رہ چکے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کے بارے میں کوئی خبر دی جائے تو صحافتی ضابطۂ اخلاق کے تحت دوسرے فریق سے اس خبر کی تصدیق اور اس کا موقف جاننا ضروری ہوتا ہے؟ مزید یہ کہ میں نے تو صرف خبر لکھی تھی اسے نیوز روم والوں نے اپنے انداز میں شائع کیا ہے اس سے میرا تعلق نہیں ہے۔'' میرا یہ موقف اور عُذر قبول نہیں کیا گیا، میں خود حاضر بھی ہوا مگر میرا جرم ناقابلِ معافی قرار پایا۔

بہرحال یہ کیس عدالت میں پیش ہوا۔ میرے لئے دوہرا مسئلہ تھا ایک طرف ان بزرگ شخصیت کا احترام واجب تھا۔ میں ان کے ساتھ ہمیشہ (بعد میں بھی) نہایت ادب اور احترام سے پیش آتا رہا تھا۔ اچانک یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ الٹا یہ کہ مجھے عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا۔ میرے لئے سخت مشکل پیدا ہو گئی کہ ان محترم شخصیت کا احترام بھی واجب تھا، ادھر اظہر جاوید کے ساتھ عمر بھر کی دوستانہ یا برادرانہ پُرخلوص رفاقت کا معاملہ بھی سامنے تھا۔ عدالت میں دونوں فریقوں کے بیانات ہوئے۔ مجھے بھی بہت سے سوالات کا جواب دینا پڑا۔ ہر طرح کی جرح کے جواب میں میرا ایک ہی موقف تھا کہ میں نے صحافتی ضابطۂ اخلاق کے تحت دونوں فریقوں کا موقف شایع کیا ہے اس میں کوئی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

یہ کیس چند ماہ چلا۔ ایک روز میں اظہر جاوید کے دفتر میں گیا۔ وہاں کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے اور قہقہے لگ رہے تھے۔ اس دفتر میں قہقہے کوئی نئی بات نہیں تھی، یہ دفتر ہر وقت قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا مگر اظہر کے چہرے پر کچھ عجیب سی بشاشت تھی۔ میں نے پوچھا کہ کس بات پر قہقہے گونج رہے ہیں۔ اظہر نے جواب دیا کہ ''شاہ جی! عدالت نے میرے خلاف 50 لاکھ روپے ہرجانے کی ڈگری جاری کر دی ہے!''

''پھر کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ ''میں اور یہ لوگ مل کر 50 لاکھ جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہیں پر ایک صاحب بولے ''یار اظہر! اس بات پر مبارک باد کہ تمہیں کم از کم 50 لاکھ روپے کی ڈگری کا مستحق تو سمجھا گیا، میں ہوتا تو یہ عزت کہاں نصیب ہونی تھی؟ محض چند ہزار کا ہرجانہ ہی کافی سمجھ لیا جاتا۔'' اظہر جاوید کے خلاف یہ ڈگری تو جاری ہو گئی مگر 50 لاکھ روپے نہ کوئی وصول کرنے آیا نہ ہی یہ کبھی ادا ہو سکی۔[1]

میں یہ واقعات بیان کر کے دراصل اظہر جاوید کے اچانک خاموش ہو جانے کے واقعہ سے ذرا ادھر اُدھر ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اظہر جاوید ہم سب کو چھوڑ کر دور دراز کے کسی سفر پر کیسے روانہ ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ گزارے ہوئے 45 برسوں کی رفاقت بہت سے واقعات، بہت سی داستانیں، کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ اتنا زندہ، اتنا خوش گوار، اتنا مجلسی شخص بلکہ خود ایک بھرپور مجلس، ایک بھرپور ادارہ...... اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔ معذرت خواہ ہوں کہ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں پا رہا۔

بہت پہلے وہ میرے گھر آیا کرتا تھا۔ ان دنوں میری بچیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہر بار ان کے لئے ٹافیاں لایا کرتا تھا۔ بچیوں نے اس کا نام انکل ٹافی رکھا ہوا تھا۔ چند روز پہلے میں نے موبائل فون پر ناصر بشیر کا بھیجا ہوا ایک پیغام پڑھا کہ ادبی ماہنامہ 'تخلیق' کے ایڈیٹر اظہر جاوید......! میں پورا پیغام نہ پڑھ سکا، اونچی چیخ نکلی اور زار و قطار رونے لگا۔ بچیاں گھبرا کر بھاگتی ہوئی آئیں، ابو! ابو! کیا بات ہے! میرے منہ سے صرف اتنا نکلا اظہر جاوید......! اور وہ دونوں بھی زار و قطار رونے لگیں......!

اظہر جی!

ہم دشت طلب میں ٹھہر گئے تم قریۂ جاں کے پار گئے
یہ بازی جان کی بازی تھی تم جیت گئے ہم ہار گئے

◆◆◆

[1] اظہر جاوید نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل دائر کر دی تھی، جس کی سماعت سے پہلے ہی ادیب موصوف اللہ کو پیارے ہو گئے''۔ (س۔س)

نصف صدی کا قصہ

پیروز بخت قاضی

یہ 1960 کی دہائی تھی جب کراچی کے بعض جرائد میں میرے مضامین چھپتے تھے۔ بیگم حسن زمانی عالمگیر ایک پرچہ ’’عکس نو‘‘ نکالتی تھیں۔ کراچی ہی سے ان دنوں ایک اور رسالہ ’’نقش‘‘ شائع ہوتا تھا۔ ’’عکسِ نو‘‘ کے سرورق پر بطور مدیر اعلیٰ حسن زمانی عالمگیر کا نام لکھا جاتا تھا لیکن درحقیقت وہ مختلف ادیبوں کی خدمات حاصل کرتی رہیں۔ شروع میں مدیرہ خود خطوط لکھ کر مضامین کا مطالبہ کرتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے اظہر جاوید کی خدمات حاصل کرلیں تو ان کے دستخطوں سے خطوط آنے لگے۔ یہ میرا اظہر جاوید سے پہلا تعارف تھا۔ جب میری ملازمت کی مصروفیات بڑھیں تو لکھنا لکھانا برائے نام رہ گیا۔

تیس برس تک اظہر جاوید کے ساتھ غائبانہ تعارف ہی رہا۔ لیکن جب میں 1990 کے آس پاس لاہور میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو چکا تھا تو کسی تقریب میں صدیقہ بیگم کی وساطت سے اظہر جاوید سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات دوستی اور محبت بھرے خلوص میں تبدیل ہوگئی۔ ان دنوں وہ ماہنامہ ’’تخلیق‘‘ کے علاوہ روزنامہ ’’امروز‘‘ کے ادبی ایڈیشن کا بھی مدیر تھا۔ مجھے صدیقہ بیگم نے جیفرے آرچر کی کہانیوں کی کتاب A twist in the tale دی۔ میں نے دو کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ ایک ’’ادبِ لطیف‘‘ میں چھپ گیا اور دوسرا ’’تخلیق‘‘ میں۔ بعدازاں میں نے تقریباً ساری کتاب کا ترجمہ کر دیا جو ’’انوکھی کہانیاں‘‘ کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اظہر جاوید نے مجھے چند پولش کہانیوں کا انگریزی ترجمہ اردو میں منتقل کرنے کے لئے دیا۔ میں نے اپنے طور پر بھی کیتھرائن منیز فیلڈ اور بعض دوسرے انگریزی افسانہ نگاروں کے تراجم کیے۔ اظہر جاوید نے بعض تراجم ’’تخلیق‘‘ میں اور زیادہ تر ’’امروز‘‘ میں شائع کئے۔ تراجم کے علاوہ بھی اظہر جاوید نے میری اور میری بیگم سیما پیروز کی متعدد تحریریں شائع کیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل چند ایک شمارے میرے ذاتی لائبریری میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ تخلیق میں چھپنے والی دیگر تحریریں میری کوتاہی سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

تخلیق فروری 1990ء	محض دوست۔ جیفرے آرچر کی کہانی
تخلیق اپریل 1990ء	سیڑھیاں۔ پولش کہانی
تخلیق اگست 1996ء	خوف اولڑے۔ پنجابی نظم
تخلیق دسمبر 1997ء	کارساز۔ ایرانی کہانی

ان کے علاوہ ''عکس نو'' اکتوبر 1965 میں ''تجریدی آرٹ'' کے زیر عنوان ایک مضمون شائع ہوا۔

یہ تعلق تو بطور مدیر تھا لیکن اظہر ہمارا بہت اچھا فیملی فرینڈ بھی تھا۔ ہمارے بچوں کے ساتھ بھی اس کے فرداً فرداً دوستانہ مراسم تھے۔ اظہر جاوید بڑا ہنس مکھ ہمدرد انسان تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کتنا دکھی ہے اور تنہا انسان ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کا دوست اور ہمدرد تھا۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ اظہر جاوید کا خاص تعلق ہے۔ وہ ہر شخص کی ہر قسم کی مدد کے لئے تیار رہتا تھا۔ لوگوں کے مسائل اور دکھ سنتا اور انہیں ہمت دلاتا لیکن اپنے دکھ اور مسائل کسی سے نہ بیان کرتا تھا۔ وہ کئی غریب اور ضرورت مندوں کی چپکے سے اپنی جیب سے مالی امداد کرتا۔ اور کئی لوگوں کی مدد کے لئے بعض دوستوں کو کہہ دیتا۔ اس طرح خاموشی سے اس کا مشن جاری رہتا۔

اظہر جاوید کو اپنے دوستوں کو ایک دوسرے سے ملانے اور گاہے بگاہے ان کو اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ ہمیں اور چند دیگر احباب کو وہ اپنے دفتر میں وَن ڈش پارٹی کی صورت میں اکٹھا کرتا۔ مہینے دو مہینے بعد ہمارے علاوہ باقاعدگی سے تسنیم اور عابد حسن منٹو، امینہ عنبریں، عطیہ سید وغیرہ اپنے اپنے پکوان لے کر بھگوان سٹریٹ پہنچتے۔ بعض اوقات کچھ اور لوگوں کو بھی شامل کر لیا جاتا۔ وہ ہمارے گھر بھی کئی بار آتا اور کریلے گوشت یا کچنار گوشت کھانے کی بطور خاص فرمائش کرتا۔ رات واپسی پر اس کی خواہش ہوتی کہ اسے کسی ایسی جگہ پر ڈراپ کر دیا جائے جہاں سے وہ رکشا لے کر اپنے گھر جا سکے۔ وہ اپنے گھر کا کسی کو پتہ نہ بتاتا تھا اور نہ ہی وہاں کسی کو بلاتا تھا۔ لیکن چند ایک مرتبہ مجھے یا میرے بیٹے کو کار میں اس کے گھر تک جانے کا موقع ملا اور وہ کار سے اتر کر خدا حافظ کہہ کر اندر چلا جاتا۔

''پرائڈ آف پرفارمنس'' ملنے پر اس کے اعزاز میں کئی دوستوں نے تقریبات کیں۔ وفات سے چار پانچ روز قبل اس سلسلہ کی آخری تقریب ہمارے گھر منعقد ہوئی جس میں کئی دوست احباب مدعو کیے گئے۔ اس روز وہ بہت خوش اور مسرور تھا۔ میرے بچوں سے بھی وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اس روز بھی میرے گھر کے ایک ایک فرد کو بڑی اپنائیت سے ملا۔ تقریب کے بعد بذریعہ ڈاک اس کا جو خط سیما پیروز کے نام ملا اس میں ہمارے خاندان کے ایک ایک فرد کا ذکر کر کے شکریہ کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور پھر 13 فروری کی شام شاہد علی خان مدیر الحمراء نے جمخانہ کلب میں ڈاکٹر سعید اختر درانی کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جہاں اظہر جاوید بھی مدعو تھا۔ اس شام بھی وہ بڑا خوش اور شوخ نظر آتا تھا۔ حسب عادت سب سے چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازی کرتا رہا۔ کھانے کے بعد خوش گپیوں کے دوران وہ مجھے گلے ملا اور خلاف معمول بڑی دیر تک مجھے اپنی بانہوں میں لئے رکھا۔ رات ہنسی خوشی وہ سب سے رخصت ہوا لیکن کس کو معلوم تھا کہ یہ اس کی دائمی رخصت ہوگی۔ اگلی صبح سویرے 14 فروری کو ویلنٹائن ڈے پر کسی کو زحمت دیئے بغیر وہ اس جہاں سے رخصت ہو گیا اور اسی شام اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔ آمین!

◆◆◆

رابطے ختم ہو گئے سارے

ظفر علی راجا

خود پسندی کے جراثیم یوں تو ہر شخص کے خون میں روزِ ازل سے شامل ہوتے ہیں لیکن ہم اہل قلم خود پسندی کی بیماری میں کچھ زیادہ ہی مبتلا ہوتے ہیں اور اخبار یا رسالے میں وہ مقام سب سے پہلے تلاش کرتے ہیں جہاں ہمارا نام کسی ادبی یا صحافتی تخلیق پر جگمگا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اس بیماری کا مریض ہوں۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں گذشتہ سولہ برس سے، اخبار کے دوسرے صفحہ پر میرا ایک قطعہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ہمیشہ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں اپنے قطعہ پر نظر ڈالوں۔ 14 فروری کو ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے مجھے لاہور سے باہر جانا پڑا۔ 15 فروری کی رات واپسی ہوئی۔ 16 فروری کو صبح ''نوائے وقت'' میں بڑی بڑی سرخیوں پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد اخبار کے دوسرے صفحہ پر حسب عادت اپنا قطعہ تلاش کیا تو دیکھا کہ میرے نام سے ایک سطر اوپر میرے مہربان دوست اظہر جاوید کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ تصویر کے اوپر دو کالمی سرخی میں لکھا تھا:

''اظہر جاوید کے شعری اور پنجابی افسانوں کے مجموعے نے بڑی مقبولیت حاصل کی''۔

یہ عبارت پڑھ کر مجھے گمان ہوا کہ لاہور میں کسی جگہ اظہر جاوید کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے کوئی محفل سجائی گئی ہوگی اور یہ اس محفل کی رپورٹنگ ہوگی کیونکہ جب سے ان کے لئے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی کا اعلان ہوا تھا، ان کے احباب ایسی محفلیں منعقد کر رہے تھے۔ میں نے اسی خوش کن تاثّر کے تحت ذیلی سرخی پڑھی تو ایک لمحے کے لئے دل دھڑکنا بھول گیا۔ لکھا تھا:

''وزیراعلیٰ شہباز شریف اور خالد محمود کا انتقال پر اظہار تعزیت''۔

بے یقینی کے عالم میں تیزی سے خبر کا متن پڑھا، تو پتہ چلا کہ نہ صرف اظہر جاوید اب اس دنیا میں نہیں رہے بلکہ ان کی رسم قُل بھی ادا کی جا چکی ہے۔ بے یقینی کی وجہ یہ تھی کہ موت سے صرف دو دن قبل اظہر جاوید اچانک، مسکراتے ہوئے میرے وکالتی دفتر ی میں داخل ہوئے تھے اور شرارت آمیز لہجے میں بولے تھے۔

''میں نے بغیر اطلاع آپ کے دفتر پر چھاپہ اس لیے مارا ہے کہ چھاپہ مارے بغیر آپ پکڑے نہیں جاتے''۔

میں نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے اس ''چھاپہ مار کارروائی'' کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی اور اس غیر متوقع کارروائی کا سبب دریافت کیا تو اظہر جاوید نے اپنے ایک دوست کا کام یاد کروایا جو بیرون ملک مقیم ہے۔ اس کی بیوی بیرون ملک سے پاکستان آ گئی تھی اور اب نوبت طلاق تک پہنچ چکی تھی۔ اظہر جاوید نے اس دوست کی قانونی معاونت کے لئے مجھے دوستانہ حکم جاری کیا تو میں نے بتایا کہ وہ اس دوست سے کہیں کہ وہ آپ کے نام ایک مختار نامہ سفارت خانے سے تصدیق کروانے کے بعد بھیج دے۔ اس مختار نامے کی بنیاد پر آپ مجھے وکالت نامہ جاری کر دیں تو اسی صورت میں مؤثر قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔'' اظہر جاوید نے بتایا کہ ان کے دوست نے انہیں اپنا مختار مقرر کر دیا ہے۔ پھر لفافے میں بند وہ مختار نامہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں مختار نامے کی عبارت پڑھنے لگا تو اظہر جاوید اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

''اسے بعد میں پڑھ لینا............ میں رکشہ باہر سڑک پر روک کر آیا ہوں...... مجھے ذرا جلدی جانا ہے''۔

میں نے مختار نامہ واپس لفافے میں ڈال دیا اور باہر سڑک تک انہیں چھوڑنے کے لئے آیا۔ اس دوران انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا اور اپنے دوست کی قانونی دادرسی کی تلقین کرتے رہے۔ رکشہ پر سوار ہونے سے قبل انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خدا حافظ کہا۔ میں نے بھی جواباً اللہ حافظ کہہ کر اظہر جاوید پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ ہمیشہ کی طرح نظر نواز رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سلیقے سے سنواری ہوئی زلفیں، قمیض کے عقبی جانب کالر کے کنارے سے ہم کنار ہو رہی تھیں اور کلین شیو چہرے پر تازگی اور شوخی کا رقص ایک بہار دکھا رہا تھا۔ یہ ایک ایسی بہار تھی جو ان کی زندگی کے تمام خزاں موسموں کو بظاہر گلزار بنائے رکھتی تھی اور ان سے ملنے والوں کو اندازہ تک نہیں ہوتا تھا کہ ہشاش بشاش دکھائی دینے والا یہ خوش لباس شخص، اپنی ذات میں کتنے بیکراں دشت تنہائی کا مسافر ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ دوست جو ہنستا مسکراتا ہوا مجھ سے جدا ہو رہا ہے، صرف دو دن بعد ایک ابدی جدائی کے سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

حکومت پاکستان کی طرف سے اظہر جاوید کو اس سال ''پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ'' کا اعلان کیا گیا تو میرا خیال تھا کہ بقول غالب ...... ''شاہ کا مصاحب'' بننے پر اظہر جاوید صاحب اتراتے پھر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا...... اس درویش صفت شخص کو ''اتراہٹ'' کے نشے میں بھی ایک نظر دیکھنا چاہیے کہ درویشوں کے اندر چھپے ہوئے ''بادشاہ'' ایسے ہی مواقع پر ذات کے جھروکے سے اپنے اصل روپ میں بے نقاب ہوتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں اور درویش موصوف کے اصل (یا نقل) درویش ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انارکلی بھگوان سٹریٹ والے دفتر میں حاضر ہو کر مبارکباد پیش کی تو انہوں نے ایک خاص انداز میں ہاتھ جھٹکے اور سرسری مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور بولے:

''بھائی اس حقیر فقیر کے لئے تو یہ ایک کمرے کا دفتر اور رسالہ ''تخلیق'' ہی سب سے بڑا ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ہے''۔

پھر اس موضوع کو یکسر نظر انداز کر کے دوستوں کے تذکرے اور گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ میں حیرت سے ان

کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ علاّمہ اقبالؔ کو جب انگریز حکومت نے ''سر'' کا خطاب پیش کیا (جسے اس زمانے کا پرائیڈ آف پرفارمنس کہا جا سکتا ہے) تو بہت سے لوگوں نے سوچا کہ اس حکومتی احسان کے بوجھ تلے اقبالؔ اب اپنے مغرب مخالف نظریات کے اظہار میں دھیمے پڑ جائیں گے، چنانچہ خطاب قبول کرنے پر اقبال کے خلاف مضامین اور نظمیں لکھی گئیں۔ایک مصرعہ تو خاص طور پر مشہور ہوا۔

''سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال''

خطاب ملنے پر اقبال کے اعزاز میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔تقریب میں انگریز حکومت کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اپنی تقریر میں اقبال نے کہا کہ ''اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس خطاب کی وجہ سے میں حق کی آواز بلند کرنا چھوڑ دوں گا تو وہ غلطی پر ہے''۔ اظہر جاوید کے قلم سے نکلا ہوا آخری اداریہ بھی اقبالؔ جیسی جرأت رندانہ کا آئینہ دار ہے۔ اکادمی ادبیات ایک عرصہ سے اپنے چیئر مین اور ڈائریکٹر جنرل دونوں سے محروم چلی آ رہی ہے۔جس کی وجہ سے بہت سے عمر رسیدہ قلمکاروں کو ملنے والے وظائف کا اجراء التواء میں پڑا ہوا ہے۔ اکادمی کی اس حال زار پر اپنے اس اداریئے میں اظہر جاوید نے لکھا:

''کوئٹہ میں مقیم، ایک نہایت ممتاز اور مقبول ادیب، جن کی اردو زبان میں قابل قدر چھ سات کتابیں چھپ چکی ہیں اور ہر جیّد نقاد سے تحسین پا چکی ہیں۔ وہ بلوچی زبان اور ثقافت کے پرچارک بھی ہیں۔ سرکاری درجہ بندی میں ان کا گریڈ اکیس ہے۔ اب تک جس عہدے اور مقام پر رہے، نک چڑھے افسران بالا نے ان کی دیانت اور امانت کی توصیف کی ہے۔

ان کی ہر دل عزیزی اور ہر طبقے میں مقبولیت کی وجہ سے بلوچستان کے ایک با اثر وزیر نے عالی جناب عزت مآب وزیر اعظم سے سفارش کی، یہ صاحب، بہر انداز، اکادمی دبیات کی سربراہی کے لائق ہیں۔ ویسے بھی اب تک پنجاب، خیبر پختونخواہ، سندھ سبھی صوبوں کو یہ افتخار مل چکا ہے، اب بلوچستان بھی فیض یاب ہو لے۔ صاف دل، صاف گو اور صاف جواب دینے کے ماہر وزیر اعظم نے فرمایا:

''یہ عہدہ تو ہم نے اپنے کسی دوست کے لئے رکھا ہوا ہے''۔ (شاید کسی میٹرک پاس دوست کے لئے)''

بریکٹ میں لکھا ہوا جملہ بھی اظہر جاوید ہی کا ہے۔ اداریئے کے اختتام پر ایک بار پھر وزیر اعظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اکادمی ادبیات کی اہمیت اور حیثیت تو ''ان'' کے نزدیک چیونٹی جیسی ہے، جہاں ہاتھی جیسے بڑے بڑے ادارے ٹھکانے لگا دیئے گئے (اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے) عوام بلبلائے، روئے، سینہ کوبی کی،

واویلا مچایا......دھرنے دیئے، راستے بند کئے......مگر

مگر......کیا؟ سب کچھ آپ کے سامنے ہے......میں تو صرف اپنے زخم اور آپ کی یادداشت کو کھوج رہا ہوں''۔

اظہر جاوید نے جس حکومت سے ''حسن کارکردگی'' کا ابھی ایوارڈ حاصل کرنا تھا۔ اسی حکومت کے ''عالی جناب عزت مآب'' وزیراعظم کی ''عزت افزائی'' اظہر جاوید نے جن الفاظ میں کی وہ ان کی ادیبانہ درویشی اور جرأتِ اظہار کا لازوال ثبوت بن کر ان کے لکھے ہوئے آخری اداریئے میں ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

وزیراعظم جیسی حاکمانہ حیثیت رکھنے والے شخص کو معاف نہ کرنے والا اظہر جاوید دوستوں کی کوتاہیوں کو بہت فراخ دلی سے معاف کر دیا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی مفاد کے لئے اپنے دوستوں کو کسی امتحان میں ڈالنا، ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی طرف سے اظہر جاوید کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ دائر ہوا تو مشہور خطّاط اور مصوّر بشیر موجد نے مجھے ہدایت کی کہ میں اظہر جاوید سے رابطہ کروں اور اس مقدمے میں ان کی قانونی معاونت کروں۔ بشیر موجد کا خیال تھا کہ کوئی دوسرا وکیل شاید معاملات کو زیادہ تلخی کی طرف لے جائے اور احمد ندیم قاسمی اور اظہر جاوید کے درمیان صلح صفائی کے وہ امکانات ختم ہو جائیں جنہیں بروئے کار لا کر بشیر موجد صاحب مصالحتی کردار کا ارادہ باندھ رہے تھے۔ میں اظہر جاوید کے پاس پہنچا اپنی طرف سے بلا معاوضہ قانونی خدمات کی پیشکش کی۔ اظہر جاوید چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے:

''مجھے معلوم ہے کہ آپ کے قاسمی صاحب سے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ آپ کے ایک شعری مجموعے کی تقریب رونمائی کی صدارت بھی کر چکے ہیں۔ آپ کی شاعری پر ان کا ایک توصیفی مضمون بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے قاسمی صاحب آپ سے بدگمان ہو جائیں''۔

اظہر جاوید اگر اس مقدمے کی پیروی میرے سپرد کر دیتے اور بشیر موجد صلح صفائی کروانے میں ناکام رہتے تو یہ مقدمہ میرے لئے یقیناً پریشانی کا باعث بنتا۔ اظہر جاوید نے ذاتی مفاد کے برعکس اس شفقت کو اہمیت دی جو قاسمی صاحب نے مجھ پر کی تھی۔ عظمتِ کردار کا یہ جوہر بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔

بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ جون ۲۰۰۹ء میں وکلاء اور صحافیوں کا ایک وفد کان پور بار ایسوسی ایشن کی ۱۱۴ویں سالگرہ میں شرکت کے لئے بھارت گیا۔ اس وفد میں سینئر صحافی اور کالم نگار سرفراز سیّد بھی تھے۔ ہم نے امرتسر سے دہلی تک بذریعہ ریل گاڑی سفر کرنا تھا۔ اظہر جاوید نے کچھ منتخب کتابوں کا ایک پیکٹ سرفراز سیّد کے حوالے کیا اور ہدایت کی کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر معروف ادیب ڈاکٹر کیول دھیر موجود ہوں گے۔ کتابوں کا یہ بنڈل آپ ان کے حوالے کر دیں۔ ہم امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی تھے۔ بھاگ دوڑ میں کتابوں کا پیکٹ وہیں کہیں رہ گیا۔ جب ریل گاڑی جالندھر کے قریب پہنچی تو سرفراز سیّد نے سامان سے یہ پیکٹ علیحدہ کرنا چاہا۔ اس وقت پیکٹ کی گمشدگی کا انکشاف

ہوا۔ جالندھر پلیٹ فارم پر ڈاکٹر کیول دھیر موجود تھے۔ ہم سب نے اس گمشدگی اور اپنی لاپروائی پر معذرت کی جو انہوں نے خوش دلی سے قبول کرلی۔ پاکستان واپس آنے کے بعد میں نے اظہر جاوید سے اس واقعے کا ذکر کیا تو انہوں نے جواباً کہا کہ ''کتابوں کی گمشدگی کا افسوس تو ہے ہی لیکن آپ پر ایک اور افسوس بھی ہے''۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ افسوس کیا ہے؟''

مسکراتے ہوئے بولے:

''میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی اگر آپ میری کتابوں کی طرح اپنے سرفراز سید کو بھی ہندوستان کے کسی کونے کھدرے میں بھول آتے''۔

اظہر جاوید کو ایک مدّت سے دل کا عارضہ لاحق تھا۔ لیکن انہوں نے اسے کبھی دل کا روگ نہیں بنایا۔ دو سال قبل رسالہ ''تخلیق'' کی چالیسویں سالگرہ منانے کے لئے انہوں نے الحمراء کمپلیکس قذافی سٹیڈیم میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ جب میں اور اظہر جاوید کے دیرینہ آشنا پروفیسر نصیر اے چوہدری قذافی سٹیڈیم پہنچے تو کچھ ادیب اور شعراء باہر سڑک پر کھڑے محوِ گفتگو دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ پتہ چلا کہ تقریب منسوخ کر دی گئی ہے کیونکہ تقریب کے دولہا اظہر جاوید کو دل میں اچانک درد اٹھنے کے بعد ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ اظہر جاوید سے ملاقات ہوئی تو حسب معمول مسکراتے ہوئے ملے اور اپنے دل کی بہت سی باتیں تو کیں لیکن دل کی بیماری کا ذکر تک زبان پر نہ لائے۔ اپنے لئے پریشان ہونے والے دوستوں کی محبت ان کی باتوں سے چھلک رہی تھی۔ اتفاق دیکھئے کہ محبتیں تقسیم کرنے والا یہ شخص ''یومِ محبت'' یعنی ''ویلنٹائن ڈے'' پر اچانک اپنے چاہنے والوں سے جدا ہو گیا۔

میں نے ۱۶ فروری ۲۰۱۲ء کو ''نوائے وقت'' میں چھپا ہوا اپنا قطعہ اور اس سے متصل اظہر جاوید کی موت کی باتصویر خبر کا تراشہ ایک کاغذ پر چپکا کر اپنی فائل میں محفوظ کر لیا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ اس قطعہ کا دوسرا شعر ان غم بھرے جذبات کی ترجمانی بھی کر رہا تھا جو اظہر جاوید کی جدائی نے میرے دل میں پیدا کر دیئے تھے۔

سب تعلق کی ڈوریاں ٹوٹیں
رابطے ختم ہو گئے سارے

یہ سطور لکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ عزیزوں اور دوستوں کے بچھڑ جانے پر کیا رفتگاں سے تعلق کی تمام ڈوریاں واقعی ٹوٹ جاتی ہیں اور کیا روابط کے سارے سلسلے واقعی ختم ہو جاتے ہیں؟...... اظہر جاوید کی زندہ جاوید یادیں اس سوچ پر ایک سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

◆◆◆

غمِ دوست

سلطان رشک

اس روز جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے تب میں معمول کے مطابق ''نیرنگ خیال'' کے دفتر پہنچا۔ دفتر کی لوکیشن کچھ یوں ہے کہ راول پنڈی کے مشہور لیاقت باغ سے بالکل جڑا ہوا یہ دفتر مجھے ''پائیں باغ'' کی طرح لگتا ہے۔ اس میں لگے ہوئے قد کشیدہ درخت اس روز مجھے خاموش خاموش اور اداس دکھائی دے رہے تھے اور میں اپنی طبیعت میں بھی کچھ بوجھل پن سا محسوس کر رہا تھا۔ کیوں؟ مجھے کسی سبب کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آفس میں اپنی کرسی سنبھال لی اور ''بوجھل پن'' کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کیوں کہ عمر کے اس حصے میں اکثر طبیعت کو اسی طرح ''آنکھ مچولی'' کھیلنے کی عادت سی ہوتی ہے۔ میں سر جھکا کر اس روز کی ڈاک دیکھنے لگا۔

لیکن چند منٹ بعد اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہینڈ سیٹ اٹھایا۔ دوسری طرف سے محترمہ عذرا اصغر بول رہی تھیں، ان کا لہجہ انتہائی غمگین تھا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں کوئی گہرے صدمے والی بات نہ ہو۔ اور وہی ہوا۔ انھوں نے بتایا: ''اظہر جاوید ہم سے جدا ہو گیا ہے۔''

فضا میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اور ابھی میں سکتے کی سی کیفیت میں تھا کہ جناب جان کاشمیری کا فون آ گیا۔ اس دفعہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ سو میں نے قدرے حوصلے سے ان کی بات سنی۔ مگر طبیعت کا بوجھل پن سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا۔ میرا یار مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ موت نے اسے اچک لیا تھا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے، میں خود اس سے قریباً تین سال قبل آنکھیں چار کر چکا تھا۔ میرے جسم کے بائیں حصے پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ مگر جانے کیسے بچ کر واپس آ گیا؟ سوچتا ہوں تو خود پر حیرت ہوتی ہے۔ مگر میرا یار، وہ تو جا چکا، اب جینے کا مزہ کیا؟

جان کاشمیری کو میں نے رندھے ہوئے گلے سے اللہ حافظ کہا اور پھر اظہر جاوید کی یادوں سے لپٹ گیا۔

میں جب بھی لاہور جاتا تھا تو اور کاموں کے علاوہ اظہر جاوید سے بالالتزام ملاقات کرنا بھی میرا ایک خاص مقصد ہوتا تھا۔ اس جیتے جاگتے، ہنستے مسکراتے اور زندگی سے بھرپور انسان سے میری آخری ملاقات دو تین ماہ قبل لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ

ہمیشہ کی طرح مجھے مسکراتے ہوئے ملا اور ایک تازہ لطیفہ سنا کر اس نے مجھ سے پوچھا:

''کب تک یہاں ٹھہرو گے؟''

''بس چند دنوں تک''

پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے چند منٹوں میں فیصلہ کیا اور کہا:

''کل شام فلاں ہوٹل میں آ جانا، تھوڑی دیر مل بیٹھیں گے۔''

پھر اگلی شام ہم مقررہ ہوٹل میں مل بیٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیس پچیس شاعرات اور شاعر وہاں جمع ہو گئے اور اس شام کی محفل میں مہمان خصوصی اظہر جاوید نے مجھے قرار دیا۔ پھر اس ہلکے پھلکے فنکشن کے بعد اس نے میری دو غزلیں لیں اور اپنے ماہ نامے میں نمایاں طور پر شائع کر دیں۔ میرا لاہور جانا کم کم تھا۔ اس سے ملاقاتیں بھی اسی طرح رہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ اظہر جاوید کی محبتوں کا یہ انداز پانے کا اعزاز صرف مجھے ہی حاصل تھا بلکہ لاہور آنے والے اپنے ہر مہمان دوست کے ساتھ وہ اسی طرح ملتا تھا۔ اس کے ساتھ خوبصورتی سے شام منانا اپنا فرض سمجھتا تھا اور وہ اس کی کسی نہ کسی تحریر کو اپنے پرچے میں نمایاں طور پر شائع بھی کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار 1982ء میں اس نے لاہور میں میرے ساتھ شام منائی تھی۔ اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب نے کی تھی اور ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ممتاز شاعر عبدالحمید عدم نے بھی شرکت کی تھی۔ اپنا کلام پیش کرنے کے بعد انھوں نے بطور خاص میرے لئے یہ دو شعر پڑھے

کیا اور ہو گی ایک قلندر کی پیش کش
دل میں خلوص آنکھ میں چاہت کا اشک ہے
تاہم میں آدمی کی فضیلت پہ ہوں فدا
مجھ کو بھی لے چلو جہاں سلطان رشک ہے

دوستوں اور ہم جیسوں پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے والے اس شخص کا ایک اور عجیب انداز بھی تھا کہ اس نے اپنے اندر کا آدمی ہر شخص سے چھپا رکھا تھا۔ اس چُھپے ہوئے آدمی کے پاس غم بہت سے تھے اور خوشی نام کو نہ تھی۔ جانے کیوں وہ اپنے سارے غم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے چھپائے رکھتا تھا۔

جب اسے دل کا عارضہ لاحق ہوا اور میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تب مجھے اس کی بیماری کا پتہ چلا۔ میں نے فوراً اسے ایک خط لکھا اور کہا کہ حوصلہ رکھو، اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ اسی دوران اسے ''پرائڈ آف پرفارمنس'' ملنے کی خبر چھپی، جسے اس نے دل سے قبول کیا۔ میں نے اسے مبارک باد کا خط لکھا۔ اس نے مجھے شکریے کا ٹیلی فون کیا۔ میں نے گزارش کی کہ جب بھی آپ پنڈی آئیں گے تو آپ کے لیے ایک شام کا اہتمام کروں گا۔

لیکن وہ شام کبھی نہیں آتی، وہ ملنے کا وقت کبھی نہیں آیا جس کا مجھے اب بھی انتظار ہے۔ وہ میری آنکھوں میں انتظار کے دیئے روشن کر کے خود کہیں چلا گیا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ اظہر جاوید مرا نہیں، اب بھی زندہ ہے اور میں جب بھی لاہور جاؤں گا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھ سے خوشی خوشی چمٹ جائے گا اور مجھے خوش آمدید کہے گا۔ مگر مجھے اس کا یہ والہانہ انداز اب کہاں دیکھنے کو ملے گا۔ اپنے بے قرار دل کو بہلانے کے لئے میں ان دنوں کو بھی یاد کرتا ہوں جب میں مشاعرے پڑھنے کیلئے اظہر جاوید کے ساتھ کراچی گیا اور اس کے ہمراہ ہندوستان بھی گیا۔ ان راستوں پر سفر کرتے ہوئے اس نے بہت دل نوازی دکھائی۔ ان ہر دو اسفار کو خوش گوار بنائے رکھا۔ اب وہ سب کچھ خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ جانے والا تو چلا گیا، لیکن دل اس کو ڈھونڈتا رہے گا، اس کی یادوں کے ساتھ دھڑکتا رہے گا۔

میں اپنے تاثرات قلم بند کر ہی رہا تھا کہ مجھے یکے بعد دیگرے غم زدہ دو دوستوں کے خطوط ملے، اظہر کے غم سے لبریز۔ ان دوستوں نے قلم آنسوؤں میں ڈبو کر مجھے خط لکھے۔ انھوں نے مجھ سے باتیں کر کے اپنے غموں کو ہلکا کیا۔ مگر میرا غم بڑھ گیا اور یہ غم مجھے بہت عزیز ہے، اس کا بڑھ جانا مجھے اچھا لگا، یہ مجھے میرے دوست کے قریب جو رکھتا ہے۔ لاہور سے آیا ہوا یہ پہلا خط ڈاکٹر انور سدید صاحب کا ہے اور دوسرا افتخار مجاز کا ہے۔

برادرم سلطان رشک صاحب، سلام مسنون!

اظہر جاوید قیدِ حیات سے چھوٹ گئے۔ اس کے دوست جن میں آپ اور میں بھی شامل ہیں ''بندِ غم'' میں جکڑے گئے۔ اسے لحد میں اترے کئی دن ہو گئے ہیں لیکن میں اس المیے سے دوچار ہوں کہ ابھی اس کے زندہ رہنے کے دن تھے اور میں جو گزشتہ کئی برسوں سے موت کی راہ دیکھ رہا ہوں اور :

گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے میں نے انورؔ
موت آئے تو مجھے ساتھ اڑا لے جائے

ابھی تک زندہ ہوں۔ لیکن 14 رفروری کو موت لاہور میں وارد ہوئی اور اظہر جاوید کو ساتھ اڑا لے گئی۔ میں اس کا غم برداشت کرنے کے لئے زندہ ہوں اور آپ سے تعزیت کر رہا ہوں کہ آپ سے بھی وہ گہری محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت بے لوث تھی، اس میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ برادرِ عزیز، آپ ہی بتایئے: ع

''کیا اس کا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور''

حق تعالیٰ اظہر جاوید کی مغفرت کرے۔ آپ سے اظہر جاوید کا ذکر کر کے اپنا غم ہلکا کر رہا ہوں اور آپ کی صحت مند

زندگی کے لئے دعا کر رہا ہوں......'' انور سدید

برادر گرامی، تسلیمات،

اظہر جاوید صاحب کی رحلت کی خبر تو آپ کو مل ہی چکی ہوگی، میں بھی کیا عجیب شخص ہوں، اظہر بھائی کی رحلت کو خبر کہہ رہا ہوں۔ برادرم، مجھے تو یہ قیامت کی گھڑی لگ رہی ہے قیامت کی، یہ تو قیامتِ صغریٰ ہے، اور قیامت کس کو کہتے ہیں؟ یکے بعد دیگرے میرے عزیز، میرے پیارے رخصت ہوتے چلے جا رہے ہیں اور یہ ایام تو ہمیں مار ہی ڈالیں گے۔

پہلے افضال شاہد رخصت ہوئے، پھر ڈاکٹر عباس نجمی کا سندیسہ آ گیا۔ یہ دونوں بھی مجھے بے حد عزیز تھے کہ ان اہل دانش کو ٹیلی ویژن (P.T.V) پر مجھے ہی بطور کومپیئر متعارف کرانے کا اعزاز ملا۔ عجیب طرح دار، محبت کرنے والے اور اخلاص بھرے لوگ تھے! ڈاکٹر نجمی کی رحلت 13 فروری 2012ء کی شب ہوئی اور 14 فروری 2012ء 'ویلنٹائن ڈے' محبت کرنے والوں کا یوم تھا۔ بھلا اظہر بھائی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے میں بعض رفقا نے اظہر جاوید صاحب کو ''رئیس العاشقین'' کا نام دے رکھا تھا۔ اب بھلا آپ ہی بتایئے، ''رئیس العاشقین'' یوم محبت پر ہمیں چونکا دینے والا کام کیوں نہ کرتے؟

اظہر جاوید کی محبت واخلاص کے سبھی معترف ہیں۔ میں نے اظہر بھائی کی رحلت کی جس جس کو اطلاع دی، یوں لگا کہ جیسے ایک صرف وہی اظہر جاوید کا محبوب و مطلوب تھا۔ تاہم مجھ سے ملاقاتوں میں جن احباب کا تذکرہ تسلسل سے کرتے، ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ اظہر بھائی میرے حوالے سے بہ تکرار بتایا کرتے تھے کہ یہ وہ نوجوان ہے جو اپنے سگے بھائی اعزاز احمد آذر سے بھی زیادہ میرا احترام کرتا ہے۔

بہر طور، حق مغفرت کرے، واقعتاً عجیب اور زندہ تر شخص تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین

نیاز کیش، افتخار مجاز''

ان خطوں کے علاوہ چند مزید خط بھی آ چکے ہیں۔ ان سب کو یہاں درج کرنے کی جگہ نہیں۔ بہت سے دوستوں نے بذریعہ ٹیلی فون، بلکہ ذاتی طور پر بھی مجھ سے اظہار تعزیت کیا ہے۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اظہر جاوید کسی ایک کا نہیں بلکہ ہم سب کا محبوب تھا، دوست تھا۔ جانے اسے کیا سوجھی کہ ایک دن اچانک وہ ہماری محبتوں اور پیار کے حلقوں کو توڑ کر کہیں دور چلا گیا، اس نے کوئی اور ہی دنیا بسا لی۔ جانے وہ جگہ کیسی ہوگی؟ وہ خود کیسا ہوگا؟ شائد ہم میں کوئی کمی تھی اور ہم اس کی محبت کے قابل نہ تھے یا یہ جگہ اس کے لائق نہ تھی۔

آیئے، ہاتھ اٹھایئے، ہم سب اس کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے اس نئی دنیا میں آرام و سکون سے رکھے۔ آمین

◆◆◆

اظہر مِن الشّمس

نجم الحسن رضوی

اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے 2009ء کے آخری شمارے میں ''اپنی بات'' کے عنوان کے تحت اداریے کی بجائے ایک نظم شائع کی تھی، جو کچھ یوں تھی:

خود ہی فون کر کے لوگوں کو
خود ہی کہتا ہوں پوچھو میرا حال
وضع داری بھی کھو گئی ہے کہیں
آ گیا ہے رفاقتوں میں زوال

لوگ مصروف ہیں کہ بے حس ہیں
دو مِنٹ بھی نکال سکتے نہیں
گھر میں آ کر کریں عیادت کیا
وہ تو اِک کال کر بھی سکتے نہیں

رائٹرز گلڈ ہو یا اکادمی ہو
ان کو رہتا ہے بس یہی اک دھیان
کوئی اہلِ قلم مرے گا کب؟
جاری کر دیں گے تعزیت کا بیان

دنیا داری کے سب تعلّق ہیں
مر گیا میں تو کس نے رونا ہے
ہوتا آیا ہے کل بھی ایسے ہی
کل بھی ایسا ہی یار ہونا ہے

یہ نظم کل بھی سچی تھی اور آج بھی سچی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اظہر جاوید نے ''اپنی بات'' کے ذریعے سچائیاں بیان کرنے کا بڑا اچھا ڈھنگ نکالا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں وہ معاشرے کی ایسی سچائیاں پرو دیتے کہ پڑھنے والے تلملا کے رہ جاتے۔ ان کے اداریوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بوجھل، فلسفیانہ اور غیر دلچسپ نہیں ہوتے تھے اور ان میں کوئی نہ کوئی غور طلب نقطہ ضرور ہوتا تھا۔

میں نے ''تخلیق'' کے کچھ پرانے شمارے نکال کر دیکھے، تو ان کے اداریوں کے بے شمار زندہ فقروں نے ذہن و دل کو انوکھی مسرّت سے سرشار کر دیا۔ اظہر جاوید نے اپنے رسالے کا نام ''تخلیق'' رکھا تو انہوں نے ہر سطح پر اس کا حق بھی ادا کیا۔ وہ ''اپنی بات'' میں کسی ادبی یا قومی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے تو اس میں بھی ایک طرح کی تخلیقی شان اور نکتہ آفرینی ہوتی تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ فقرے ملاحظہ ہوں:

''ایک محبِّ وطن اور ملک وقوم سے غیر مشروط محبت کرنیوالا شاعر اور ادیب ہجرت کر گیا...... یہ واقعہ یا خبر نہیں المیہ ہے!''

....

''ادب تو آئے گا بعد میں آپ پہلے اردو زبان کو تو زندہ اور پائندہ رکھنے کا جتن کر لیں!''

....

''دفترِ تخلیق میں ایک پڑھی لکھی مہذّب خاتون بیٹھی تھیں۔ ماشاء اللہ ان کی چار پانچ نثری اور شعری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اتنے میں حاجی لق لق کے پوتے آئے۔ میں نے رسمی تعارف کرایا۔ خاتون کے علم و فضل کی بہت توصیف کی۔ انہیں بتایا یہ حاجی لق لق کے پوتے ہیں۔ خاتون نے نہایت اعتماد سے سوال کیا...... حاجی لق لق کیا کرتے تھے؟''

''صاحب من اب فرمائیے...... میں کڑھوں یا نہیں؟''

....

ایک باخبر ادیب اور صاحبِ علم مدیر کی حیثیت سے جن باتوں پر وہ کڑھتے تھے وہ اب اس ''ادب فراموش'' اور ''کتاب دشمن'' معاشرے میں اتنی عام ہو گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بظاہر علم کے پھیلاؤ کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ کی کساد بازاری کی بنیاد پر اطلاعات کا ''اتوار بازار'' لگا ہوا ہے مگر علم و ادب کے خزینوں سے لوگوں کی بے خبری میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک ایسے شخص کے لئے جس نے اپنی زندگی کی چار پانچ دہائیاں ادب کی نیکیاں پھیلانے میں صرف کر دی ہوں، کسی طرح بھی قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی۔ اظہر جاوید ساری عمر اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ''تخلیق'' کے ذریعے انہوں نے علم و ادب کی ترویج میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے ادبی رسالے کے واسطے سے پاکستان اور پاکستان سے باہر ساری دنیا میں بسنے والے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور اہلِ دانش کے درمیان ایک بین الاقوامی ادبی مکالمے کو فروغ دینے کی سعی کی............

''تخلیق'' سے خود میری وابستگی دبئ میں قیام کے دوران شروع ہوئی۔ اس سے قبل میرا تعارف اظہر جاوید سے نہیں تھا۔ غالباً ۱۹۹۰ء کا سال تھا جب دبئ میں قتیل شفائی کا جشن منایا گیا جس میں اظہر جاوید بھی آئے اور میری ان سے ملاقات ہوئی۔ تب سے میں بھی ان کے سینکڑوں قدردانوں میں شامل کر لیا گیا۔ اسی زمانے میں جب بھی میں دبئ سے پاکستان آتا، لاہور میں ان سے ضرور ملاقات ہوتی اور ''تخلیق'' کے دفتر یا قریب ہی میں واقع الحمد پبلی کیشنز کے صفدر حسین کے آفس میں محفلیں جمتیں۔ ان ہی محفلوں میں میری ملاقات بہت سے ان اہلِ قلم سے بھی ہوئی جن سے میں پہلے نہیں ملا تھا ان میں احمد راہی، شہزاد احمد، احمد عقیل روبی اور دیگر کئی سینئر شاعر و ادیب شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں لاہور چھاؤنی میں واقع ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے گھر جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے پتہ نہیں معلوم تھا۔ اس موقعہ پر اظہر جاوید نے میری رہنمائی کی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر وہاں گئے۔ اسی طرح ایک بار ان کے ساتھ ہی میں نے مجلس ترقیِ ادب میں ندیم صاحب کے یہاں بھی حاضری دی۔ اس وقت منصورہ بھی وہاں موجود تھیں۔

1999ء میں جب ''تخلیق'' کا خلیجی ریاستوں کا نمبر شائع ہوا تو میں نے ان کے کہنے پر خلیجی ریاستوں کے بارے میں ایک مفصّل تعارفی مضمون لکھا جس میں تمام ملکوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے لاہور کے پرچوں میں ''اوراق'' اور ''فنون'' کے بعد میرے سب سے زیادہ افسانے ''تخلیق'' میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ 2009ء کے آخر میں دبئ سے میرے پاکستان لوٹ آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ بلکہ گذشتہ سال جب میں نے انہیں ایک افسانہ بھیجا اور وہ کئی مہینے تک نہیں چھپا تو میں نے فون کر کے پوچھا کہ وہ افسانہ انہیں ملا بھی تھا یا نہیں۔ بولے ''جناب ملا کیوں نہیں، سینے سے لگا کے رکھا ہوا ہے''۔

میں ہنسا، عرض کیا...... ''اس قدر عزت افزائی کا شکریہ...... مگر اب اسے چھاپ ہی ڈالیں کیونکہ اگلے مہینے میں میرا نیا مجموعہ چھپ رہا ہے جس کا نام اسی افسانے پر ہے'' اور انہوں نے وہ افسانہ اگلی اشاعت میں شریک کر لیا، اس کا نام ''دریا گھر'' ہے جس مہینے وہ افسانہ چھپا، اسی مہینے کتاب بھی چھپ کے آ گئی۔

دبئ میں میرے قیام کے دوران اظہر جاوید کے حوالے سے بے شمار احباب مجھ سے آ کر ملے۔ ان مختلف قسم کی شخصیات میں بعض بڑی نامور ہستیاں بھی تھیں ان میں سرفراز اقبال بھی شامل تھیں جو فیض صاحب اور ایک کتاب ''دامنِ یوسف'' کے حوالے سے بڑی معروف ہوئیں۔ سرفراز اقبال شاعر پرست اور ادب پرور تو تھیں ہی، ممتاز کالم نگار بھی تھیں اور اسلام آباد کے اخبار ''اوصاف'' میں بڑے چہکتے ہوئے کالم لکھتی تھیں۔ دبئ آئیں تو میں نے ان کے اور فیض صاحب کے تعلق سے خلیج ٹائمز کے ہفتہ وار میگزین کے لئے ایک مضمون لکھا، جو بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا۔ سرفراز اقبال سے ملاقات سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا مرتّب کردہ ''دیوان غالب'' جسے ''نسخہ خواجہ'' بھی کہتے ہیں، ہاتھ آیا۔ اپنی نہایت شاندار اور خوبصورت طباعت کی وجہ سے اس کی سب کتابوں میں وہی اہمیت ہے جو سب شاعروں میں غالب کی ہے۔

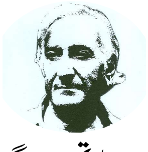

اس مجموعے کی اشاعت کے لئے جن مہربانوں نے مالی تعاون کیا ان میں سرفراز اقبال بھی شامل تھیں۔ بیگم سرفراز اقبال تو کچھ سال پہلے وفات پا گئیں مگر جب تک میں دبئی میں رہا ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر ثمینہ سے، جو اب آسٹریلیا میں مقیم ہیں، کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی سڈنی سے امارات یونیورسٹی میں لیکچر دینے آتیں، مجھ سے ضرور ملنے کا وقت نکالتیں۔ ان لوگوں کا ذکر کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے ذریعے ایسا حلقۂ دوستاں ترتیب دیا تھا جس کے ارکان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور ''تخلیق'' ان سب کے درمیان رابطے کے پُل کا کام دیتا تھا۔

آج کل کے زمانے میں جب باقاعدہ ادبی ماہناموں کی رسم اٹھ چکی ہے اور ضخیم کتابی سلسلے زیادہ وقت پڑھنے والوں کو مطالعے کا روزہ رکھواتے ہیں اور بس سال میں ایک بار عید کے چاند کی طرح نمودار ہوتے ہیں، ''تخلیق'' نے اپنی بے ناغہ اشاعتوں سے ساری اردو دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور مشرقِ وسطیٰ میں رہنے والے ادیبوں اور ادب کے سنجیدہ قارئین کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر رکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ''تخلیق'' کے ذریعے ہندوستانی اہلِ قلم سے بھی ہمارا بڑا قریبی رابطہ قائم رہتا تھا۔ شاید ہی کسی اور پرچے نے یہ کام اس خوبی سے کیا ہو۔ اظہر جاوید کو ''تخلیق'' کی محفل کے سب دوست بہت یاد کریں گے۔

اظہر جاوید نے نثر و نظم دونوں شعبوں میں بڑی ذہانت، تخلیقی اپج اور نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا مگر ''تخلیق'' کے ذریعے انہوں نے ادبی صحافت کے شعبے میں جو لمبی ریاضت کی ہے وہ بے مثال ہے۔ اپنے بارے میں لکھتے ہوئے ایک بار 'اپنی بات' میں ان کے قلم سے یہ فقرے ادا ہوئے۔

''مجھے نہ محقق ہونے کا دعویٰ، نہ تنقید نگاری کا زعم، جو کچھ سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتا ہوں''۔

پھر ایک اور جگہ ادب کے حوالے سے لکھنے والوں کے بارے میں کہا:

''ذات کو کائنات میں گم کر کے اور کائنات کو ذات میں ڈبو کے جو کوئی لکھتا ہے اس کے پیشِ نظر وعظ نہیں ہوتا، وہ نصیحت نہیں کرتا، مشورہ نہیں دیتا، جس طرح اس نے مشاہدہ کیا اسے اپنے جذبات کے رس میں گھول کے پیش کر دیتا ہے''۔

بعینہٖ یہی کچھ انہوں نے خود بھی کیا۔ کبھی انہوں نے وعظ دیا نہ مشورہ، اور نہ کبھی کوئی نصیحت کی ...... جیسا محسوس کیا ویسا بیان کر دیا۔ اپنے رسالے ''تخلیق'' کے ذریعے وہ جو کام کرنا چاہتے تھے، کر گئے ...... ادب کی آگہی پھیلانے اور دوستیاں بڑھانے کا کام ...... !تخلیق ان کا حرفِ مدّعا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک حالیہ اداریے میں لکھا تھا: ''میرا خیال ہے۔ میں جو کہنا چاہتا تھا کہہ دیا ہے'' اور اس میں کوئی شک نہیں انہوں نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔

اظہر جاوید کے لئے ''اپنی بات' ہی سچّی بات تھی اور وہ چاہتے تھے کہ سچ کہہ دیا جائے کیونکہ سچ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

◆◆◆

مر بھی جائیں ہم تو رسمِ عاشقی باقی رہتی ہے

ضیاء الرحمٰن ضیاء

تمام زندگی محبت کرنے والے، محبت بانٹنے والے، شاعر خوش نوا اظہر جاوید 14 فروری 2012ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اظہر جاوید کی زندگی محبت سے عبارت تھی اور حسنِ اتفاق کہیے یا ان کا خلوصِ محبت کہ اظہر جاوید کا انتقال بھی محبت کی علامت ''ویلنٹائن ڈے'' کی صبح کو ہوا۔ اظہر جاوید محبت کے لئے پیدا ہوئے اور محبت کے لئے ہی اپنی جان دے دی۔ مگر اپنے پیچھے محبت کی ایسی دستان چھوڑ گئے کہ ایسا اعزاز کسی کسی کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔

اس لئے شعروں میں اپنا حال ہم نے لکھ دیا
مر بھی جائیں ہم تو رسم عاشقی باقی رہے

اظہر جاوید تمام زندگی محبت کیلئے تڑپتے رہے، ترستے رہے۔ انہیں بے شمار محبتیں ملیں مگر ان کی تشفی نہ ہو سکی، تسکین نہ مل سکی۔ ان کو بس ایک ہی غم تھا ''غمِ عشق'' اظہر جاوید نے اپنے شعری مجموعے کا نام رکھا ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' رکھا۔ یہ ایک سوال بھی ہے۔ کیونکہ اظہر جاوید سے میرا تعلق، میرا ناتہ اور میری دوستی، کم و بیش 45 سال پر محیط ہے، اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غمِ عشق گر نہ ہوتا تو بھی انہیں غمِ عشق ہی ہوتا۔

اظہر جاوید کے کچھ اصول تھے اور انہوں نے ان اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس بنا پر اظہر جاوید کو مالی نقصان بھی ہوا اور اپنے ذریعۂ معاش سے بھی ہاتھ دھونا پڑا لیکن اظہر جاوید آخری دم تک اپنے اصولوں پر کاربند رہے۔ اظہر جاوید نے شاعری بس اپنی ذات کی تسکین کے لئے کی، تاکہ رسمِ عاشقی باقی رہے۔ ماہنامہ ''تخلیق'' جاری کیا تو گھاٹے کا سودا کیا۔ ''تخلیق'' 42 برس تک پابندی سے جاری رہا۔ ''تخلیق'' اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو نمایاں کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ ''تخلیق'' گویا ایک تحریک بن گیا تھا۔ اندرونِ ملک اور بیرون ملک کا کون سا ایسا ادیب و شاعر ہوگا جو ''تخلیق'' میں نہ چھپا ہو۔ اظہر جاوید ''تخلیق'' میں بے لاگ اداریے لکھتے رہے تاکہ کوئی تو سچ کو سچ کہے۔ حق بات کو حق بات جانے مگر اس گونگی بہری دنیا میں ان کی شنوائی نہ ہو سکی مگر وہ اس سے تھک ہار کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ مرتے دم تک اپنے اصولوں پر مبنی اپنے اس مشن کو جاری رکھا۔

اظہر جاوید نے پنجابی زبان میں بھی بہت خوبصورت شاعری کی۔ جس کے کچھ ترجمے میں نے کئے۔ میں نے بارہا اظہر جاوید سے کہا کہ وہ اپنی پنجابی شاعری کا مجموعہ بھی لے آئیں۔ وہ وعدہ کرتے رہے مگران کے لاابالی پن کی وجہ سے بات ٹلتی رہی۔ ان کی پنجابی کہانیوں کا مجموعہ ''بڑی دیر ہوگئی'' بھی چھپا تھا۔ واقعی وہ اپنی ذات کے معاملے میں تساہل سے کام لیتے تھے اور کبھی کبھی دیر کر دیتے تھے۔ اظہر جاوید کی بہت سی تحریریں، کہاں کہاں، کس کس، کے پاس بکھری پڑی ہیں۔ ان کو یکجا ہو کر چھپنا چاہیے۔ پچھلے دنوں حکومت پاکستان نے اظہر جاوید کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ''پرائڈ آف پرفارمنس'' دینے کا اعلان کیا۔ اس میں بھی شاید دیر ہوگئی تھی، کیونکہ اظہر جاوید کو اس اعتراف نے شاید کچھ حوصلہ تو دیا ہو مگر وہ یہ ایوارڈ اپنی زندگی میں وصول نہ کر سکے۔

انتقال سے چند دن قبل فون پر اظہر جاوید سے بات ہوئی۔ ''ادبی ڈائجسٹ'' کی دوبارہ اشاعت پر کھلے دل سے مجھے حوصلہ دیا۔ میں نے بتایا آفاق صدیقی صاحب بیمار ہیں۔ اظہر جاوید نے انہیں فون کیا، حوصلہ دیا اور کہا'' آفاق بھائی اللہ آپ کو زندگی دے ابھی تو آپ نے مجھ پر کتاب لکھنی ہے۔'' پھر مجھے فون کیا۔ کہنے لگے۔ ''یار! آفاق صاحب کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا ہے کہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے''۔ اظہر کی باتوں میں وہی شگفتگی، وہی بے ساختگی اور جملے بازی تھی۔ کیا خبر تھی کہ وہ ہم سے یوں اچانک جدا ہو جائیں گے۔

جو تھا ایک اظہر خوش نوا، وہ جو بات کہتا تھا برملا
وہ جو اس کے ہوتے تھے طنطنے، سبھی بجھ گئے، سبھی مر گئے

لاہور پی ٹی وی کے کرنٹ افیئرز کے سربراہ افتخار مجاز کے بھائی اعزاز احمد آذر مجھے بتا رہے تھے کہ انتقال سے ایک دن قبل کی رات کو اظہر جاوید کا انہیں فون آیا، کہنے لگے ''نوجوان تم ڈاکٹر سے چیک اپ میں لاپرواہی برتتے ہو! تم ڈاکٹر کے یہاں نہیں گئے''۔ یاد رہے کہ دونوں کا ڈاکٹر ایک ہی ہے۔

اظہر جاوید کے دنیا سے چلے جانے سے ایک محفل اجڑ گئی۔ ایک تحریک دم توڑ گئی۔ میری زندگی کا ایک باب تمام ہوا۔ ایک دوست بچھڑ گیا۔ خوش ہونے والا۔ حوصلہ دینے والا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

◆◆◆

ڈاکٹر وزیر آغا

''اظہر جاوید کی نظموں کا بنیادی نکتہ محبت ہے، پاکیزگی کے ساتھ۔''

میرا ہم نفس

سلطان احمد علوی

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قِصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

یہ 1951ء کا سال تھا اور میں نے بھاگٹانوالہ ہائی سکول میں نو ویں جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ کلاس روم میں ڈیسک پر مجھے جو نشست ملی، وہاں پہلے سے ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو یک دم خاموشی طاری ہوگئی۔ لڑکوں نے کتابیں کھول لیں، ماسٹر صاحب سبق پڑھانے لگے، پہلا پیریڈ ختم ہوا، دوسرا شروع ہونے کے درمیان وقفہ تھا۔ اس وقفے میں میری اظہر جاوید کے ساتھ پہلی ملاقات، پہلی گفتگو ہوئی۔

مزاجوں کی مطابقت دوستی کے لئے شرطِ اوّل ہے، اظہر جاوید کی طبیعت میں چلبلا پن بہت زیادہ تھا۔ میں بھی کچھ ایسا ہی تھا، اس کے علاوہ ہماری نمایاں قدر مشترک تھی شاعری سے لگاؤ، ہم دونوں اس وقت ادھ کچے ادھ پکے شعر کہتے تھے تاہم اچھے شعر کی پہچان ضرور تھی، ہم مزاج دوستوں کا حلقہ تھا جس کسی کو کوئی اچھا شعر، غزل یا نظم مل جاتی دوسروں کو لہک لہک کر سناتا، سنانے والے کو ہم یوں داد دیتے گویا وہ شاعری میں اپنا کلام سنا رہا ہو۔ پھر دوستی کا سلسلہ اگلی جماعتوں تک مضبوطی سے قائم رہا۔

پرویز بزمی اس وقت فتح خان پرویز تھے اور بھاگٹانوالہ ہائی سکول میں ان ٹرینڈ ٹیچر تعینات ہوئے تھے، بزمی صاحب کے ننھیال (بعد میں سسرال بھی) بھاگٹانوالہ کے قریبی چک 77 جنوبی میں رہتے تھے، اس وجہ سے وہ اسی چک میں رہائش پذیر ہوئے۔ بزمی صاحب کو اس وقت بھی ادب میں خاص دسترس تھی۔ انہوں نے ہمارے ذوق وشوق کو مزید مہمیز کیا، میں تو خیر بزمی صاحب سے کُھلا ڈُلا تھا لیکن میرے توسّط سے اظہر جاوید بھی ان سے بے تکلّف ہو گئے۔

اظہر جاوید بے تکلّف ہونے کا فن جانتے تھے۔ میں اور اظہر تو پہلے ہی گھل مل گئے تھے۔ بزمؔی بھی اس گھلاوٹ میں شامل ہو گئے۔ یہ بزمؔی ہی کا فیض تھا کہ ہمیں سینئرز سے ملنے کا کچھ کچھ سلیقہ آ گیا۔ پھر ہم دونوں سرگودھا میں الطاف مشہدی، جوہر نظامی، غلام حسین قیصر، اخگر سرحدی، عبدالرشید اشک تک پہنچنے لگے۔

اس زمانے میں اظہر جاوید اپنے ننہالی چک 80 جنوبی میں رہتے تھے، ان کے نانا شیخ صالح محمد (ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس) گاؤں کے متمّول زمیندار تھے۔ ان کی رہائش کی حویلی دو کنال پر مشتمل تھی، میں چک ۷۷ جنوبی کا رہائشی تھا، دونوں چکوں کی حدود آپس میں ملتی ہیں، سو ہم ''گوانڈھی'' بھی تھے۔ ہماری بیٹھکیں خوب بھری رہتی تھیں۔ کبھی وہ میرے ہاں چلے آتے کبھی میں ان کے ہاں چلا جاتا، سکول سے چھٹی کے دن بھی ہم نہر کنارے مل بیٹھتے، جو دونوں گاؤں کے درمیان بہتی ہے۔ پرویز بزمی صاحب بھی بزم آرائیوں کی زینت بنتے، البتہ اتوار کے دن ناغہ کر جاتے کہ انہیں اپنے چک 39 شمالی جانا ہوتا تھا، 80 چک کا زیرِ زمین والا پانی کھاری ہے۔ چنانچہ نہر کنارے پنگھٹ سے پنہاریاں پانی بھرنے آتیں، 80 چک نہر سے قریب ہے، مٹیاریں سروں پر گھڑے اور گاگریں اٹھائے، اٹھلا اٹھلا کر آپس میں چہلیں کرتیں، اظہر مچل مچل جاتا، یہ سب عنفوانِ شباب کی نادانیاں تھیں۔ اب ان کا ذکر ہی کیا کرنا؟ کچھ عرصہ کے بعد پرویز بزمی جی معلّمی سے دستبردار ہو کر چلے گئے، اظہر جی اور میں نے ایک ہی سیشن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد وہ بھی بھاگٹا نوالہ کے منظر سے غائب ہو گئے۔ وہ خود بتاتے تھے کہ ان کے والد صاحب ملک عبدالغفور راولپنڈی میں ریلوے کے کسی منصب پر فائز تھے، ایک خبر تھی کہ وہ راولپنڈی چلے گئے ہیں لیکن ان کے بھاگٹا نوالہ سے چلے جانے کے بعد میری معلومات زیادہ معتبر نہیں ہیں۔...... (اظہر جاوید کے بڑے بھائی مظہر سہیل کو ان کے چلے جانے کے بعد بھی میں نے دو ایک بار اس طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ بھی مستقلاً کہیں اور چلے گئے)

ان دنوں انور گوئندی سرگودھا میں ''کامران' کے عنوان سے مشاعرے کروایا کرتے تھے، جن میں شاعروں کے علاوہ شاعرات کی بھی معتد بہ تعداد شریک ہوا کرتی تھی، میں بھی کبھی کبھار سامع کی حیثیت سے مشاعروں میں چلا جایا کرتا تھا۔ چند بار اظہر جاوید سے بھی ملاقات ہوئی، میں نے ہر بار یہی چاہا کہ وہ پہلے کی سی مراجعت کریں لیکن انہیں اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔ مجھ سے گلے ملتے، حال احوال پوچھتے، اچٹتا سا فقرہ کستے اور جہانِ رنگ و بو میں کھو جاتے۔

اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کا اجراء کیا تو پہلا پرچہ مجھے بھجوایا، گویا یہ تجدید مراسم تھی۔ ازاں بعد نہایت باقاعدگی سے مجھے ''تخلیق'' بھجواتے رہے، میں بھی از راہ نیاز مندی و ممنونیت ان سے رابطہ میں رہا، میں لاہور بہت کم جاتا ہوں، لیکن ان کی زندگی میں جب بھی اس طرف گیا کسی اور دوست سے ملا یا نہیں، اظہر جاوید سے ملنے دفتر ''تخلیق'' ضرور جاتا، ہماری باتیں ادبی لحاظ سے کم عہدِ گذشتہ پر زیادہ ہوتی تھیں، ان کی طبیعت کی پرانی جولانیاں اور رنگینیاں عود کر آتیں۔ مجھے فرصت کم ہوتی تھی چند لمحے اپنے ہم نفس و ہمدم دیرینہ کی صحبت میں گزار کر لوٹ آتا۔ دوبارہ کسبِ فیض تک ان کی باتوں کی خوشبو مشامِ جاں میں بھر لیتا۔

اظہر جاوید کا آخری ذاتی خط جناب نذیر فتح پوری کے خط کے ساتھ ایک ہی لفافہ میں بند مجھے نومبر 2011ء کو ملا، فروری 2012ء کا ان کی ادارت میں شائع ہونے والا آخری پرچہ ''تخلیق''، موصول ہوا، پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سرگودھا سے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے مجھے پیغام بھجوایا......

''اظہر جاوید مدیر ماہنامہ تخلیق ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں''۔

شیخ صاحب کیلئے ان کا حوالہ ''تخلیق'' ہی بنتا ہوگا، ہزاروں لوگ انہیں اپنے اپنے حوالوں سے جانتے ہوں گے، میرے لئے ایک ہی حوالہ کافی ہے، من تو شدم تو من شدی۔ اے اظہر جاوید! اے میرے ہم نفس! مجھے معلوم نہ تھا۔

صبح کی پہلی کرن بن کر گذر جاؤ گے تم ......!
ہم کڑکتی دھوپ میں جانے کہاں رہ جائیں گے

دنیا کے ہر اس گوشے میں جہاں ''تخلیق'' جاتا ہے وہاں اظہر جاوید سے محبت کرنے والے پائے جاتے ہیں، ہزاروں گوہر رقم قلم کاران پر لکھیں گے، ہر زاویے سے، ہر پہلو سے، مجھے فقط اتنا کہنا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

چک ۸۰ جنوبی میں میرا ایک دوست رحمت علی ہے، چند دن پہلے معلوم ہوا کہ وہ کچھ علیل ہے۔ میں اپنے پوتے فراز احمد کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس کی مزاج پرسی کیلئے گیا۔ وہاں جانے کیلئے نہر کی پٹڑی پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ راستے میں اظہر جاوید کی نانکی حویلی بھی پڑتی ہے، جہاں اب بھی ان کے ماموں شیخ رفعت مقیم ہیں۔ وہی نہر کنارا، وہی آبِ رواں، وہی سبزہ زار، وہی پنگھٹ، وہی شیخ والی ''حویلی''۔ ساٹھ باسٹھ سال پہلے کے مناظر چشمِ تصور میں گھوم گھوم گئے۔ راہِ حیات کا اپنے ہم سفر سے بچھڑا ہوا تنہا مسافر، کربِ تنہائی، مفارقت کا قلق، اداسیاں ہی اداسیاں......

ان راستوں نے جن پر کبھی گامزن تھے دونوں
مجھے روک روک پوچھا، ترا ہم سفر کہاں ہے

◆◆◆

افضال شاہد

''انتہائی استقلال سے مسلسل ایک ادبی پرچہ نکالنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے...... ان کٹھنائیوں سے میں ذاتی طور پر نبرد آزما ہو چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ آپ کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے کہ ایک الگ ''محلے'' میں ایک اور طرح کی ''بیٹھک'' سجائے آپ کو برسوں بیت گئے مگر آپ کی صحت آج بھی جواں ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے۔''

آہ اظہر جی

پروفیسر قیصر نجفی

یہ ماضی کی ایک یادگار صبح تھی، جب ''تخلیق'' آسمان اردو ادب پر طلوع ہوا۔ ایک نام ''اظہر جاوید'' جس کی گونج گوشِ جاں میں سنائی دی، نس نس میں مچلنے لگا اور میں کشاں کشاں میکلیگن روڈ پر واقع دفتر ''تخلیق'' پہنچ گیا...... گویا وہاں ایک مرمریں مجسمہ براجمان تھا، جو میری آہٹ پر لب کشا ہوا،

''جی آیاں نوں''

میں نے سرگوشی کی، ''لاہور میں تو مجسّمے بھی بولتے ہیں!''

صدا اُبھری، ''کوئی مسیحا آجائے تب......''

فوراً اپنا تعارف کرایا، ''خاکسار کو مسیحا نہیں، قیصر کہتے ہیں...... قیصر نجفی۔''

جواب آیا، ''بندہ بھی مجسمہ نہیں، اظہر جاوید ہے...... جیتا جاگتا......''

ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ آواز آئی، ''قیصر اور خاکسار! یقین نہیں آتا...... چلئے، نجفی کی رعایت سے مان لیتے ہیں''۔

اظہر جی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کا ماحصل ان کی ارادت کیشی کا وہ قلاوہ ہے، جو ایک زمانے سے میں نے روح کی کلائی میں پہن رکھا ہے...... میں ان دنوں بے روزگاری کے گھوڑے پر سوار پھرا کرتا تھا، کبھی کبھار دلکی چال میں ''تخلیق'' کے دفتر میں جا نکلتا...... شہر بھر میں وہیں مجھے کنج عافیت میسر آیا تھا۔ یہ تو بعد میں کھلا کہ دفتر ''تخلیق'' مجھ جیسے زندگی سے گلہ مند (Angry Youngmen) دیگر نوجوانوں کی بھی پناہ گاہ ہے۔ جہاں گاہے بگاہے اظہر جاوید مدیرانہ، شاعرانہ، صحافیانہ، غرض اپنے ہر نوع کے شعور سے سرشار Surmon دیتے ہیں اور اب تک کئی ایک منفی سوچ کے شکار نوجوانوں کا قبلہ درست کر چکے ہیں۔

افسوس! کہ میں تادیر لاہور میں اپنا قیام جاری نہ رکھ سکا۔ زندگی کے معکوس حالات نے اظہر جی کے قرب کی جنت سے نکال کر کراچی کے پتھریلے راستوں پر لا پھینکا۔ جہاں کشادہ شاہراؤں پر تیرتی ہوئی گاڑیوں میں سوار لوگوں سے اپنی جیسی

مخلوقِ خدا کو بزبانِ بے زبانی یہ کہتے ہوئے سنا ۔

پتھریلے راستوں پہ چلے ہم برہنہ پا
گل ہیں تمہارے زیرِ قدم سوچنا پڑا

کراچی کا ایک نام ''منی پاکستان'' ہے اور دوسرا نام ''مسائلستان'' ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ منی پاکستان ہونا ہی اس شہر کے مسائلستان بننے کا بڑا سبب ہے۔ کیونکہ عروس البلاد میں مختلف دیار وامصار سے آ کر آباد ہو جانے والے لوگ ہی، جو آپس میں قسم قسم کے سماجی و معاشرتی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں ہمہ وقت ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو فضا میں اتنا تکدّر اور ماحول میں اس قدر زہر بھر جاتا ہے کہ شہر بھر کی سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں اور اپنے ہی کہے ہوئے اشعار ناوک بن کر دل و جان میں ترازو ہو جاتے ہیں۔

ہر طرف موت کا ہے سناٹا
زندگی ہو گئی ہے بے آواز
ایک آسیب کا کھلا ہے منہ
ایک آفت کا در ہوا ہے باز
بوالہوس دندناتے پھرتے ہیں
چل رہی ہے ہوائے حرص و آز
آج وہ بن گیا ہے دشمنِ جاں
کل جو تھا یار ہمدم و دمساز

کراچی میں جسموں کا ریگزار روانی میں تھا، میں بھی اس میں ضم ہو گیا۔ 1998ء تک شجر زندگی حالات کے کیسے کیسے تیز و تند جھکڑوں کی زد میں رہا اور کیسے کیسے منہ زور و سرکش طوفانوں سے ہم آغوش ہوا، بیان کرنے کا یارا نہیں۔ البتہ ایک دکھ......شہرنا پرساں میں اپنی شناخت کھو جانے کا دکھ، تمام آلام سے بھاری نکلا۔ بالآخر اپنے اوّلیں شعری مجموعہ ''شہرِ جاناں'' کے دوش پر سوار ہو کر شناخت کا ہفت خواں طے کرنے کی ٹھان لی......معاً اظہر جی کا خیال آیا اور ان کا شعار دوست نوازی جگنو بن کر جادۂ امید پر راستہ دکھانے لگا۔ فوراً ان سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔

''ہیلو''

''جی اظہر''

''کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''

اس بڑھاپے میں یادوں کے خارزار میں کہاں گھسیٹتے ہیں حضرت! نام بتا دیجئے''۔

''آپ کا مدّاح قیصر''

''معاف کیجئے! ہم بادشاہوں سے رابطہ نہیں رکھتے......رانگ نمبر''۔

''پلیز! فون مت بند کیجئے گا......قیصر نجفی بول رہا ہوں اظہر جی!''

''آئے ناں تھاں پر''......کہاں ہیں پیارے! کراچی میں یا......''

''جی کراچی میں ہوں......شرمندہ ہوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد آپ سے رابطہ کر رہا ہوں''۔

''لگتا ہے شاعری چھوڑ دی ہے۔''

''نہیں اظہر جی! ثبوت کے طور پر اپنا پہلا شعری مجموعہ ''شہر جاناں'' ''تخلیق'' کی نذر کر رہا ہوں۔''

''پروفیسر صاحب! ''تخلیق'' ایسے نذرانوں میں خود کفیل ہے......خیر! آپ بھیجنا چاہتے ہیں تو ''چشم ما روشن دل ماشاد۔''

دوسرے روز میں نے انہیں ''شہر جاناں'' کا ایک نسخہ اور ایک تازہ غزل بھیج دی۔ انہوں نے تازہ شمارے میں نہ صرف کتاب پر تبصرہ اور غزل شامل اشاعت کئے بلکہ مجھے اپنی محبتوں کا مظہر ''تخلیق'' بھی ارسال کر دیا، اور یوں ان کے فیض عام کا ایک دریچہ میری جانب بھی کھل گیا، جوان کی زندگی تک وا رہا۔ میں اسے اظہر جاوید سے احیائے روابط کا حاصل سمجھتا ہوں کہ ایک نہایت قلیل مدت میں ادبی دھارے میں شامل ہو گیا......خاص کر ''تخلیق'' کے طفیل مجھے اردو زبان و ادب سے تجدید وفا کا موقع میسر آیا۔

''تخلیق'' کا اپنا ایک رشتہ ہے۔ میں اس نشے میں ابھی تک تھا کہ ایک روز موبائیل بجا، آواز آئی۔

''اظہر بول رہا ہوں۔''

''بولتے رہیے''۔

''اگر آپ سامنے ہوں تو شاید بولتا رہوں''۔

''کاش! لاہور اور کراچی کے فاصلے سمٹ سکتے۔''

''یہ فاصلے سمٹ چکے ہیں پیارے! میں کراچی سے بول رہا ہوں۔ آج ہی بعد از دوپہر پہنچا ہوں۔''

''قیام کہاں ہے؟''

''نیپا میں مقیم ہوں۔ فوراً آ جایئے......یقین کیجئے آپ کے آنے کے بعد بھی چراغوں میں روشنی رہے گی۔''

یہ پہلا موقع تھا، جب کسی کی کراچی آمد پر میرے دل و جان دونوں رقص کرنے لگے۔

اس موقع پر استاد ذوقؔ کو بھی داد دینی چاہیے۔ بے شک کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ اظہر جی سامنے آئے تو حیرت سے میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے بالوں میں چاندی کا ایک آدھ قریہ آباد تھا۔ اظہر جی تو

اپنے بالوں میں چاندی کا پورا ایک نگر لئے کراچی پہنچے۔اس کے باوصف وہ ہمیشہ کی طرح سدا بہار تھے......انہوں نے ملتے ہی سی ویو(Sea view) پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مجھے تو وہاں جانے کے لئے کوئی بہانہ چاہیے تھا،فوراً تیار ہو گیا۔ پلک جھپکتے ہی دونوں سی ویو کی جانب رواں دواں تھے۔ طے یہ پایا کہ پہلے بابا عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر حاضری دیں گے۔

بابا غازی شاہ جنہوں نے سمندر کے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے اور جن کے سنگِ مزار سے مس ہوتے ہی سمندر کی تمام تر شوریدگی و تلخی کافور ہو جاتی ہے اور وہ صاف وشفاف آبِ شیریں بن جاتا ہے۔

ع　　ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔

مزار کے احاطے میں صدقہ وخیرات کا سلسلہ جاری تھا۔ہم نے بھی حسب استطاعت اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ازاں بعد فاتحہ خوانی کے لئے ضریح پر پہنچے۔ فاتحہ پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اظہر جی میرے ہمراہ نہیں ہیں۔ باہر آیا تو انہیں دیوار سے ٹیک لگائے عالم استغراق میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔انہیں میرے آنے کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔انہوں نے خاصی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں اور گھڑی پر نظریں جمالیں۔ پھر بہ سرعت کھڑے ہو گئے اور مجھ سے چلنے کو کہا۔ میں نے ان سے ضریح کی زیارت نہ کرنے کے بارے میں استفسار کیا تو میری طرف دیکھے بغیر بولے،''شاہ جی! راز نوں راز ای رہن دیو۔'' لیکن جب میرا اصرار بڑھا تو صرف اتنا کہا ''میں ضریح پر جانے کے لائق نہیں ہوں'' اور آبدیدہ ہو گئے۔

عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ہوٹل جا کر پہلے ہم نے ایک گوشے میں نماز ادا کی، پھر کھانا کھایا اور ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرنے لگے۔ میں پہلے ہی قدرے متعجب سا تھا۔اظہر جی نے یہ کہہ کر میرے تعجب میں معتد بہ اضافہ کر دیا، ''ہم جتنی دیر یہاں بیٹھیں گے،ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کریں گے۔'' ان کے چہرے پر غیر متوقع سنجیدگی کو گہرا ہوتا ہوئے دیکھ کر میں نے خود کو سوال و جواب تک پھیلنے سے روک لیا اور کنوئیں کی طرح اپنے اندر سمٹ کر رہ گیا۔ہم مغرب تک وہاں بیٹھے رہے،لیکن اس طرح کہ اظہر جی ہمہ وقت سمندر کی موجوں میں اور میں ان کی شخصیت کی لہروں میں غوطہ زن رہا۔

اظہر جی تقریباً 15 روز کراچی میں قیام پذیر رہے۔اس دوران میں صرف ایک مرتبہ غریب خانے پر کھانا کھانے کی دعوت قبول کی۔ بچوں کے ایما پر ایک تعطیل کے روز ظہرانے کا اہتمام کیا تاکہ وہ اظہر جی کی شفقت سے محروم نہ رہ جائیں...... میرے چاروں بچے ابھی بچپنے کی انگلی تھامے زندگی کی ڈگر پر چل رہے تھے۔اظہر جی سے غائبانہ طور پر نہ صرف متعارف تھے بلکہ مانوس بھی تھے۔ ''تخلیق'' جب بھی نظر نواز ہوتا تو وہ ان کے حوالے سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور پوچھتے۔اس بار اظہر جی کی شخصیت کے ایک اور رخ نے متحیر کر دیا......وہ گھنٹوں ہمارے گھر میں رہے،مگر ایک لمحہ کو بھی بچوں کو خود سے اور خود کو بچوں سے الگ نہ ہونے دیا۔ لطیفے، پہیلیاں،معلومات عامہ، ذہنی آزمائش کی باتیں، جانے کیا کیا کچھ ان سے سنتے اور کیا کچھ انہیں سناتے رہے......وضع داری کی یہ مثال شاید ہی کہیں ملے۔ جب تک زندہ رہے،میرے بچوں سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ ہمیشہ

وقفے وقفے سے ان کی خیر خبر لیتے رہتے......

اس وزٹ (visit) کے بعد بھی اظہر جی دو ایک بار کراچی آئے......کراچی میں میرے علاوہ ان کا جن احباب سے رابطہ رہتا تھا۔ان میں محمود شام، ظفر عظیم اور شہناز نور شامل ہیں۔محمود شام کا وہ بے حد احترام کرتے تھے۔وہ انہیں کوئی نہ کوئی اسائنمنٹ (assignment) دے دیتے تھے۔ظفر عظیم سے ان کا تعلق خاطر تھا۔وہ انہیں ''کفیل'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔نیپا میں ان کے قیام کی ذمہ داری ظفر عظیم نے ہی سنبھال رکھی تھی۔شہناز نور سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔شہناز کا دفتر گویا ان کا گوشۂ عافیت تھا۔دو تین برسوں سے اظہر جی کراچی آنے کے لئے بیتاب تھے۔مگر شاید انہیں ''کفیل'' سے گرین سگنل نہیں مل رہا تھا۔وفات سے چند ماہ قبل انہوں نے مجھے اچانک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ جلد ٹرین پر عازم کراچی ہونے والے ہیں۔مگر میں نے انہیں ریلوے کے نظام میں ابتری کے پیش نظر اس سفر سے باز رکھا۔بلکہ اس خود کشی سے بچا لیا۔

اظہر جی کے طائر قلم کی رسائی میں شعر و ادب کی متنوع جہات تھیں۔مگر ان کی شخصیت پر ''تخلیق'' کی ادارت محیط تھی......ادبی جرائد و رسائل کے مدیروں کی کہکشاں میں وہ ایک ایسے درخشندہ ستارے تھے، جس کی روشنی سماجی، معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، علمی اور ادبی زندگی کے کم و بیش ہر گوشے تک پہنچتی تھی۔ان کا اداریہ ''اپنی بات'' حدیث زندگی کے طور پر پڑھا جاتا تھا۔یہ اداریہ دراصل ان کے دردمند دل کی آواز تھی، جس میں اجتماعی شعور کی کسک بھی شامل تھی۔مجھے یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہے کہ ایک عرصے سے اداریہ ''اپنی بات'' جریدہ ''تخلیق'' کا ایک Salient Feature تسلیم ہوتا تھا۔شاید ہی ''تخلیق'' کا کوئی قاری ''اپنی بات'' سے پہلے دیگر مشمولات کی طرف متوجہ ہوتا ہو۔یہ قابلِ داد صورت حال اظہر جی کی ادب سے مخلصانہ وابستگی اور ان کے قلم کی سچائی کا نتیجہ تھی۔

اردو دنیا میں جن اکابرین ادب کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اظہر جاوید ان میں سے ایک تھے۔ان کے شخصی احترام کا ایک منظر تا حال آنکھوں کے سامنے ہے۔2004ء میں ''جشن ساحر'' کے موقع پر ساحر کلچرل اکادمی کی دعوت پر پاکستان سے شاعروں اور ادیبوں کا ایک قافلہ (جس میں ناچیز بھی شامل تھا) بشریٰ رحمٰن کی قیادت میں لدھیانہ (انڈیا) پہنچا۔ابھی ہم سفر کی تکان کا پیرہن اتارنے نہ پائے تھے کہ خبر ملی۔''اظہر جاوید آئے ہیں۔'' یہ خبر سنتے ہی جیسے میرے رگ و ریشہ میں برق سی دوڑ گئی۔جوتا بھی نہ سنبھلا اور آناً فاناً ان کے پاس پہنچ گیا۔وہ اپنے مداحوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔شاید انبالہ سے مشاعرہ پڑھ کر اس وقت آئے تھے۔میں نے دیکھا کہ کیول دھیر صاحب اور مہندر سنگھ چیمہ (منتظمین) ان کے آگے بچھے بچھے جا رہے ہیں اور ان کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے ہیں۔قبل ازیں میں ایسا منظر بشریٰ رحمٰن اور احمد فراز کی آمد کے موقع پر دیکھ چکا تھا...... بلاشبہ میزبانوں نے ہر مہمان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا، مگر جس گرم جوشی میں احترام شخصیت کی حدت نسبتاً زیادہ تھی وہ ان مہمانانِ گرامی کے استقبال میں تھی۔

کراچی کے روز افزوں مخدوش حالات اور لرزہ خیز واقعات سے جان ہوا ہونے لگی تو کئی مرتبہ اس شہر کو خیر باد کہنے اور لاہور منتقل ہو جانے کا قصد کیا۔ مگر ہر بار اظہر جی نے اس اقدام کی سخت مخالفت کی۔ ایک دفعہ قدرے مشوش ہو کر میں نے وجہ دریافت کی تو نہایت گداز لہجہ میں بولے، ''کراچی میں زیست کرنے کے لئے جس جگر گردہ کی ضرورت ہے، وہ شاید آپ کے پاس ہے۔ لیکن لاہور میں زندگی بِتانے کے لئے جو جگر گردہ چاہیے وہ آپ کے پاس نہیں ہے...... شاید ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے...... میرے بارے میں مت سوچئے گا۔ جانے میں کس مٹی سے بنا ہوں۔''

لیکن وہ جو کہتے ہیں، ''تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ''۔ 2006ء میں ایک روز میں نے کراچی کی سنگینی حالات کا خود کو متحمل نہ پایا۔ قوت برداشت یکسر جواب دے گئی اور پیمانہ صبر سربہ سرلبریز ہو گیا۔ بالآخر یہ حتمی فیصلہ کر لیا کہ روز روز کے مرنے سے ایک ہی دفعہ مر جانا بہتر ہے۔ میرے بڑے بھائی پرویز صاحب عرصہ دراز سے لاہور میں سکونت پذیر ہیں، اس فیصلے سے صرف انہیں آگاہ کیا اور جنگی بنیادوں پر رختِ سفر باندھ کر لاہور روانہ ہو گیا...... لاہور میں آمد کے دوسرے دن اظہر جی سے ملاقات کی۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن احوال سننے کے بعد اتنے ہی اداس نظر آئے، پھر خود پر قابو پا کر مجھ سے مخاطب ہوئے، ''بہتر تھا کہ آپ یہ قدم نہ اٹھاتے۔ خیر اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یقیناً آپ نے لاہور میں مستقل قیام کا کوئی منصوبہ بنایا ہوگا۔ اسے عملی جامہ پہنانے کا آغاز کیجئے۔ میرا کسی حوالے سے تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں......'' اظہر جی کے ڈھارس بندھانے سے میں نے رگ و پے میں ایک نئی قوت محسوس کی اور حالات سے پیکار کا آغاز کر دیا۔ شومئی قسمت کہ کسی بھی حوالے سے پیش رفت ہوتی نظر نہ آئی اور جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ لاہور میں رہنا دشوار ہے۔ لیکن اب میں کر بھی کیا سکتا تھا، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن...... اظہر جی کو دکھڑا سنانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس پر مستزاد حالات کی بے یقینی نے اعصاب میں شدید ضعف پیدا کر دیا۔ جسے اظہر جی نے بھی بھانپ لیا۔ میرے پاس آئے کہنے لگے، ''اب اپنا معاملہ کسی اللہ والے کے سپرد کر دیجئے۔ اٹھیے! داتا دربار چلتے ہیں اور ان سے رہنمائی کی التجا کرتے ہیں۔'' ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور میرا بازو پکڑ کر ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔ داتا دربار پہنچتے ہی میں نے ضریح کی زیارت کی اور فاتحہ پڑھی۔ اظہر جی یہاں بھی ضریح کے قریب تک نہ پھٹکے اور دور دالان میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آواز کانوں سے ٹکرائی، ''اسے کہو واپس چلا جائے۔ یہاں اب اس کے لئے کچھ نہیں رکھا۔'' یہ داتا دربار کے متوّلی کی آواز تھی، جو کسی زائر کو پیغام بھجوا رہے تھے۔ اظہر جی نے فوراً سر اٹھایا اور مجھے آہستگی سے کہا، ''کام ہو گیا ہے۔ اب آپ واپسی کا ٹکٹ کٹائیں...... یہ ایک اللہ والے کا حکم ہے۔''...... جب ہم ''تخلیق'' کے دفتر پہنچے تو اظہر جی کی آنکھوں میں ایک عجب سی روشنی اور چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ اظہر جی کی شخصیت کا یہ ایک اور حیران کن رخ تھا جو میرے سامنے آیا۔

میں یہ بات اپنے لئے باعث تفاخر سمجھتا ہوں کہ اظہر جی کراچی سے متعلق ہر کام بلا تکلّف۔ مجھ سے کہتے تھے۔

احباب جانتے ہیں کہ وہ ایک خوددار، انا پسند اور اپنے دم خم پر بھروسا کرنے والے انسان تھے۔ فیض رسانی تو ان کے کردار کا نمایاں وصف تھا...... گزشتہ سال انہوں نے اچانک مجھے انڈیا کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی اور پاسپورٹ کی نقل طلب کی۔ میں فوراً حکم بجالایا۔ مگر انڈین ایمبیسی نے کسی پاکستانی ادیب یا شاعر کا ویزا نہ لگایا...... وضع داری کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجئے۔ اظہر جی نے مجھ سے اس طرح سے معذرت کی جیسے ویزے دینے سے انہوں نے انکار کیا ہو۔

ایک زمانے میں ان کے حوالے سے میں ایک نہایت صبر آزما دور سے گزرا۔ جناب احمد ندیم قاسمی میرا آدرش تھے اور اظہر جی کی ان سے ٹھن گئی۔ بابا سے میرے تعلق خاطر کو وہ بھی جانتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کسی روز وہ مجھے دوستی کی پالکی میں بٹھا کر اپنی مخاصمت کے کیمپ میں لے جانے کی کوشش کریں گے یا کم از کم اپنے موقف کے آگے چھائی ہوئی دھند ضرور صاف کریں گے...... حیرت ہے کہ انہوں نے بابا کے خلاف نہ مجھے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور نہ کبھی اپنے موقف کی درستی کا دعویٰ کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس مسئلہ پر سرے سے کبھی مجھ سے بات ہی نہ کی...... یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قاسمی صاحب نے اپنی وفات سے قبل جس آخری تقریب میں شرکت کی، وہ میرے ساتھ منائی جانے والی شام تھی جس کا انہوں نے اپنے دفتر میں اہتمام کیا تھا (تفصیل ماہنامہ ''بیاض'' میں شائع ہوچکی ہے)۔ اس روز تمام تر میرا وقت اظہر جی کے ساتھ گزرا۔ میں نے جب تقریب میں جانے کے لئے ان سے رخصت طلب کی تو انہوں نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''جلدی جاؤ! ایک تاریخی لمحہ آپ کے انتظار میں ہے۔'' اظہر جی کی شخصیت کا یہ ایک اور رخ ہے، جس نے مجھے متحیر کردیا۔ قاسمی صاحب کی وفات کے بعد کسی نے جب یہ بتایا کہ اظہر جاوید نے ان کے مرقد پر جاکر شمع جلائی ہے تو میری نظروں میں ان کا روشن چہرہ روشن تر ہوگیا......

◆◆◆

سیّد ضمیر جعفری

''اظہر جی! ہم خود خواہ کسی ترتیب (بلکہ بے ترتیبی) میں مبتلا ہوں۔ ''تخلیق'' کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے کہ اس رشتے میں اک عمر بیت گئی اور اگر دوسری مل جائے تو وہ بھی اس کی نذر کردیں۔
''تخلیق'' کے ہر شمارے کے ساتھ آپ کو آخر میں کہتا ہوں کہ معلوم نہیں آپ خود کس طرح زندہ ہیں، مگر ''تخلیق'' کے سوتے جگائے رکھتے ہیں۔ آپ وہ فصل کاشت کر رہے ہیں جو عموماً سروں کی فصل کٹ جانے کے بعد کٹا کرتی ہے۔''

اظہر جاوید سے آخری ملاقات

ملک مقبول احمد

اردو کے ممتاز ادیب شاعر، افسانہ نگار اور مقبول ترین ادبی رسالہ ''تخلیق'' کے ایڈیٹر جناب اظہر جاوید سے میری دوستی کا عرصہ بہت طویل ہے لیکن ان سے آخری ملاقات اس روز ہوئی جب میں جنوری 2012ء کے آخری ہفتے میں مکہ معظّمہ جانے اور عمرہ کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تھا اور لاہور میں اپنے سب دوستوں سے مل رہا تھا کہ انہیں سعودیہ سے کوئی چیز منگوانی ہو تو مجھے بتا دیں۔ حسب معمول بھگوان سٹریٹ میں ''تخلیق'' کے دروازے کے سامنے ڈرائیور نے کار کھڑی کی اور اپنے مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو اظہر جاوید دروازے پر نمودار ہو گئے۔

وہ میری ٹوٹی ہوئی کار کے ہارن کی آواز پہچانتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں ان کے باہر آنے سے پہلے کمرے میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں نے کئی بار اپنے ڈرائیور کو کہا ''وہ بھگوان سٹریٹ میں پہنچنے کے بعد ہارن نہ بجائے۔ میں اس گلی کے ''کنہیا'' کو (اظہر جاوید کو یہ خطاب ان کی کتاب ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی رونمائی کی تقریب میں محترمہ بانو قدسیہ نے دیا تھا) ان کی کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' لیکن ڈرائیور اپنی عادت کا پابند تھا۔ وہ دفتر کے سامنے پہنچتے ہی ''اطلاعی ہارن'' بجا دیتا اور بھگوان سٹریٹ کا ''کنہیا'' اپنی کرسی سے اٹھ کر استقبال کے لئے دروازے سے باہر آ جاتا اور دیکھتے ہی کہتا۔

''شاد آباد رہو......خوش آمدید......شکریہ کہ آپ کو بھولا ہوا راستہ یاد آ گیا۔''

یہ اظہر جاوید کی عادت تھی کہ میں سابقہ ملاقات سے دوسرے روز بھی جاتا تو وہ یہ چند جملے ضرور دوہراتے تھے۔ آج بھی جب میں ''تخلیق'' کے دفتر میں پہنچا تو انہوں نے دعائیہ الفاظ کہے۔ کمرے میں پہنچ کر وہ چائے کا انتظام کرنے لگے۔ لیکن میں نے اصرار کر کے انہیں روک دیا۔ کیونکہ مجھے اس دن کئی دوستوں سے ملنا تھا اور اگلے روز عمرے کے لئے پرواز کر جانا تھا۔ میں نے جلدی رخصت ہو جانے کے ارادے سے اپنی بات پہلے کہنی ضروری سمجھی۔

''اظہر صاحب! مجھے بلاوا آ گیا ہے؟''

اظہر جاوید اس وقت تک اپنی الماری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہیں رُک گئے اور حیرت سے پوچھا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ بلاوا آ گیا ہے؟''

میں نے کہا ''اظہر صاحب! پریشان نہ ہوں۔ مجھے مکّے مدینے والے کا بلاوا آیا ہے۔اور میں کل عمرہ پر جا رہا ہوں۔''

اظہر جاوید یہ سنتے ہی واپس مڑے اور مجھ سے بغل گیر ہوگئے۔ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

''اللہ مبارک کرے، اللہ مبارک کرے......خیر خیریت سے فریضہ ادا کر کے واپس آؤ......

میری ایک ہی درخواست ہے......مکّہ میں خانہ کعبہ کے طواف کے بعد اور مدینے میں مسجد نبویﷺ میں نماز کے بعد میرے لئے میرا نام لے کر بڑی عاجزی سے دعا ضرور کرنا۔''

میں نے پوچھا ''کوئی چیز لانا ہو تو حکم کریں؟''

اظہر جاوید بولے۔''ملک صاحب! خیر سے جاؤ، عمرے کی سعادتیں حاصل کرو اور خیر سے واپس آؤ......دعا کرنا کہ اللہ مجھے بھی اپنے گھر کا بلاوا بھیجے۔ مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی......'' ایک لمحے کے لئے رکے اور بولے ''قدرت اللہ شہاب نے دیارِ حبیبؐ کی مٹی کی تعریف عجب انداز میں کی ہے۔ میرے لئے مکّے کی سرزمین سے دو چٹکی مٹی لیتے آئیں......میں اسے اپنی زندگی میں محفوظ رکھوں گا اور وصیت کر جاؤں گا کہ میری قبر میں شامل کی جائے۔''

میں نے سعودی عرب کے تمام مقاماتِ مقدسہ میں سب دوستوں کے لئے اور اظہر جاوید کیلئے خاص طور پر ان کا نام لے لے کر دعائیں کیں اور مکہ اور مدینہ کی خاک پاک بھی ایک ڈبیا میں بند کر لی کہ یہ اظہر جاوید کیلئے بہترین تحفہ تھا۔اس کی فرمائش بھی تھی۔

13 فروری 2012ء کی شب کو میں واپس لاہور پہنچا تو آدھی رات کا وقت تھا۔ میں نے دل میں یہ ارادہ باندھا تھا کہ اگلے روز 14 فروری کو سب سے پہلے دفتر ''تخلیق'' میں حاضر ہوں گا اور اظہر جاوید صاحب کی خدمت میں ''خاکِ شفا'' کا تحفہ پیش کروں گا۔اس روز صبح کی نماز ادا کر کے میں سفر کی تھکن اتارنے کے لئے صوفے پر ہی لیٹ گیا۔خدا جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ اچانک میرا موبائل فون بجنے لگا تو آنکھ کھل گئی۔دوسری طرف سے آواز آ رہی ہے!

''اظہر جاوید فوت ہوگئے''۔

میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔اس خبر کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔لیکن مجھے اس خبر کی صداقت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر فون کھڑکانے شروع کئے۔ اتفاق سے ڈاکٹر انور سدید مل گئے۔انہوں نے میری آواز پہچان لی تھی اور میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''ملک صاحب! اظہر جاوید چلے گئے۔''

پھر سارا دن جگہ جگہ سے فون آتے رہے اور یہ خبر دوہرائی جاتی رہی۔ ہر لمحہ میرا کرب بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اطلاع بھی مل گئی کہ جنازہ کیولری گراؤنڈ میں واقع ان کے بیٹے کے گھر سے رات کو سات بجے اٹھے گا۔میں نے ڈاکٹر انور سدید سے کہا ''وہ گھر

پڑھی رہیں، میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' سوا چھ بجے میں ان کے گھر پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ہمیں بسم اللہ سٹریٹ کا پتہ نہیں تھا۔تلاش کرتے کرتے دیر ہوگئی تو انور سدید پریشان ہوگئے، کہنے لگے''کہیں اظہر جاوید کے آخری دیدار اور جنازے میں شرکت سے محروم نہ رہ جائیں۔'' لیکن جنازہ عشاء کی نماز کے بعد اٹھایا گیا۔اور ہم اپنے ''یار دلنواز'' کو پورے سکون سے سفید بے شکن کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر رو دیئے۔اس وقت لاہور کے تمام بڑے ادیب جنازے کو کندھا دینے کے لئے موجود تھے۔سب کے دل رو رہے تھے لیکن سب کو پتا تھا کہ موت سے کسی کو نجات نہیں۔ جنازہ قریبی مسجد میں پڑھا گیا اور تدفین بھی قریب ہی کے ایک قبرستان میں کی گئی۔ مجھے اظہر جاوید کی وصیت یاد تھی۔انہیں لحد میں اتارا جا رہا تھا اور ان پر مٹی ڈالی جانے لگی تو میں نے اپنی جیب سے ڈبیا نکالی اور مکے مدینے کی خاکِ شفا اس میں ملا دی۔

قسمت کو منظور نہیں تھا کہ میں عمرے سے واپس آ کر ان سے زندہ معانقہ کرتا۔آخری ملاقات ایسے حالات میں ہوئی کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی اور ہم ان کو آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ قبر میں اتار کر دعائے مغفرت پڑھ رہے تھے۔اناللہ وانا الیہ راجعون!

◆◆◆

اظہر جاوید

''ادب میں مقصدیت کی بحث پرانی ہو کر دم توڑ چکی ہے اور اب مقصدیت کو اس حد تک سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اپنی زمین سے پیار کرو اور اس پیار کو اپنی تحریر و تقریر میں پوری شدت کے ساتھ سمو دو، دنیا کے کسی بھی خطے کی کسی بھی زبان کا کوئی سا بھی اہل قلم اس سوچ سے انکار نہیں کر سکتا۔اگر اس حوالے سے ادب پر مقصدیت کی چھاپ لگتی ہے تو کسی باضمیر اور اہل ظرف قلم کار کو اس سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔'' (اپنی بات)

....

اظہر جاوید

جتنی نظمیں، غزلیں لکھیں جتنے شعر تراشے ہیں
اُن کو دیکھ کے یوں لگتا ہے، یہ جذبوں کے لاشے ہیں

اظہر جاوید ایک یار باش شخصیت

راجہ اسد علی خان

اظہر جاوید کی شخصیت کے مختلف پہلو میرے سامنے ہیں۔معتبر، ہشاش بشاش اور یار باش فرد تھے۔وہ ایک سچے اور بے تکلف دوست تھے۔قصہ یوں ہے کہ اَسّی کی دہائی میں گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی میں، میں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے سپورٹس اور حالات حاضرہ کے پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا۔اس دوران میں نے اظہر جاوید کو پہلی مرتبہ رضا کاظمی صاحب کے کمرے میں دیکھا۔اظہر صاحب دبلے پتلے مگر وضع اور چال ڈھال ویسی تھی جیسے اب ہے۔مگر اگست 2008ء میں چیئر مین، مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ جناب خالد محمود نے اظہر جاوید سے جب میرا باضابطہ تعارف کروایا تو پھر اسی لمحے سے ان سے بے تکلفی اور دوستی کا آغاز ہوا۔

ان کی باغ و بہار شخصیت کے وہ پہلو نمایاں ہوئے جن میں قلندری بھی تھی اور سکندری بھی۔وہ تقریباً ہفتے میں پانچ روز ٹرسٹ کے دفتر آتے۔مولانا ظفر علی خان کی کتب اور ٹرسٹ کے دیگر معاملات میں گہری دلچسپی کا اظہار فرماتے۔دفتر میں آنے والے سب سے تو نہیں، البتہ چند لوگوں سے وہ بڑی گرم جوشی اور تپاک سے ملتے۔اظہر جاوید زندگی اور اس کی رنگینیوں سے بھرپور لطف اٹھانے کے قائل تھے اور میں گواہ اور شاہد ہوں کہ وہ زندگی کی ہر خوبی اور حسن و جمال سے بدستور فیض یاب ہوتے رہے۔وہ عارضہ قلب کے دوران بھی بستر پر لیٹے ہوئے لطیفہ گوئی، لطیفہ سازی اور گپ شپ کا ماحول برقرار رکھتے۔لاہور میں رہتے ہوئے یہاں کی ثقافتی اور صحافتی خبروں کے بارے میں مکمل باخبر رہتے ہوئے گپ شپ اور بھرپور انداز میں تبصرہ کرتے۔

بحیثیت شاعر اور ادیب ان کے تعلقات کی وسعت قومی اور بین الاقوامی ادبی حلقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔فلمی شخصیات اور سیاستدانوں سے بھی ان کے گہرے، بے تکلفانہ اور پرانے مراسم تھے۔وہ نوجوانوں کا دل رکھتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔قریبی احباب کیلئے تحسین و ستائش کیلئے شاندار اور خوشگوار الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔وہ دوسروں کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، تحسین، حوصلہ افزائی اور ستائش ان کا وطیرہ تھا۔ان کا عمومی انداز بڑا عاجزانہ ہوتا تھا۔تجربے، مشاہدے اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بڑے جہاں دیدہ اور باخبر تھے۔الفاظ اور ان کے استعمال پر انہیں مکمل

دسترس حاصل تھی۔

میں نے ذاتی طور پر اظہر جاوید کی ادبی گفتگو، بے تکلف انداز و بیان اور زبان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ چٹکلا بازیوں میں بھی ماہر تھے۔ میں 12 فروری 2012ء کے روز کرم آباد، وزیر آباد میں موجود تھا۔ جب میرے چچا شاہد علی خان صاحب نے لاہور آ کر اس تقریب کی نظامت کیلئے ہدایت کی جو جناب سعید اختر درانی کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی تھی۔ یہ تقریب اگلے روز لاہور جم خانہ میں انعقاد پذیر تھی۔ بہت سے مہمان آ چکے تھے۔ اچانک اظہر جاوید بھی ہال میں داخل ہوئے۔ میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی حیرت انگیز خوشی اور پر مسرت جوش کا اظہار کیا۔ تقریب کے دوران وہ انتہائی مصروف اور مسرور تھے۔ اس دوران انہوں نے مختلف مہمانوں کے ساتھ تصاویر بھی بنوائیں۔ تقریب کامیابی سے اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ سابقہ تجربات کی بنیاد پر مجھے خدشت تھا کہ شاید وہ کہیں آمد و رفت کے لئے ہمیشہ کی طرح پھر رکشے کا سہارا نہ لیں۔ میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ بھگوان سٹریٹ میں کچھ لوگ ان کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ وہاں فوراً پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ گاڑی سے اترے اور مجھے کہا کہ راجہ صاحب! کل صبح ملاقات ہو گی۔ اگلے روز گیارہ بجے ہمارے ساتھی منشا قاضی نے بصد افسوس اور غم، مجھے فون پر اطلاع دی کہ اظہر جاوید اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے لیے ہی کیا سب وابستگان کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ تقریباً چار سال سے روزانہ مسلسل ملاقاتوں اور مختلف امور پر تبادلہ خیال، علمی ادبی نکات، ادبی محافل، نئی کتابوں، عالمی ادب کی جھلکیوں، شاعروں اور ادیبوں کی خوش گفتاریوں اور کتابوں کی اشاعت، پروفنگ پر بھی گفت و شنید ہوتی۔ حالاتِ حاضرہ اور کرکٹ پر بحث بھی روزمرہ کا معمول تھا لیکن یہ سب کچھ اظہر جاوید کے جانے کے ساتھ ہی جاتا رہا۔ بلاشبہ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ اظہر جاوید میرے 'کرکٹ کالم' کے حوالے سے ہمیشہ مجھے بدستور کالم لکھتے رہنے کی تاکید کرتے بلکہ وارننگ دیتے تھے، اگر کل کالم نہیں چھپا تو میں دفتر نہیں آؤں گا'۔ ہمارے دفتر مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ کے جونیئر سٹاف اور رفقاء کار کے ساتھ بھی بے تکلف ہو جاتے اور بعض اوقات کچھ ہدایات بھی دیتے۔ ان کا یہ رویہ بھی بڑا ہمدردانہ ہوتا تھا۔

دفتر کے سٹاف نے مجھے بتایا کہ تیرہ فروری کو اظہر جاوید نے ٹرسٹ میں آ کر ایک کیک منگوایا اور سب کے ساتھ مل کر کھایا۔ اظہر جاوید مختلف شخصیات اور مشاہیرِ علم و ادب سے متعلق بھی ایک غیبی خزانہ تھے۔ راجہ مہدی علی خان سے متعلق ان کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ وہ مولانا حامد علی خان، چوہدری غلام حیدر خان، پروفیسر محمود احمد خان، پروفیسر حمید احمد خان میرے والد محترم راجہ فاروق علی خان اور راجہ عثمان علی خان کا زمانہ بھی دیکھ چکے تھے۔

مرحوم اظہر جاوید پر ریفرنس کالم اور مضامین کے سلسلے ایک تواتر کے ساتھ شائع ہوئے ہیں جن میں ان کے چاہنے والوں نے ذاتی تعلق کی بنا پر انہیں شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ امریکہ سے تاشی ظہیر اپنی ہر ای میل میں اظہر جاوید کے بچھڑنے کا غمگین تذکرہ کرتے ہیں۔ اظہر جاوید کے انتقال اور تدفین سے اگلے روز ان کے

صاحبزادے سونان اظہر جاوید ٹرسٹ کے دفتر تشریف لائے اور مشورے کے انداز میں کہنے لگے کہ میں ''تخلیق'' کو جاری نہیں رکھنا چاہتا میرے والد اظہر جاوید نے اس ادبی پرچے کا جو مقام قائم کیا ہے میں اسے اپنی ناتجربہ کاری کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے انہیں سمجھایا اور الحمرا کی مثال پیش کی۔ مرحوم مولانا حامد علی خان کی یاد کو قائم رکھنے کیلئے جناب شاہد علی خان نے دوبارہ بامِ عروج تک پہنچایا ہے اور اب الحمدللہ الحمراء اشاعت کے مسلسل دس سال مکمل کر چکا ہے۔

سونان اظہر جاوید بڑے ملنسار نوجوان ہیں۔ ان کی گفتگو میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جو والد سے مشابہت رکھتی ہیں سونان نے ایک روز مجھے فون کیا اور گلہ کے انداز میں کہنے لگے کہ راجہ بھائی، آپ میرا نام غلط انداز میں لیتے ہیں میرا نام سونام نہیں سونان (100 نان) ہے۔ سونان بتا رہے تھے کہ اظہر جاوید صاحب کے قریبی دوست اور چاہنے والے ان سے پورا تعاون کر رہے ہیں اور اب وہ خود اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر بھگوان سٹریٹ جا کر بیٹھتے ہیں میری دعا ہے کہ سونان ''تخلیق'' کو زندہ اور جاری رکھنے میں کامیاب رہیں۔

اظہر جاوید بظاہر خوش گفتار، پرجوش اور خوش پوش دکھائی دیتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے ان کی اندرونی صحت قابل رشک نہیں تھی۔ وہ خرابی صحت کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں جو بہترین افراد دیکھے اظہر جاوید ان میں سے ایک تھے۔ بحیثیت انسان وہ کسی شخصی رتبے یا دبدبے سے متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن شخصیات کا احترام ضرور کرتے تھے۔ بلا کے حاضر جواب تھے۔ انہیں کچھ اور دیر زندہ رہنا چاہیے تھا۔ افسوس کہ اب ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر یونس بٹ

''اظہر جاوید عاشق مزاج آدمی ہیں۔ گفتار میں ترنم ...... اور کردار میں ملکہ ترنم ہے۔ اس نے ''تخلیق'' کے زور پر کئی شاعرات پیدا کیں۔ جن میں اکثر بڑی ہوگئی ہیں مگر صرف عمر میں۔ اردو ادب کے لیے اس نے جب عملی کام کیا ہے کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔ یعنی جتنے عشق اس اکیلے بندے نے کیے ہیں کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔ جتنے لمبے وہ عشق کرتا ہے اتنی لمبی تو لوگ دشمنیاں بھی نہیں کرتے۔ عورتوں کے کام آنا اعزاز سمجھتا ہے۔ اسی لیے کسی نہ کسی خاتون کا اعزازی مدیر ہوتا ہے۔''

خوددار اظہر جاوید

نوید قتیل

یہ 14 فروری کا دن تھا اور ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔فون کی گھنٹی بجی، میرے دفتر کی کرسی لرز اٹھی۔فون منور سلطانہ صاحبہ کا تھا۔فون کان سے لگایا تو منور سلطانہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''نوید آپ نے کوئی خبر سنی؟''

میں سمجھا کہ شاید وہ عباس نجمی کے بارے میں بتانا چاہتی ہیں لیکن وہ بولیں ''اپنے اظہر صاحب کے بارے میں۔''

میں نے پوچھا کیا ہوا؟

بولیں ''اپنے اظہر صاحب کا ابھی کچھ دیر پہلے انتقال ہوگیا ہے۔اور سب سے پہلے آپ کو خبر دے رہی ہوں۔''

خبر سننے کے بعد میری عجیب کیفیت ہوگئی اور میں فوراً ہی آفس سے چھٹی لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، کیونکہ گزشتہ رات وہ جم خانہ کی ایک تقریب میں موجود تھے اور فوزیہ تبسم اور آغا شاہد نے بتایا کہ بہت فریش نظر آ رہے تھے، انہوں نے خاص طور پر میرا پوچھا تھا۔ میں نے اپنی بیوی ارم کو یہ خبر سنائی تو وہ بھی آبدیدہ ہوگئی۔اظہر صاحب نے ارم کو بیٹی بنایا ہوا تھا، وہ جب مجھ سے کبھی ناراض ہوتے تھے تو اِرم کی سفارش کروانا پڑتی تھی۔ ناراضی دور ہوجاتی تو ارم سے کہتے ''اِس نالائق کو تمہاری وجہ سے معاف کر رہا ہوں'' ہم اکثر تقریبات میں اکٹھے ہوتے تھے اور واپسی پر انھیں گھر تک چھوڑنے کی ذمہ داری ہماری تھی۔

اظہر صاحب بہت رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔وہ دوسروں کے بارے میں اچھی سوچ رکھتے، صاف باطن اور صاف دل، کبھی کبھی ناراض بھی ہوجاتے تھے۔ناراضی کے بعد جلدی مان بھی جاتے تھے۔اظہر صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے اپنے علمی، ادبی اور تخلیقی سفر کو جاری رکھا تھا۔اس کی مثال اُن کے ادبی رسالے ''تخلیق'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔اِس سفر کو اُنھوں نے 42 سال تک خونِ جگر سے جاری رکھا۔اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ایک توانا شخص تھے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ ان کی محبت اور شفقت کی ٹھنڈی چھاؤں مجھے میسر ہے۔

فون اُٹھاتا تو کہتے تھے ''جی اظہر'' فون بند کرنے سے پہلے کہتے ''جیتے رہو، شاد آباد رہو، سکھی رہو۔''

اظہر جاوید، میرے والد قتیل شفائی صاحب کو بہت یاد کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد ہمیشہ یہ کہتے ''یار! قتیل صاحب کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اب بھی ہمارے درمیان ہوتے'' پھر ایک لمبی آہ بھرتے، جوان کے اندر کے دُکھ کا اظہار کرتی۔ قتیل صاحب سے ان کی نیاز مندی بھی تھی اور دوستی بھی۔ قتیل صاحب اکثر اظہر جاوید صاحب کو بیرونی ممالک میں اپنے ساتھ لے جاتے تو وہ بڑی خوش محسوس کرتے تھے۔ خاص طور پر انڈیا کئی باران کا جانا ہوا، پھر جشن قتیل جو کہ یو اے ای میں ہوا تھا اِس میں مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا، یہ بہت یادگار لمحات تھے۔

اب انارکلی کی طرف جانا ہوتو اچانک ذہن میں آتا ہے کہ بھگوان سٹریٹ میں ''تخلیق'' کا آفس ہے، اظہر صاحب آ گئے ہوں گے انھیں سلام کرتا چلوں لیکن پھر......

''الحمد'' کے صفدر حسین سے میری بات ہوئی تو میں نے نارنگ ساقی صاحب کی کتاب کے بارے میں کہا ''یار اسے اب تو چھاپ دو کیونکہ اظہر صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب چھپ جائے تو ساقی صاحب کو لاہور بلوائیں گے''۔

صفدر میری اس بات سے آبدیدہ ہو گیا ''یار نوید ہم دونوں اب اکیلے رہ گئے ہیں، نہ قتیل صاحب ہیں اور نہ ہی اظہر جاوید صاحب جو مجھے کہیں کہ یہ کام جلدی کر دو''۔

اظہر جاوید صاحب مجھے اپنا بھائی بھی سمجھتے تھے اور دوست بھی۔ اس کا ثبوت ان کی کتاب ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' ہے، جس پر انہوں نے میرے لیے لکھا:

> ''پیارے نوید قتیل کیلئے، جو دوست بھی ہے اور چھوٹا بھائی بھی اور عکس قتیل بھی۔ وہ قتیل شفائی جو ہمارا (میرا اور نوید کا) مشترکہ سرمایہ تھے، سرمایہ ہیں۔''

اظہر صاحب بھی ہمارا سرمایہ تھے۔ قتیل صاحب کی طرح وہ بھی چپکے سے چلے گئے۔ اب اُن کا مسکراتا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یقیناً اُنھیں جنت میں گھر مل گیا ہے۔

◆◆◆

ضیا نیّر

''...... ''تخلیق'' ...... بوقلموں رنگوں کا گلدستہ جو طبیعت کو بشاشت اور روح کو استہزاز کا باعث بنتا ہے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ''تخلیق'' نوجوان قلمکاروں کا اپنا پرچہ ہے اور اس اپنائیت کا بے ساختہ اظہار ''انجمن خیال'' کی سطر سطر سے مترشح ہوتا ہے۔

''مشک آں است کہ خود بگوید'' نہ کہ عطار بگوید''

ہم سے ہیں یہ محفلیں ہم سے دل لگانا ہے
اور کیا ہے چاہیے ہم سے ہی زمانہ ہے
روح افزا اور کیا چاہیے!
ہمدرد

اظہر جاوید

منظوم نذرانے

CamScanner

دور خلاء میں جھانکا تو کچھ اپنا پن محسوس ہوا
دل کم بخت ہی کافر ہے، یہ جانے کیوں مایوس ہوا

اظہر جاوید

CamScanner

سید مشکور حسین یادؔ

اظہر جاوید

بہت واضح

ہمیشہ کے لئے واضح

وضاحت جس کی تصویریں بناتی تھی قیامت کی

پھر ان تصویروں میں

وہ رنگ بھرتی تھی......محبت کے

وضاحت کہتی تھی

اظہر تمہیں جاوید کرنا ہے

نہ کوئی راز رکھنا ہے نہ کوئی بھید رکھنا ہے

مگر یہ بات الگ ہے

پھر بھی اظہر راز رکھتا تھا، انوکھے بھید رکھتا تھا

جنہیں وہ فاش کرنے پر بھی قادر تھا

کہ آخر تھا تو وہ اظہر

ہمیشہ کے لئے اظہر

امین راحت چغتائی

غبارِ غفلت
اظہر جاوید کی یاد میں

نہیں ہے کوئی مداوا غبارِ غفلت کا
کہ آنکھ اب بھی ہے بھرپور اُس کے منظر سے
ابھی تلک ہے سماعت میں گفتگو اُس کی
ہیں یاد اُس کے تبسم کی شوخیاں ساری
وہ سازِ نغمۂ ہستی کا استعارہ تھا

کبھی اُبھرتا تھا مظلوم کی صدا بن کر
کبھی کھلاتا تھا گلزار، چشمِ حیرت میں
وہ اپنی بزم کا خود ساقیٔ جہاں بیں تھا
ہر اک نظر کے تجسّس کو جھانک لیتا تھا
دلوں میں کیا ہے، بہت جلد بھانپ لیتا تھا
وہ زیرِ لب کے بیاں کا ہنر بھی رکھتا تھا

چھپا بھی لیتا تھا احوالِ دل سلیقے سے
کہ وصل و ہجر کا احساس خوب رکھتا تھا
کہیں سے پردۂ تحریر کُھل بھی جاتا تھا
کہ جذب و شوق میں آخر کو وہ بھی انساں تھا
جسے نہ دیکھ سکے ہم غبارِ غفلت میں
وہ کچھ نہاں بھی تھا راحت مگر عیاں بھی تھا

''جہانِ حادثہ از وضعِ من گرفت سبق[ا]
بقدرِ گردشِ رنگِ من آسماں گردید''

ا۔ بیدل

ناصر زیدی

قہقہہ بردار، خوش نَوا

اظؔہر تھا ایک صاحبِ دل، صاحبِ اَدا
دل ہی کے ہاتھوں ہم سے وہ یک دَم ہُوا جُدا

تخلیق اُس کے کارِ نمایاں کا نقش گر
برسوں پہ ہے محیط ادب کا یہ سلسلہ

اپنے اِداریوں کے وسیلے سے دہر میں
اُس نے شعور و فکر کا روشن کِیا دِیا

شاعر تھا اور مُدیر تھا وہ کتنا منفرد
وقت اور زمانہ خود ہی کرے گا یہ فیصلہ

فی الوقت تو خراجِ محبت ہے اس قدر
تھا دوستوں کا دوست وہ اک مَردِ باصفا

شامل تھا ابتدا ہی سے اُس کی سرشت میں
شعروادب کا ذوق، صحافت کا مشغلہ

تھا اُس کی محنتوں کا ثمر بھی برروئے کار
حق نے عطا کیا تھا اُسے ذہن بھی رَسا

مر کر بھی دے گیا وہ ہمیں زیست کا چلن
محفل کی جان، قہقہہ بردار، خوش نوا

ہے اُس کا نام زندۂ جاویؔد اِس لئے
ناصِر! وہ راست گوئی پہ قائم رہا سدا

اقبال گرامی (انڈیا)

تعزیتی غزل

اچھا ہُوا کہ بات بڑھا کر نہیں گیا
جاتے ہوئے وہ ہاتھ مِلا کر نہیں گیا

برسا تو خوب برسا گرج اور کڑک کے ساتھ
دل کا غبار دل میں چُھپا کر نہیں گیا

اُس صاعقہ مزاج کو عجلت تھی اس قدر
نام و پتہ تک اپنا بتا کر نہیں گیا

وہ جانتا تھا ضِد ہوں میں اُس کی اسی لئے
دیوار درمیاں کی گرا کر نہیں گیا

اقبالؔ اگر ہے کوئی شکایت تو بس یہ ہے
جھونکا ہَوا کا پھول کِھلا کر نہیں گیا!

انور سدید

اظہر جاوید کی یاد میں

اظہرؔ دیئے وفا کے جلا کر چلا گیا
نقشہ خلوص کا وہ بنا کر چلا گیا

تابندگی بکھیر رہا تھا وہ کل کی شام
اور آج اپنی شمع بجھا کر چلا گیا

اظہرؔ تھا اس کا سابقہ، جاوید لاحقہ
دونوں کا خوب جادو جگا کر چلا گیا

وہ دل کے خوں سے اپنے خیالات لکھ گیا
رومانوی غزل وہ سنا کر چلا گیا

سرگودھا سے چلا تو وہ لاہور آ گیا
اور یاں ''ادب تماشا'' دکھا کر چلا گیا

گلدستۂ حیات میں دلکش جو پھول تھے
''تخلیق'' میں وہ پھول سجا کر چلا گیا

وہ سلطنتِ دل کا تھا بے تاج بادشاہ
وہ محفلِ حیات سجا کر چلا گیا

کہتا تھا اپنی بات وہ ڈنکے کی چوٹ پر
نکتے نئے نئے وہ اٹھا کر چلا گیا

اپنے مزاج میں وہ کنہیا صفات تھا
مانند شمع خود کو جلا کر چلا گیا

''تخلیق'' اس کا ''تختِ سلیماں'' کی مثل تھا
''سونان'' کو وہ اس پہ بٹھا کر چلا گیا

اس کا وجود محفلوں کی آن بان تھا
وہ محفلوں میں جوت جگا کر چلا گیا

وہ بھی تھا اس جہان میں ''اک بے نوا فقیر''
وہ بھی خودی کے گیت سنا کر چلا گیا

دربار اس کا خوب سجا گوپیوں سے تھا
وہ اپنی گوپیوں کو رُلا کر چلا گیا

انورؔ سدید ڈھونڈ اسے آسماں سے دور
وہ اس زمیں کا قصر گر کر چلا گیا

انور سدید

ادب کنہیّا

خلوص و مہر کا پیکر تھا اظہر جاوید
ادب کا مرکز و محور تھا اظہر جاوید

اگرچہ عمر بسر کی تھی عجز سے اس نے
مگر خودی کا بھی مظہر تھا اظہر جاوید

کمال نظم نگاری میں اس کو حاصل تھا
غزل کا ماہِ منور تھا اظہر جاوید

فروغِ علم و ادب اس کا شوقِ اولیٰ تھا
جمالِ فن کا شناور تھا اظہر جاوید

ہے ترجمان ادب کا جریدۂ ''تخلیق''
اور اس کا بانی و مصدر تھا اظہر جاوید

نئے نکات اٹھاتا تھا ''اپنی بات'' میں وہ
کہ فِکر نو کا سمندر تھا اظہر جاوید

جو مہ جبین تھے، لیتے تھے عشق کی خیرات
کہ ایک شجرِ ثمرور تھا اظہر جاوید

جھمیلے اس نے بھی دیکھے تھے زندگی میں مگر
غمِ حیات کا خوگر تھا اظہر جاوید

سکھائیں اس نے قلم کاریاں حسینوں کو
کہ ادب و فن کا ، ہنرور تھا اظہر جاوید

وہ دے رہا تھا چراغوں کو روشنی اپنی
نئے ادیبوں کا رہبر تھا اظہر جاوید

وجود اس کا کنہیا مثال تھا انورؔ
وہ گوپیوں کا مہندر تھا اظہر جاوید

سلیم آغا قزلباش

عجیب سلسلہ ہے یہ!

(اظہر جاوید کی یاد میں)

رُوح
جیسے ایک آزاد پنچھی
بدن کی شاخ پر
چند ساعتیں گزارتا ہے
اپنی سانسوں میں پروئے گیت
گاتا ہے، چہچہاتا ہے
مگر پھر کسی انجان ساعت میں
اچانک، اپنے پر کھول کر
اجنبی دنیا کی طرف پرواز کر جاتا ہے
شاخ، ٹوٹ کر
زمین کا رزق بن جاتی ہے
اور پھر کوئی نیا پنچھی
کسی اور شاخ پر آ بیٹھتا ہے
ازل سے، یہ سلسلہ جاری ہے
نہ جانے کب تک
یوں ہی جاری رہے گا
شاید اَبد تک
مگر اَبد کس نے دیکھی ہے!

یونس جاوید

جی اظہر

شام اک موت ہے، مر جاتا ہوں
صبح اُمید ہے، جی اُٹھتا ہوں
کوئی ہر روز تو مر کر سوئے
کوئی ہر روز تو جی کر اُٹھے
وہ جو تازہ تھی بہاروں سی، ترے ساتھ گُندھی
زندگی، راکھ کے اک ڈھیر کی چنگاری ہے
کوئی سُلگائے اِسے، کوئی بجھادے آ کر
کچھ نہیں اگر، مرے رانجھن کو بتادے جا کر
کون ہے جو مرا اپنا ہی پرایا بھی ہو
اور کچھ ہو نہ اگر، تجھ سا ہو، اظہر سا ہو!!

دل نواز دل

تخلیق کار

(اظہر جاوید کی نذر دردِ دل سے کہی گئی ایک نظم)

شمس ظہر اور قمر جاوید ہیں کیا
جام جَم میں آئینۂ جمشید ہیں کیا!

راز سب تخلیق کے وہ جانتا تھا
لَوح واقف تھی قلم کے بَھید ہیں کیا

وہ صحافت اور ادب کی چھانی تھا
تھا اسے معلوم ان میں چھید ہیں کیا

نثر کے سب راز تھے اس کی نظر میں
وہ تھا واقف شاعری کے بھید ہیں کیا

تنگ تھی بھگوان کی سٹریٹ لیکن
آ گہی تھی اس کو، چاروں وَید ہیں کیا

اس کو لے ڈوبے گا اک دن دلّ اسی کا
بول تَو، ''امروز'' فردا! وَید ہیں کیا!

صفدر سلیم سیال

اظہر جاوید کی یاد میں

وہ ایک رسم شگفتہ خرام چھوڑ گیا
وہ کیسے کیسے حسیں زیرِ دام چھوڑ گیا

رہیں گی تازہ بہ تازہ حکایتیں اُس کی
وہ رسم و راہ کا ایسا نظام چھوڑا گیا

حسد سے داد نہ دے کوئی پر حقیقت ہے
بساط شعر و سخن میں وہ نام چھوڑ گیا

رہیں گی یاد ہمیشہ مروّتیں اس کی
ہر ایک دل میں وہ اپنا مقام چھوڑ گیا

تمام عمر ترے ساتھ ہمسفر وہ رہا
شب فراق تجھے بے مرام چھوڑ گیا

رہے گا یاد ہمیشہ وہ اس کا حُسنِ سلوک
قلندروں کی صفوں میں مقام چھوڑ گیا

نمود و نام کی خواہش نہیں تھی اس کو سلیم
مگر وہ برسرِ ایّام کام چھوڑ گیا

وصی شاہ

بھول سکتا ہے انہیں کوئی بھی ایسے کیسے
رفتگاں دل میں بسا کرتے ہیں کیسے کیسے

وہ تو انمول ہے نایاب ہے اکلوتا ہے
اس کی تشبیہہ کریں ہم کسی شے سے کیسے

زندگی سے تجھے بے دخل تو کر دیں جاناں
پر تُو نکلے بھی تو نکلے رگ و پے سے کیسے

جان لے کر بھی اگر خوش نہیں ہونے والا
کوئی بتلائے وہ پھر مانے گا ویسے کیسے

یہ مِرے یار کی آنکھوں میں رہا کرتی تھی
پوچھیئے کچھ نہ ہوئی دوستی مے سے کیسے

ہنستے ہنستے وہ جدائی کو بھی سہہ جائے گا
زندہ رہ پائیں گے لیکن مِرے جیسے کیسے؟

زندگی یہ تری رفتار عجب طرز کی ہے
چلنا چاہیں تو چلیں ہم تری لے سے کیسے

قلقلِ مے کی طرح بہنے لگا خونابہ
نغمے نکلے ہیں تِرے درد کی نے سے کیسے

ہم سے کہتے ہیں بُھلا دیں تمہیں دیکھو تو وصی
مشورے ہم کو مِلا کرتے ہیں کیسے کیسے

شِبہ طراز

غزل

(اظہر انکل کے لئے)

روئے قرطاسِ ادب پھول کھلانے والو
روشنی بجھنے نہ دو شمع جلانے والو

دوستوں نے کبھی تنہا مجھے ہونے نہ دیا
شکریہ شکریہ! اے ساتھ نبھانے والو

عشق کے رنگ میں رنگتے ہیں تو سب ملتا ہے
عشق کا گھونٹ بھرو پینے پلانے والو

آخری سانس تلک پاسِ ادب مجھ کو رہا
یہ ہے جاگیر مری لکھنے لکھانے والو

سُرخ رنگ اوڑھ کے جاتے مسافر نے کہا
الوداع شام و سحر رستے سجانے والو

موت بھی آئی مرے زخموں پہ مرہم رکھنے
کوئی الزام نہ دے دینا زمانے والو

میں تو ہنستے ہوئے دنیا سے چلا آیا ہوں
خوش رہو تم بھی مرا سوگ منانے والو

بسمل صابری

بیادِ اظہر جاوید

ہمارے عہد کا اِک دیدہ ور چلا ہی گیا
وہ پُرخلوص سا انساں مگر چلا ہی گیا

قیام کب ہے زمانے میں عمر بھر کے لئے
رہِ حیات کا اِک ہمسفر چلا ہی گیا

بنا جو درد کا درمان غم کے ماروں کا
ہوا کے دوش پہ تھا جلوہ گر، چلا ہی گیا

کبھی نصیب کے ماروں کا بھی اُجالا ہو
اُسی کی یاد میں دامن ہے تر، چلا ہی گیا

خود اپنے ہاتھوں سے بو کر وہ پیار کی فصلیں
دیئے جلا کے سرِ رہگذر چلا ہی گیا

جو دُھوپ میں بھی رہا سب پہ سائباں کی طرح
وہ چھاؤں بن کے جیا، اِک شجر چلا ہی گیا

سُخن شناس جو بھٹکا تھا زندگی کے لئے
فلک سے آگے جہاں میں مگر چلا ہی گیا

سُنا کے آخری نغمات ساری دُنیا کو
ہمارے دور کا اک نغمہ گر چلا ہی گیا

مریضِ عشق کے آنگن میں زندگی بن کر
لئے وفا کا بھرم عُمر بھر چلا ہی گیا

اُسی کے شیریں سُخن سے مشامِ جاں مہکے
وہ خوش خصال سا اِک باخبر چلا ہی گیا

رُخِ حیات پہ رونق اُسی کے دم سے تھی
زمانے بھر کو دِکھا کر ہُنر چلا ہی گیا

خوداپنی ذات کی پیکار میں نہ بولتا تھا
وہ خامشی میں شرر تھا مگر چلا ہی گیا

شعورِ غم میں بھی فکرِ مآل رکھتا تھا
جہاں سے آیا تھا پھر وہ اُدھر چلا ہی گیا

مسافتوں کی تو چہرے پہ کوئی دُھول نہ تھی
بہت گراں تھا وہ آئینہ گر چلا ہی گیا

خبر رسان تھا پس منظروں کی دُنیا کا
وہ شہرِ جان، چراغِ سحر چلا ہی گیا

تھا اُس کو تیز ہواؤں کا سامنا بسملؔ
گلے لگا کے وہ برق و شرر، چلا ہی گیا

رشیدہ عیاں

''اظہر جاوید''
صنعتِ توشیح میں

ا — ایک انسان، کہ جو عظمتِ انسانی تھا
اپنے سینے میں لئے اِک دلِ نورانی تھا
ظ — ظلم اور جور و جفا سے وہ گریزاں ہی رہا
ظلمتیں دور ہوں، دن رات وہ کوشاں ہی رہا
ہ — ہمّت و جرأت و اخلاص کا پیکر تھا وہ شخص
ہمہ ایثار، ہمہ لطف کا پیکر تھا وہ شخص
ر — رفعتِ خُلق میں صوفی منش، اک ساحر تھا
راہِ پُرخار پہ چلنے میں، بہت ماہر تھا
ج — جو بھی امکان ہو خدمت کا نہ چھوڑا اس نے
جب کوئی کر لیا اقرار، نہ توڑا اس نے
ا — ایک درویش صفت، عارف و مشفق جاوید
اظہر و مظہرِ دانائی، محقق جاوید
و — وہ جو الطاف مجسّم تھا، جہاں چھوڑ گیا
وہ، جو اس گھر کا مکیں تھا، وہ مکاں چھوڑ گیا
ی — یوں تو دنیا میں بہت آئیں گے اور جائیں گے
یہی مشکل ہے کہ تجھ جیسا کہاں پائیں گے
د — دیکھ، دنیا تری فرقت میں ہے گریاں جاوید
دردِ دل دور ہو اس کا نہیں امکاں جاوید

صفدر صدیق رضی

اظہر جاوید کیلئے

جو محبت کو دے لباسِ وجود
دوستی کو وجودِ معنی دے
سارے ناتوں تمام رشتوں کی
اپنے کردار سے گواہی دے
دشمنوں سے رکھے جو دل آباد
دوستوں کیلئے وہ جاں بھی دے
حُسن سے عشق کی کرے درخواست
عاشقی کے حضور عرضی دے
حرف اور لفظ کو سرِ قرطاس
غنچہ وگل کی حُسن کاری دے
اس وسیع و عریض دنیا میں
وہ فقط ایک شخص کافی تھا
غمِ جاں، فکرِ دوستاں کے بعد
بے شک اُن کیلئے اضافی تھا
دوستداری کا مظہرِ جاوید

مظہر بخاری

اظہر تمھارے بعد......

بامِ اُفق پہ روشنی، رنگوں کے ساتھ ساتھ
وہ بے نیازِ غم سے محبت نواز تھا
جس کے ہُنر سے پھول وفاؤں کے عام تھے
جس نے کیا بہار میں خوشبو کو نغمہ ریز
جس سے ہر اِک حسین کے چہرے پہ رنگ تھا
جس نے عدو کو پیار کے تحفے تھما دیے
جس سے تھا دوستوں میں مرّوت، خلوص و مہر
جس کے سخن میں قوسِ قزح کے تھے سات رنگ

وہ ابرِ نو بہار کہاں کوچ کر گیا!
اُجڑا ہوا ہے ''شہرِ ادب'' دل فگار ہے
اظہرؔ تمھارے بعد ہر اک سوگوار ہے

اقبال راہی

ہدیہ عقیدت

(اس عہد کے انتہائی مقبول شاعر، ادیب، دانشور، صحافی جناب اظہر جاوید کے لئے)

ا　سے اظہر بہت ہی پیارا انساں تھا
تاروں اور چندا کی طرح فروزاں تھا
ظ　سے ظرف کی دولت تھی اُس کے دل میں
اُس کی عزت آج بھی ہے ہر محفل میں
ہ　سے ہادیٔ برحق کا تھا پیروکار
ہر انسان سے کرتا تھا وہ بے حد پیار
ر　سے راہ دکھائی اُس نے عظمت کی
دیواریں توڑی ہیں اُس نے نفرت کی
ج　سے جاوید اظہر فن کا دلدادہ
اُس کی طبیعت دلکش کو مل اور سادہ
ا　سے اپنے لئے نہ تھا جینا اُس کا
بڑا کشادہ رہتا تھا سینہ اُس کا
و　سے واقف تھا وہ اعلیٰ قدروں سے
اُس نے حاصل کیا اُجالا قدروں سے
ی　سے یاس کو پاس نہ آنے دیتا تھا
لفظوں کو موسم وہ سہانے دیتا تھا
د　سے داغ جدائی کا دے ڈالا ہے
چاروں جانب اُس کی یاد کا ہالہ ہے

اسلم حنیف

توشیح

اظہر جاوید کے نام

ا　اپنے احساس کی مجذوب صفت کرنوں سے
ظ　ظلمتِ شب کا
ہ　ہر اک حوصلہ تو نے کیا چاک
ر　روشنی جب ترے تخلیقی ادب کی پھیلی
ج　جگمگاتی ہوئی راہوں میں صدائیں گونجیں
ا　ایک درویش کہ نام اس کا ہے ''اظہر جاوید''
و　وہ کسی وقت بھی ہوتا نہیں غفلت کا شکار
ی　یعنی ہر وقت اسے رہتی ہے بس ایک ہی دھن
د　دامنِ اردو ادب کو میں کشادہ کردوں
(اپنے احساس کی مجذوب صفت کرنوں سے)

حمیرا راحت

اظہر جاوید کے لیے

ہوا کو شاید خبر نہیں ہے
چراغ جو اُس نے گل کیا ہے
وہ شب گزیدہ
اندھیری اور بے نُمو رتوں میں
اُجالے کی فصل بو رہا تھا
خود اُس کی قسمت میں
رات جیسے
سیاہ دکھ تھے
مگر وہ کرنیں تراشتا تھا
فگار ہاتھوں سے
پھول اوروں میں بانٹتا تھا
وہ دوسروں کی
خوشی میں خوش تھا
یہ موت بھی کتنی سنگ دل ہے
کہ جس نے دو ایسے ہاتھوں سے
روح کھینچ لی ہے
کہ جو قلم کا وقار تھے
اور حرف کا مان بن گئے تھے
ادب کی قسمت سنوارتے تھے
جو لفظ کی حرمتوں کے ضامن تھے
صدق کی گہری گھاٹیوں میں
شمع جلاتے ہوئے وہ دو ہاتھ
گر گئے ہیں
وجود اُس کا ہماری نظروں سے
گو کہ اوجھل ہوا ہے
لیکن
دلوں میں سچائی بن کے
اب بھی دھڑک رہا ہے

شبہ طراز

خوشیوں والا گھر

(اظہر انکل کے نام)

بڑی دیر کر دی
اُن خوشیوں نے آنے میں
جن کے انتظار میں آنکھیں جلتی رہیں
اور عشق کا غم سُلگتا رہا
سُلگتا رہا
صبح کی ملگجی روشنی میں
دبے پاؤں چلتی ہوا
اور رات کی تنہائی کی کُرلاہٹ
قدموں کے نشان ڈھونڈتی رہی
سانس کٹنے کی اذیّت
پلکیں جھپکائے بغیر
دہلیز تکتی رہی
فون کی گھنٹی
اور دروازے کی دستک
چونک کر ٹوٹ گئی
رات کا پچھلا پہر بھی ختم ہو چکا
سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہی
پارکوں میں بھی رش تھا
خزاں کے زرد پتے
ہری کونپلوں میں بدل گئے
حیرت ڈالیوں پر اُچھلتی رہی
اور خوشبو بانٹنے والا مسافر
بھری خوشبو کے موسم میں
پھولوں کی قبا اوڑھ کر ایسا سویا
کوئی سندیس
کوئی آواز سُنتا ہی نہیں
شاید
اُسے گھر لوٹنے میں
بڑی دیر ہو گئی......!!

خورشید احمر

آفتابِ صحافت۔اظہر جاوید

فروغِ لطف کا ساماں جناب اظہر تھے
ندیم شہر غزل خواں جناب اظہر تھے
قرار حلقۂ یاراں جناب اظہر تھے
سکونِ قلبِ پریشاں جناب اظہر تھے

رموزِ حکمت یوناں کے رازداں وہ تھے
جمالِ دانش ایراں کے نغمہ خواں وہ تھے
ستارہ و مہ و پرویں کے ہم عناں وہ تھے
مسافرانِ رہِ ارتقا کی جاں وہ تھے

وہ آفتابِ صحافت جو رزق خاک ہوا
ہر اک جریدۂ عالم کا سینہ چاک ہوا

سرفراز سیّد

اظہر جی!

اک قصہ ایسے پتّوں کا جو سبز رُتوں میں چاک ہوئے
اک نوحہ شہد کے چھتوں کا جو فصلِ گل میں خاک ہوئے

کچھ باتیں ایسے خوابوں کی جو بیچ نگر میں ٹوٹ گئے
کچھ یادیں ایسے ہاتھوں کی جو بیچ بھنور میں چھوٹ گئے

ہم دَشتِ طلب میں ٹھہر گئے تُم قریہ جاں کے پار گئے
یہ بازی جان کی بازی تھی تم جیت گئے ہم ہار گئے!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

اظہر جاوید کے نام

الصبح اظہر کا قافلہ
رُخ کرتا تھا صحافت کی طرف
اور سانجھ ڈھلے
واپس آتا تھا
شاعری کی گود میں
پرندوں کے جھنڈ کی طرح
قلم پر سوچ کا عنوان لئے!
اجنبیت کے ساتھ شروع ہوتا تھا دن
اور کٹتی تھی رات
ادھورے سنسنی خیز قصوں کے ساتھ
کنکریٹ سے دبی پگڈنڈی کی طرح!
گونگی رہ جاتی ہے
جیون کے قدموں کی چاپ
رفاقت کا سنہرا پھل پھیلائے
تم پارہ صفت تھے اظہر جاود!!

زمان کنجاہی

اظہر جاوید کی یاد میں

رات کو خواب کے گلستاں میں
یوں ہوا آ کے سرسراتی ہے
جس طرح روح میرے اظہر کی
گھر کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے

عمرانہ مشتاق

اظہر جاوید

خلوص و مہر کا پیکر تھا اظہرِ جاوید
ادب کا ماہ منوّر تھا اظہرِ جاوید
وفا شناس تھا وہ اور وفا پسند بھی تھا
وہ غم گسار تھا ہمدرد، درد مند بھی تھا
وہ دوستوں کے لئے چاہتوں کی ڈھال بھی تھا
وہ خود مثال تھا لیکن وہ بے مثال بھی تھا
زباں پہ اس کی شکایت کبھی نہیں آئی
کسی کی جھوٹی حکایت کبھی نہیں آئی
وہ مطمئن تھا، وہ سرشار تھا، وہ شاداں تھا
وہ اپنی دھن میں مگن پیار سے غزل خواں تھا
وہ بے غرض تھا مگر لوگ اُس سے جلتے تھے
جو فیض پاتے تھے، چہرے وہی بدلتے تھے
وہ بے ریا تھا، کوئی دل پر اُس کے داغ نہ تھا
وہ روشنی کا پیمبر تھا، بے چراغ نہ تھا
انا پسند تھا، دل میں نہ بغض رکھتا تھا
نہ انکسار کے مسلک سے پیچھے ہٹتا تھا
بہت سے لوگوں نے تحسین کی، سراہا اسے
جو خود پسند ہیں، اِن سب نے بھی تھا چاہا اُسے
میں بے نوا سہی ماؔنی مِرا یہ کہنا ہے
وہ شعر و علم و ادب کا حسین گہنا ہے

یونس صابر

اظہر جاوید کی یاد میں

اے اظہؔر جاوید میاں!
تجھ جیسا کوئی سجن کہاں

دیکھ کہ شہر لاہور ترا
تیرے بِنا، سُونا سُونا

راہ یہی، منزل ہے یہی
زیست کا بھی حاصل ہے یہی

چُپ سادھے ہے سدید انور
روئے ہے اردوداں گھر گھر

''اپنی بات'' بیاں اب بھی
ہوتی ہو گی وہاں اب بھی

کیا تیری بستی میں وہاں
سجتی ہے بزمِ ہم سُخناں

پڑھتا ہوں جب بھی خط تیرے
بولتے ہیں اب بھی خط تیرے

صابؔر اور کنولؔ تجھ کو
یاد کریں پل پل تجھ کو

آفتاب راجا

اظہر جاوید کی یاد میں

جاتے ہوئے احساسِ تعب چھوڑ گیا ہے
وہ ہم کو سرِ راہِ ادب چھوڑ گیا ہے

اِک عمر وہ محصور رہا کُنجِ صدف میں
دن ڈھونڈنے نکلا ہے وہ شب چھوڑ گیا ہے

تصویر اک اپنی مرے غم خانۂ دل میں
حیراں نگراں مُہر بلب چھوڑ گیا ہے

آباد گلستان محبت ہے ابھی تک
وہ یاد کا احساس عجب چھوڑ گیا ہے

وہ آج بھی رہتا ہے نہاں خانۂ دل میں
کب دور ہوا مجھ سے وہ کب چھوڑ گیا ہے

جانا تھا مجھے چھوڑ کے اُس کو تو سرِ بزم
وہ دے کے دلاسہ مجھے اب چھوڑ گیا ہے

وہ مستِ جنوں نکلا تہی دست جہاں سے
ترکے میں وہ صہبائے ادب چھوڑ گیا ہے

محمد ضیاء اللہ قریشی

اظہر جاوید سے عقیدت کا اظہار

فضائے شہرِ سخن سوگوار ہو گئی ہے
ترے بغیر اُدھوری بہار ہو گئی ہے

کچھ ایسا گھیر لیا یادِ رفتگاں نے ہمیں
ہماری زندگی بس انتظار ہو گئی ہے

اک اور شخص امر ہو گیا ہے لفظوں میں
اجل یہ دیکھ تجھے پھر سے ہار ہو گئی ہے

خوشی کے راستے پھر زیرِ آب آ گئے ہیں
کہ غم کی جھیل ضیاء بے کنار ہو گئی ہے

تمھاری یاد کی خوشبو سمیٹتے اظہر
یہ میری نظم بھی اک شاہکار ہو گئی ہے

رومانہ رومی

نذرِ اظہر جاوید

نام جن کا ہے اظہرؔ جاوید
کس قدر خوش بیان تھے بے شک
بولتے تھے وہ صبح کی صورت
روشنی کی زبان تھے بے شک

کیا اُنھیں ہم سے کچھ شکایت تھی
ہم سے وہ کیوں بچھڑ گئے آخر
تھے وہ شاعر ادیب اِک اعلیٰ
اس میں کیا شک ادب کے تھے ماہر

جو رسالہ تھا ان کا اک تخلیق
ہے گواہی وہ اُن کی محنت کی
اُن کا ایک ایک لفظ روشن تھا
بات کرتے تھے وہ صداقت کی

وہ بہت ہم کو یاد آئیں گے
عشق گہرا ادب سے تھا اُن کو
عمر بھر روشنی ہی پھیلائی
پیار ایسا ادب سے تھا اُن کو

کیسے بھولوں تمھیں اظہرؔ جاوید
آپ انسان تھے خلیق بڑے
رومی رطبِ اللسان رہے گی مدام
آپ انسان تھے شفیق بڑے

نسرین نکہت سبزواری

اظہر جاوید کی یاد میں

وقتِ سحر جو آج چمن جا کے دیکھیے
ہر گُل کی آنکھ نم ہے، ہر اک برگ اشک بار
پھولوں نے غم سے چاک گریبان کر دیئے
ماتم کناں ہے بادِ سحر، چرخِ دل فگار
ویران ہو گیا ہے گلستاں ترے بغیر
اب کون ہے جو بزم کو رنگین کر سکے
شعر و ادب کو دے سکے اک رنگِ تازگی
اک یاد رہ گئی ہے کہ ہے باعثِ سکوں
ورنہ تو زندگی میں نہیں رنگِ زندگی
محفل ہے آج شامِ غریباں ترے بغیر

زمان کنجاہی

وفا کا پیکر

میرے دل کے آنگن میں
ایک پھول ایسا ہے
روز جس کی خوشبو سے
بام و در مہکتے ہیں
روز جس کے چہرے سے
چاند مسکراتا ہے
میرے دل کے آنگن میں
روشنی اُترتی ہے
اور میری آنکھوں میں
پیار بن کے رہتا ہے
نام اُس کا اظہرؔ ہے
وہ وفا کا پیکر ہے

اظہر جاوید

فن، شخصیت اور تاثّرات

(غیر ملکی مصنفّین کی نظر میں)

عمر ساری بے بسی میں کٹ گئی تو یہ کھلا
اس جہاں میں چاہتیں ملتی ہیں تھوڑی دیر کو

اظہر جاوید

CamScanner

لاہور سنسان......خالی پاکستان

نیّر جہاں، امریکا

اظہر جاوید کے بارے میں تعزیتی طور پر کچھ لکھنا ہے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی ایسا بھی دن آئے گا جب مجھے اس طرح کی کسی تحریر کے لئے لفظ اور واقعات ڈھونڈنے ہوں گے۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا تھا۔''سنو اظہر! میں مروں گی تو تم ''تخلیق'' کا میرا خاص نمبر نکالو گے؟ ایک شاندار تقریب کرو گے اور ساری دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرو گے کہ ایک بہت عظیم ہستی ادبی دنیا کو سونا کر کے چلی گئی''۔ نہایت جھلّائے اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا''تم کو شرم نہیں آتی کہ اب ذہانت صاحب کی کتاب آنے والی ہو گئی ہے۔ میں تمہاری کتابوں کے اشتہار چھاپتا ہوں تو لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔انہیں جواب دے دے کر اب مجھے شرم آنے لگی ہے لیکن تمہیں شرم نہیں آتی۔شرم کرو شرم''۔

میں شاید کبھی کچھ نہ لکھتی اگر اظہر کے تقاضے نہ ہوتے۔اس نے مجھے ادب کی قوس قزح سے اس وقت روشناس کرایا جب مجھے صرف پڑھنے سے دلچسپی تھی، لکھنے سے نہیں۔معلوم نہیں اس کا کون سا جملہ تھا جس نے مجھے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو لفظوں میں ڈھالنے پر آمادہ کیا۔

میں 1984ء میں لاہور گئی تو اظہر سے ملاقات ہوئی۔تب مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ اپنے اصولوں پر خاموشی سے قربان تو ہو جاتے ہیں لیکن اصولوں پر سودا نہیں کرتے۔جنرل ضیاء اپنی تمام تر سفاکی کے باوجود اظہر سے وہ نہیں لکھوا سکا جو آمروں کا مقصد حیات ہوتا ہے۔میرے دل میں اس صوفی منش انسان کی عزت اور بڑھ گئی۔

کبھی خط سے اور کبھی فون پر باتیں ہوتی رہیں۔اب سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اظہر سے میرا رشتہ کیسا پنچ رنگا تھا۔وہ میرا چھوٹا بھائی تھا اور دوست بھی۔بیٹا بھی تھا اور بزرگ بابا بھی۔وہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا اور ایک قد آور ناصح بھی۔اور بھی پتہ نہیں وہ کیا کیا تھا۔اب میں کس زاویئے سے اس کے بارے میں لکھوں؟

2010ء کے پاکستان کے دورے میں ہم جب تک لاہور میں رہے روزانہ بغیر سوچے ہوئے کہ اظہر کو اور بھی کوئی کام ہو سکتا ہے اس کے دفتر میں دن بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔بجلی چلی جاتی تو لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر ایک انتہائی بوڑھا

پنکھا وہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیتا جو انگلی کے سائز کی جلتی ہوئی موم بتی کی روشنی میں ہم سے بھی زیادہ بوڑھا نظر آتا اور ہم سے بھی زیادہ تھکا ہوا اور خفا خفا لگتا جسے جھلا جھلا کر میں جھلاّ جاتی اور سامنے رکھی میز پر پٹخ دیتی۔ اس پر وہ بڑے مغموم لہجے میں کہتا ''دیکھو یہ ہے زندگی ہماری''۔

میں اس کے بارے میں کیا لکھوں؟ میرے لئے تخلیق کا خاص نمبر نکالتے نکالتے اب وہ اپنا نمبر نکلوا رہا ہے۔ جلد باز کہیں کا۔

میں کیا لکھوں۔ وہ تو یہاں آنے والا تھا اور اب ایسی جگہ چلا گیا جہاں ہماری آواز بھی نہیں جا سکتی۔ وعدہ فراموش کہیں کا۔

میں کیا لکھوں۔ میری کتاب کی رسم پذیرائی کرتے کرتے اس نے نظریں پھیر لیں۔ بے وفا کہیں کا۔

میں کیا لکھوں کہ ہم کیا کیا سوچتے ہیں مگر ایک لمحے میں سب کچھ سوچا سمجھا، کیا دھرا خاک ہو جاتا ہے۔

رات کے تین بجے تھے جب مظفر حسین (الحمد پبلیکیشن) کی کال آئی کہ ذرا صفدر بھائی کو ان کے موبائل پر فون کر لیجئے۔ یہ پیغام بڑا عجیب سا لگا۔ فوراً ہی صفدر کو فون کیا تو وہ خبر ملی جس سے میرا دم گھٹنے لگا۔ آسمان دھڑ سے زمین پر گر پڑا۔ سمندر لہروں کے کلیجے پیٹنے لگا اور جیسے پوری دنیا عزا خانے میں ڈھل کر بے آواز ماتم کرنے لگی۔

میں لکھوں تو کیا لکھوں؟...... وہ بہت بڑا ادیب تھا۔ بہت بڑا شاعر تھا۔ بہت بے باک نثر نگار تھا۔ قیامت کا اصول پرست تھا۔ ذہین، صوفی مزاج، مکمل ایثار اور ٹوٹ کر محبت کرنے والا انسان تھا۔ مگر اب یہ سب لکھنا بیکار ہے۔ یہ تحریریں تو جیسے پانی پر لکھی جا رہی ہیں۔ جب وہ پڑھنے والا ہی نہیں رہا جو میری اس تحریر پر مجھ سے خوب لڑتا جھگڑتا...... تو اب ایک خاموش انسان، مٹی کے مادھو سے کیا بات کرنا۔

اظہر! یہ تو نے کیا کیا یہ جاتے وقت بھی ایسی خاموشی رکھی ''خدا حافظ'' کے دو بول بھی نہ کہے۔ آج آنکھیں ویران اور دل میں سنّاٹا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پورا لاہور ویران اور سارا پاکستان خالی ہو گیا۔

◆◆◆

احمد ندیم قاسمی

''میں خوشی سے اظہار کرتا ہوں، اظہر جاوید میرے ہم پیشہ، ہم مسلک اور ہم مرتبہ ہیں۔''

''اظہر جاوید'' ہمیشہ یاد آتے رہیں گے

نارنگ ساقی (انڈیا)

کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اظہر جاوید جیسا یارِ دلدار جس کے مزاج میں ایک قلندرانہ رکھ رکھاؤ، ٹھہراؤ، دھیما پن، نرم روی، ملائمت اور ہمیشہ فرصت و فراغت کی جھلک دکھائی دیتی تھی وہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یوں تو پچھلے دنوں انہوں نے اپنی پنجابی کہانیوں کا مجموعہ ''بڑی دیر کر دی'' شائع کیا تو میں نے تبصرہ نما مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا کہ منیر نیازی کی طرح آپ بھی ہر کام میں بڑی دیر کر دیتے ہیں، پتہ نہیں ہمیشہ دیر کر دینے والے ہمارے یار کو اس دنیا سے جانے کی ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ نہ احباب اور اقربا کو تیمارداری کا موقع دیا اور نہ ہم جیسے دور افتادہ دوستوں کو حال چال پوچھنے کی مہلت دی۔ فروری کا دوسرا ہفتہ اردو والوں کے لئے بہت بھاری رہا اور خاص کر میرے لئے تو بہت جان لیوا ثابت ہوا۔ کیونکہ اس عرصہ میں یکے بعد دیگرے پہلے میرے بزرگ دوست بلراج ورما کا انتقال ہوا۔ ابھی ان کی رسومات سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ ہمارے پرانے دوست شہریار کے اس دنیا سے جانے کی خبر آ گئی، ابھی اس دکھ سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ لاہور سے فون آ گیا کہ ہمارے یار دلدار اظہر جاوید ہمیں داغِ مفارقت دے گئے ابھی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے تو مظہر امام اور مغنی تبسم کے انتقال کی روح فرسا خبر آ گئی۔

کچھ عرصہ پہلے حکومتِ پاکستان نے اظہر جاوید کو Pride of Performance کا اعزاز دینے کا اعلان کیا اس خوشی نے مجھے نہال کر دیا تھا میں نے فوراً انہیں مطلع کیا کہ آپ کے ہندوستان آنے پر اردو اکیڈمی دہلی کے اشتراک سے آپ کو اعزاز ملنے کی خوشی میں تقریب کا اہتمام کیا جائے گا وہ اس بات سے بہت خوش ہوئے تھے اور ہندوستان آنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ یہ اعزاز انہیں 23 مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر دیا جانے والا تھا۔ تاہم اس اعلان کے ساتھ احباب نے ان کے اعزاز میں محفلیں منعقد کرنی شروع کر دی تھیں۔ میری اطلاع کے مطابق انتقال سے پہلے شام کو جم خانہ کلب لاہور میں شاہد علی خان مدیر 'الحمرا' کی ایک تقریب میں شامل تھے جو ڈاکٹر سعید درانی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ اس تقریب میں لاہور کی برگزیدہ ہستیوں نے شرکت کی۔ سب لوگ بتا رہے تھے کہ حسبِ معمول اظہر چہک رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ پارٹی میں شرکت کے بعد وہ رات دیر گئے گھر لوٹے۔ رات میں ایک بجے ان کی طبیعت اچانک خراب ہونے لگی۔ انہوں نے اپنے ڈاکٹر کو فون کیا، ڈاکٹر نے

فوراً ایک گولی کھانے کی ہدایت کی جس پر عمل کرنے کے بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ تاہم ڈاکٹر نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ صبح ضرور ہسپتال پر معائنے کے لئے آ جائیں۔ صبح وہ ذرا دیر سے اٹھے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہسپتال جانے کے لئے ٹیکسی منگوائی لیکن ٹیکسی آنے تک ان کے قلب پر زبردست حملہ ہوا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انتقال کے فوراً بعد جب سلطانہ منور کا لاہور ہسپتال سے میرے پاس فون آیا تو یوں لگا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ مجھے خود کو سنبھالنے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ اگر چہ وہ دل کے پرانے مریض تھے لیکن میرا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اظہر جاوید جیسا مخلص اور پیارا دوست اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

اظہر جاوید نہ صرف اچھے شاعر اور مدیر تھے بلکہ نثر نگار بھی بہت اچھے تھے۔ وہ سچے واقعات کو نہایت چابک دستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے کہ ان کی افسانہ نگاری کا قائل ہونا پڑتا۔ ابھی پچھلے دنوں ان کی پنجابی کہانیوں کی ایک کتاب ''بڑی دیر ہوگئی'' آئی تھی۔ اندازِ بیان اور طرزِ ادا کی خوبی ان کی کہانیوں کی خوبصورتی بھی ہے اور ان کی انفرادیت بھی۔ انہیں پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے جیسے آپ کہانی کی اس واردات قلبی سے بنفسِ نفیس گزر رہے ہیں۔ اظہر جاوید سے میرے 27 برس سے پرانے مراسم تھے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب اظہر جاوید 1985ء میں قتیل شفائی کے عقیدت مند اور نوجوان دوست کی حیثیت سے ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ان کے ہمراہ آئے تھے تو میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، قتیل شفائی سے میرے پرانے مراسم تھے، اظہر جاوید قتیل شفائی کے گہرے عقیدت مند تھے اور قتیل شفائی بھی اظہر جاوید کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے، بعد میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ قتیل شفائی کو اپنی فلمی مصروفیات کے سلسلے میں بار بار ہندوستان آنے کے مواقع ملتے رہے۔ یوں اظہر جاوید کا بھی ہندوستان آنا جانا بڑھتا چلا گیا۔ قتیل شفائی اکثر دہلی سے ممبئی چلے جاتے تھے اور اظہر جاوید کا زیادہ وقت دہلی میں میرے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں اظہر جاوید سے میرے مراسم کچھ ایسے استوار ہوئے کہ میں رفتہ رفتہ ان کی عادتوں، ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے معاملات دل سے بھی واقف ہوتا چلا گیا، ازراہ کرم انہوں نے مجھے ہندوستان میں اپنے رسالہ ''تخلیق'' کا نمائندہ بنا دیا۔ یوں میرا دفتر دہلی میں ان کے قیام کے دوران ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنتا چلا گیا۔ اکثر احباب ان سے ملاقات کے لئے میرے دفتر اور گھر پر آیا کرتے تھے یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ایک دفعہ شام کو دفتر سے ہم لوگ گھر پر پہنچے تو منہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد میں شام کے اہتمام میں لگ گیا۔ میں نے اپنے لئے وہسکی کا پیگ بنایا اور ان کے لئے کوکا کولا آ گیا، اتنے میں میرے ایک دوست تشریف لے آئے میں نے اپنے دوست سے ان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ پاکستان سے تشریف لائے ہیں۔

ان کے لئے گلاس منگوایا اور پیگ بنانا شروع کیا۔ اس پر وہ بولے ان کا پیگ بھی بنایئے اور جب میں نے بتایا کہ یہ شراب نہیں پیتے، وہ پہلے تو یہ سن کر حیران ہوئے اور پھر حیرت سے بولے پھر یہ پاکستان سے کیا لینے آئے ہیں؟ اسی طرح میں کبھی

لاہور جاتا تو اظہر جاوید بھی میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اکثر شیزان ہوٹل میں کوئی نہ کوئی محفل برپا کر دیتے۔ دیکھتے دیکھتے ہم دونوں کی دوستی وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم اور توانا ہوتی چلی گئی۔ اظہر جاوید اگرچہ کم آمیز اور لیے دیئے رہنے والی شخصیت کے مالک تھے مگر اپنے حسن سلوک کے ذریعہ اپنی محبتوں کی بارش برساتے رہتے تھے۔ احباب کی محفلوں میں جب بھی تیز مباحث ہوتے تو وہ عموماً خاموش تماشائی بن جاتے تھے مگر درمیان میں جب جب کوئی بات بول دیتے وہ نہایت نپی تلی، سلجھی ہوئی، سنجیدہ اور بردبار ہوا کرتی تھی۔ تخلیق کے شہرۂ آفاق اداریئے اور ان کی بے لاگ رائے، دوٹوک اندازِ بیان کے مظہر ہوا کرتے تھے۔

اظہر جاوید کے لئے شعر و ادب صرف اوڑھنا بچھونا ہی نہیں بلکہ آہیں بھرنا اور سانس لینا بھی تھا۔ ہندوستان کے اسفار کے دوران انہوں نے بیشتر ہندوستانی ادیبوں، شاعروں اور شاعرات سے اپنے دوستانہ تعلقات استوار رکھے اور ''تخلیق'' کے لئے قلمی تعاون حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ''تخلیق'' کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادیبوں کے درمیان تعلقات کو پروان چڑھانے میں ''تخلیق'' نے ایک ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔

پچھلے دنوں جناب نذیر فتح پوری صاحب نے اپنے رسالے ''اسباق'' میں گوشۂ اظہر جاوید شائع کیا جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اسے راقم نے مرتب کیا تھا۔ اظہر جاوید کا کمال تھا اور ان کا حوصلہ تھا کہ وہ پچھلے 42 برسوں سے ''تخلیق'' کو اسی شان اور آن بان کے ساتھ نکال رہے تھے۔ وہ نہایت منظّم، مربوط اور سلیقہ مند انسان تھے اور ادیبوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ وہ نئے نئے موضوعات پر اپنے اداریوں میں اظہارِ خیال کرتے جس پر بڑی فکر انگیز تحریریں اور خطوط ''تخلیق'' کو ملا کرتے تھے۔ ''تخلیق'' کا مستقل کالم ''انجمن خیال'' اس رسالہ کا سب سے مقبول کالم تھا۔ اظہر جاوید نے اپنے رسالہ میں یادنگاری، سفرناموں اور انٹرویوز کو ہمیشہ نمایاں طور پر شائع کیا۔ افسانے اور شعری تخلیقات بھی نہایت معیاری ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے اس طویل عرصہ میں بے شمار نئے لکھنے والے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان میں سے بعض اب ادب کے نہایت بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔ اظہر جاوید جیسے مخلص، مشفق اور مہربان دوست کا گزر جانا میرے لئے ایک سانحہ عظیم ہے۔

اظہر جاوید کی یاد میرے دل میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی ع

مدتوں رویا کریں گے کتنے دیوانے تیرے

◆◆◆

جگن ناتھ آزاد

''آپ نے تخلیق کی جو، جوت جلائی ہے، اس کی بہتیری روشنی انڈیا میں بھی پہنچتی ہے۔''

اظہر جاوید......اور میں

سید ذہانت حسین (امریکا)

سال 1997ء میں اظہر جاوید امریکہ میں مشاعروں کے سلسلے میں آئے تو آخری مشاعرے کے بعد وہ کچھ دن خصوصی طور پر لاس اینجلس میں ٹھہرے۔ اس قیام کے دوران ایک دن میری شامت جو آئی تو میں نے انہیں بتایا کہ اختر شیرانی اپنی زندگی کے آخری چند مہینوں میں میرے ''روم میٹ'' تھے۔ وہ اس طرح کہ وہ عرصہ لاہور میں حکیم نیر واسطی صاحب کے مہمان خانے میں ہم نے اکٹھے ہی گزارا۔ یہ ذکر کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی یہ گمان نہیں تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں یہ میرے لئے کتنے کٹھن اور آزمائشی مرحلے لے کر آئے گا۔ یہ سن کر اظہر تو اچھل پڑے اور اصرار کیا کہ میں ان چند مہینوں کی روداد لکھ کر انہیں دوں۔ میں ''ادب پسند'' تو ضرور تھا لیکن ادیب نہیں تھا۔ میرے لئے روداد لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس معاملے کو کسی طرح ٹال دیا جائے لیکن میری کوشش ناکام رہی۔ اظہر دھن کے بہت پکے نکلے۔ انہوں نے نیّر جہاں کو ساتھ ملا کر وہ آپ بیتی لکھنے پر مجھے مجبور کر ہی دیا۔ اور اس طرح اظہر جاوید کی قوت ارادی نے مجھے لکھنے پر ہی نہیں لگایا بلکہ باقاعدہ لکھنا سکھا دیا۔

پھر جب میں اور نیّر جہاں ریٹائر ہوئے اور دنیا کی سیر شروع کی تو اظہر جاوید مستقل طور پر مجھ سے سفر نامے لکھوا کر ''تخلیق'' میں چھاپتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر خط اور ٹیلیفون کے ذریعے میری حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔

انتقال سے تین دن پہلے بھی ان کا فون آیا تو مجھ سے کہا۔ ''شاہ جی! اب آپ کا اتنا میٹریل جمع ہوگیا ہے کہ آپ کی کتاب آنی چاہیے۔ اب آپ اس کی تیاری شروع کر دیں''۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے استاذ'' اس پر ہنس کر بولے۔ ''شکر ہے، آپ نے استاد جی نہیں کہا'' اور فوراً فون بند کر دیا۔ یہ ان کا خاص انداز تھا کہ وہ اختتامی کلمات کہے سنے بغیر ہی فون بند کر دیتے تھے۔

......اور پھر تین دن بعد رات گئے صفدر حسین (الحمد پبلیکشن) نے فون پر اطلاع دی کہ اظہر جاوید نہایت خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر سفر عدم پر روانہ ہو گئے ......یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں اور نیّر جہاں کتنی دیر تک خالی نظروں سے ایک دوسرے کو

دیکھتے رہے کہ تین دن پہلے کھنکھناتی آواز میں باتیں کرتا ہوا اظہر جاوید کیسے اتنی بے نیازی سے ہم سے منہ موڑ کر چلا گیا۔لیکن غالباً اپنے اچانک فون بند کرنے کے انداز کو اس نے اپنی ابدی جدائی میں بھی قائم رکھا۔میں سوچتا رہا کہ میں بیاسی سال کا ہوں۔ جانے کی باری تو میری تھی۔لیکن وہ ہمیشہ ہر کام میں پہل کرنے کی طرح اس دفعہ بھی پہل کر گیا......حق مغفرت کرے۔آمین۔

آج میں یہ چند سطریں لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اظہر جاوید کتنا ماہر بت تراش تھا کہ اس نے ساری زندگی میں مجھ جیسے کتنے لوگ تراش کر ادیب اور شاعر بنا ڈالے......!!

◆◆◆

کیول دھیر

''اظہر جاوید کے بغیر محبت کی کہانی ادھوری ہے۔اس کے بغیر کسی کہانی کا آغاز نہیں، انجام نہیں وہ محبت کی وادیوں کا شہزادہ ہے۔وہ سچ مچ ایک بڑا انسان ہے۔ادب تخلیق کرتا ہے۔ محبتیں تخلیق کرتا ہے۔محبتوں کی اس وادی کی بھگوان گلی کا باسی ہے۔انارکلی کی کہانی کا پاسبان ہے۔''

آہ! اظہر جاوید

مرتضیٰ برلاس

بے وقت کون آج جہاں سے چلا گیا
کس کی وجہ سے آج طبیعت اداس ہے
کیسی غزل 'کہاں کا فسانہ' کہاں کا گیت
شعر و ادب ہی کیا کہ صحافت اداس ہے

اگلی صفوں کا نکتہ چیں۔اظہر جاوید

کشمیری لال ذاکر (انڈیا)

جیسا کہ میں نے اپنے عزیز دوست شہریار کی وفات پر لکھے مضمون میں تحریر کیا ہے۔شہریار اور اظہر جاوید دونوں سے میری پہلی ملاقات ایک ہی دن ہوئی تھی۔میرا مطلب ہے، بہت برس پہلے، اُس دن (اب تاریخ اور سال مجھے یاد نہیں) جب میں نے ہریانہ اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ایک پاک و ہند مشاعرہ پی جی آئی کے خوبصورت آڈیٹوریم میں منعقد کیا تھا۔اُس زمانے میں ڈاکٹر بی این ایس آہلووالیہ پی جی آئی کے ڈائریکٹر تھے۔اُنہیں اُردو ادب، خاص طور پر اُردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔اس لئے مشاعرے کے انعقاد میں انہوں نے ہمیں بھرپور تعاون دیا تھا۔وہ مشاعرہ اس لئے بھی اہم تھا کہ اُس میں سردار جعفری اور کیفی اعظمی پہلی بار شریک ہوئے تھے۔پاکستان سے قتیل شفائی آئے تھے اور ان کے ساتھ آئے تھے اظہر جاوید اور بشریٰ اعجاز۔ ان دونوں سے میں پہلی بار ملا تھا۔اظہر جاوید جس محبت اور احترام کے ساتھ مجھے ملا اُس نے مجھے اس کا گرویدہ بنا لیا۔میں نے اُس کے میگزین ’’تخلیق‘‘ کو اپنا لیا اور اُس کے لئے لگاتار لکھتا رہا۔کہانیاں، قسط وار ناول، غزلیں اور مضامین۔

جب 14 رفروری 2012ء کو نارنگ ساقی نے ٹیلی فون پر اظہر جاوید کی موت کی خبر دی تو میں ایک دم سکتے میں آ گیا۔ اتنے برسوں کا طویل زمانہ ایک لمحہ میں سمٹ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا جیسے مجھ سے ہم کلام ہو۔

’’ذاکر صاحب آپ نے تو اپنے بیٹے کو صرف ایک بار ہی چنڈی گڑھ بلایا۔پھر تو کبھی یاد نہیں کیا اُسے۔‘‘

’’میں نے تو اُسے کئی بار چنڈی گڑھ آنے کی دعوت دی لیکن اُسے کبھی چنڈی گڑھ کا ویزا ہی نہیں ملا۔البتہ جب وہ دہلی آتا تھا میں اُسے ضرور مل لیا کرتا تھا وہ ہر بار میرے لئے لاہور سے کوئی نہ کوئی گفٹ لے کر آتا تھا۔

’’آپ کو معلوم ہے اب کئی برسوں سے وہ ہندوستان نہیں آیا۔‘‘

’’مجھے بھی اس سے یہی شکایت تھی۔‘‘

’’اظہر جاوید نے ’’تخلیق‘‘ کے ہر شمارے میں ’’اپنی بات‘‘ میں اہلِ وقار پر اُنگلی اُٹھائی تھی۔وہ اُس کی انگلی کاٹ دینا چاہتے تھے۔‘‘ آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ’’تخلیق‘‘ میں ’’اپنی بات‘‘ اور ’’انجمنِ خیال‘‘ کا سلسلہ بند کر دے گا۔اس کا اعلان اُس نے ’’تخلیق‘‘ کے جون 2009ء شمارے میں صفحہ 168 پر ’’آخری صفحہ‘‘ لکھ کر اعلان کر دیا تھا‘‘ اتفاق کی بات ہے کہ اسی شمارے

کے صفحہ 167 پر میرے قطعات کے مجموعے ''عکسِ رُخِ گُلبدن'' کا اشتہار بھی شامل ہے۔

''مجھے معلوم ہے۔ میں نے اُس کے اس اعلان کی مخالفت کی تھی اور اس پروٹیسٹ میں میرے ساتھ اظہر جاوید کے بہت سے چاہنے والے شامل ہو گئے تھے۔ اسی لئے تو اُس نے آخر ''اپنی بات'' اور ''انجمنِ خیال'' کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلی صفوں میں بیٹھے باوقار لوگ اُس کی نکتہ چینی سے بیزار ہو گئے تھے اور پاکستان سے باہر جانے کے دروازے اُس پر بند کر دیئے تھے۔

اظہر جاوید کے جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ پُل ہی ٹوٹ گیا ہے جس پر کبھی کبھی نارنگ ساقی، میں اور دو ایک دوسرے دوست کسی خوبصورت صبح کو ٹہلتے ٹہلتے لاہور پہنچ جایا کرتے تھے اور اظہر جاوید کو اُس کے ٹیلی فون 7230807 پر اطلاع دیتے تھے کہ ہم اُس کے دفتر پہنچ رہے ہیں۔ اور اظہر جاوید پھولوں کے ہار لئے ''تخلیق'' کے دفتر کے باہر اپنی دُھلی دُھلی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے بغل گیر ہونے کے لئے کھڑا ہوتا تھا۔

◆◆◆

بانو آپا (بانو قدسیہ)

''بھگوان سٹریٹ'' کا کرشن کنھیّا۔ اظہر جاوید، اب تک نہ جانے کتنی ادب کی گوپیوں کو نامور کر چکا ہے۔''

ش۔ صغیر ادیب (لندن)

''...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ ''تخلیق'' کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں اس دور میں جب کہ قدریں اور معیار بدلتے جا رہے ہیں، لوگ چمک دمک کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، ادبی رسالوں کا بُرا حال ہے۔ آپ کوئی کمرشل قسم کا فلمی رسالہ یا ڈائجسٹ شائع کرنے کے بجائے ادبی رسالہ نکال رہے ہیں۔ یہ کارنامہ نہیں تو اور کیا ہے؟ میری جانب سے اور اردو زبان سے محبت کرنے والے ہر فرد کی جانب سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

اظہر جاوید۔ میرا لاہور

ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا)

بڑی بڑی مملکتیں، بڑے بڑے شہر چوڑی چوڑی سڑکیں، لمبی لمبی گلیاں، اونچے بڑے، چھوٹے گھر کہنے کو سب اپنا وجود رکھتے ہیں۔ مگر انہیں یاد رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر حرف ایک محبت بھری ہستی کا حوالہ کافی ہوتا ہے۔ ایک آدمی کی محبت کبھی کبھار پورے دیس کی محبت کا کارن بن جاتی ہے۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے۔ لاہور مجھے لاہوریوں سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر پتہ نہیں پہلے کبھی مجھے یہ احساس ہوا تھا یا نہیں۔ اس محبت کی سب سے بڑی وجہ لاہور کی بھگوان سٹریٹ پرانی انارکلی کا کرشنا، میرا یار اظہر جاوید تھا۔

اظہر جاوید سے میری دوستی تیس پینتیس سال پرانی ہے۔ اسّی کی دہائی میں اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ وہ پہلی ملاقات میں کچھ ایسی تھی کہ پہلی نہ لگی۔ یوں لگا جیسے جنم جنم کا ساتھی ہو۔ بس ساتھ بن گیا۔ دوستی ہوگئی۔ پھر لاہور میرا اپنا شہر تھا۔ جب کبھی واہگہ باڈر پار کر کے لاہور پہنچتا تو اظہر جاوید کھلے بازوؤں میں یوں لپیٹ لیتا، جیسے جاڑے کے دنوں میں گرم اور نرم کمبل...... جتنے دن لاہور رہتا، اظہر جاوید کا دفتر ہماری باہمی محبت سے ہمکتا رہتا۔ اظہر جاوید کی شخصیت میں پیار ایسے ابلتا تھا۔ جیسے آگ پہ رکھی ہوئی پتیلی میں دودھ اجلا، پاوتر اور مہکتا ہوا نور اس کی آنکھوں میں پیار۔ اس کی باتوں میں پیار۔ اس کے روئیں روئیں میں پیار۔ وہ پیار کا بھگوان تھا......اسی لیے، بھگوان نے اسی اپنی گلی میں بسایا ہوا تھا۔

ایک بار اس کے دفتر پہنچ جاتا تو اس کے دفتر کے سارے معمولات الٹ پلٹ جاتے۔ وہ ٹیلیفون کے چونگے سے چمٹ کے بیٹھ جاتا۔ کبھی بشریٰ رحمان کا نمبر ڈائل کر رہا ہے......فون نہیں اٹھا رہی...... پارلیمنٹ میں ہوگی...... سیاست دان ہے۔ لو، یہ نمبر بول رہا ہے۔

بشریٰ رحمان کی جگہ بشریٰ اعجاز سے گزارا کرو۔ پھر نمبر گھماتا۔ لو آ گئے کیول دھیر...... بات کرو، مجھے فون پکڑاتے ہوئے سرگوشی میں کہتا۔ انور سدید ہیں۔ ان سے بات کر کے فارغ ہوتا تو پھر ایک نمبر گھما دیتا اور ہنستے ہوئے کہنے لگتا، حیرت ہے عقیل روبی آج اپنے گھر مل گیا...... تجھے بلا رہا ہے...... بات کرلو۔ جتنی دیر میں اس کے دفتر میں ہوتا، اس کا فون مصروف رہتا، یا تو وہ دوسروں کو میری آمد کی اطلاع دیتا رہتا یا میری ان سے بات کرواتا رہتا......لو بات کرو، فرحت نکل آئی ہے تیری

طرف......نہر کے پل سے ادھر مال روڈ پر مڑ گئی ہے۔ کہتی ہے بات کرنی ہے۔ صبر نہیں ہوتا۔ کرو بات۔ ادھر باتیں کرواتا رہتا۔ دوستوں کی منڈلی جمع کر لیتا۔ پھر آؤ بھگت میں جُت جاتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کے سامنے کی میز پہ لگاتا۔ چائے گرم کر کر کے پیالوں میں بھرتا۔ سموسے، کچوریاں، مٹھائیاں، پراٹھے۔ پتہ نہیں وہ اتنی ساری چیزیں، اتنے تھوڑے وقت میں کیسے منگوا لیتا تھا۔ پرانی انارکلی میں کھانے پینے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ایک دن ختائیوں سے بھرا مرتبان الماری سے نکال کے میرے سامنے میز پہ رکھ دیا...... میں نے ڈھکن کھول کے ایک ساتھ دو ختائیاں اٹھالیں......کھائیں تو مزہ آ گیا۔ پھر ڈھکن اٹھایا تو اظہر جاوید نے تڑپ کے میرے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بولا، تجھے شوگر ہے۔ احتیاط کر، میں نے جیب سے انسولین کے ٹیکے والی ڈبی نکال لی......کہا، انجکشن لگا تیار ہیں......مگر کھاؤں گا ضرور تیری ختائیاں۔ وہ مجھ سے چمٹ گیا...... بولا، ادھر دیکھ۔ الماری کے نچلے خانے کی طرف اشارہ کر کے بولا، یہ پیپا پورا ختائیوں کا ہے......تیرے لیے ہے، جاتے ہوئے لے جانا۔

ابھی تو، تو کہہ رہا تھا نہ کھا یار، شوگر کا مریض ہے، تو اِدھر بھی ٹیکہ لگا ادھر کھا لیا کرنا......مگر کھانا ضرور۔ اسے پتہ تھا مجھے لاہور کی ختائیاں پسند ہیں۔ میرے لیے مرتبان بھر بھر کے رکھتا۔ جو سبزی مجھے پسند ہوتی۔ وہ اٹھا کے لے آتا۔ کبھی کسی ہوٹل میں لے جا رہا ہے۔ کبھی کسی ریستورانت میں۔ ہر جگہ اس کے دوستوں کی محفل ہوتی۔ میں لاہور میں کیا جاتا، اظہر جاوید کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں جیسے طوفان آ جاتا۔ سارے شہر کے ادیب، شاعر اور نقاد وہ جمع کر لیتا۔ لوگ تو دن میں کسی کے ساتھ ایک آدھ شام مناتے ہیں، وہ میرے ساتھ صبح سے شام اور شام سے آدھی رات تک ہر لمحہ منانے میں لگا رہتا۔

ایک بار، میں نے اسے گلے سے لگا کے، پیار سے پوچھا، یار اظہر جاوید تو اتنا پیار کیوں کرتا ہے؟ ''اس لیے کہ تو لاہور آ تا رہے۔'' وہ ہنس کے بولا۔ آج جب وہ لاہور میں نہیں ہے۔ تو کوئی مجھے بتائے میں کیسے لاہور جاؤں؟

اسے مارچ میں میرے پاس لدھیانے آنا تھا۔

کچھ ایوارڈ دینے تھے، مشاعرہ تھا۔ کارڈ چھپوائے۔ اظہر جاوید کی تیسری شاندار تصویر چھپ کے آئی۔ میں ہر روز اسے فون کرتا۔ ویزا لگوا لیا؟

وہ کہتا میں لگا ہوا ہوں کوشش میں۔

میں اسلام آباد ابدال بیلا کو فون کرتا۔ اسے کہتا۔ یار......اظہر جاوید کو ساتھ لے کر آنا۔ مجھے اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ بس اظہر جاوید کا ڈر تھا کہیں یہ رہ نہ جائے۔ درویش منش ہے۔ کسی سے کہے گا نہیں۔ رہ نہ جائے۔ مجھے کیا پتا یہ کسی اور ہی سفر کے لیے سامان باندھے بیٹھا ہے۔ آنا میرے پاس تھا یہیں، چلا کہیں اور گیا۔

اس کی عقیدت مند سلطانہ کا فون آیا۔

فون کیا آیا......میرا تو خون جم گیا۔

دماغ ماؤف ہو گیا۔

اظہر جاوید؟

ابھی ایک دن پہلے میری اس سے بات ہوئی تھی۔

اس کی آواز تو بالکل توانا تھی!

اسے ہوا کیا؟

فون کرنے والی سلطانہ بھی رورو کے پگلی سی ہو رہی تھی۔اس سے کوئی تفصیل نہ کہی گئی۔

شام تک میں نے ادھر ادھر کئی فون کیئے۔

اسلام آباد ابدال بیلا کو فون کرتا۔اس کا فون بند ملتا۔شام کو اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

پہلے ہر فون پر میں اسے کہتا تھا، اظہر جاوید کو ساتھ لے کر آنا۔اس دن اظہر جاوید کا نام لیا تو ابدال بیلا بولا پاہ جی ،فکر نہ کریں۔اظہر جاوید کو لے کر آؤں گا انشاءاللہ

تجھے نہیں پتہ!

کیا؟

پھر میں نے اسے وہ کرب ناک خبر سنائی جو میں زندگی بھر نہ سنانا چاہتا تھا نہ سننا۔بس۔وہ بھی میری طرح کرچی کرچی ہو گیا۔سمجھ نہ آئے۔میں اسے دلاسا دوں یا وہ مجھے۔دونوں لہولہان ہو گئے۔

اظہر جاوید محبت کا برگد تھا۔

برگد کے نیچے بیٹا مروان پالینے والا بدھا تھا۔اس نے اپنے ادبی پرچے تخلیق سے آدھی صدی تک ادب کے باغ کی باغبانی کی۔ہزار ہا ادب کی کونپلیں اس کے اس تخلیق باغیچے سے ابھر کے پیڑ بنیں۔اس نے لوگوں کو بڑا بنایا۔خود کبھی بڑا نہیں بنا۔انسانی قدروں کی عظمت ہمیں اظہر جاوید کی شخصیت میں بھرپور اور مکمل نظر آتی ہے۔وہ ایک سفید پوش کم وسائل والا عظیم آدمی تھا۔جس نے ساری عمر اپنے آدرش کی خاطر نہ کبھی تھک کے سر جھکایا نہ اپنے اٹھائے ہوئے بھاری بوجھ سے تھکن محسوس کی۔تھوڑے وسائل سے وہ اپنی زندگی میں اتنا بڑا کام کر گیا کہ آج کل کی حکومتیں اپنے سارے لاؤلشکر کے ساتھ بھی ایسے کام نہیں کر سکتیں۔وہ تنہا آدمی اپنے آپ میں ایک بھرپور شہر تھا۔شہر بھی ایسا جسے لاہور یے لاہور کہتے ہیں۔وہ میرا لاہور تھا۔

اب میں سوچتا رہا۔میں پاکستان جانے کے لیے، واہگہ پار کر کے جس شہر میں جاؤں گا، اس کا کیا نام ہوگا۔میرا شہر لاہور تو اظہر جاوید کا لاہور ہے۔

خدا میرے یار کے لاہور کو آباد رکھے۔

میرے لیے اب سارا لاہور اظہر جاوید ہے۔مگر یہ میں جانتا ہوں کہ اب لاہور آیا، تو میں کس قدر تنہا ہوں گا۔ایسا تنہا جیسے مکین کے بغیر مکان۔میرا بھگوان، میرا رب میرے بھگوان سٹریٹ کے کرشنا کو جہاں بھی رکھے، اسے پیار سے رکھے، جیسے وہ اپنے دوستوں کو رکھتا تھا۔ختائیوں سے بھرے مرتبان کے ساتھ۔

◆◆◆

کبھی آپ اپنی مثال تھا، وہ نہیں رہا

تاشی ظہیر (امریکا)

غالباً 2009ء کی بات ہے۔ میں ''تخلیق'' کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ بات چل نکلی میری بیماری کی۔ میں نے کہا ''شاہ جی! (ہم ایک دوسرے کو ''شاہ جی'' کہہ کر بلاتے تھے) لگتا ہے اپنا بھی بلاوا آنے والا ہے اوپر سے۔ کچھ دنوں کے لئے طبیعت سنبھلتی ہے اور پھر وہی بیماریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔''

اظہر بھائی نے میری طرف دیکھا اور اپنے خاص انداز میں بولے ''یار، اِک تے میں تیرے کولوں بڑا تنگ ہیگاں۔ تینوں نہ تے یاراں دا کوئی خیال اے، نا ناہید (میری بیوی) دا، تینوں کوئی خیال اے۔ جدوں دیکھو ''بے فضول'' جئی گلاں کری جانداں ایں۔''

یہ کہہ کر ایک ڈاک کے لفافے کی پشت پر کچھ لکھا اور میری طرف بڑھا دیا۔ لفافے پر لکھا تھا:

بسم اللہ

آج کے بعد عشرتِ مجلسِ شامِ غم کہاں
دل نہ لگے گا تیرے بعد، پھر ترے بعد ہم کہاں

جون ایلیا

میرے پیارے اظہر بھائی! دو عدد ہارٹ اٹیکس اور اُن سے بڑھ کر آپ کے چلے جانے کا صدمہ...... میں زندہ ہوں، اور اپنی سخت جانی پر شرمندہ ہوں۔ راجہ اسد صاحب نے Email بھیجی کہ اظہر جاوید گزر گئے۔ لاس اینجلس سے نیّر جہاں صاحبہ کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے بھی یہی پیغام چھوڑا۔ سونان سے متعدد بار گفتگو ہو چکی ہے۔ سونان اپنے والد کا سیل فون استعمال کر رہے ہیں۔ فون آتا ہے تو اظہر جاوید کا نام دیکھ کر عجب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اُن کی وفات کے دو ہفتے بعد اُن کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایڈریس کے ساتھ ''تخلیق'' ملا۔ لفافہ کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا بس ایڈریس ہی دیکھتا رہا۔ عجب یقین اور بے یقینی کا عالم ہے۔ یوں لگتا ہے کبھی کبھی کہ بس اُن کا فون آ جائے گا اور کہیں گے ''میں تے مذاق کر ریا ساں تیرے نال، اجے میرا مَرن وَرن دا کوئی ارادہ نئیں۔''

1978ء میں امریکہ ہجرت کر جانے کے بعد، اظہر بھائی سے میری پہلی ملاقات ''تخلیق'' کے دفتر میں دسمبر 2000ء

میں ہوئی تھی۔ 1999ء میں جب خرابیِ صحت کی وجہ سے میں نے Citi Bank کو خیر باد کہا تو کچھ دیر کو سکون سے سانس لینے کا موقع ملا۔ اسی دوران عزیز ترین دوست فیاض الدین نے بھی اظہر جاوید صاحب اور ''تخلیق'' کے بارے میں بتایا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ فیاض کی بات سُن کر کہ آج کی دنیا میں ایک شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ میرے دل میں اظہر جاوید سے ملاقات کا شدید اشتیاق پیدا ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میں ذاتی طور پر ایسے عظیم شخص کی خدمت میں حاضر ہو کر خراجِ تحسین پیش کروں۔ میرے کہنے پر فیاض الدین نے اظہر جاوید صاحب کے نام میرے لئے ایک تعارفی خط لکھ کر اُنہیں ارسال کر دیا۔

جب میں لاہور پہنچا تو دوسرے روز ڈھونڈتا ڈھانڈتا ''تخلیق'' کے دفتر پہنچا۔ میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ایک ایسی شکل نظر آئی جس کا عکس میرے لاشعور میں کہیں تھا۔ اظہر بھائی نے میری طرف دیکھا اور سوالیہ لہجے میں میرا نام لیا ''تاشی''؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کرسی سے اُٹھے اور بڑے پیار سے گلے لگایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تینوں پتہ اے میں تینوں کس طرح پچھانیاں اے''؟

میں نے پوچھا، کیسے؟ تو انہوں نے کہا ''تیری اکھاں توں!''

یہ سنتے ہی مجھ پہ تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا اور میں اپنی وہ تقریر بھول گیا جو سوچتا ہوا میں ''تخلیق'' کے دفتر تک پہنچا تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ تھوڑی دیر میں برادرِ محترم جناب اصغر مہدی بھی تشریف لے آئے اور یوں دفتر کی فضا محبتوں سے معمور ہو گئی۔

اس ملاقات کے بعد مزید ملاقاتیں رہیں۔ فون پر گفتگو رہتی، خطوط کا تبادلہ ہوا اور اس تمام عرصے میں اپنی یادداشت کو کوستا رہا کہ ایک شریف انسان اور ''بڑا آدمی'' جو نہ صرف مجھے اچھی طرح جانتا ہے بلکہ میرے باپ دادا کو بھی، میرے مرحوم بڑے بھائی کو، حتیٰ کہ میری بیگم کی والدہ کو بھی بخوبی جانتا ہے۔ اور اس بات سے بھی واقف ہے کہ کالج کے زمانے میں، میں نے اپنی خوشدامن، کلثوم رحمٰن صاحبہ کے رسالے ''نور و نار'' کی ادارت بھی کی ہے۔ آخر میرے حافظے پر کون سی بجلی گری ہے کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں سوائے اس کے کہ ان کا چہرہ پہلی بار ہی بہت مانوس لگا تھا۔

2009ء میں ہماری آخری ملاقات میں اظہر بھائی نے آخر میرا مسئلہ حل کر دیا۔ بھائی جان (انوار انجم) 1963ء۔ 1964ء میں اورینٹل کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ میں ملتان سے اکثر آیا کرتا تھا اُن سے ملنے اور اکثر کئی ہفتے اُن کے پاس ٹھہر جایا کرتا تھا۔ اُسی دوران اظہر بھائی سے ملاقاتیں رہیں۔ 1963ء میں میں سولہ برس کا تھا۔ انجم بھائی مجھ سے چھ سال بڑے تھے اور اظہر بھائی پانچ سال۔

اُن کے دل کی طرح، اظہر بھائی کا حلقۂ احباب بھی بہت بڑا تھا۔ صحافتی رشتے، سیاسی رشتے، ادبی رشتے، خونی رشتے اور سب سے بڑھ کر انسانی رشتے۔ میرا بھی اُن کے ساتھ انسانی رشتہ تھا۔ چونکہ عمر میں وہ مجھ سے بڑے تھے اس لیے انتہائی قربت اور بے تکلفی کے باوجود ہمارے درمیان تہذیب کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔

ایک زمانہ یہ بات جانتا ہے کہ اُردو ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی ترویج و ترقی کے لئے اظہر بھائی نے زندگی بھر جس

قدر محنت کی ہے، ایسی مثالیں کم کم ہی ملتی ہیں لیکن نام ونمود سے جس قدر دور وہ بھاگتے تھے اُس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اُن کے تقریباً تمام دوستوں نے (جن میں شمولیت کا اعزاز مجھے بھی ہے) بار باراُن سے درخواست کی کہ اپنا کلام "تخلیق" میں ضرور شامل کیا کریں لیکن انہوں نے یہ بات کبھی نہیں مانی۔ زندگی بھر خودنمائی جیسی بیماری کوانہوں نے کبھی اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیا۔ کتنے لوگوں کواظہر جاویداور "تخلیق" نے نامور کیا۔ دور کیوں جائیں، میری اپنی مثال سامنے ہے۔ یہ نہیں کہ میں مشہور ہوں کسی بھی اعتبار سے۔ لیکن امریکہ جا کر پورے 25 برس میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اظہر بھائی نے ضد کر کر کے مجھے دوبارہ لکھنے پر مجبور کیا اور پھر "تخلیق" کے لئے فرمائش کرتے تھے۔

اظہر بھائی کا ہاتھ دینے والا ہاتھ تھا لینے والا ہاتھ نہیں تھا۔ خوددار، غیرت منداور عزت نفس رکھنے والا یہ انسان عمر بھر ہر ایک کے دُکھ درد کا ساتھی رہا، اپنے اردگرد مسکراہٹیں بکھیرتا رہا اور اپنے غم بھول کر دوسروں کے دُکھوں پر آنسو بہاتا رہا۔ کسی کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو اظہر جاوید نے ظالم کے خلاف آواز اُٹھائی لیکن اپنے لئے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ کڑے سے کڑا وقت آنے پر بھی اظہر بھائی نے کبھی اپنے دوستوں کو آزمائش میں نہیں ڈالا۔

ایثاراور ہمدردی جیسے عظیم جذبوں کی دولت سے مالا مال یہ شخص تمام عمر محبتیں لٹاتا رہا۔ دوسروں کی کامیابیوں پر خوشیاں مناتا رہا۔ گمنام ادیبوں اور شاعروں کے گلوں میں شہرتوں کے تعویز باندھتا رہا۔ یہی لوگ مشہور بھی ہوئے، اربابِ اختیار واقتدار بھی ہوئے لیکن اظہر جاوید نے کبھی کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ یہی اُس کی عظمت ہے اور یہی اُس کی بڑائی ہے اور اُس کی یہی ادااس کو اتنا بڑاانسان بناتی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

2005ء میں، میں نے انہیں امریکہ آنے کی دعوت دی۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں کے لوگ دیکھیں کہ کیسے ایک انسان نے چالیس برس سے "تخلیق" کی صورت میں اُردوادب کا چراغ روشن رکھا ہوا ہے۔ کسی امداد کے بغیر، ایسے ماحول میں ایک خالصتاً ادبی جریدہ نکالنا اس تواتر کے ساتھ کسی بھی طور ایک معجزے سے کم نہیں۔ مشکل سے امریکہ آنے کے لئے رضامند ہوئے۔

اُن کے ساتھ ایک شاندار تقریب سان فرانسسکو میں منائی گئی، اُردواکیڈیمی شمالی امریکہ کے زیراہتمام۔ لاس اینجلس میں نیّر جہاں صاحبہ نے اُن کے شعری مجموعے "غمِ عشق گر نہ ہوتا" کی تقریبِ رونمائی کی اور ایوارڈ دیا۔ ایری زونا میں عزیزی فیاض الدین صاحب نے "بزمِ سخن" ایری زونا کے زیرِ اہتمام کتاب کی رونمائی کی اور اُن کی خدمات کے اعتراف میں مقالے پڑھے گئے۔ شمالی کیلی فورنیا میں "پنجابی ساہت سبھا" نے بھی اظہر بھائی کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ اظہر بھائی نے یہاں جو پنجابی کلام پڑھا اُس کی کاپی میں ارسال کررہا ہوں۔ ممکن ہے یہ سب کچھ انہوں نے یہاں پر بھی لکھا ہو۔

میری خوش قسمتی کہ تقریباً دو ماہ کا عرصہ انہوں نے ہمارے ساتھ گزارا۔ اسی دوران وہ اپنی صاحبزادی سے ملاقات کے لئے ٹورانٹو، کینیڈا بھی گئے چند دنوں کے لئے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں ہی بے شمار لوگ اُن کے دوست بن گئے۔ یہ اعجاز تھا اُن کی مخلص، سادہ اور سحر انگیز شخصیت کا۔ میرے گھر ہر وقت جھمگھٹا لگا رہتا تھا اُن کے چاہنے والوں کا۔

یہاں سے جا کر اظہر بھائی نے مجھے لکھا کہ یہ دو ماہ میری تمام زندگی کا حاصل تھے۔ یہ پڑھ کر مجھے بہت خوشی بھی ہوئی

اور بے تحاشا رنج بھی ہوا۔ باجی عذرا اصغر نے اپنے مضمون ''منجملہ اوصاف شخص'' (اس مضمون کی کاپی مجھے اظہر بھائی نے دی تھی) میں اظہر بھائی کے بارے میں لکھا تھا کہ

''اس کی صحبت میں بیٹھتے تو لگتا ہے جیسے خوشیاں بانٹنا اس کا مشن ہو اور غم اس کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا۔ لیکن اندر سے یہ شخص کس قدر ٹوٹا پھوٹا ہے، یہ کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ بقول احسان دانش :

کہیں ہنستے ہوئے چہروں سے نہ دھوکا کھانا
دل ٹٹولو گے تو مل جائیں گے ناسور بہت''

میں اُن کے ایک فقرے میں دو لفظوں کے اضافے کی جسارت کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ ''اندر سے یہ شخص کس قدر ٹوٹا پھوٹا اور تنہا ہے۔'' چٹان کی طرح مضبوط، اظہر جاوید کا دل کانچ کا بنا ہوا تھا جو اکثر و بیشتر ''اپنوں'' کی عنایت (یا عنایات) سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ پھر کوئی اور اپنے دکھ درد سمیٹ کر تخلیق کے دفتر چلا آتا اور اظہر بھائی کی جھولی میں ڈال دیتا اور وہ اپنے غم بھول کر اُس کے اندھیروں میں اُجالوں کے رنگ بھرنا شروع کر دیتے۔ ٹوٹا دل جُڑ جاتا اور مسکراہٹیں پھر سے بکھرنا شروع ہو جاتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ امریکہ سے اظہر بھائی کے جانے کے چند ماہ بعد ہی سے بیماریوں نے ایسا گھیرا ہے کہ آج تک نکل نہیں پایا جاتا۔

35 سالوں میں جو کچھ کمایا تھا جاتا رہا۔ ایسے میں کبھی کبھار مولا دو چار پیسوں کا کہیں سے بندوبست کر دیتا تو کبھی کبھار کسی آتے جاتے کے ہاتھ تھوڑا بہت اظہر بھائی کو بھجوا دیتا رسالے کے لئے۔ وہ ناراض ہوتے، فون کرتے یا خط لکھتے اور خوب ڈانٹتے اور کہتے ''توں آپ فقیر ایں میرے نال دا۔ بہت ''بے فضول'' بندہ ایں توں۔ ایسے بے وقوفاں آلے کم نہ کریا کر۔'' پھر میں نے کہا ''شاہ جی! ایہہ پیسے تہاڈے واسطے نئیں، ایہہ ''تخلیق'' واسطے نیں۔'' پھر کہتے ''چل ٹھیک اے، جیوندہ رہ۔''

جب یہاں تھے 2005ء میں تو ایری زونا میں کسی نے اُن سے کہا کہ ''اظہر صاحب آپ ہمارے ساتھ ''تعاون'' کیجئے، آپ کے مالی مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اظہر بھائی نے اُنہیں خدا جانے کیا جواب دیا لیکن گھر واپسی پر مجھے یہ واقعہ سنایا اور اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولے ''یار! ایہہ تیرے شہر امریکہ وچ کیسے کیسے واہیات لوک رہندے نیں۔''

میں جانتا ہوں امریکہ سے ادیب شاعر لاہور جاتے اور جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، جانے سے پہلے اطلاع کرتے کہ کسی نہ کسی صورت تقریب کا اہتمام ہو۔ میں ذاتی طور پر یہ بات جانتا ہوں کہ کبھی کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کم از کم، خرچے کے پیسے ہی ادا کر دیں۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں جن لوگوں کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اُن میں نیّر جہاں صاحبہ شامل نہیں ہیں۔ اظہر بھائی نیّر جہاں صاحبہ کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور کئی بار انہوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ نیّر جہاں صاحبہ اکثر ''تخلیق'' کے لئے مدد کیا کرتی تھیں۔ عزت پر یاد آیا کہ دو اور لوگوں کی وہ بہت زیادہ عزت کیا کرتے تھے ویسے تو بہت سے لوگ تھے جن کی وہ دل سے عزت کرتے تھے۔ ان دو اصحاب سے اُن کی عقیدت اور محبت بہت خاص تھی اور یہ دو لوگ ہیں۔ محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب اور محترم ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب۔ میرے اپنے دل میں ان دونوں حضرات کے لئے بے تحاشا عزت و احترام

ہے اور اس احترام کی بنیاد اظہر جاوید کی عطا کردہ ہے۔

میں جب بھی لاہور جاتا وہ میرے لئے کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام کرتے۔ میں منع کرتا رہ جاتا اور وہ دوستوں کو اکٹھا کر لیتے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح راتوں رات تاشی ظہیر کو مشہور شاعر بنا ڈالیں۔ میں خط لکھنے کا بہت چور ہوں اور اُنہیں میری عادت سخت ناپسند تھی۔ امریکہ سے جانے کے بعد اُن کے اکثر خطوط میں اُن کا ایک پسندیدہ فقرہ یہ ہوا کرتا تھا۔ ''کاش، جب میں نے تمہیں شاعری کرنا سکھائی تو خط لکھنا بھی سکھا دیتا۔'' میرے شعری مجموعے کا نام ''شام کی آہٹ'' اظہر بھائی نے تجویز کیا تھا اپنے امریکہ قیام کے دوران۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بھرپور پریشر ڈالنے کے لئے انہوں نے ''تخلیق'' میں اشتہار دینا شروع کر دیا اور ''الحمد'' کا بطور ناشر اعلان بھی کر دیا۔ کچھ ماہ بعد جب ہارٹ اٹیک ہوا اور میں شدید بیمار ہوا تو ہماری بیگم نے فوراً عزیزی نوشی گیلانی کے ذمے یہ کام لگایا اور کہا کہ اس کتاب کا جلد چھپنا بہت ضروری ہے۔ نوشی کو علم نہیں تھا کہ اظہر بھائی کئی ماہ سے تخلیق میں اشتہار دے رہے تھے۔ نوشی نے کسی اور ناشر سے بات چیت کر کے مسّودہ لاہور بھجوا دیا۔ مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے اظہر بھائی کو تفصیلی خط لکھا اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اب کتاب اس دوسرے پبلشر کے پاس سے نہیں نکل سکتی اور ساتھ کتاب کے لئے ایک عدد مضمون کی درخواست کی۔ اظہر بھائی نے مضمون لکھنے سے صاف انکار کر دیا اور لکھا۔

''تمہارا مجموعہ چھپے، الحمدللہ......صد ہزار مبارک لیکن جو انداز اپنایا گیا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ پسند کیا قبول ہی نہیں۔ ہم لوگوں نے (تمہارے سمیت) ہمیشہ کہے ہوئے حرف کی پاسداری اور رویوں میں وضع داری نبھائی ہے۔ تم شاید اتنے مجبور بھی نہیں تھے کہ بالکل ''ہتھیار'' پھینک دیتے۔ یہ تمہارے مزاج کے دھیمے پن کا ''شاخسانہ'' ہے۔ انکار کرنے حتیٰ کہ کبھی کبھی اقرار کرنے میں بھی صدیاں لگا دیتے ہو۔''

اس وقت تک میں جس حالت میں ہوں، اس کو کوئی نام تو نہیں دے سکتا، مگر ایسا لگ رہا ہے، میں تمہارے لئے کچھ نہیں لکھ پاؤں گا۔ لکھنے لگا تو اندر کی رنجیدگی غیر شعوری طور پر نکھر آئے گی۔ یہ خط 27/اپریل 2007ء کو لکھا گیا تھا۔ میں دو رشتوں کے درمیان بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ دوسرے پبلشرز کو پیسے بھی بھجوا دیئے گئے تھے۔ میرے مالی حالات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ یہ سکت نہیں تھی کہ پیسے دوبارہ سے الحمد کو بھجوائے جائیں پہلے والے پر فاتحہ پڑھ کر۔ 8 نومبر 2008ء کو اظہر بھائی کا خط آیا۔ خط کے ساتھ کتاب کے لئے مضمون بھی شامل تھا۔ انہوں نے لکھا ''یہ جو کچھ لکھا ہے، اسے قبول کر لو جیسے مجھے تم نے میری تمام حماقتوں سمیت قبول کر رکھا ہے۔ پہلے کیوں نہیں لکھا تھا، تمہیں پتا ہے۔ اب کیوں لپا جھپ لکھ دیا ہے، اس کی تمہیں خبر نہیں۔''

میرا یہ شعری مجموعہ خاصا منحوس ثابت ہوا۔ داستان طویل ہے لیکن اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں بچپن کی ایک دوستی ختم ہو جانے سے بال بال بچی اور میرے کئی ''اپنے'' ہمیشہ کے لئے پرائے ہو گئے۔

◆◆◆

اظہر جاوید کی غزلوں میں وجودی زاویہ

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (انڈیا)

اظہر جاوید غزل اور نظم کے شاعر ہیں۔ اور دونوں میں روحِ عصر کو مناسب طریقے سے برتنے کا ہنر جانتے تھے۔

جہاں تک غزلوں کی بات ہے صورت یا فارم اور مفہوم کے وصل سے معانی کو بہتر طور پر اظہر جاوید اجاگر کرتے ہیں اور نفس اور آشنائی کی حقیقت سے زندگی کی ترجمانی میں امید اور آرزو کے رنگ بھرتے ہیں۔ روایت اور جدیدیت کے درمیان قوت تفہیم کی معنویت کو وہ جس طرح شعر کا روپ دیتے ہیں اس سے اشیاء اور واقعات کے مشاہدہ کا وژن سامنے آتا ہے اور والہانہ وابستگی کی ہمہ جہتی سامنے آتی ہے۔ انہوں نے زندگی کو مرحلہ وار جس طرح دیکھا تھا اور نئی صورت حال سے جتنا کچھ کشید کیا تھا اس میں جذبہ احساس، کیفیت اور کسک کی بازگشت ہے۔ ان کی غزلوں میں محاکات و انداز بیان، لطف زبان اور سادگی و برجستگی کو مضامین کے گل ہائے رنگ رنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے آس پاس منظروں کی بوقلمونی ہے، انکشافات کی رنگا رنگی ہے، جذبے کی لطافت ہے اور وجودی زاویہ ہے انکشافات کی حقیقت ہے۔

ہمارے نور سے نکھریں گے آفتاب سبھی
ہمیں سے دہر میں آئے ہیں انقلاب سبھی

....

آوارگی کا شوق نہیں، المیہ ہے یہ
گھر ہے نہ کوئی گھر میں ہمارا ہے منتظر

....

مری معصومیت کا حال دیکھو
سمندر سے کنارا مانگتا ہوں

....

پھیل جاتی ہے جہاں کے حکمرانوں میں ہوس
وہ میری شاداب ہنستی بستیاں رہتی نہیں
ایک ایک کر کے دوست چھوڑ گئے
کیوں انہیں میں نے آزمایا تھا

وہ محنت کش نہ جانے اب کہاں ہے
سڑک پر خالی ٹھیلا رہ گیا ہے

....

اظہر جاوید فکر کو سنجیدگی کی شعاعیں عطا کرتے ہیں اور نئی قوتِ تخلیق کے منشویقات کو شعری پیکر دیتے وقت آثار و اعمال پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

یا تو لوگ ہوئے ہیں بے حس یا پھر ہیں مصروف بہت
فون پہ سمجھانا پڑتا ہے باہر موسم اچھا ہے

....

اجنبی نگر میں بھی جانے کیسا جادو تھا
خواہشوں کی چادر کو داغدار کر بیٹھے

....

وہ جن کا فرض تھا سیراب کرنا
وہ دریا بستیوں کو ڈھا رہے ہیں

....

اس کے انہیں اشارے پر سب طور طریقے چھوٹ گئے
یوں لگتا ہے اپنے آپ سے اب آغازِ جنگ ہوا

....

مباحثہ تھا بہت سخت، جیت سکتا تھا
ہوا تھا یہ، کہیں تقریر رکھ کے بھول گیا

....

انسان کو درد و سوز اور آرزومندی کی دولت عطا کی گئی ہے اور لامحدود قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے، اسی لئے اظہر جاوید فہم کی سرحدوں کو وسیع تر کرتے ہیں اور جذبہ کی مضرابی کو امکانات سے بھرپور پاتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے کئی موڑ پر ناکامیوں کا منہہ دیکھا تھا اور کٹھن منزلوں سے بھی وہ گزرے تھے۔ ایسے میں درد آشنا ہونا فطری ہے۔ لیکن جذبات کے جوالامکھی کو انہوں نے آتش فشاں نہیں بنایا ہے بلکہ جذبی، ذہنی اور فکری پیکر سے نرم لہجہ اختیار کیا ہے۔ البتہ تلخی کو راہ دینے سے خود کو نہیں روک سکے ہیں ۔

چلی تھی ساتھ مرے بے ثبات رستوں پر
ہوا کی جھوٹی رفاقت، اداس رکھتی ہے

کبھی چاند دل میں اجالنا، وہ کمند تاروں پہ ڈالنا
وہ کمال کے مرے حوصلے، سبھی بجھ گئے، سبھی مر گئے

....

عجب جادونگر ہے دیس میرا
یہاں ہر شخص سپنے دیکھتا ہے

....

جو بھی حاکم آیا ہمیشہ نعرے دعوے ہی لایا
لیکن اسی طرح بگڑا آوے کا آوا، رہ جاتا ہے

....

اسپتال میں لیٹے، سوچیں، انہونی سی باتیں
پاگل جیسے ماہ محرم میں بھی مانگے عید

....

اظہر جاوید کی غزلوں میں روایتی عشق و عاشقی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔محبوب کی یاد اکثر آتی ہے لیکن خیال وفکر کے اعتبار سے اشعار اچھوتے اور گہرے اور معلوم ہوتے ہیں۔اسلوب کی تازگی اور سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے خالص تاثراتی فضا قائم کرنے میں وہ کامیاب ہیں ۔

ہمیں بھی شوق تھا کچھ عشق میں برباد ہونے کا
نہیں انصاف ہر الزام اس کے نام دھر جانا

....

سوکھ جائیں پھول تو پھر تتلیاں رہتی نہیں
روکھے پھیکے عشق سے خوش لڑکیاں رہتی نہیں

....

اُس بدن کے لمس میں اظہؔر یہ کیسا کیف ہے
انگلیاں ہیں مضطرب خوشبو چُرانے کے لئے

اظہر جاوید نے تازگی اور ندرت کو اپنایا ہے۔وابستگی اور وارفتگی کے احساسی سطح سے بھی وہ گزرے ہیں اور فنکاری اور تخلیق کی آنچ کو بھی انہوں نے نمایاں کیا ہے!

◆◆◆

غمِ عشق گر نہ ہوتا/اظہر جاوید

کرشن کمار طُور

اظہر جاوید کی کتاب ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' میرے پیشِ نظر ہے۔اس کتاب میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔بعض اوقات غلط فہمی اور کم نظری کیسے عجیب گل کھلا سکتی ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ میں اظہر جاوید کو اتنے برسوں کے تعلقات کے باوجود محض نظم ہی کا شاعر سمجھتا رہا ہوں۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ رسالوں میں بے حد کم چھپتے اور نظر آتے تھے اور شاید یہ بھی کہ انہیں اوروں کی بہ نسبت خودنمائی کا شوق ذرا کم رہا تھا۔وہ چپ چاپ ادب کی خدمت کرنے کے قائل تھے۔ بہر کیف جب میں نے ان کی غزلیں اس کتاب میں پڑھیں تو مجھ پر ایک مسرت انگیز حیرت کا در وا ہوا۔مجھے خوشی ہے کہ ان کی غزلوں نے میری سوچ اور اندازِ فکر ونظر کو باطل ثابت کیا اور ایک نیا جہانِ معنی میرے سامنے رکھ دیا،سو میں آج ان کی غزلوں کے حوالے سے ہی یہ مختصر گفتگو کروں گا۔

اردو اور فارسی کے شعر وادب میں فنا فی الشعر دراصل ایک طرح سے فنا فی الذات کے وسیع اور بسیط معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ شاعری انکشافِ ذات ہی نہیں بلکہ ذات سے آمیز کائنات کے رموز بھی روشن کرتی ہے اور حیات کے افہام وتفہیم میں اس اثبات خیز منزل کا بھی اشاریہ بنتی ہے جو جذب کے وسیلے سے عرفان کی کائنات میں ایک درخشاں سورج کی مانند جلوہ فگن ہے۔شاعری روزِ اول ہی سے شخصیت کے داخلی آہنگ کی بنیاد قرار پائی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ایک مرکزی امید یا مختلف زمانی اور مکانی تناظر میں ایک امتیازی نقطہ اور اس کی اضافی حیثیت کو دریافت کرنا اور اسے عملی اور فکری سطح پر برقرار رکھنا شاعر کی سعی میں شامل ہے اور اگر یہ سچ ہے تو ہمیں عصری آگہی کے لفظ سے بھی آشنا ہونا پڑے گا کیونکہ انسان کی یہ نو دریافت جس طرح ذہنوں کو تازہ خیالات سے آراستہ کرتی ہے اور جس تیزی سے اس کا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اپنے آپ میں کسی مثال سے کم نہیں۔آیئے اس پس منظر اور حوالے سے اظہر جاوید کے چند اشعار پر نظر ڈالیں۔

کچھ ذائقوں کا ذوق نہ آوارگی کا شوق
ہر ایک جسم میں تری لذت تلاش کی

....

ہم کو دیکھو کہ مطمئن ہیں ہم
اپنے ہاتھوں سے زندگی کھو کے

....

کسی بھی شام کو اڑتے پرندوں سے کبھی پوچھیں
کہ کیسا لطف دیتا ہے پلٹ کر اپنے گھر جانا

....

یہی ہے بس مری عرضِ تمنا
تمہیں کو میں دوبارہ مانگتا ہوں

....

لوگ جب کہتے ہیں برباد سے کیوں رہتے ہو
نام اک یاد تو آتا ہے لیا جاتا نہیں

....

اک شام میرے نام بھی لکھ دیجئے کبھی
اک لمحۂ وصال کا کچھ اہتمام ہو

....

دھوپ اتنی تیز ہے اور سائباں ملتا نہیں
شہر ناپرساں میں کوئی مہرباں ملتا نہیں

....

نام تو لوحِ ہستی سے مٹ جاتا ہے
بورڈ لگے رہ جاتے ہیں دیواروں پر

....

میں بھی عجیب شخص ہوں اظہرؔ تمام عمر
اک برف سے وجود میں حدّت تلاش کی

....

جو چاہیں بھی تو دم بھرتا نہیں ہے
سمندر دوستی کرتا نہیں ہے

کتاب کے مطالعے کے دوران ایک اور واضح رجحان سے میرا واسطہ پڑا ہے۔اظہر جاوید کی غزل جس لازمی عنصر سے تشکیل پاتی ہے وہ ہے ان کا زندگی سے پیار۔اگر آپ اپنی روح اور آتما کے بارے میں کسی طرح کے جذبات بلکہ وافر جذبات کا احساس نہیں رکھتے، انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تو بلاشک آپ کا زندگی پر سے یقین بلاواسطہ اور خارجی ہے۔بجلی، بارش، پانی، آگ آپ کو متحیر نہیں کرتے۔سورج، آسمان، چاند اور وقوع پذیر موسم آپ کو ماورائی قوتوں کے مظہر نظر نہیں آتے اور نہ ہی کائنات کے دیگر مظاہر تشکیل پاتے ہیں اور آپ کے شعور کو انگیخت کرتے ہیں۔قدرت کے یہ تحائف موسمِ بہار کی پہلی صبح کی علامت کے طور پر آپ کی زندگی میں داخل نہیں ہوتے، نہ آپ محبت کر سکتے ہیں اور نہ محبت کے لازوال اثر سے آپ کی شخصیت جاوید ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب آپ کی شاعری محبت کی اس اثباتی منزل کی نشان دہی کرے جس کے حوالے اور تناظر میں جذب کا وسیلہ اور اس کے عوامل آپ کی زندگی کے حامل نظر آتے ہیں۔چند اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں۔

ابتدا کر رہا تھا جینے کی
ہائے کس وقت تیری یاد آئی

....

سوچا تو اک جہاں پہ ہمیں اختیار تھا
دیکھا تو اپنے گھر کا پتہ تک نہ مل سکا

....

جس گھر کی اینٹ اینٹ پہ لکھا تھا میرا نام
اس گھر میں اب مجھے کوئی پہچانتا نہیں

....

زندگی سے کروں گا سمجھوتہ
دل میں یہ بات ٹھان لی میں نے

....

کل رات شب برات تھی بٹتی تھی زندگی
شب بھر میں بس خدا سے تجھے مانگتا رہا

....

جہاں سے وقت نے بھٹکا دیا تھا
وہی تو ایک دل کا راستا تھا

یہ اور بات زمانہ بدل گیا ورنہ
کبھی اُترتے تھے اس دل میں ماہتاب سبھی

....

دل کو برباد کر کے دیکھ لیا
پھر تجھے یاد کر کے دیکھ لیا

....

ہم بھی تو کسی کے نہ ہوئے شہرِ وفا میں
کیا غم کہ اگر کوئی ہمارا بھی نہیں ہے

....

تجھے میں یاد رکھوں وقت کو نہیں منظور
تجھے میں دل سے بھلا دوں مری مجال نہیں

....

ساتھ چلنے والوں کا مان کیا بھروسہ کیا
جانے کب کہاں کوئی راستا بدل جائے

....

پیار کے نام کو بیوپار بنا لو اظہرؔ
دوستوں نے یہ بتایا ہے مجھے راز نیا

....

اظہر جاوید کا ایک اور وصف، ان کے طرزِ شعر کی وہ دردمندی ہے جو ان کے شعری افکار میں موج زیریں کی طرح رواں دواں ہے۔ محبت اور صرف محبت کے حوالے سے ان کی ذات کے اظہار اور اسلوب زبان و بیان میں ان کے اندرونی ہیجان اور کرب کی پہچان ہے۔ ان کی شعری علامتوں میں وہ ابہام نہیں ہے جو آج کی شاعری کا ایک طرح سے طرۂ امتیاز ہے بلکہ وہ اپنے تجربات کو ایسا شعری پیکر عطا کرتے ہیں جو کاروبارِ تمنا کو معرکۂ زیست میں بشارت کے وسیع امکانات سے ہم کنار کرتا ہے اور یہ کوئی معمولی فریضہ نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی شاعری کا ایک بلیغ استعارہ ہے۔ ان کی بیشتر شاعری اسی محور کے گرد گھومتی ہے اور ان کے موضوعی تسلسل میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ وہ اپنے داخلی تاثر سے خارجی اشیاء کے طلسم کو ایک پرفریب شناخت عطا کرتے ہیں۔ ان کا عشق ارضی ہے اور وہ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو کر بھی ایک منتشر اکائی کی صورت

میں باقی رہتا ہے کیونکہ وہ ایک وجدانی تجربہ کا حامل ہے۔جس کا عرفان بڑے زمانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ قطرہ ہوتے ہوئے بھی کُل کا روپ دھار لیتا ہے اور اپنے وجود سے داخلیت کی علامت کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اسے آپ ایک طرح کی شرح بیانی سے بھی متصف کر سکتے ہیں کیونکہ اظہر جاوید کے بعض بعض اشعار ایسے ہیں جنہیں بلاتکلف داخلی احساس کے اظہار کے طور پر بیان میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے شعروں کا آہنگ، ان کی پیکر سازی اور ان کی فضا آفرینی اپنا جداگانہ انداز رکھتے ہوئے بھی ایک جاوید حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور سوالاتی منطق کی بجائے وجدانی کشف کی سطح پر اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ ان کے شعروں کے اسرار منظر بہ منظر قاری پر کھلتے ہیں اور دیر تک اسے اپنی گرفت میں لئے رہتے ہیں۔ اسے چاہے آپ کچھ کہہ لیں لیکن میں اسے شعری، اعجاز سے کم کا درجہ نہیں دے سکتا۔

سفر کا استعارہ مانگتا ہوں
ستاروں سے اشارہ مانگتا ہوں

....

کچھ لوگ لے گئے ہیں خدائی سمیٹ کر
ہم کو تو ڈھونڈنے سے خدا تک نہ مل سکا

....

پلٹ کر جا چکی ہیں ساری لہریں
سمندر اب اکیلا رہ گیا ہے

....

میں اس لئے بھی محبت کا کھیل ہار گیا
کہ چال چلنے میں اس کو بہت مہارت تھی

....

پرندے گھر کو واپس جا رہے ہیں
پرانے دُکھ بہت یاد آ رہے ہیں

....

آوارگی کا شوق نہیں المیہ ہے یہ
گھر ہے نہ کوئی گھر میں ہمارا ہے منتظر

....

جانے کیا ہو گیا تمہارے بعد
دل کسی نام پر دھڑکتا نہیں
تم جب میری سانسوں میں گھل جاتی ہو
عمر کا حاصل بس وہ لمحہ دیکھا ہے

....

رویہ اس کا بالکل آپ سا ہے
سمندر بھی کرم ناآشنا ہے

....

اس بار اپنے شہر میں آیا جو لوٹ کر
غیروں سے اس کے گھر کا پتہ پوچھتا رہا

....

فلک بھی چومتا ہے جُھک کے اس کو
ہوا نے ریت پر کیا لکھ دیا ہے

....

میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور اس میں مجھے کسی شرمندگی کا دخل بھی نہیں کہ میں نے اظہر جاوید کے اشعار اقتباس کرنے میں بے حد فراخ دلی سے کام لیا ہے لیکن اس میں میری مجبوری بھی تھی۔ ان کے اشعار نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا ہے اور میں ابھی تک ان کے حصار میں خود کو سحر زدہ پاتا ہوں۔ یہ نہ صرف ان کی محبت پر لازوال یقین کی دلیل ہے بلکہ میرے جیسے ان کے عقیدت مندوں کے لئے نشانِ راہ بھی۔ اگرچہ وہ اب ہم میں جسمانی طور پر موجود نہیں ہیں لیکن ذہنی اور روحانی حوالے سے قرب قریب ہیں۔

◆◆◆

بھگوان سٹریٹ کا درویش......اظہر جاوید

ڈاکٹر اختر شمار (قاہرہ)

اگلے روز فیس بک کھولی ہی تھی کہ ایک خبر سے آنکھیں چپک کر رہ گئیں۔ اوپر نیچے ''ویلنٹائن ڈے'' کے حوالے سے سرخ پھولوں سے مرصّع پیغامات چل رہے تھے اور درمیان میں اظہر جاوید کی ناگہانی موت کی اطلاع دکھائی دے رہی تھی۔ اظہر جاوید کے انتقال کی خبر سے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ان سے فون پر بات ہوئی تھی اور تین روز قبل میں نے ''تخلیق'' کے لیے اپنی تازہ غزلیں الگ کر کے رکھی تھیں کہ لفافے میں انہیں پوسٹ کروں گا لیکن......

میں نے جلدی جلدی خبر پڑھی مگر زیادہ تفصیل نہیں تھی۔ رضی الدین رضی اور عقیل عباس جعفری دونوں کا دم غنیمت ہے کہ ادبی حوالے سے بھی ''فیس بک'' کو اَپ ڈیٹ کرتے رہتے ہیں۔ رضی نے اظہر جاوید کی تصویر لگا کر خبر لکھ رکھی تھی۔ بہت سے احباب خبر کو شیئر کرتے ہوئے تعزیتی ''کومنٹ'' لکھ رہے تھے۔ میں نے بھی اظہر جاوید کی چند یادگار تصویریں لگائیں اور احباب سے شیئر کیا۔ اسی دوران راجہ نیئر نے موبائل پر عباس نجمی کی رحلت کا پیغام لکھ بھیجا۔ میں نے فیس بک کو دوبارہ اوپر سے نیچے تک کھنگالا لیکن عباس نجمی کے بارے میں ان کے بہت ہی قریبی دوست کا ذاتی صفحہ بھی اس خبر سے خالی تھا۔ تاہم فیس بک پر آن لائن ہی جب میرا رابطہ اسلم کولسری صاحب اور ممتاز ملک سے ہوا تو خبر کی تصدیق ہوگئی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

ابھی افضال شاہد کی موت کے دکھ کی نمی آنکھوں میں تھی کہ یہ دو مزید نشتر دل میں کھب گئے اور دل صدمے سے نڈھال ہوگیا۔ آہ خدایا! کیسے کیسے دوست بچھڑتے جا رہے ہیں۔ پردیس میں سب سے بڑا عذاب اپنوں سے دوری ہوتا ہے۔ میں نے والدہ مرحومہ کی وفات کی خبر بھی پردیس میں سنی اور بے بسی کے عجیب عالم سے گزرا ہوں۔ پنجرے میں قید پنچھی کی طرح دل فقط پھڑ پھڑا کر رہ جاتا ہے، کچھ ایسی ہی صورتحال تھی۔ لاہور میں ہوتا تو خبروں میں ایسی تاخیر اور بے بسی کی سی کیفیت نہ ہوتی۔ بندہ جنازے میں شریک ہوجاتا ہے، آخری دیدار کر لیتا ہے، دیگر احباب سے مل کر غم ہلکا ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن اگر ملک سے باہر ہوں تو واحد وسیلہ وہی فون، وہی انٹرنیٹ، فیس بک، تصاویر، کومنٹس اور بس...... یہ اچھا ویلنٹائن ڈے تھا میں رات بھر سو نہ سکا تھا۔ اظہر جاوید کا چہرہ نگاہوں میں تھا، میرے سامنے پچھلے بتیس برس اوراق کی مانند پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میری پہلی تخلیق اظہر جاوید ہی

کے جریدے ''تخلیق''، میں اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ان سے ذاتی تعارف نہ تھا۔ پھر لاہور آنے کے بعد ان سے محبت کا وہ رشتہ استوار ہو گیا جسے کم از کم بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بھگوان سٹریٹ میں ان کا دفتر دوستوں کے لیے گوشۂ عافیت کا درجہ رکھتا تھا۔ ''تخلیق''، ایک ادبی پرچہ تھا۔ ادبی پرچہ نکالنا ہمیشہ ہی خسارے کا سودا رہا ہے اور اظہر جاوید ہمیشہ ہی خساروں میں زندہ رہے۔ ان کا جریدہ واقعتاً صرف اور صرف تخلیق کاروں کی پروجیکشن کے لیے تھا۔ اس کے مدیر نے کبھی ''تخلیق'' کو اپنی ذاتی پبلسٹی کا ذریعہ نہ بنایا ، نہ ہی اس کے ذریعے تعلقات بنا کر شہر شہر اپنے لیے تقریبات منعقد کرائیں یا مشاعرے پڑھے۔ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کی سالانہ خریداری کے لیے اہلِ قلم پر کبھی زور نہ دیا اور ہر ادیب شاعر کو اپنے ہاتھ سے ایڈریس لکھ کر ارسال کرتے رہے۔ ان کی دوستی ہر عمر کے ادیبوں اور شاعروں سے رہی۔ وہ بیرونِ ملک سے آنے والے دوستوں کے لیے ہنگامی طور پر خوبصورت نشستیں منعقد کرنے کے ماہر تھے۔ اظہر جاوید کا تعلق سرگودھا سے تھا لیکن ایک مدت سے وہ لاہور میں مقیم تھے۔ وہ ایک کل وقتی صحافی تھے، روزنامہ امروز کے بند ہونے تک آپ اس سے وابستہ رہے۔ ان کے دور میں امروز کا ادبی ایڈیشن بہت مقبول ہوتا تھا اس دوران آپ امروز سے نکالے بھی گئے، لیکن بیروزگاری کے دنوں میں بھی ان کی وضعداری، دوستوں سے محبت اور استقامت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ادبی ایڈیشن اور میگزین کی نگرانی اور ایک ادبی پرچے کی ادارت کے باوجود انہوں نے کبھی سیلف پروجیکشن کی طرف توجہ نہیں دی۔ اپنا واحد شعری مجموعہ ''غم عشق اگر نہ ہوتا'' بھی انہوں نے الحمد پبلیکیشنز کے روح رواں صفدر حسین اور دیگر دوستوں کے بے حد اصرار پر ابھی چند سال قبل شائع کروایا تھا یہی کچھ حال ان کی پنجابی کہانیوں کا بھی تھا۔ جو جمیل پال کے اصرار پر لکھی گئیں۔ بعد ازاں کتابی صورت میں چھپیں۔ عام ادیبوں کی طرح وہ ادبی صفحات میں اپنے انٹرویو کے لیے کبھی بے چین نہ ہوئے۔ نہ ہی ریڈیو، ٹی وی اور شہر کے لفافہ مارکہ مشاعروں میں انھوں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ وہ ہمیشہ اپنے بہت ہی ذاتی دوستوں میں خوش رہتے تھے۔ پچھلے برس جب مصر کے حالات خراب ہوئے اور پاکستانیوں کو یہاں سے نکالنے کی باتیں ہونے لگیں تو ایسے ہی اہلِ قلم میں سے صرف اظہر جاوید ہی تھے جنہوں نے باقاعدہ فون پر ہماری خیریت دریافت کی۔ میں نے بہتیرا کہا کہ آپ فون بند کریں میں ملاتا ہوں مگر وہ بڑے سکون سے قاہرہ کے حالات اور ہمارے بارے میں پوچھتے رہے۔ ان کی آواز میں وہی محبت، رس اور ملائمت تھی۔ حالانکہ میں آج تک ان کے کسی کام نہیں آ سکا۔ اپنی گفتگو میں ہمیشہ ''پیارے'' کا لفظ استعمال کرنے والے اظہر جاوید خود بھی بہت نفیس اور پیارے انسان تھے۔ میرا ان سے جونیئر ادیب کا سا رشتہ تھا۔ لیکن جب مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تو سینئرز میں سے اظہر جاوید اور ڈاکٹر محمد زکریا صاحب نے میرے لیے خصوصی نشستیں اور ڈنر کی دعوتیں کیں۔ کسی بڑے انسان، ادیب، شاعر کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ ہم سے جدا نہیں ہوتا۔ پھر جب اچانک وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتا ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر اہم اور بڑا آدمی تھا۔ کہتے ہیں کہ بڑا وہ ہے جس کے پاس بیٹھ کر کوئی بھی خود کو چھوٹا نہ محسوس کرے۔ اظہر جاوید بھی محبت کا ایسا ہی شجرِ سایہ دار تھے، جن کے ہاں نوجوانوں سے لے کر عمر رسیدہ خواتین و

حضرات تک سبھی دکھائی دیتے۔ وہ دوستوں کا درد بانٹنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ دن کو گیارہ بجے کے بعد دفتر آتے اور شام گئے واپس لوٹتے۔ اس دوران نمازیں بھی دفتر میں ہی ادا کی جاتیں۔ مجھے ان کے ساتھ الحمد پبلی کیشنز کے دفتر میں گزری شامیں یاد آتی ہیں اور کبھی شیزان کی وہ نشستیں، جن میں قتیل شفائی، احمد راہی، شہزاد احمد، خواجہ محمد زکریا، یونس جاوید، کنول فیروز، انور سدید، عمر زمان، صفدر حسین، نوید قتیل، ناہید شاہد، اے۔ جی جوش، ناصر زیدی، اعزاز احمد آذر، افتخار مجاز، لطیف قریشی، سیما پیروز، قاضی پیروز بخت، زریں پنا، عبدالکریم خالد، سرفراز سید، ریحان اظہر، زمان کنجاہی، سلطانہ منور اور دیگر بہت سے اہلِ قلم موجود ہوتے۔ پاکستان سے باہر ان کے ذاتی دوستوں میں امریکہ میں نیر جہاں، ذہانت حسین، آصفہ نشاط، تاشی ظہیر جبکہ کیول دھیر، نارنگ ساقی بھارت میں ان کی موت کے بعد صدمے سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبھی چاہنے والوں اور لواحقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ابھی انہوں نے اپنا صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی وصول کرنا تھا کہ ایک ماہ قبل ہی ہمیشہ کے لیے شاید اس لیے رخصت ہو گئے کہ انہیں تمغوں یا ایوارڈز کی کبھی ضرورت نہیں رہی۔ وہ سراپا محبت تھے تبھی عین ویلنٹائن کے دن جدا ہوئے تاکہ محبت کو یونہی منایا جاتا رہے۔ میں نیاز مندانِ اظہر جاوید سے تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت اپنے جوارِ رحمت میں انھیں جگہ عطا فرمائیں...... آمین ثم آمین......

◆◆◆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

''اظہر جاوید شاعر ہیں، ان کے کلام میں آگہی اور شعور کی تہوں کا ایسا جائزہ ملتا ہے جس سے نرمی اور گرمی ترتیب پاتی ہے۔ حساس اور منقلب پس منظر میں رجائیت، حوصلہ مندی، یقینِ کامل، ایمان بالخیر، بے چہرگی، ایجاز و ایمائیت، عصری شعور کی رمزیت، فکر انگیز طنز، اور جدید حسیت کی جاذبیت اس طرح جلوہ گر ہیں کہ فکری اور تہذیبی روایتوں کی علامت بن جاتے ہیں۔ زندگی کی سفاکی، انسانی فطرت کی دو چہرگی اور زمینی حقائق کی ترجمانی کے ساتھ ان میں خودداری اور خودشناسی ان کی شاعری کی انفرادیت ہے۔''

بیادِ جناب اظہر جاوید

پروین شیر (کینیڈا)

سنا ہے سنگ و آہن بے حد سخت جان ہیں۔ انہیں توڑنا بہت مشکل ہے۔ لیکن انسان ......؟ شاید ان سے بہت زیادہ مضبوط ہے، تند آندھیاں آتی رہتی ہیں، منہ زور تھپیڑے وار کرتے رہتے ہیں لیکن انسان سب کچھ برداشت کیے جاتا ہے۔ جیتا رہتا ہے، چلتا رہتا ہے۔ یہ وار اسے کچھ دیر کے لئے زیر ضرور کر دیتے ہیں لیکن پھر وہی معمولات زندگی ...... وہی جھمیلوں کے جال میں پھنسی حیات!

اظہر جاوید صاحب کا اچانک یوں دنیا چھوڑ جانا ایک ایسی ہی آندھی تھی جو دندناتی ہوئی آئی، جس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ میں اظہر جاوید سے کبھی ملی نہیں صرف فون پر کئی بار باتیں ہوئی تھیں۔ اکثر آوازیں شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں۔ وہ مجھے نہایت اخلاق مند، پرخلوص، نیک اور نرم دل انسان لگے تھے بہترین تخلیق کار ہی نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ 42 سالوں سے ''تخلیق'' جیسا معیاری رسالہ شائع کرتے رہنا اور وہ بھی پابندی کے ساتھ ...... جوئے شیر ہی لانا تو ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو مصائب سے پر ہوتا ہے۔ ذہن و دل مشکلات کے کانٹوں سے زخمی ہوتے رہتے ہیں اور پاؤں لہولہان۔ لیکن وہ اس راستے پر ہر حال میں گامزن رہے۔ اردو کے افسردہ ہوتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے رہے۔ انا و خودداری ایسی کہ کبھی زر سالانہ یا چندہ نہیں مانگا۔ اپنی زندگی اردو ادب کے لئے بے غرضی کے ساتھ وقف کر دی۔ ان کے اس بے لوث جذبے کی ترجمانی ان کا یہ شعر کر رہا ہے۔

ہمارا فرض ہے روشن رکھیں بجھتے چراغوں کو
ہوا کی اپنی فطرت ہے وہ اپنا کام کرتی ہے

اظہر جاوید مالی مشکلات سے نبرد آزما ہوتے رہے، پھر بھی مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے رہے۔ اس کی گواہی ان کا یہ شعر دے رہا ہے۔

طوفانوں نے ضد پکڑی، پر رب کی رحمت ساتھ رہی
دیکھو موجو، غور سے دیکھو، سالم مرا سفینہ ہے

لیکن انسان مصیبتوں کے وار سہتے سہتے تھک کر مایوس بھی ہو جاتا ہے۔اسی عالم میں شاید اظہر جاوید صاحب نے کہا تھا

زندگی ہماری تو رائیگاں رہی اظہر
چھاپ کر رسالہ اور شعر کہہ کے کیا پایا

ان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔وہ اکثر مجھ سے کہتے ''بی بی اپنی تخلیقات بھیجتی رہا کریں''۔اب اس آواز کی بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ان کا یہ شعر پلکیں نم کرتا رہے گا۔

موت کو روکو، دستک مت دو، کچھ دن اور بھی جینا ہے
ابھی تو قطرہ قطرہ جیون مدرا کا رس پینا ہے

لیکن کب تک؟ موت دستک دیتے دیتے دروازے توڑ کر داخل ہو جاتی ہے۔بے رحم ہاتھوں سے صہبائے زندگی کا نازک پیمانہ چھین کر چکنا چور کر دیتی ہے۔مدرا کا رس ختم ہونے سے پہلے ہی۔قطرہ قطرہ رس پینے والے پوری طرح سیراب ہوئے بغیر چلے جاتے ہیں۔یہ خواہش ادھوری دم توڑ دیتی ہے۔وہ ایک کھرے انسان تھے جو ''تخلیق'' کے اداریے ''اپنی بات'' سے صاف ظاہر ہے۔ان کی مغفرت کیلئے دعا گو ہوں۔خدا کرے ''تخلیق'' کو ان کے بچے قائم رکھیں اور وہ اس جہاں سے یہ دیکھ کا خوش ہوتے رہیں کہ ان کے نقش پانے آگہی کا شعور بخشا ہے اور اس کی مدرا کا رس لوگ پی رہے ہیں۔

◆◆◆

عابد حسن منٹو

''مسائلِ ادب ہوں یا مسائلِ زمانہ، اظہر جاوید نے ان کے بارے میں ہمیشہ ہوش مندانہ، اصولی اور ترقی پسندانہ موقف اختیار کیا ہے۔وہ ادب وفن، تہذیب وثقافت کو پورے سیاق اور سباق میں دیکھتا ہے اور انسان اور انسانیت کی حرمت کے تصورات کی بنیاد پر سماجی زندگی کو جانچتا ہے۔البتہ مسائل عشق کے بارے میں ان کا رویہ مختلف ہے۔''

اظہر واپس آ جاؤ!

نذیر فتح پوری (انڈیا)

برادرم اظہر جاوید! آپ بھی چلے گئے۔ اپنے چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر آپ نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

یہ خبر سب سے پہلے مجھے موبائل پر محترم کے ایل نارنگ نے سنائی۔ دو پہر سے پہلے کا وقت تھا۔ میں ابھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ یہ دل دہلانے والی خبر سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے اپنا بڑا بھائی چلا گیا ہو۔ ہاں گذشتہ دو ڈھائی برسوں میں آپ نے مجھے بڑے بھائی کے جیسا ہی اپنی شفقتوں سے نواز رکھا تھا۔ جب بھی فون پر بات ہوتی آپ دعاؤں کے پھول برسانے لگتے۔ ان برسوں میں زیادہ نہیں لیکن جو بھی چار چھ خط آپ نے مجھے لکھے ان میں بھی دعاؤں کے تحفے زیادہ ہوتے تھے۔ انتقال سے دو تین روز قبل میں نے فون کیا تو آپ نے بتایا کہ ''اسباق'' کا شمارہ مل گیا ہے اور زائد کا پیاں احباب تک پہنچا دی گئی ہیں اور آپ نے یہ بھی بتایا کہا ''بیتے کل کا اک اک پل'' کی تازہ قسط بھی مل گئی ہے اس کے بعد آپ نے لکھا کہ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ارسال کر چکا ہوں۔ دو چار دن میں مل جائے گا۔ اس کے بعد پھر وہی دعاؤں کے پھول نچھاور تھے۔ آپ چلے گئے تو بڑے بھائی کی طرف سے دعاؤں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اچانک دعاؤں کے سائبان سے محروم ہو گیا۔

مجھے یاد آ رہا ہے جب میں نے اسباق کا ماں نمبر آپ کو ارسال کیا تھا تب آپ نے مجھے فون کر کے بہت بہت مبارکباد کہی تھی اور اس کے بعد دعاؤں کا سائبان تنتا چلا گیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے 'اسباق'' کا یہی ''ماں نمبر'' ہمارے برادرانہ سلسلہ کی اہم کڑی تھی۔ یہ سچ ہے ماں ہی بھائیوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے ہمارے مابین یہ سلسلہ جڑا تو دونوں طرف سے ادبی طور پر خوشگوار ثابت ہونے لگا۔ محبتوں کے چمن میں بہت جلد پھول کھلنے لگے اور ہندوستان پاکستان سے لے کر ساری اردو بستیوں میں ''تخلیق'' لاہور اور ''اسباق''......کی وجہ سے خوشبو پھیلنے لگی۔

میری فرمائش اور خواہش کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے آپ نے میری ابتدائی زندگی کے حالات ''بیتے کل کا اک اک پل'' کے عنوان سے ''تخلیق'' میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ''تخلیق'' میں اس سلسلے کی اشاعت کو بڑی مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہوئی، دو ایک بار قسط ارسال کرنے میں تاخیر ہوئی تو آپ نے نارنگ ساقی کے ذریعہ فون کروا کے قسط کی

ترسیل کے لئے یاد دلایا۔ ایک بار جب فون پر ہمارے مابین گفتگو ہو رہی تھی تب آپ نے بتایا کہ ''بیتے کل کا اک اک پل'' کی اشاعت کے بعد تخلیق کے قارئین میں اضافہ ہوا ہے۔ سبحان اللہ۔ یہ اعتراف آج کون کرتا ہے۔ بڑا دل، بڑا کردار اور بڑی نظر رکھنے والا کوئی قلندر ہی کر سکتا ہے۔

ابھی ایک سال ہوا۔ جب ''اسباق'' میں محترم نارنگ ساقی کا مرتب کردہ ''گوشہ اظہر جاوید'' شائع ہوا تو چاروں طرف سے اس کی اشاعت پر مبارک اور سلامت کے تحفے موصول ہوئے، اس گوشہ کی اشاعت کے لئے آپ قطعی تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل سے اور میری گذارش پر، آپ نے ڈاکٹر محبوب راہی کو اپنی شعری مجموعہ ارسال کیا تھا، جس پر انہوں نے آپ کی غزل نگاری پر بہت خوبصورت مضمون لکھا تھا۔ اس گوشے پر پاکستان کے اہم رسائل اور اخبارات میں تبصرے شائع ہوئے تھے۔ پاکستان کے ادبی حلقوں سے مجھے کئی خطوط ملے۔ خطوط لکھنے والوں میں اکثریت نئی نسل کے طلبہ کی تھی۔ جنہوں نے کہا تھا کہ ہمارا تعلق ادبی طور پر ''تخلیق خاندان'' سے ہے۔، ڈاکٹر انور سدید جو ہمارے اور آپ کے بزرگ ہیں، انہوں نے بھی اس گوشے والے شمارے پر اچھا تبصرہ کیا تھا۔ آپ یقین کریں اظہر بھائی! آپ کے فکر و فن پر گوشہ شائع کر کے مجھے ادبی تسکین ملی تھی۔ اس گوشے کی اشاعت میری ادبی نیکی میں ایک بڑی نیکی تھی۔

یہ ثقافتی سلسلے محبتوں کو فروغ دیتے ہیں سرحدوں کے مابین اگائے گئے نفرت کے ہتھیاروں کی شدت کم کرتے ہیں۔ آپ نے ''تخلیق'' کے توسط سے یہ کام کرنے کی کوشش کی۔ ''تخلیق'' میں ہندوستانی اہل قلم کی نگارشات جس تواتر اور تسلسل سے شائع ہوتی تھیں، اتنی پاکستان کے کسی اور رسالے میں شائع نہیں ہوئیں، آپ ڈاک کا بھاری خرچ اٹھا کر یہاں ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنا رسالہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہندوستان میں ''تخلیق'' کی مقبولیت کا اندازہ مجھے ''بیتے کل کا اک اک پل'' کی اشاعت کے بعد ہوا اکثر قارئین مجھے فون کر کے یا خط لکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے اور تحریر کے انداز اور اسلوب پر تبصرہ بھی کرتے۔

یہ میری کاوشوں سے زیادہ آپ کی محبتوں کا ثمر تھا۔ آپ کے پر خلوص جذبے کا بدل تھا۔ آپ کے قلندرانہ اوصاف کا ماحصل تھا۔ سچ ہے، فراخ دلی اور کشادہ ذہنی آدمی کو بلندی عطا کرتی ہے۔ میری نظر میں آپ بلند تھے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، آپ کے حسن سلوک کی خوشبو کا احساس ہمیشہ مشام جان کو مہکاتا رہے گا۔ خزاں اور بہار کے موسم آتے جاتے رہیں گے۔ منظر بدلتے رہیں گے۔ لیکن آپ کی یاد کا موسم سدا بہار رہے گا۔

یہاں ہندوستان میں آپ کے انتقال کی خبر سن کر دوستوں نے مجھے فون کر کے تعزیت کا اظہار کیا۔ جیسے میں یہاں آپ کا وارث ہوں، اسی طرح مجھے احباب نے پرسہ دیا۔ اکولہ سے ڈاکٹر محبوب راہی، پونے سے رفیق جعفر، اورنگ آباد سے اسلم مرزا اور ڈاکٹر عظیم راہی، سیرونج سے سیفی سرونجی، حیدرآباد سے یاسین احمد اور رنگ و بو کے مدیر جناب مجتبیٰ فہیم، پنجاب سے کرشن پرویز، فرید آباد سے کلدیپ جوشی، ممبئی سے مراق مرزا نے فون سے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور آپ میں

آنسوؤں کی تقسیم بھی کی۔ دلی سے فصیح اکمل قادری نے بھی تعزیتی فون کیا اور دلی میں آپ سے اپنی ملاقات کو یاد کیا۔ آپ کے ساتھ ادا کی ہوئی نمازوں کا ذکر کیا۔ آپ کی محبت اور احباب نوازی پر اظہارِ خیال کیا۔ جس دن دوپہر میں نارنگ ساقی کی زبانی یہ الم ناک خبر سنی اسی رات فون کر کے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو...... اطلاع دی۔ وہ بے حد دکھی ہو گئے تھے۔ کہنے لگے میرا بڑا نقصان ہو گیا۔ اب آپ تصور کریں کہ آپ کے جانے کے بعد کیسے کیسے دوست کا نقصان ہوا۔ غالب نے کہا تھا ع

''غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں''

غالبؔ کا یہ خیال مجھے ہمیشہ غلط ہی لگا۔ دنیا سے جو بھی جاتا ہے اس کے بعد اس کے کاموں کا سلسلہ تو بند ہو ہی جاتا ہے۔ سامنے کی بات تو یہی ہے اظہر بھائی! کہ اب ''تخلیق'' کا کیا ہو گا۔ جس کی آبیاری میں آپ نے اپنی زندگی کے 42 سال خون بنا کر بہا دیئے تھے۔ جس کو آپ نے بیج سے پودا اور پودے سے ایک تن آور شجر بلکہ گھنا اور پھیلا ہوا برگد بنا دیا تھا، جس کی گہری اور افزاء چھاؤں میں بیٹھ کر قلم و قرطاس کے بے شمار مسافروں نے اپنی سانسیں درست کی تھیں، پسینہ پونچھا تھا، ٹھنڈا پانی پیا تھا اور آگے کوچ کر گئے تھے۔ اس گھنے برگد کی حفاظت اور آبیاری اب کیسے ہو گی۔ ادب کے بھولے بھٹکے قافلے اب کہاں پناہ گزیں ہوں گے۔ اظہرؔ خستہ کے بغیر یہ کام اب کون کرے گا۔ مجھ ایسا نیا ادب کا مسافر جو ابھی ابھی اس برگد کی چھاؤں میں آ کر ستانے اور ٹیک لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسی ٹھنڈی چھاؤں کہاں پائے گا؟

آپ سے مخاطب ہوتے وقت تسلسل میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ کہنے کو بہت کچھ ہے، فون اور خطوط کے ذریعہ تو آپ سے کبھی طویل گفتگو نہ ہو سکی۔ بہت سے راز دبے رہ گئے۔ آپ نے تو میری مسلسل تحریر ''بیتے کل کا اک اک پل'' پڑھ کر میری ٹوٹی پھوٹی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ لیکن میں محروم رہا۔ آپ نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس محرومی کا احساس مجھے ہمیشہ رہے گا۔ ابھی چند دن ہوئے 25 فروری 2012ء کو لکھا ہوا ایک خط مجھے حیدر آباد سے جناب ایم اے سلیم کی طرف سے ملا۔

''نذیر بھائی سلام مسنون

سہ ماہی ''اسباق'' اپریل تا ستمبر 2010ء میں آپ نے ''گوشہ اظہر جاوید'' شائع کیا تھا۔ وہ پیاری شخصیت یقین نہیں آتا کہ اس قدر جلد دنیا کو خیر آباد کہہ جائے گی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خدا اسے اعلیٰ علیین میں تخلیق کردہ فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے۔ مجھے اس کے رسالے ''تخلیق'' کا بڑی بے تابی سے انتظار رہتا تھا اور اس میں آپ کی خود نوشت گل سر سبد ہوتی تھی۔ معلوم نہیں یہ سلسلہ آیا اسباق کی زینت بنے گا یا آئندہ آپ کے منتخب کردہ کسی دوسرے رسالے میں شائع کیا جاتا رہے گا ۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے''

اظہر جاوید کی غزل کا ایک شعر یاد آ گیا۔

پاس معالج کھڑا بھی ہو تو پھر بھی موت تو آ جاتی ہے
سانسیں ختم اگر ہو جائیں تہمت کس پر دھرنا ہے

سلیم صاحب ''تخلیق'' کا ہر شمارہ مطالعہ کرنے کے بعد مجھے خط لکھتے اور ''بیتے کل کا اک اک پل'' پر اپنی رائے کا اظہار کرتے، سچ ہے اظہر بھائی! محبتوں کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں رشتوں کے الگ الگ چہرے ہوتے ہیں۔ پذیرائیوں کے الگ الگ طریقے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی برائی نہیں کہ گذشتہ دو برسوں میں آپ کے رسالے ''تخلیق'' کی وجہ سے جو ادبی شہرت ملی اور قارئین کا جو پیار ملا۔ وہ میرے لیے گراں قدر ادبی تحفہ ہے۔ اردو کے معتبر نقاد ڈاکٹر انور سدید ہر قسط پڑھنے کے بعد اپنی گراں قدر رائے کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یہ سب آپ کی مدبرانہ محبتوں کا ثمر تھا، جو مجھے ملا تھا۔ آپ نے ''تخلیق'' کی 42 سالہ اشاعتی زندگی میں احباب میں کتنے ہی شریں ثمر تقسیم کیے ہوں گے۔ اس کا شمار کون کر سکتا ہے۔

جس بات کا ذکر مجھے مضمون کے پہلے حصے میں کرنا چاہیے تھا وہ یہاں کر رہا ہوں۔

مجھے آپ کی رخصتی کی خبر آپ کے یارِ غار کے ایل نارنگ ساقی نے سنائی تھی جسے سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ساقی صاحب نے بتایا کہ قتیل شفائی کے جانے کے بعد لاہور میں اظہر جاوید ہی میرا سہارا تھے۔ اس کے بعد مجھے فون پر نارنگ ساقی کی ہلکی ہلکی سسکی سنائی دی۔ کوئی کسی کیلئے یونہی تو آنسو نہیں بہاتا۔ آنسو پہلے دل کی آنکھیں چیر کر باہر نکلتا ہے پھر پلکوں پر آتا ہے۔ ساقی باضبط آدمی ہیں۔ لطیفوں سے مسکراہٹ بکھیرتے ہیں، احباب کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آج اپنے عزیز ترین دوست کی جدائی میں سسکنے لگتے تھے۔ میرا بھی برا حال تھا۔ نہ میں رو سکا نہ سو سکا۔ غم کی چادر اوڑھ کر دن بھر لیٹا رہا۔ سارے کام بند کر کے بیٹھا رہا۔ اور دو دن پہلے فون پر آپ سے گفتگو کو تصور میں لا کر اپنی سماعت میں اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ تا کہ کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی یہ یقین کر لوں کہ اظہر جاوید ابھی موجود ہیں اور مجھ سے مخاطب ہیں لیکن میں ایسا نہ کر سکا، مجھے اس میں کامیابی نہ ملی۔

مجھے رہ رہ کر یہی خیال ستا رہا ہے کہ جس طرح آپ کے بعد آپ کے رسالے ''تخلیق'' کا کیا ہو گا اسی طرح میرے بعد میرے رسالے ''اسباق'' کا کیا ہو گا۔ میری کتابوں کا کیا ہو گا۔ میرے غیر مطبوعہ مسودات کا کیا ہو گا، دور دور تک پھیلے ہوئے میرے تخلیقی سلسلوں کا کیا ہو گا۔ ان کو کون آگے بڑھائے گا۔ کون فروغ دے گا۔ غالبؔ خستہ کے بغیر سارے کام بند ہو جائیں گے۔ سلسلے تھم جائیں گے۔ لیکن اظہر بھائی کیا کیا جائے۔ جس طرح ہمارے بس میں ہماری آمد نہیں اسی طرح ہماری روانگی کا نقارہ بھی کس اور جگہ سے بجتا ہے اور جب نقارے پر چوٹ پڑتی ہے تو ہر حال میں کوچ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی ڈنکے کی چوٹ نے آپ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ آپ کے جانے سے کتنے دلوں پر چوٹ لگی ہو گی۔ اس کا احساس کتنوں کو ہے۔ ان

چوٹوں کا اور ان چوٹوں سے اٹھنے والی ٹیسوں کا شمار کون کرے گا۔ کتنے لوگ ہیں۔ آپ کا اپنا گھر پریوار، خاندان کے لوگ، رشتے داری اور قرابت رکھنے والے، ادبی دوست، احباب، شاگردان، شاعر، افسانہ نگار، مراسلہ نگار، قارئین۔ ایک پورا ادبی معاشرہ اس چوٹ سے بلبلایا ہوگا، اس ٹیس سے تڑپ اٹھا ہوگا۔ ہندوستان، پاکستان، امریکہ، برطانیہ اور جرمنی سے اگر تمام احباب کو یکجا کیا جائے تو ''اظہر جاوید'' کے نام سے ایک شہر بسایا جاسکتا ہے۔ اس شہر میں پنجاب بھی ہوگا، سندھ بھی ہوگا۔ راجستھان بھی ہوگا اور گجرات کے ساتھ مہاراشٹر بھی ہوگا۔ کتنا خوبصورت ہوگا وہ گاؤں، جہاں افسانہ کالونی ہوگی۔ غزل اپارٹمنٹ ہوگا۔ نظم منزل ہوگی۔ تنقید محل ہوگا۔ محقق حویلی ہوگی، گیت گلی اور تبصرہ اسٹریٹ ہوگی۔ جہاں کے باشندے اس کا گیت گائیں اور اردو کی ہنسی بجائیں گے۔ جہاں صرف اور صرف فنون لطیفہ کا سکّہ چلے گا۔ دلوں کے سودے ہوں گے۔ جذبات کی ہاٹ لگے گی اور ایک ایسا بلند اور پرشکوہ، منقش مزّین محل ہوگا جس میں اردو اخبارات و رسائل کے مدیران کے دفتر ہوں گے۔ لیکن ایسا شہر تو آپ کے آنے کے بعد ہی بسایا جاسکتا ہے اور آپ آنہیں سکتے۔ کیوں کہ جس طرف آپ کے نقشِ قدم گئے ہیں وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یا الٰہی کون سی منزل ہے وہ
جو وہاں جاتا ہے وہ آتا نہیں

اب ہم سبھوں کو آپ کے پاس آنا ہے۔ سب اپنی اپنی سانسوں کی گٹھری باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ کب بلاوا آ جائے۔ کب نقارے پر چوٹ پڑ جائے۔ کب کوچ کرنا پڑے۔ کون جانتا ہے اس لیے ہم لوگ آپ کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا گزار ہیں۔

اے خدا! ہمارے بھائی! اظہر جاوید کو اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ عطا فرما۔ اس کی عبادت کیا تھی، ریاضت کیا تھی، ہم نہیں جانتے، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ محبتوں کا انسان تھا، احباب کے لئے جائے پناہ تھا۔ ایثار کا پیکر تھا۔ خلوص اور مہربانیوں کا منبع تھا اردو کا عاشق زار تھا۔ ادب کا قلندر بے مثال تھا۔ اس کی محبت کی پرواز ساری سرحدوں سے اوپر تھی۔ اس کے کردار کی روشن سازی حصار بندیوں سے بلند تھی۔ تو بھی اس کے مرتبے کو بلند کردے۔ اس کو رنج و محن کی ساری سرحدوں سے آزاد کردے۔ اور ایک اور ہی سکون اس کے کشکول میں ڈال دے کیوں کہ تیری رحیمانہ، کریمانہ اور مشفقانہ سنتوں سے یہ کوئی بعید نہیں۔ آمین۔

◆◆◆

ندا فاضلی (بھارت)

''...... ''تخلیق'' برابر مل رہا ہے۔ ہندوستان میں اس کی کافی چہل پہل ہے۔ آپ بڑی خوش اسلوبی سے فاصلوں کو نزدیکیوں میں بدل رہے ہیں۔ خدا آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے۔''

اظہر جاوید ایک دوست ایک ہم دم!

کلدیپ راج جوشی (بھارت)

اکثر اوقات انسانی رشتوں کی مٹھاس اور پکڑ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ حقیقت سامنے ہوتے ہوئے بھی انسان اس پر یقین نہیں کر پاتا یا کرنا نہیں چاہتا۔ میرے عزیز دوست نارنگ ساقی صاحب نے جب یہ جانکاہ خبر فون پر سنائی کہ اظہر جاوید ہمارے درمیان نہیں رہے تو ایسا لگا کہ جیسے ایک زلزلہ آ گیا ہو، جس نے سب کچھ درہم برہم کر دیا ہے۔ لیکن اِتنے دن گذر جانے کے باوجود دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ ہمارے چہیتے، پیارے، پرخلوص دوست اظہر جاوید اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں اور اب ہم ''اپنی بات'' نہیں پڑھ پائیں گے نہیں سُن پائیں گے۔ میں نے تو خیر یہ خبر فون پر سنی ہے لیکن لاہور کے احباب جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اظہر جاوید کو لحد میں اُتارا اور اپنی آنکھوں سے سپردِ خاک ہوتے دیکھا اُن کو بھی ابھی تک یہ یقین نہیں ہوگا کہ سب کا پیارا دُلارا اظہر اس دنیا میں نہیں ہے۔

اظہر جاوید سے میرا تعارف میرے قریبی دوست اور معتبر کہانی کار مرحوم کیول شوری کی وساطت سے ہُوا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں شاید 96-95ء کی بات ہے کہ کیول کا فون آیا کہ لاہور سے اظہر جاوید ایڈیٹر ''تخلیق'' بھارت آئے ہوئے ہیں اور میرے اصرار پر آج کی شام اشوک وہار دہلی کے لئے وقف کی ہے۔ پروفیسر این ڈی کپور (آذر) کے ہاں شام کو پہنچ جائیں گے۔ میں نے جلدی جلدی چند ادب دوست لوگوں کو مطلع کر دیا۔ ہم سب لوگ پروفیسر صاحب کی قیام گاہ پر آنے والے نئے مہمان کے خیر مقدم کے لئے حاضر ہوگئے۔ شام ڈھلے کیول شوری، اظہر جاوید اور جناب اوتار سنگھ جج صاحب کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ بس یہ تھی اظہر بھائی سے ہماری پہلی ملاقات۔ دورانِ ملاقات ہم سب اظہر بھائی کے ایک معتبر ادبی جریدے کے مدیر ہونے اور پاکستان سے آئے ہونے کے مدنظر کافی تکلّف برت رہے تھے لیکن آہستہ آہستہ اظہر کی باتوں میں بے تکلفی نکھر رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں تکلف کی سب چلمنیں سرک گئیں اور ماحول پوری طرح سے بے تکلف اور خوشگوار ہوگیا۔ دیر رات تک جام وسبو کے ہلکے ہلکے دور کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ شعروشاعری کی باتیں، پاکستان کی باتیں، ہندو پاکستان کے تعلقات کی باتیں۔ رات کافی گذر چکی تھی، وقت گذرنے کا احساس تک نہ ہُوا۔

ڈنر کے بعد اظہر جاوید نے اجازت چاہی اور موجود سب اصحاب کو ''تخلیق'' کے تازہ شمارے کی ایک ایک کاپی پیش کی۔ اظہر جاوید کی مکمل دل کش شخصیت، گفتگو، اپنا پن اور بے تکلفی، غرضیکہ اظہر کا جادو سب موجود لوگوں کے سر چڑھ کر بول

رہا تھا۔ اس مختصر سی لیکن یادگار رات کی یاد کافی دنوں تک دل و دماغ کو مہکاتی رہی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دو اور ملاقاتیں جناب نارنگ ساقی صاحب کے دفتر میں ہوئیں۔ آج جب اظہر جاوید ہمارے درمیان نہیں ہیں تو اُن کے ساتھ گذارے ہوئے اُن چند لمحات کو دل کے کونے سے نکال کر اُن کی یادوں کی خوشبو سے دل و دماغ معطر محسوس کر رہے ہیں۔

''تخلیق'' کا وہ شمارہ جو اظہر جاوید بھینٹ کر گئے تھے اُس کے اوراق پر نظر دوڑاتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے اُردو ادب کی نئی دُنیا نظر کے سامنے ہے۔ ''شاہراہ'' کے بعد کوئی پوری طرح سے ادبی جریدہ ہاتھ نہیں آیا۔ جس کی وجہ دہلی سے میری کافی مدت تک غیر حاضری تھی۔ میں نے فوراً کیول شوری کے ہاتھوں سالانہ چندہ تھما دیا اور ''تخلیق'' کے ساتھ پیار بھرا اٹوٹ رشتہ جوڑ لیا، تب سے آج تک میں نے سالانہ چندہ بھیجنے کی کبھی ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کی۔

یہ میری نااہلیت ہی سمجھئے کہ پاکستانی ادب سے میری علمیت بہت کم رہی۔ چند ناموں کے علاوہ مجھے کسی کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ تخلیق کے متواتر مطالعے سے پاکستانی ادب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آنکھوں کے سامنے اُبھر کر آیا۔ صحیح اور جاندار ادب کیا ہے، ادبی مباحثوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور اس سے کیا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ ''تخلیق'' کی تخلیقات سے ہی معلوم ہوا۔ ناصر شہزاد، انور سدید، منشا یاد، ڈاکٹر وزیر آغا محمود شام، کنول فیروز، شفیع عقیل، محسن بھوپالی، مجید امجد، ش صغیر ادیب، بشریٰ رحمٰن، مقصود الٰہی شیخ اور ان گنت ناموں کی ادبی عظمت کے بارے میں پتہ چلا۔ یہی نہیں سچ تو یہ ہے کہ بھارت کے کئی تخلیق کاروں جناب کشمیری لال ذاکر، نذیر فتح پوری، کرشن کمار طور، ڈاکٹر کیول دھیر، روپا صبا اور کئی دوستوں سے مزید شناسائی کا شرف بھی ''تخلیق'' کے ذریعے ہی حاصل ہوا۔ جناب نارنگ ساقی سے ''تخلیق'' کے ذریعے ہوئی ملاقات نے ایک مستحکم دوستی کا روپ لے لیا ہے۔ ''تخلیق'' کے مطالعے اور اظہر جاوید کے اصرار نے چالیس سال سے کہانی سے ٹوٹا ہوا رشتہ قائم کرنے میں مدد کی اور ''تخلیق'' کے صفحات پر میری کہانی ''راج کمار'' شائع ہوئی جس کی مرحوم ناصر شہزاد، جناب انور سدید اور کئی پاکستانی بھائیوں نے دل کھول کر پذیرائی کی۔

پچھلے چالیس برسوں سے اظہر جاوید نے ''تخلیق'' نامی شمع کو نامساعد حالات اور آندھی اور طوفان میں روشن رکھا۔ باہمی بے کسی نے اس کی اشاعت میں رکاوٹ نہیں پیدا ہونے دی۔ ''انجمنِ خیال'' کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کے درمیان ایک ادبی پُل کی تعمیر کی جس پر سے گذر کر میرے جیسے کئی کم علم فیض یاب ہوئے۔ میں پاکستانی بھائیوں سے التجا کروں گا کہ میرے بھائی اظہر جاوید کے ہاتھوں روشن کی گئی اِس ''تخلیق'' نما شمع کو مدھم نہ ہونے دیں۔ بھارت کے ادیبوں، کہانی کاروں، قارئین کا تعاون اور بھرپور ساتھ آپ کے ساتھ رہے گا اور سب کو آپ شانہ بشانہ موجود پائیں گے۔

''تخلیق'' کے کسی شمارے سے نوٹ کئے ہوئے اس شعر کے ساتھ اظہر جاوید کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

◆◆◆

خاک درِ مے فروش......

مجید اختر (لاس اینجلس)

کاغذ کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ

ادب کے قارئین کی تعداد میں حیرتناک حد تک کمی

کتب ورسائل کے ڈاک خرچ میں سو فیصد اضافہ

شعرا و ادبا کا اعزازی کاپی حاصل کرنے پر اصرار

مستقل خریداروں میں روز افزوں کمی

خریداروں کی طرف سے زرِ تعاون کی ادائیگی میں افسوسناک تساہل

بیرونی ممالک میں رہائش پذیر نسبتاً امیر متشاعروں اور نیم ادیبوں کے ہزاروں درہم و دینار و ڈالرز کے عوض ان کی رپورٹس، تصاویر، تقاریب و گوشہ ہائے ادب کی اشاعت سے انکار۔

ہم عصر ادبی رسالوں اور نئی ادبی کتابوں کے مفت اشتہار

حکومتی، نیم حکومتی اداروں، جامعات کے شعبہ ہائے اردو ادب اور دیگر اداروں کی مسلسل سرد مہری

مدیر کی بڑھتے ہوئے میڈیا اور اس کی چمک دمک سے مسلسل دوری

یہ ان سینکڑوں مسائل میں سے چند ایک ہیں جو فوری طور پر میرے ذہن میں آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسائل ہم میں سے کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جو پندرہ کروڑ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کے ملک میں ایک ہزار یا اس سے بھی کم تعداد میں چھپنے والے ایک ادبی رسالہ کو درپیش ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے چھوٹے بڑے، اہم اور غیر اہم، مقبول اور گمنام رسائل ان آلام کی تاب نہ لاتے ہوئے بالآخر بند ہو گئے۔ ان رسائل کے بند ہونے پر حیرت کیسی؟ حیرت تو ان پر ہے جو ان مسائل کے باوجود مستقل چھپتے رہے یا چھپ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز میں کسی ادبی رسالہ کے اجراء کی خبر ایک یقینی خسارے کی پیشن گوئی ہوا کرتی ہے۔ ایسے میں کوئی ایک شخص ایک ادبی رسالے کو جاری رکھے اور تاحیات جاری رکھے۔ 42 برس تک اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ

آئے تو اسے اس دشتِ بے کنار کا ایک مجنوں ہی کہا جا سکتا ہے۔

اظہر جاوید...... تمہیں سلام۔ تم زندگی میں بھی ایک روشن مثال تھے اور موت کے بعد بھی آنے والے جہانوں کے لئے مشعل راہ اور روشن ستارہ بن گئے۔

اب ہم اس پندرہ کروڑ کے اژدھام میں تم جیسا سادہ لوح، مستقل مزاج اور درویش صفت انسان کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں۔

پتہ نہیں تم کون سی مٹی سے بنے تھے...... یہاں تو ایک ہجوم ہے جو بین الاقوامی مشاعروں اور مذاکروں میں شرکت کیلئے تڑپ رہا ہے۔ ایک طرف بڑھتے ہوئے ٹی وی چینلز پر پروگرام حاصل کر لینے کی جنگ جاری ہے۔ لوگ باگ اپنی تمام تر توانائیاں اور تمام تر تعلقات کو کام میں لا رہے ہیں۔ ایک تم تھے کہ نہ شہرت کی چکا چوند نے تم پر کوئی اثر کیا نہ روپے پیسے کے لالچ نے۔ حالانکہ تمہارے پاس تو اس مہنگائی میں بچے پالنے کے علاوہ بھی ایک بہترین عذر تھا، تخلیق کو زندہ رکھنے کا۔ لیکن تم نے شاید یہ طے کر لیا تھا کہ بچوں کے ساتھ ساتھ تخلیق کو بھی رزق حلال پر ہی زندہ رکھو گے۔

خدائے برتر نے تمہاری نصرت کی۔ 42 سال تم میسر رزق پر توکل کئے اپنے اس جنون کی آبیاری کرتے رہے۔ مجھ سمیت کتنے ہی لکھنے والوں کی تم نے اس وقت حوصلہ افزائی کی جب ہم نو واردان دانش گاہ ادب ابھی گھٹنوں چل رہے تھے۔ ہمارے ڈرے ڈرے، چھوٹے چھوٹے، سہمے سہمے اور لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر تم نے ہمارا ہاتھ تھاما ہمیں اعتماد بخشا اور شاہراہِ ادب کی طرف آہستہ سے ہمیں دھکیل کر اس باپ کی طرح ایک طرف کھڑے خوش ہوتے رہے جو اپنے بچے کو اسکیٹنگ رنگ میں اسکیٹس پر اڑتا پھرتا دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

تم نے مڑ کر بھی کبھی نہیں جتایا کہ فنون و اوراق و ادبِ لطیف و سیپ میں چھپنے والو، ٹی وی اور فیس بک پر راج کرنے والو، تمہیں یاد ہے کہ تمہاری کچی پکی تحریریں سب سے پہلے کہاں چھپتی ہیں......

دل تمہاری مغفرت کیلئے ہمہ وقت دعا میں ہے اور سر تمہاری عظمت کے سبب جھکا ہوا ہے۔

روئے من و خاکِ درِ مے فروش

◆◆◆

ڈاکٹر خلیق انجم (بھارت)

''آج صبح کی ڈاک سے ''تخلیق'' کا تازہ شمار موصول ہوا۔ بہت کم ایسے ادبی رسالے ہیں جنہیں ملتے ہی میں اپنی مصروفیات کے باوجود شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا ہوں۔ تخلیق بھی ان ہی چند رسالوں میں ہے۔ جنہیں میں شوق سے پڑھتا ہوں۔''

اظہر جاوید

چند نادر و نایاب تصویریں

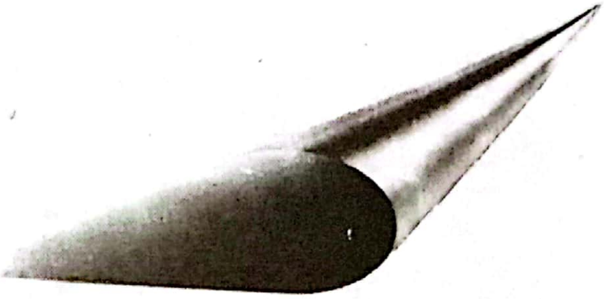

CamScanner

١

نام و نمود سے تو رہے بے نیاز ہم
گم نامیوں میں ڈوب کے شہرت تلاش کی

اظہر جاوید

CS CamScanner

انڈیا کے دورہ کی ایک نادر تصویر (دائیں سے بائیں) کشمیری لعل ذاکر، اظہر جاوید، نارنگ ساقی، قتیل شفائی، گلزار

(دائیں سے بائیں) قتیل شفائی، موسیقار روی، اظہر جاوید، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سلیم اختر

CamScanner

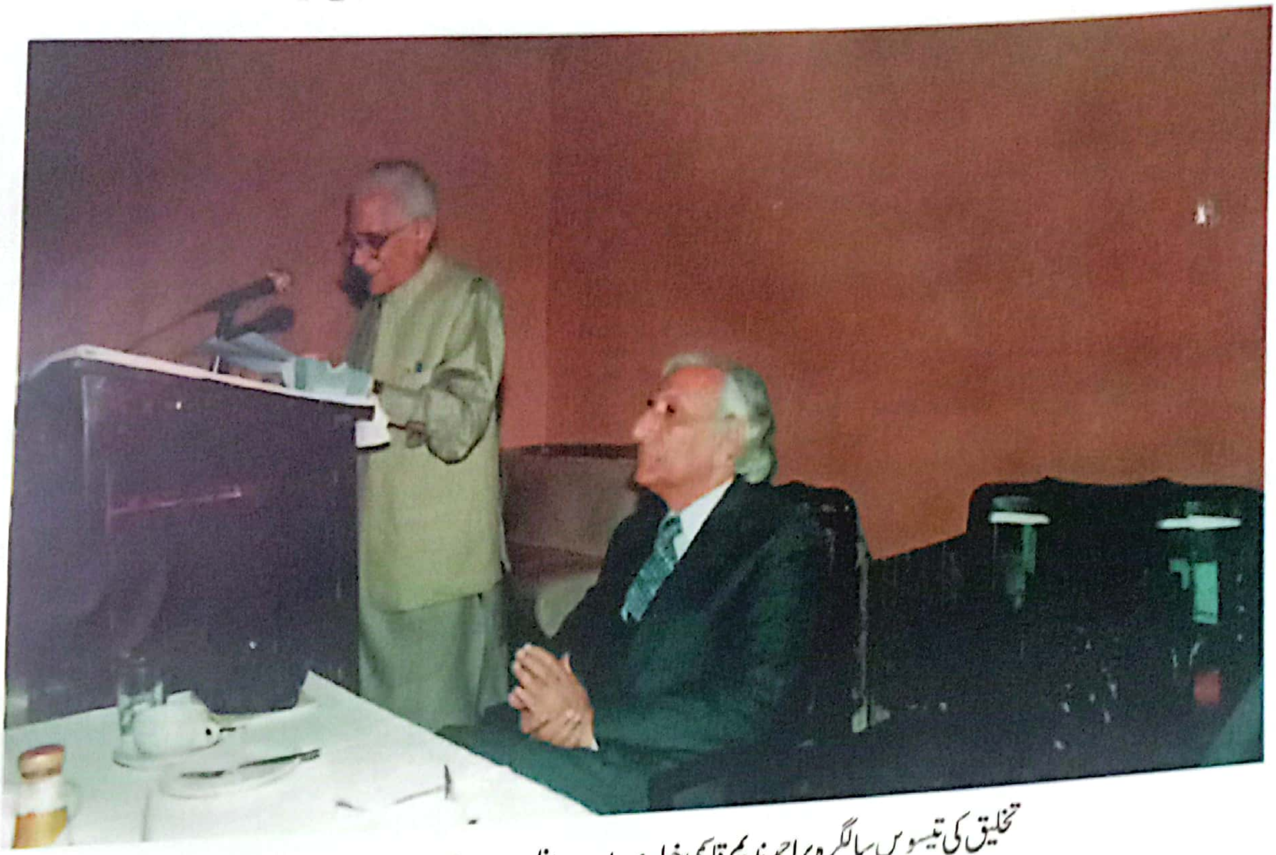

تخلیق کی تیسویں سالگرہ پر احمد ندیم قاسمی خطبہ صدارت، اظہر جاوید عقیدت سے سن رہے ہیں۔

اظہر جاوید صاحب کا بانو قدسیہ صاحبہ سے عقیدت کا ایک انداز۔

(دائیں سے بائیں) یونس جاوید، انور سدید، اظہر جاوید، سلیمہ ہاشمی اور ڈاکٹر ذکریا ایک تقریب کے دوران۔

(بائیں سے دائیں) اظہر جاوید، سعادت حسن منٹو، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ، اظہر جاوید کی شاعری کی پہلی کتاب "غم عشق گر نہ ہوتا" کی تقریب رونمائی کے دوران۔

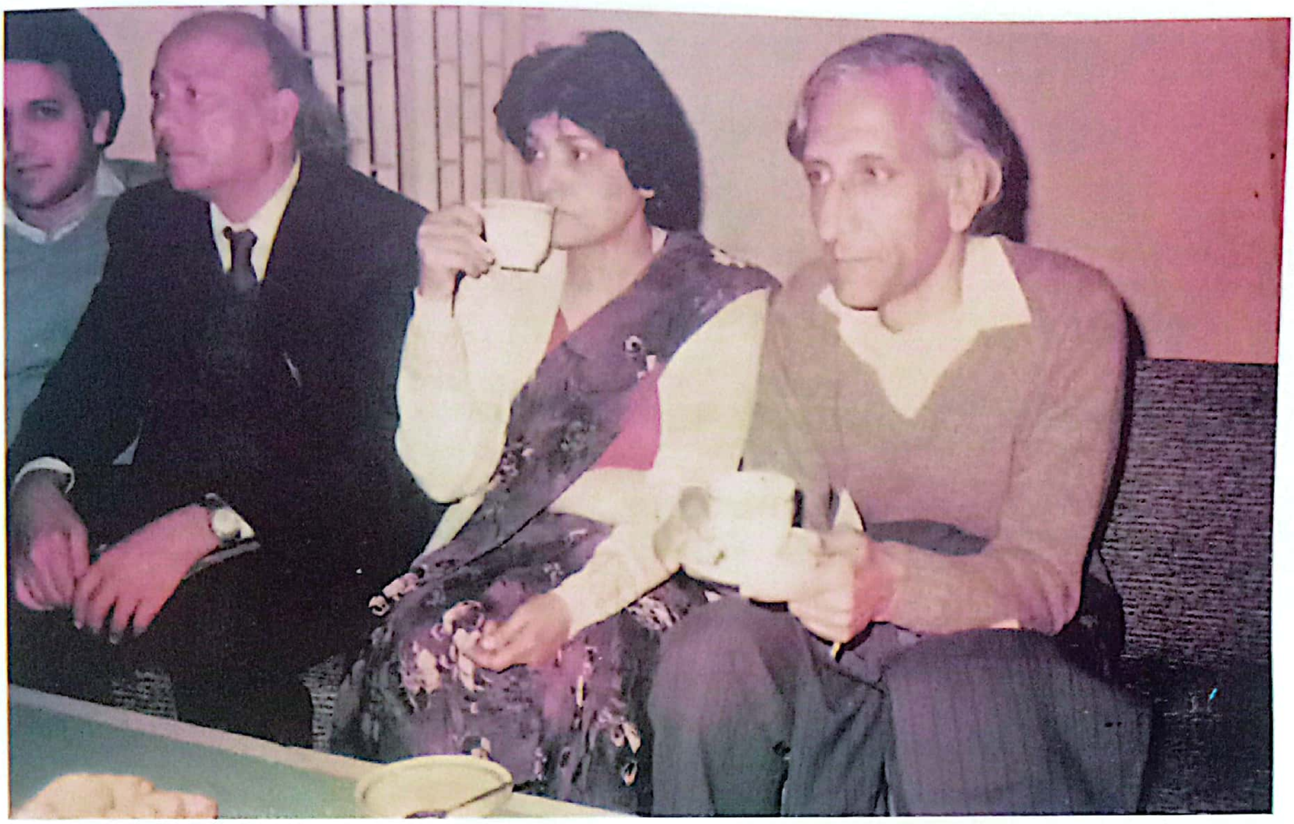

(دائیں سے بائیں)اظہر جاوید، کشورناہیداور حبیب جالب

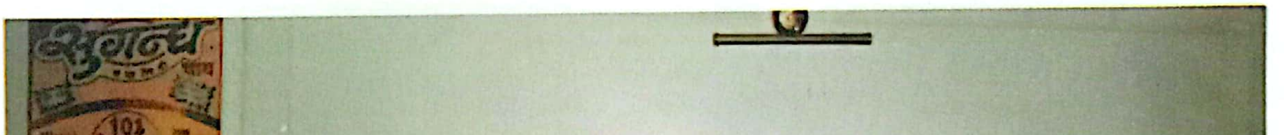

(بائیں سے دائیں)اظہر جاوید، احمد فرازاور سلطان رشک (مدیر"نیرنگ خیال")

CS CamScanner

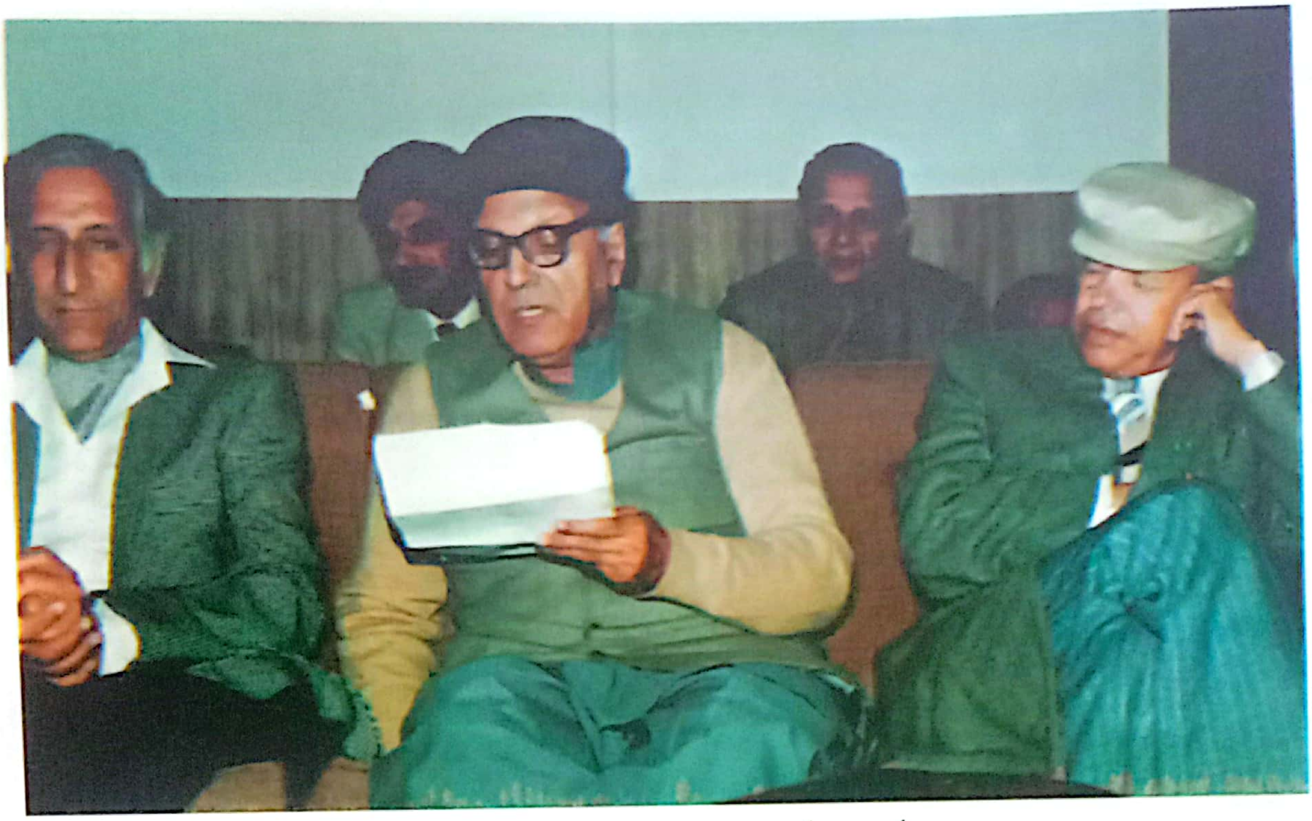

(بائیں سے دائیں) اظہر جاوید صاحب، انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا

(بائیں سے دائیں) اظہر جاوید اور ایلس فیض

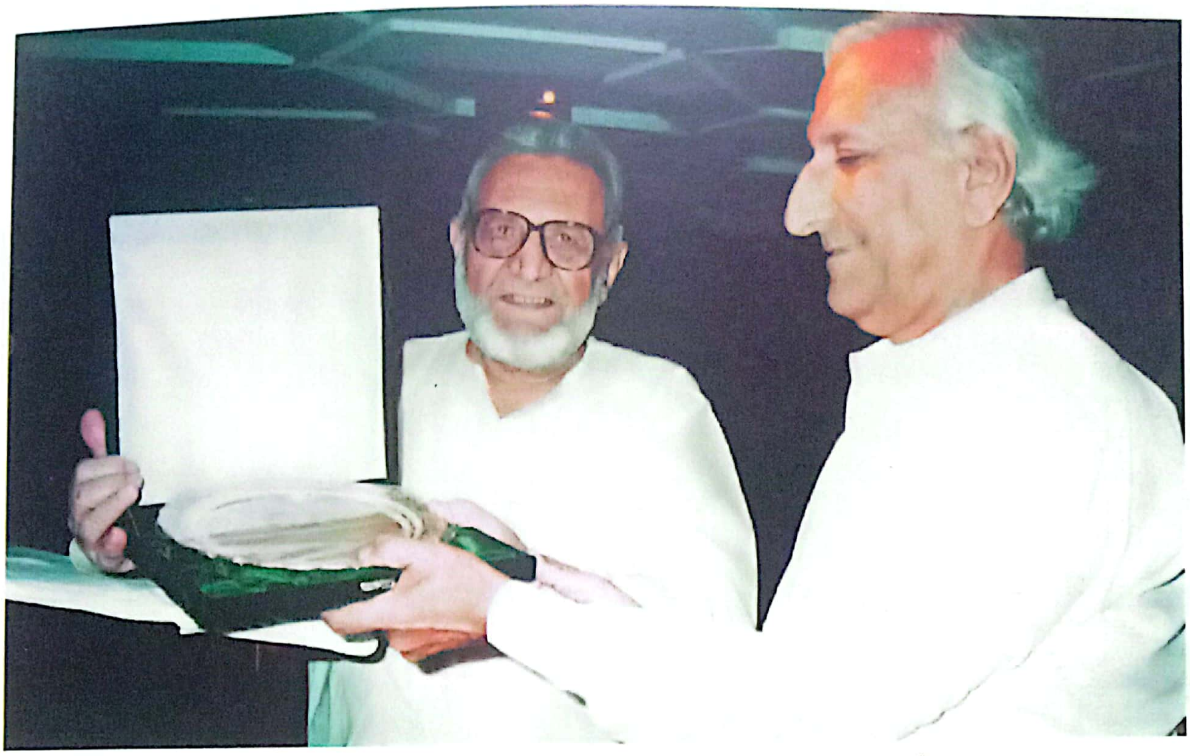

''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی تعارفی تقریب میں اشفاق احمد خان نے اظہر جاوید کو شیلڈ عطا کی۔

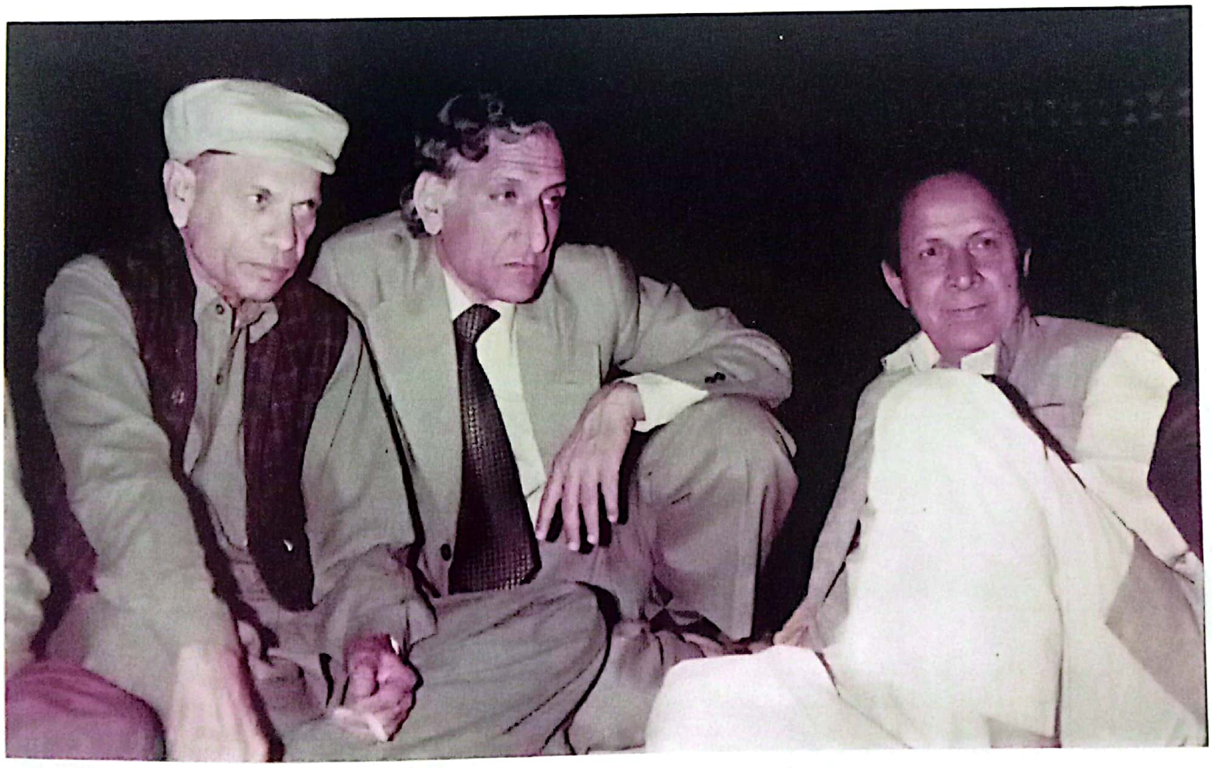

1976ء کی نایاب تصویر (دائیں سے بائیں) قتیل شفائی، اظہر جاوید اور اسرار زیدی ایک مشاعرے میں

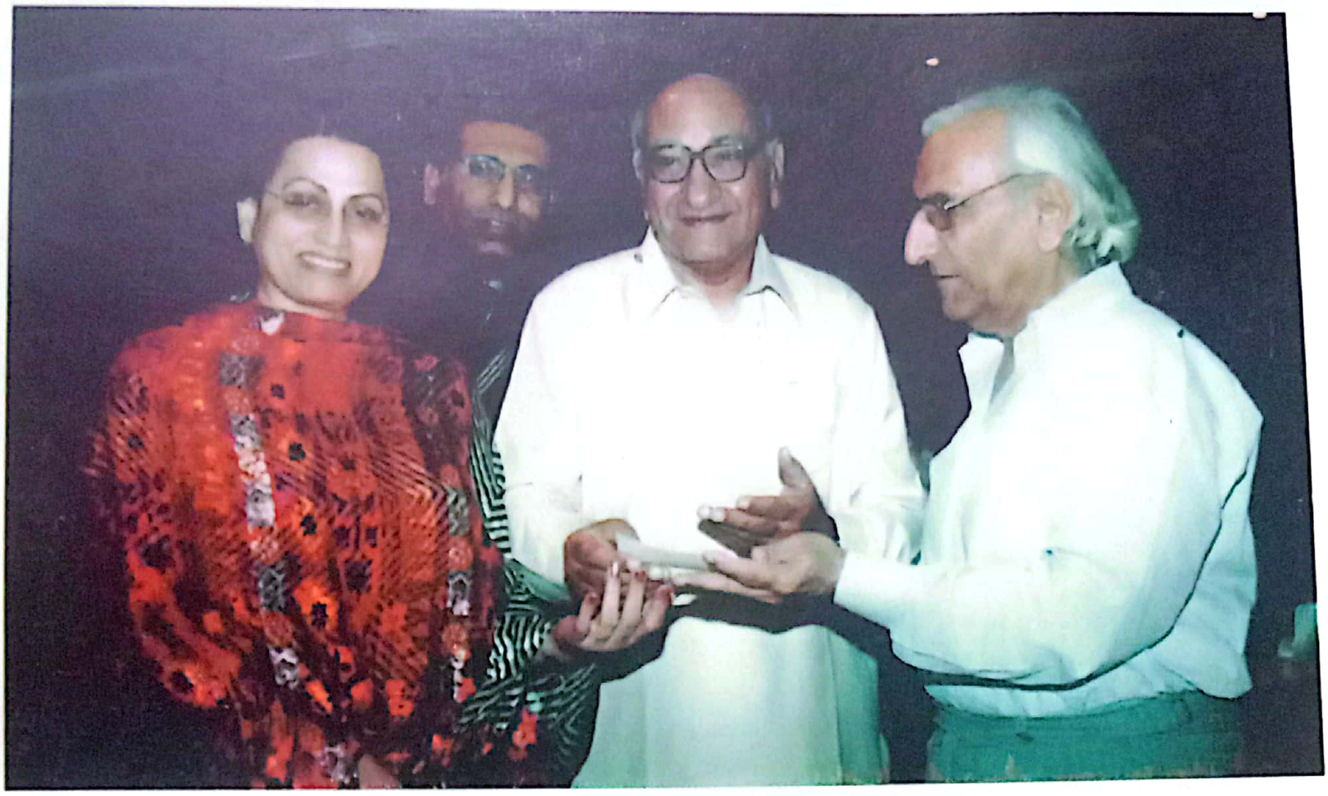

(دائیں سے بائیں) اظہر جاوید، حمید اختر، طاہر منظور اور غزالہ نثار

اظہر جاوید صاحب دفتر تخلیق مکلیگن روڈ لاہور (1973)ء اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروف

CamScanner

(بائیں سے دائیں) اظہر جاوید ڈاکٹر سلیم اختر، احمد ندیم قاسمی، رام لعل، ابصار عبد العلی، انتظار حسین، ڈاکٹر آغا سہیل 1980ء کی نایاب تصویر

(دائیں سے بائیں) اعجاز احمد، محمود احمد، ملک اسلم، وقار عظیم، اظہر جاوید، قتیل شفائی، مرزا ادیب، موجد، توصیف احمد خان، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری اور خدا بخش بوچہ 1979ء

CamScanner

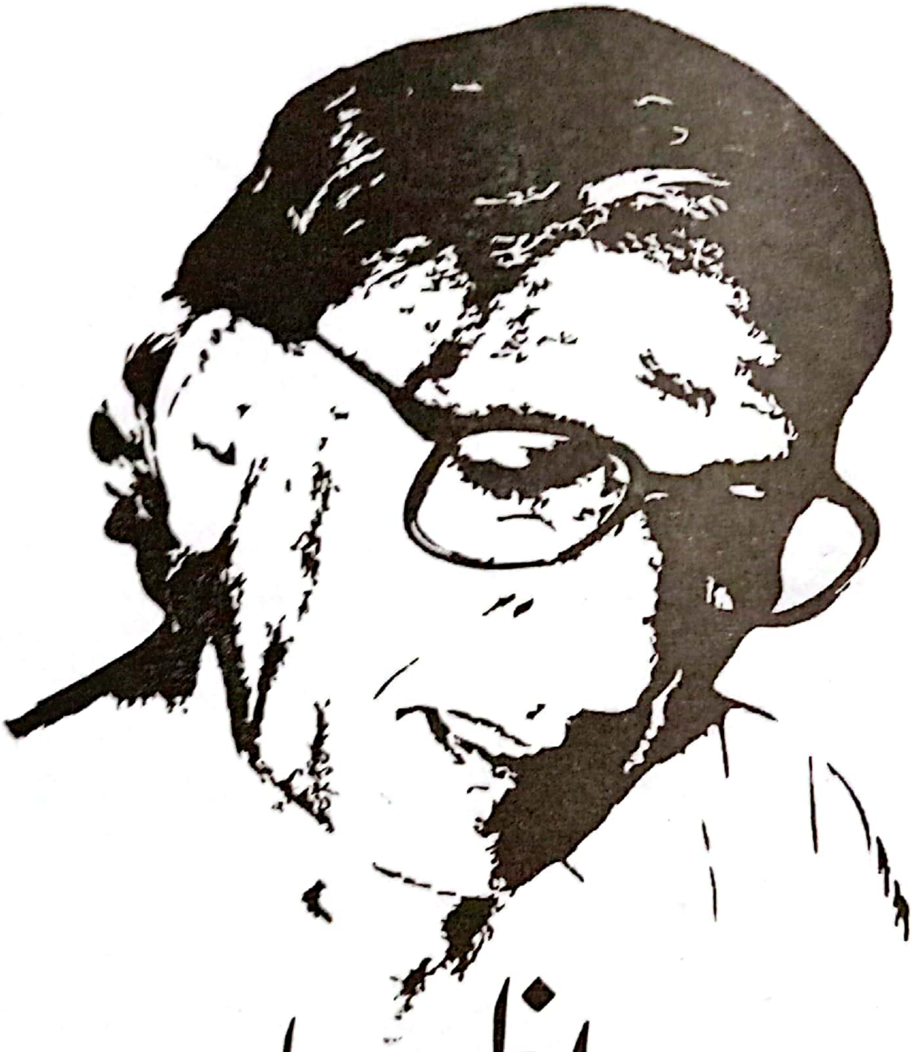

اظہر جاوید

اپنی تحریروں کے آئینے میں

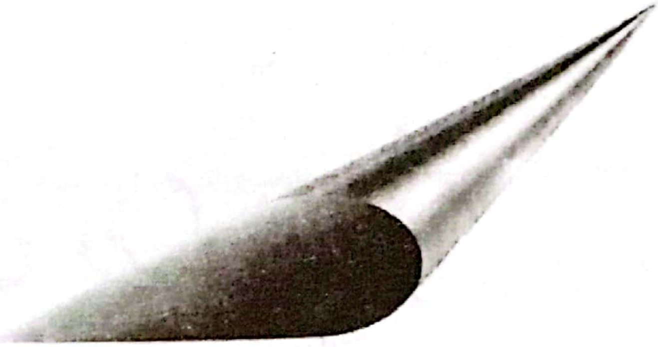

CamScanner

زندگی میں راحتیں ملتی ہیں تھوڑی دیر کو
سانس کی بھی آہٹیں ملتی ہیں تھوڑی دیر کو

اظہر جاوید

CamScanner

اپنی بات

اظہر جاوید

''تخلیق'' دسمبر 1990ء

قطرہ، قطرہ، ریزہ ریزہ اور دھجّی دھجّی کرتے ایک سال اور گزر گیا۔

وہ برہمن، جو آنے والے برس پر یہ کہا کرتے تھے، کہ یہ سال اچھا ہے، اب انھوں نے بھی ایسا کہنا چھوڑ دیا ہے۔

کل کیا ہوگا......؟ یہ نہ گزرے کل میں کسی کو خبر تھی نہ آئندہ کل کو ہوگی۔ اور ہم ایسے بے کل لوگ آج کا دن ہی گزار لیں، صبح سے شام کر لیں تو یہی بہت غنیمت ہے۔

''تخلیق'' کے ہر شمارے میں 'انجمن خیال' (خطوط) کے صفحات بڑھتے جا رہے ہیں۔ جتنے خط چھپتے ہیں، چھپنے تک اتنے اور بھی آ جاتے ہیں۔

ان خطوط سے، ادب کی کوئی خدمت ہوتی ہے یا نہیں، یہ سوچنا میرا کام نہیں، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگ محبت کی بات کرنے کو ترسے ہوئے ہیں، محبتوں کے لئے ترسے ہوئے ہیں۔

یہاں، وہاں...... ہر شہر میں۔ ہر ملک میں یہی عالم ہے۔

میرے اندر، آس پاس......سندھ میں......کینیڈا میں...... چاروں طرف دھڑکنوں میں ایک ہیجان ہے۔ اظہار کا سیلاب ہے۔ سب لوگ کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر اس کی کوشش میں ہیں، یا اس انتظار میں کہ کوئی سننے والا تو ہو۔ ان کے اضطراب کو جذب کرنے والا تو ہو۔

اے خداوندِ کریم، آنے والے سال کو محبتوں کا سال بنا دے......

انھیں بھی محبت مل جائے اور ان کے طفیل مجھے بھی......

آپ آمین تو کہہ دیں۔

اظہر جاوید

....

''تخلیق'' اکتوبر1994ء

شاعر نے کہا تھا ؎

جو بھی حساس ہے زمانے میں
اس سے کہہ دو کہ گھٹ کے مر جائے

میں پچھلے دنوں کراچی میں تھا اور وہاں مَیں نے ہر طرف یہی عالم دیکھا۔ وہ روشنیوں کا شہر، وہ محبتوں کا مامن، کتنے ہی سال سے جل رہا ہے۔ خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ مایوسی اور بے چارگی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اہلِ دل پریشان ہیں، صاحبِ فکر بے یقین ہیں، ادیب، شاعر، صحافی...... یا کوئی بھی عام شہری جس سے بھی بات ہوئی، وہ دردمندی کا اظہار کر رہا تھا...... وطن سے محبت کا دعوے دار تھا، مگر...... پھر وہ کون لوگ ہیں جو گولیاں برسا رہے ہیں، لاشوں کا بازار سجا رہے ہیں۔ مرنے والوں کی تو شناخت ہو جاتی ہے، لیکن مارنے والے کیوں نہیں پہچانے جاتے؟ سب یہی سوال پوچھتے ہیں۔

کسی دانشور نے کہا...... یہ ہماری مجموعی بے حسی کا نتیجہ ہے...... میں نے عرض کی...... بے حسی نہیں، بے بسی کی بات ہے...... آج کے اہلِ اختیار ہوں یا گئے کل کے...... سب جانتے ہیں کہ مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیسے ہو......؟ مگر رموزِ خسروی اور اسرارِ حکمرانی ایسے ہیں کہ (شاید) سب کو ایسی ہی صورتِ حال گوارا ہے۔

غیر ملکی ایجنٹوں کا حوالہ دے کر اور نامعلوم دہشت گردوں کی دہائی دے کر نہ جانے کیا کیا مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ لیکن میں نے اس بار شدت سے محسوس کیا کہ نہایت مثبت سوچ رکھنے والے، روشن خیال، محبِّ وطن اور دردمند اہلِ قلم بھی مایوس تھے...... انتہائی لاچاری کا شکار تھے۔

کراچی کے بانکپن، پاکستان کے نکھار کو اور وطن کی دائمی بہار کو کون بچائے گا، کیسے بچائے گا......؟ عام شہری تو کیا اب صاحبِ رائے اور صائب الرائے بھی مجبور اور بے آس دکھائی دیتے ہیں۔

....

اظہر جاوید

''تخلیق'' جون1996ء

عجیب بے چینی ہے، اضطراب ہے، بے کلی ہے، بے یقینی ہے......

شعر کہنے والے...... افسانے لکھنے والے...... کہانیاں بُننے والے...... دوسروں کے درد کی فریاد سننے والے سب کے سب مطمئن نہیں...... خوش گماں نہیں......

سکون اور چیز ہے...... اطمینان دوسری بات ہے......

یہاں، وہاں...... پاکستان میں...... ہندوستان میں...... یورپ میں...... امریکہ میں...... دور دراز کی بستیوں میں، خلیجی ریاستوں میں...... جہاں جہاں بھی، جو لکھنے والا ہے، سوچنے والا ہے وہ مضطرب ہے...... بے اطمینان ہے۔

برصغیر پاک وہند کے معاشرتی حالات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ یہاں والوں کا کرب سمجھ میں آتا ہے مگر باہر کے خوش حال ملکوں میں ان دیاروں سے روٹی روزی کی تلاش میں نکلے ہوئے اہلِ دل بھی غیر مطمئن ہیں......ان کی جڑیں انہی دیسوں میں ہیں......ان کی پہلی پہلی محبتیں یہیں کہیں بھٹک رہی ہیں......وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو ان کی تحریروں میں یہاں کا ایک ایک روگ، سوگ بن کر امڈ آتا ہے۔

''تخلیق''......یا ایسے ہی دوسرے ادبی رسائل دیکھیں، ان میں ایک سے بڑھ کر ایک اہلِ قلم شامل ہوتا ہے......دل کو چھونے اور ضمیر کو جھنجھوڑنے والی ان کی تحریریں ان رسائل میں چھپی ہوتی ہیں......مگر پھر بھی......خطوط کے صفحات دیکھیں، تو وہ بھی اظہار کے مختلف پہلوؤں اور اشاروں سے بھرے ہوتے ہیں۔

بہت کچھ کہہ لینے، بہت کچھ بیان کر دینے کے باوجود ذہن و دل میں سوچوں کا طوفان موجیں مار رہا ہوتا ہے......''تخلیق'' کے ہر شمارے کی ضخامت، بہت کوشش کے باوجود گرفت میں نہیں آتی......جتنا کچھ چھپتا ہے، اس سے بہت زیادہ بچا پڑا رہتا ہے......اس میں نئے لکھنے والوں کی تخلیقات بھی ہوتی ہیں اور معتبر اور نامور اہلِ قلم کی بھی......اس پہ مستزاد ''انجمن خیال (خطوط) کے صفحات کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے......لوگ اور کچھ......اور زیادہ کہنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں، ان میں ذاتی شکایات بھی ہوتی ہیں اور تنقیدی اشارات بھی......کوئی کوئی بے معنی بات بھی اور بہت زیادہ سمجھنے سمجھانے کی حکایات بھی......

میں کاٹ چھانٹ نہیں کرتا......روکتا ٹوکتا نہیں......

جن اہلِ علم سے میں نے ادب کا مسلک پایا ہے، اور صحافت کا چلن سیکھا ہے......ان کا فرمان ہے......سوچوں کی بھڑاس نکلنے دو......دلوں کی پیاس بجھنے دو......میں کسی بحث میں شامل نہیں ہوتا، کسی اعتراض کا حصہ نہیں بنتا......کئی بار خیال آیا کہ اپنی رائے دے دوں، مگر جانب داری کے الزام سے بچتا رہا......

میں ایک بات سمجھ گیا ہوں......(آپ لوگوں نے بھی محسوس کی ہوگی......کہ یہ سب اسی بے یقینی کا فیضان ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے حالات بکھیر دیئے گئے ہیں، ایسی فضا انڈیل دی گئی ہے کہ اداروں پر سے، کرداروں پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے......ہمارا اعتبار ختم ہو گیا......ہم بے یقینی کا شکار ہو گئے ہیں......ہم متاع کوچہ و بازار ہو گئے ہیں......شعوری طور پر نہ سہی......لاشعوری طور پر، ہمیں شاید اپنی تحریروں پہ، اپنے آپ پہ بھی، اعتبار نہیں رہا......اختیار نہیں رہا۔

کچھ شمارے پہلے، لکھنے والی ایک معتبر خاتون نے ایک دوسری معزز خاتون کے ایک لفظ 'ہجرت' پر اعتراض داغا۔ کہ ہر ترکِ وطن، ہجرت نہیں ہوتی......انہیں گمان تھا کہ اس سے اسلامی شعائر کی بے حرمتی ہوئی ہے۔

معترض خاتون، افسانہ نگار بھی ہیں، شاعرہ بھی......سلیقے سے لکھتی ہیں، اور تہذیب و شائستگی کی پرچارک ہیں......مگر کیا انہوں نے، برسوں سے جنم لینے والے اردو ادب ہیں، کعبہ عشق، مدینہ دل، حدیث دلبراں اور حضورِ یار جیسی بیسیوں ترکیبیں اور تمثیلیں ملاحظہ نہیں فرمائیں؟......ان لفظوں کے لکھنے والے کوئی ہما شُما نہیں تھے......صاحبِ فکر تھے......اہلِ خبر تھے......

مگر بات وہی بے یقینی کی ہے، جو اس دور پر زیادہ ہی چھا گئی ہے......اردو ادب کی معلوم تاریخ کئی صدیوں پر محیط

ہے......تب سے اب تک......خدا کا لفظ سینکڑوں، لاکھوں، کروڑوں بار استعمال ہوا ہے......شعر و ادب میں......معصوم دعاؤں میں......لکھنے والوں نے اسی سے عظمت شہرت بھی پائی اور مانگنے والوں نے اسی نام پر رحمت اور برکت بھی......

اب کچھ سال سے، اچانک کسی کو خیال آیا ہے کہ یہ لفظ عربی کا نہیں، اللہ جل شانہ، کے مقدس ناموں میں سے نہیں، اسے کہنے، لکھنے اور بولنے سے شرک ہوتا ہے...... ماشاءاللہ......سبحان اللہ......

ہمارے ابلاغ کے اداروں، ٹیلی وژن اور ریڈیو کا ایمان تو ہمیشہ سے کمزور رہا ہے، ڈانواں ڈول رہا ہے، انہوں نے فوراً ''خدا حافظ'' کو ترک کیا اور اپنی زبان اور ایمان کو راسخ کرنے کے لئے اللہ حافظ کہنا شروع کر دیا......(اس پر غیروں نے اشکلے بھی چھوڑے...... بھارت کے کالم نگاروں نے لکھا......''پاکستان میں 'خدا' کو ترک کر دیا گیا ہے''۔)

اللہ اللہ......کیا شان ہے کہ ایک لفظ کی بدولت ان داناؤں کو جنت کی نوید اور کلید مل گئی ہے۔

ہمیں کیا ہو گیا ہے......ہم اتنے غیر مطمئن اور اتنے بے یقین کیوں ہو گئے ہیں......ہم دلوں کی آواز کیوں نہیں سنتے......جذبوں کی بات کیوں نہیں سمجھتے......نیتوں کا راز کیوں نہیں جاننے کی کوشش کرتے......جو روح کا عذاب ہے اسے دور کرنے کی سعی کیوں نہیں فرماتے......

شک......شک......شک......! بے یقینی، بے یقینی، بے یقینی!!

میں، آپ......ہم سب......کیوں لفظ کی پکڑ دھکڑ میں لگے ہوئے ہیں......کیوں کسی کی ذات پر حملہ کرتے ہیں، کیوں کسی کے غم کا مذاق اڑاتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے کہا تھا......یہ نہ دیکھو، کہنے والا کون ہے، یہ سنو، کہ کیا کہہ رہا ہے......اور اسی طرح یہ بھی تو کسی سیانے کا قول ہے......دیوار پہ لکھی تحریر کو، کم ترجان کر رَد نہ کرو، اسے سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی کوشش کرو......

اس بار میری بات (اپنی بات) بہت لمبی ہوگئی......معذرت......سو بار معذرت!!

اظہر جاوید

....

''تخلیق'' اپریل 2002ء

ایک پرانی بات پھر دہرائی گئی ہے

ایک پھٹا ڈھول پھر بجایا گیا ہے

فحاشی کیا ہے۔(اور کیوں ہے؟) اس کا چرچا پھر عام ہوا ہے۔

اخلاق (اور اسلام) کس حد تک اجازت دیتا ہے، اور کہاں حد لگاتا ہے اس پر مختلف علماء کرام اور دانشوران عظام کے متضاد بیانات آئے ہیں۔

بات ادب (تہذیب) اور علم و ادب کی نہیں، اس سے بھی آگے گزر گئی ہے۔

پاکستان میں کیا روا ہے اور کیا ناروا۔اس کی سند کہاں سے ملے؟ تصورِ پاکستان کے خالق، مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فرزند کا بیان تو جھنجھوڑ دینے والا ہے۔وہ کہتے ہیں......علامہ گانا بھی سننے کے شوقین تھے اور رقص بھی دیکھ لیتے تھے؟ فرزندِ اقبال کہتے ہیں......فحاشی کیا ہے......؟اس کا فیصلہ پولیس نے نہیں کرنا۔

ہوتا عجب ہے۔ پہلے صاحبانِ اختیار کسی بھی معاملے میں ڈھیل دیتے ہیں پھر اچانک پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے۔نہ کوئی وارننگ نہ کوئی شوکاز نوٹس۔

کہا گیا (اور وہ بھی ایکشن لینے کے بعد) کہ تھیٹر سٹیج پر فحش رقص ہو رہے ہیں۔رقاصائیں تو ہاتھ نہ لگیں، ڈراما کرنے والے دوسرے اداکار ساتھی دھر لئے گئے، اور ان کے ساتھ ایسا سلوک ہوا جو چوروں اچکوں کے ساتھ ہونا چاہئے (مگر نہیں ہوتا)۔

خبرنگاروں نے لکھا کہ رقاصاؤں کو خود موقع دیا گیا کہ وہ کھسک جائیں۔اس پر پولیس نے طیش کھایا۔تب ایک معروف رقاصہ نے الزامات لگائے کہ فلاں، بچولا، مجھے فلاں ناظم کے حضور پیش کرنا چاہتا تھا۔انکار پر یہ سب پولیس ایکشن ہوا ہے۔اسی رقاصہ نے پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا، ہم اگر ان کے لئے ناچیں تو بجا، ورنہ فحاشی میں دھر لئے جاتے ہیں۔

کئی سال پہلے، ایوب خاں کے دورِ اقتدار میں ایک برادر اسلامی ملک کا شہنشاہ لاہور آیا تو پاکستانی ثقافت کا نمونہ پیش کرنے کے لئے ایک معروف اداکارہ کو بلوایا گیا......اور یوں بلوایا گیا کہ فلمی حلقوں اور آدھے شہر پر ''بدمعاشی'' سے حکومت کرنے والے ایک پہلوان کو یہ ''فریضہ'' سونپا گیا۔اس بدمعاش حاکم نے اداکارہ کو دھمکی دی کہ سیدھے سبھاؤ نہیں آؤ گی، تو اٹھا کر لئے جائیں گے۔

اداکارہ نے جھنجھلا کر نیند کی گولیاں پھانک لیں۔

بروقت طبی امداد ملنے پر وہ بچ گئیں اور حبیب جالبؔ نے انہیں یوں خراج پیش کیا:

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

ایک اور بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔تب بھی، اور آج بھی، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ثقافت کیا ہے، فحاشی کسے کہتے ہیں؟

سعادت حسن منٹو پر دسیوں مقدمے چلے۔کچھ میں بری ہو گئے کبھی کبھی جرمانہ ہو گیا۔ان مقدموں میں برصغیر کے نامور صاحبانِ علم اور ادیب شاعر گواہی کے لئے پیش ہوتے رہے، مگر عدالتی فیصلوں کے باوجود، یہ تصفیہ نہ ہو سکا، فحاشی کیا ہے؟

خان فضل الرحمٰن کی کتاب کو فحاشی کے الزام میں بین کر دیا گیا، مگر اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ باطل کر دیا۔

کتنے واقعات بیان کرتا جاؤں۔

کئی ایسی اخلاقی کتابیں ہیں، جو بچیوں کو جہیز میں دی جاتی ہیں، لیکن انہیں کوئی بھی بچی، اپنے سسر، جیٹھ، دیور کی موجودگی میں نہیں پڑھ سکتی۔

پھر بات کہاں ٹھہری؟

المیہ تو یہ ہے، یہاں فحاشی سمیت تمام الفاظ پر فیصلے وہ کرتے ہیں جنہیں ان کے لغوی معنی بھی نہیں آتے، علمی محاسن کی بات تو بعد میں ہوگی۔

ضیاالحق کے مارشل لاء میں دلبرداشتہ (دل برداشتہ) بھی سنسر کی زد میں آجاتا تھا، کہ اس میں دہری فحاشی نظر آتی تھی۔

وقت اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکا ہے، مگر ہم ذہنی پسماندگی کی تاریک صدیوں میں گھسٹتے پھر رہے ہیں؟

قائداعظم اور علامہ اقبال کو ''رول ماڈل'' بنانے اور بتانے والوں نے ثقافت، علم وادب اور قوم کو (بھی) ناظموں اور پولیس کے حوالے کردیا ہے۔

کیا پتا، میری اس تحریر میں بھی کہیں کوئی فحاشی آ گئی ہو؟ کیا پتا!

....

اظہر جاوید

''تخلیق'' فروری 2005ء

عیاں ہے ان کی عیاری، بڑا وہ نام رکھتے ہیں
وہ خود ملزم ہیں لیکن ہم پہ ہی الزام رکھتے ہیں

انہیں یہ زعم ہے وہ کج کلاہ و بندہ پرور ہیں
ہمیں یہ فخر ہے ہم فقر کا احرام رکھتے ہیں

ہم اپنے ہاتھ پر رکھتے ہیں سچائی کے سورج کو
وہ اپنی کہنہ سوچوں میں بھیانک شام رکھتے ہیں

ہمیں دعویٰ نہیں ہے نیک نامی، پارسائی کا
وہ خرقہ پوش ہیں، اپنی بغل میں جام رکھتے ہیں

انہیں یہ خوف ہے وہ لڑکھڑا کر گر ہی جائیں گے
وہ ہاتھوں میں تملق کی چھڑی کو تھام رکھتے ہیں

یہ ان کا شوق ہے جو جھوٹ کہنے پر انہیں ٹوکیں
زبانِ خامہ پر ان کے لئے دُشنام رکھتے ہیں

جو کرتے ہیں، بہت چرچا دیانت کا، امانت کا
وہ اپنا مول رکھتے ہیں، وہ اپنا دام رکھتے ہیں

بہت مغرور پھرتے ہیں، گھمنڈی بن کے رہتے ہیں
یہی ہیں لوگ، عبرت ناک جو انجام رکھتے ہیں

کبھی فریاد کرنے پر کسی دربار سے اُن کو
ملے بخشیش، اس کا نام یہ انعام رکھتے ہیں

ہمیشہ فیض پاتے ہیں وہی اظہرؔ زمانے میں
نہیں فن سے، خوشامد سے فقط جو کام رکھتے ہیں

....

اظہر جاوید

''تخلیق'' اگست 2010ء

تخلیق کے سرپرست اور میرے کرم فرما اکثر مجھے ہدایت دیتے، میری کوتاہیوں پر ٹوکتے اور تخلیق کو معیاری بنانے اور سنوارنے کے مشورے عطا کرتے رہتے ہیں۔

میں نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے، میں کم سواد ہوں......علم و ادب کی راہوں کا مسافر ہوں، منزل دور ہے، اتنی دُور کہ اس جنم میں تو ملنے کی امید نہیں۔

ایک سینئر، ممتاز ادیب، صحافی، فلم نگار، فلم ساز اور ہدایت کار مہربان نے ارشاد کیا ہے، میں ہر بار سڑے بُسے، جلے بُھنے، کڑوے کسیلے اور رونے دھونے والے ابتدائیے لکھتا ہوں۔ کبھی تو کوئی شگفتہ تحریر بھی ہو۔ کچھ نہیں تو بچپن میں سنا ہوا کوئی لطیفہ ہی بیان کر دیا کروں۔

میں شرمسار ہوا ہوں۔

میں خوش فہم تھا جیسے میں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا ہے...... جو کچھ ہم ایسے بے ثبات لوگوں، اہلِ قلم اور قلم، صاحبان ادب اور ادب سے ناروا ہو رہا ہے، اس کا تذکرہ کرتا ہوں۔ یارانِ تیز گام نے بہت کچھ پا لیا (اللہ مبارک کرے) جو پچھڑے ہوئے ہیں، جن کی حق تلفی ہو رہی ہے، جنہیں اور پیچھے دھکیلا جا رہا ہے اور جنہیں سیڑھی بنا کر ایوانِ بالا تک پہنچنے والے کیوں یہ کوشش بھی کرتے ہیں، یہ لوگ۔ سہارا بننے والے لوگ سر اٹھا کے انہیں دیکھ نہ لیں......ان کے خیال میں دیکھیں گے، تو مانگیں گے بھی!

یہ آہ وزاری اور فریاد گزاری مجھ اکیلے کی تو نہیں ہوتی۔

میں دو چار سچے واقعات عرض کر رہا ہوں۔ انہیں آپ لطیفے سمجھ کر ہی لطف لیں۔ بچپن میں سُنے اور بُنے ہوئے لطیفے آج کی منڈی میں نہیں کھپ سکتے۔ (اب تو پنجابی کی کھپ ہے یا سندھی کا کھپے)

ایک سفید پوش گھرانے کے آٹھ نو سالہ ذہین بچے نے باپ سے پوچھ۔ ابو! آپ کتنا پڑھے ہوئے ہیں؟

باپ نے کہا......بی۔اے۔

موجودہ فضا میں سانس لینے والے بچے نے نہایت کٹیلا سوال کیا۔

''ڈگری اصلی ہے یا جعلی؟''

اس کے بعد گھر میں دیر تک، بہت دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ گھر تو گھر ہی ہوتا ہے، اسمبلی ہال نہیں، جہاں شور شرابا، غُل غپاڑا اور مستیاں، سرمستیاں ہوتی ہیں۔

دوسرا واقعہ......اس پر میرے محترم سینئر کو کڑھنا چاہیے گا......

گھٹ کے مر جاؤں، یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ کے دفتر میں ایگزیکٹو سیکرٹری کے پاس مولانا غلام رسول مہر کے صاحب زادے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان تشریف لایا۔ نظر کمزور ہونے کی عینک لگی دیکھ کر اس کے ''پڑھاکو'' ہونے کی نشانی مل رہی تھی معلوم ہوا، ایک بڑے اخباری گروپ کے ٹی وی چینل پر، پروڈیوسر ہیں اور حالاتِ حاضرہ، معلوماتِ زمانہ اور عصری آگہی کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔

سیکرٹری صاحب نے تعارفی جملہ کہا۔

غلام رسول مہر کا نام سنا ہے......؟ نوجوان نے حیرت سے آنکھیں جھپکیں اور جھپکتا ہی گیا۔ کہا گیا......مولانا غلام رسول مہر۔اب کے اُس نے ''دیانت داری'' سے کام لیا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

مجھے نہیں پتا، مولانا مہر کے صاحب زادے کا کیا حال ہوا (بہ ظاہر یہی لگا، وہ ایسے صدمے سے پہلے بھی کئی بار دوچار ہو چکے ہیں......) میرا یہ حال تھا، میں اس نوجوان کو تو کچھ نہیں کہہ سکتا، اپنے ہی بال نوچ لوں......

ایسے نوجوان کو میڈیا پہ رہنے کا کوئی حق نہیں......؟

یقیناً یہی جواب ہونا چاہیے۔افسوس تو یہ ہے، ایسے نوجوانوں سے معاشرہ بھرا پڑا ہے، اور وہ ہم پر مسلط بھی ہے۔

دفتر 'تخلیق' میں ایک پڑھی لکھی، مہذب خاتون بیٹھی تھیں۔ ماشا اللہ ان کی چار پانچ نثری اور شعری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اتنے میں حاجی لق لق کے پوتے آئے...... میں نے رسمی تعارف کروایا۔ خاتون کے علم و فضل کی بہت توصیف کی۔ انہیں بتایا، یہ حاجی لق لق کے پوتے ہیں۔

خاتون نے نہایت اعتماد سے سوال کیا۔

حاجی لق لق کیا کرتے تھے......؟

پوتے صاحب کا تو نہ جانے کیا جواب ہوتا، میں نے عرض کی۔

کیا کرتے تھے، یہ تو مجھے علم نہیں۔ آج ہوتے تو آپ سے عشق فرما رہے ہوتے۔

میں نے بھڑاس نکالنے کے لئے یہ اوچھا جواب دیا، مگر یوں ہوا، بات ہنسی میں ٹل گئی۔

صاحب من......اب فرمایئے، میں کڑھوں یا نہ......؟

آپ نے لطیفے کی بات کی ہے۔اس دور میں اتنے لطیفے گھڑے گئے ہیں، کہ مظلوم، مجبور اور محکوم قوم پر ترس نہیں پیار آتا ہے، تمام تر، پریشانیوں، ویرانیوں اور اہل اختیار کی نادانیوں اور من مانیوں کے باوجود اس کی حس لطیف مر نہیں سکی۔

ایک خاتون، اپنے آٹھ سالہ بچے کو لے کر نجومی کے پاس گئی اور سوال کیا...... بتائیں......میرا بچہ کیا بنے گا......؟

نجومی نے بچے کے سامنے ایک کتاب، شراب کی بوتل اور کچھ بڑے بڑے نوٹ رکھ دیئے۔ بچے نے بڑے اطمینان سے کتاب کو بند کیا۔ بوتل کو بغل میں دبایا اور نوٹ لے کر بھاگ اٹھا۔

نجومی نے تُرت جواب دیا۔

یہ صدر بنے گا......!!

میں اعتراضات کا جواب نہیں دیتا۔تمام عمر اہل علم کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہی میرا اثاثہ ہے۔ بہت کچھ سیکھا، تادمِ مرگ سیکھتا ہی رہوں گا۔ اگر جواب دہی کا سلسلہ چل پڑا، تو میں تو پھر اسی کام کا رہ گیا۔

بچپن کا لطیفہ تو نہیں، ایک نصابی انگریزی کہانی یاد آ گئی ہے۔ عنوان ہی کافی ہے......

You can not please every body

مہاتما گاندھی نے قائداعظم کے لئے کسی اخبار میں اختلافی مضمون لکھا......قائد کے قریبی ساتھیوں نے کہا......

''آپ جواب لکھیں۔''

قائد نے متانت سے کہا......میں جواب لکھوں گا۔ اُدھر سے پھر جواب آئے گا......اور پھر......اور پھر......! میں تو اپنا مشن بھول کر اسی کام ہی میں لگا رہوں گا۔''

اور......

مجھے　تو　اور　کوئی　کام　بھی　نہیں　آتا

اظہر جاوید　　..................................

''تخلیق'' فروری 2012ء (آخری اداریہ)

عرصہ ہوا، ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک منظر دلچسپ (مگر دردناک) تھا۔

میکسیکو کے غریب لوگ بھی روٹی روزگار کی تلاش میں امریکا کا رخ کرتے ہیں۔

وہی قانونی شکنجے......وہی پابندی کی جکڑ بندیاں......

مجبور اور غربت کے مارے لوگ سرحد پار کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ایک امریکن ٹرک سامان لے کر میکسیکو جاتا ہے۔ واپس آنے سے پہلے، ایک میکسیکن ٹرک کے نچلے حصے سے لٹک جاتا ہے۔ ٹرک چلتا ہے، سرحد پار کرنے کے بعد، تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے، تو لٹکا ہوا شخص، سامنے آتا ہے اور امریکن سے ساتھ لے جانے کی گزارش کرتا ہے۔

ٹرک چلتا ہے...... چلتا جاتا ہے اور اِدھر میکسیکن اپنی بے بسی کی داستان سنانے لگتا ہے۔ بوڑھے ماں باپ......علالت اور بھوک کے مارے ہوئے بچے، اور دوسری بے شمار پریشانیاں......

بہت وقت گزر جاتا ہے۔

کہیں ایک مقام پر جا کر، میکسیکن جب یہ یقین کرتا ہے، وہ خطرے کی حد سے نکل آیا ہے، تو امریکن سے ٹرک روکنے کو کہتا ہے۔

میکسیکن پھر کہتا ہے......مگر وہی کیفیت......وہ گھبرا کر امریکن کا بازو پکڑ کر اپنی بات دہراتا ہے۔

امریکن، اس کی طرف بے خبر نظروں سے دیکھتا ہے...... جیب سے آلہ صوت نکال کر کان میں لگاتا، اور پوچھتا ہے......

کیا کہا......؟

وہ بچارا میکسیکن جو پہروں داستانِ غم سنا کر جذباتی ہو رہا ہوتا ہے......اس کے چہرے پر جو عجیب سے تاثرات ابھرتے ہیں، انہیں لفظوں میں بیان کرنا، مشکل ہی نہیں ناممکن لگتا ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے میں بھی درد کا مارا میکسیکن ہوں (کروڑوں میرے جیسے پاکستانی بھی......اور صاحبانِ اختیار امریکن

ڈرائیور ہیں۔

یہاں ایک اور شعری مماثلت بنتی ہے..... کیا واقعی وہ ''امریکن (امریکا کے) ڈرائیور'' نہیں ہیں۔ اپنے کردار اور اپنی غلامانہ سرشت کے ساتھ۔

میں باقی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور بزرجمہر بننے کی کوشش نہیں کرتا۔

ادب کو اور اہلِ ادب کو دیکھیں.....اُدھر لاف زنی اور شیخیاں بگھارنے اور اٹھارہ کروڑ عوام پر صبح شام احسانات جتانے اور خود کو تہذیب کا دلدادہ اور سخن پرور بننے والوں کی صرف ایک جھلکی ملاحظہ ہو۔

چھ ماہ سے بھی زیادہ عرصہ ہو چلا ہے..... اکادمی ادبیات بے یار و مددگار رہے..... چیئرمین نہیں، ڈائریکٹر جنرل بھی نہیں ..... (تو کیا ہوا.....؟)

کوئٹہ میں مقیم ایک نہایت ممتاز اور مقبول ادیب، جن کی اردو زبان میں قابل قدر چھ سات کتابیں چھپ چکی ہیں، اور ہر جید نقاد سے تحسین پا چکی ہیں۔ وہ بلوچی زبان اور ثقافت کے پرچارک بھی ہیں۔ سرکاری درجہ بندی میں ان کا گریڈ اکیس ہے۔ اب تک جس عہدے اور مقام پر رہے، نک چڑھے افسرانِ بالا نے بھی ان کی ذہانت اور امانت کی توصیف کی ہے۔

ان کی ہر دل عزیزی اور ہر طبقے میں مقبولیت کی وجہ سے بلوچستان کے ایک با اثر وزیر نے عالی جناب عزت مآب وزیراعظم سے سفارش کی، یہ صاحب، بہر انداز، اکادمی ادبیات کی سربراہی کے لائق ہے۔ ویسے بھی اب تک، پنجاب، خیبر پختون خوا، سندھ سبھی صوبوں کو یہ افتخار مِل چکا ہے اب بلوچستان بھی فیض یاب ہو لے۔

صاف دل، صاف گو اور صاف جواب دینے کے ماہر وزیراعظم نے فرمایا.....

''یہ عہدہ تو ہم نے اپنے کسی دوست کے لئے رکھا ہوا ہے.....'' (شاید کسی میٹرک پاس دوست کے لئے)

وزیراعظم کا دوست..... یقیناً کوئی مافوق الفطرت ہی ہوگا۔

مگر..... کب آئے گا.....؟

مہینہ دو مہینہ کی بات ہے۔ اسلام آباد سے کسی ادیب کا ایس ایم ایس آیا تھا..... یہاں (اسلام آباد۔ راولپنڈی) کے اہلِ قلم احتجاج کریں گے اور جلوس کی صورت میں اکادمی ادبیات کے دفتر میں جائیں گے۔ پھر.....؟ پھر کیا ہوا؟ کوئی خبر نہیں ملی۔

خبر بھی کیا ملتی..... امریکن ڈرائیور نے تو کان سے آلہ صوت نکالا ہوا ہے۔ اکادمی ادبیات کی اہمیت اور حیثیت تو ''ان'' کے نزدیک چیونٹی جیسی ہے۔ یہاں ہاتھی جیسے بڑے بڑے ادارے ٹھکانے لگا دیئے گئے۔ (اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے) عوام بلبلائے، روئے، سینہ کوبی کی، واویلا مچایا..... دھرنے دیئے، راستے بند کئے۔ مگر۔

مگر..... کیا.....؟ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ میں تو صرف اپنے زخم اور آپ کی یادداشت کو کھرچ رہا ہوں۔

اظہر جاوید..... فروری 2012ء

◆◆◆

چلو اچھا کیا

تمہاری بے نیازی نے، تمہاری کج ادائی نے
مجھے ناشاد کر ڈالا
مجھے برباد کر ڈالا
میں پاگل تھا
کہ تم سے پیار کی اُمید رکھ بیٹھا
تمہارے نام کا دل میں کوئی خورشید رکھ بیٹھا
مجھے معلوم ہے تم سوچ کا معیار رکھتی ہو
بہت سی چاہتوں کا ساتھ میں انبار رکھتی ہو
بہت وعدے نبھاتی ہو، بہت اقرار رکھتی ہو
مگر مجھ جیسے بے کس، بے نوا لوگوں کی خاطر تم
ہمیشہ اپنے ہونٹوں پر کوئی انکار رکھتی ہو
تمہیں میں نے کہا تھا میں غم و آلام کا مارا
جو پل میں ڈوب جائے، میں ہوں ایسا شام کا تارا
میں بے چارا
فقط تم سے محبت کا سہارا میں نے مانگا تھا
میں ہوں منجدھار میں، تم سے کنارا میں نے مانگا تھا
تمہارے لطف کی تھوڑی تجلی مجھ کو مل جاتی
دلاسا مجھ کو مل جاتا، تسلی مجھ کو مل جاتی
کوئی دن میں بھی جی لیتا
تمہاری مہربانی سے، تمہاری دل ستانی سے
وفا کے گھونٹ پی لیتا
میں اپنے زخم سی لیتا
چلو......اچھا کیا تم نے
مجھے ناشاد کر ڈالا
مجھے برباد کر ڈالا

جنم دن

رات بارہ بجے
فون کھنکا تو، آواز اُبھری کوئی
''ہوں مبارک جنم دن کی خوشیاں تمہیں''
ایک پل کو میں خوش تو ہوا تھا مگر
کوئی حسرت سی دل میں مچلنے لگی
میرے احساس کو یوں مسلنے لگی
کاش! یہ فون اور مہرباں یہ صدا
اُس کی ہوتی، جو ہے اصل میں کج ادا
بے خبر کو میں کیسے کہوں بے وفا
اُس نے چاہا نہیں، یاد رکھا نہیں
میری چاہت کو آباد رکھا نہیں
بے نیازی سے ناشاد رکھا مجھے
لطف سے مجھ کو دلشاد رکھا نہیں
صبح ہوتے ہی پھر
فون آئے کئی
پھول پہنچے بہت
کیک لائے گئے
پیار سے میرے لمحے سجائے گئے
ایک پل کو میں خوش تو ہوا تھا مگر
پھر بھی غمگین تھا
فون بجتا رہا، وقت کٹتا رہا
جس کا آنا تھا فون، اُس کا آیا نہیں
آج کے دن بھی میں مسکرایا نہیں
گویا میں نے جنم دن منایا نہیں

کج ادا کے لئے

میری آنکھیں برس رہی تھیں جب
تم نے آنچل نہ اپنا پیش کیا
کوئی لارا نہ کچھ تسلی دی
چاہتوں کا نہ سپنا پیش کیا

جانتا ہوں کہ تُم پرائی ہو
تم سے کوئی گلہ نہیں مُجھ کو
ایک ہمدرد سوچ کا لمحہ
تم سے اب تک ملا نہیں مُجھ کو

پھر بھی تم کو دعائیں دیتا ہوں
ہر مسّرت ہزار بار ملے
میرے دامن میں صرف کانٹے ہیں
تم کو پھولوں بھری بہار ملے

اپنی دُنیا کی راحتوں میں گُم
تم کسی کا عذاب کیا جانو!
زعم ہے تم کو اپنی دانش کا
درد کا تُم نصاب کیا جانو!

تُم پہ غم کی نہ دھوپ آئے کبھی
تم کو خوشیوں کا سائبان ملے
چاند تارے جو تُم کو لا کر دے
کوئی ایسا ہی مہربان ملے

تُم ہو سیراب زندگانی سے
ہجر کی پیاس کیا تُمہیں معلوم!
کیسے ہوتی ہے چکنا چُور یہاں
ایک اک آس کیا تمہیں معلوم!

تم کو احساس کی ملے دولت
تُم کسی کے اَلَم کو جان سکو
تُم ہو بے مہر، کج ادا ہو تُم
اس حقیقت کا کاش، مان سکو!

محبوبہ 2008

تم سے پہلے بھی چاہتوں کے چاند
میری راتوں میں جگمگائے تھے
تم سے پہلے بھی کچھ جواں پیکر
میری بانہوں میں کسمسائے تھے
تم سے پہلے بھی زندگی نے مجھے
راحتوں کا سرور بخشا تھا
میرے ویراں اُداس لمحوں کو
خواہشوں کا غرور بخشا تھا
تم جو آئی ہو ایسے لگتا ہے
بے ثباتی کے خواب تھے سارے
بے وفائی کے، کج ادائی کے
کاغذی سے گلاب تھے سارے
میں نے چاہا جسے بھی شدت سے
بے نیازی سے دل کو توڑ گئی
منزلوں کا فریب دے کے مجھے
راستوں میں اکیلا چھوڑ گئی
مجھ کو معلوم تم ہو صبحِ نو
اور میں ڈھلتی شام کا سایا
تم کو ہر کام پر ملا ہے پیار
میں نے تو صرف رنج وغم پایا

جانتا ہوں تمہیں کمی ہی نہیں
تم پہ اُلفت نثار ہوتی ہے
میں خزاں رنگ اور تمہارے ساتھ
ہر گھڑی اِک بہار ہوتی ہے
تم کو شعروں میں بھی سراہا گیا
تم پہ لکھے گئے قصیدے بہت
جن میں شامل تمہاری تصویریں
ایسے چھپتے رہے جریدے بہت
تم تو اِک چاندنی کا پرتو ہو
تم اُجالوں کا روپ رکھتی ہو
جو مٹا دے الم کی تاریکی
تم وہ ہاتھوں میں دھوپ رکھتی ہو
مسکراتی تمہاری آنکھوں کو
دیکھ کر پھول بھی سمٹ جائیں
اُڑتے بادل تمہاری زُلفوں سے
آئیں اور بے سبب لپٹ جائیں
ایک معصوم سی تمنا ہے
جسم وجاں کا قرار دے دو تم
چند دن اور جی سکوں گا میں
مجھ کو تھوڑا سا پیار دے دو تم

بجھتی ہوئی اِک شام

اُس نے کہا تھا دل کی بات سنانے کو
اپنے اشک بہانے کو
اِک کاندھے کی ضرورت ہے
میں نے کہا تھا
میں خود ہوں محرومِ تمنّا
تنہائی کے روگ کا مارا
بجھتی ہوئی اک شام کا تارا
صدیاں گزریں
میں بھی تو اک کاندھے کا متلاشی ہوں
لیکن پھر بھی
اپنے سب آرام بُھلا کر
وقت سے کچھ خوشیوں کو چُرا کر
غم کے نقش مٹا سکتا ہوں
کتنے دن تک
شام ڈھلے یا اکثر آدھی رات بِتا کر
فون ملایا کرتی تھی

بھرے پُرے گھر میں ہو کر بھی
اکلاپے کا درد سُنایا کرتی تھی
میں لفظوں کا مرہم رکھتا
پیار بھری باتوں کی کومل شبنم رکھتا
وہ کچھ دیر میں کِھل سی جاتی
نئی اُمنگوں کے رنگوں میں
دِھیرے سے گُھل مِل سی جاتی
اپنے مسائل کے مرکز سے
تھوڑی دیر کو ہل سی جاتی
اب کچھ یوں ہے
کتنی شامیں، راتیں گزریں
اُس نے مجھے اب
اپنا ہمدم اپنا مسیحا اور ہمراز
نہیں بنایا
شاید اُس نے اور کسی کاندھے پر سر کو رکھا ہے
نئے دلاسوں کا اُس نے
نیا ہی ذائقہ چکھا ہے

11/اپریل کی شام
(ناکامِ محبت کی تقریب)

وقت جیسے وہیں رُک گیا ہے
کوئی منظر بھی بدلا نہیں ہے
اُسی ماحول کا عکسِ تاباں
اب بھی آنکھوں کے آگے ہے رقصاں
کیسی محفل وہ رنگوں بھری تھی
چاہتوں کی، اُمنگوں بھری تھی
کتنے چہرے چمکتے دمکتے
کتنے آنچل مہکتے مہکتے
قہقہے، تالیاں، چہچہاہٹ
دھیمی دھیمی کوئی گنگناہٹ
کہہ رہا تھا کوئی کیا مقرّر
مجھ کو کیا تھی بھلا یہ خبر
کیسے کیسے کسی نے سراہا
میری تحسین کی، مجھ کو چاہا
میں تو بے خود تھا، بیٹھا تھا گُم صُم
میری نظروں کا مرکز تھیں بس تم

خال و خط کو چھپاتی وہ بانہیں
جسم سے پھوٹتے وہ شرارے
پیرہن میں حسیں وہ غبارے
چوری چوری کبھی دیکھ لینا
کوئی معصوم پیغام دینا
میری دھڑکن کی حِدّت بڑھانا
میری حسرت کی شِدّت بڑھانا
سارا منظر وہیں جم گیا ہے
وقت جیسے وہیں تھم گیا ہے
میں بھی ویسے وہیں پر ہوں بیٹھا
تم بھی ٹھوڑی ہتھیلی پہ رکھے
مرمریں بُت کی صورت پڑی ہو
سینۂ وقت پر تم گڑی ہو
ایسی کچھ بے بسی چھا رہی ہے
یاد یہ بھی جا رہی ہے

ایک نظم

اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے
ذہن میں شعر کلبلاتے ہیں
کتنی سوچیں ہیں جو مچلتی ہیں
کیسے کیسے خیال کے جگنو
جگمگاتے ہیں، مسکراتے ہیں
کئی نظموں کی تتلیاں اپنے
رنگ کیا کیا عجب دکھاتی ہیں
زندہ غزلوں کی دل رُبا پریاں
رقص کرتی ہیں اور دھڑکن کو
ہولے ہولے سے گدگداتی ہیں
اور میں ہوں کہ جھنجھلاہٹ میں
غم کی بے کیف سی گھلاوٹ میں
ایک بے نام تلملاہٹ میں
نظموں، غزلوں کو، شعروں سوچوں کو
آپ ہی آپ قتل کرتا ہوں
اپنی بے رنگ زندگانی میں
اپنے جذبوں کا خون بھرتا ہوں
سوچتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی
شعر کہہ کہہ کے میں نے کیا پایا
ایک سفاک درد کا سایہ
ایک بے فیض غم کا سرمایہ
چاہتوں میں تو دُنیا داری تھی
ہر تعلق ہوا کا جھونکا تھا
دوستی بھی وفا سے عاری تھی
چھپ گئی ہے جو شاعری کی کتاب
کیا کہیں سے، کسی دریچے سے
پیار کا مُجھ کو ہے جواب آیا

اکیلا شجر

ہارٹ کلینک کے لان میں تنہا
میری طرح اُداس اک شجر
بے خبر، بے ثمر، پریشاں ہے
فکر میں، سوچ میں، یہ غلطاں ہے
ہے تو سرسبز پر یہ ویراں ہے
کوئی ساتھی نہیں، نہ اس کا رفیق
بے ثباتی کی کیسے ہو تصدیق
سرسراتی ہوائیں آتی ہیں
کچھ ذرا دیر گدگداتی ہیں
پھر کہاں جانے لوٹ جاتی ہیں!
شوخ چڑیاں، حسین سی بلبل
اپنی چہکار کا مچا کے غُل
ڈھونڈ لیتی ہیں اِک ٹھکانہ نیا
یہ رفاقت کا ہے بہانہ نیا
اور گُم صُم یہ سوچتا ہوں میں
بکھری یادیں دبوچتا ہوں میں
ایک ٹھنڈے مریض بستر پر
کاغذوں کے سفید پیکر پر
اِس شجر کی کہانی لکھتا ہوں
داستاں اپنی بے بسی کی میں
گویا اپنی زبانی لکھتا ہوں

ڈھلتی شام

(آخری نظم 12 دسمبر 2011ء)

مجھے معلوم ہے تُم چاندنی کا رُوپ ہو جاناں
مُجھے معلوم ہے تُم سردیوں کی دھوپ ہو جاناں
مروت میں میری خواہش کو تم برداشت کرتی ہو
مرے جذبوں کی ہر بارش کو تُم برداشت کرتی ہو

مُجھے معلوم ہے، تم چاند تاروں کی تجلی ہو
مہکتا پھول ہو تُم اور بہاروں کی تجلی ہو
میں ہوں ناشاد اور مجھ کو یونہی ناشاد رہنا ہے
مرا وعدہ ہے اب تُم سے نہیں کچھ مُجھ کو کہنا ہے

مُجھے احساس ہے میں ایک ڈھلتی شام ہوں جاناں
میں ہوں تقدیر کا مارا، بُہت ناکام ہوں جاناں
دُعا ہے تُم کو دُنیا کی ہر اک راحت میسر ہو
جسے تم چاہتی ہو، اُس کی ہی چاہت میسر ہو

میں اک پت جھڑ کا پتا ہوں زمیں پر رُلنے والا ہوں
میں ہوں اک برف اور دو چار پَل میں گھُلنے والا ہوں
مرا کیا ہے میں مَر مَر کر کوئی دن اور جی لوں گا
تمہارے ہجر کے مَیں زہر کو ہنس ہنس کے پی لوں گا

مجھے معلوم ہے تم کو جوانی کی ضرورت ہے
جو ہو تازہ تمھیں ایسی کہانی کی ضرورت ہے
تم اپنی زندگی کو پیار سے آباد کر لینا
اگر ممکن کبھی ہو گا تو مجھ کو یاد کر لینا

قطعات

(1)

زندہ رہنے کی آرزو کے لئے
غم کی بانہوں میں ہم بھی جھول گئے!
لیجئے! یہ بھرم بھی توڑ دیا
دیکھئے! آپ کو بھی بھول گئے

(2)

موت سے کیا گلہ کریں گے ہم
زیست پر بھی تو اختیار نہیں
کاش نفرت ہی کوئی ہم سے کرے
کیا ہُوا گر کسی کو پیار نہیں

(3)

آج بھی کارزارِ ہستی میں
آرزوؤں کا خون ہوتا ہے
کون کہتا ہے ہر مسرت میں
زندگی کا سکون ہوتا ہے

(4)

اِک مسرت کی بھیک مانگی تھی
تو نے غم بے حساب بخشے ہیں
مالکِ دو جہاں ترے صدقے
تیری قُدرت کے کیا کرشمے ہیں

(5)

محبت میں جدائی کا زمانہ آ ہی جاتا ہے
نہ ملنا ہو، نیا کوئی بہانہ آ ہی جاتا ہے
کہیں ہو ذکر بدنامی کا، ناکامی کا چاہت میں
کسی عنوان سے میرا فسانہ آ ہی جاتا ہے

(6)

کیسے کیسے خواب سجائے کیسے چکنا چور ہوئے
قسمت کی مرضی کے آگے ہم بے بس مجبور ہوئے
ترکِ تعلق گویا اُس کی چاہت کا اقرار بنا
دُکھی ہوئے ہم لیکن اُس کے دعوے پر مغرور ہوئے

(7)

اِس جہاں سے حسرتیں لے جائیں گے
اُس جہاں میں جانے کیا ہم پائیں گے
آگے اِک صبح تمنا آئے گی
اِس تسلی ہی سے جی بہلائیں گے

(8)

دُور اُفق کے پار نہ جانے کیوں ہم جھانکتے رہتے ہیں
ڈوبنے والے تاروں سے خوش بختی مانگتے رہتے ہیں
کتنے بھونرے آتے ہیں، رس چوستے ہیں، اُڑ جاتے ہیں
ہم تو ایسے پھول ہیں پھر بھی خوشیاں بانٹتے رہتے ہیں

غزل

گھر چلے ہو یارو تو یہ کرم بھی فرماؤ
شام کی اُداسی کو اپنے ساتھ لے جاؤ

آؤ تو کبھی دیکھو، ہم نے کر کے رکھا ہے
درد کی گزر گہہ پر، آنسوؤں کا چھڑکاؤ

اس کی مہربانی سے اپنا وصل ہوتا ہے
رازداں سہیلی سے اس قدر نہ شرماؤ

ہم تو لوڈ شیڈنگ میں مبتلا ہیں مدّت سے
چاند کے نگر سے تم چاندنی ہی لے آؤ

آج تک انھوں نے ہی بے ثبات رکھا ہے
اب نہ اے حسیں لوگو اور خواب دکھلاؤ

عشق کے مقدّر میں ریگ زار لکھے ہیں
تم سراب دکھلاؤ اور پیاس بھڑکاؤ

کیوں نئی محبت کو ڈھونڈتے ہو تم اظہؔر
کیوں بسا رہے ہو تم دل میں پھر نئے گھاؤ

غزل

یہ دعاؤں کی بے ثباتی ہے
ہم پہ قسمت بھی مسکراتی ہے

اتنی ہمّت سے جی رہا ہوں میں
موت بھی مجھ سے خوف کھاتی ہے

دھوکا پہلے بھی جن سے کھایا ہو
قوم پھر اُن کو آزماتی ہے

وعدہ کرتے ہوئے نہ جانے کیوں
تیری آواز کپکپاتی ہے

کشتی گرداب سے جو بچتی ہے
آ کے ساحل پہ ڈوب جاتی ہے

تم سے جس شام گفتگو نہ ہو
شام کی آنکھ ڈبڈباتی ہے

اُس کی تصویر دیکھ کر اظہؔر
آرزو اب بھی ڈگمگاتی ہے

غزل

خوابوں کے سہارے جینے دو یہ خواب تو ہم سے مت چھینو
سب چاند ستارے چھین لئے شب تاب تو ہم سے مت چھینو

اُمیّد بجھی، ہر آس لُٹی، ہر خواہش چکنا چُور ہوئی
ہے کرچی کرچی دولت جو نایاب تو ہم سے مت چھینو

غم سہہ لیں گے، چپ رہ لیں گے، خود دل سے دل کی کہہ لیں گے
جو سانسوں میں ہے بچی کھچی وہ تاب تو ہم سے مت چھینو

دو چار جو آنسو باقی ہیں یہ تنہائیوں کے ساتھی ہیں
اس عُمر کے آخری حصے کے احباب تو ہم سے مت چھینو

انجامِ محبت سہنا ہے، ناکامِ محبت رہنا ہے
ناکامی کا، بدنامی کا سرخاب تو ہم سے مت چھینو

اب پیار کی شبنم رہنے دو، اخلاص کا موسم رہنے دو
یہ زخم، جفائے یاراں ہیں شاداب تو ہم سے مت چھینو

مانا کہ زمانہ بدلا ہے، ہر طَور پرانا بدلا ہے
جو خون میں رچتے بستے ہیں آداب تو ہم سے مت چھینو

غزل

کس نے کتنے دن جینا ہے، کس نے کیسے مرنا ہے
قدرت کے دستور کے آگے انسانوں کو ہرنا ہے

کیا ویرانی! کیا حیرانی! ہونی ہو ہی جائے گی
دل پہ کیوں اک بوجھ ہے رکھنا، ناحق آہیں بھرنا ہے

پاس معالج کھڑا ہو پھر بھی، موت تو آ ہی جاتی ہے
سانسیں ختم اگر ہو جائیں، تہمت کِس پہ دھرنا ہے

رب پہ توکّل رکھنے والا، بے پروا ہو جاتا ہے
آنا جانا اُس کی مرضی، غم کس بات کا کرنا ہے

دُکھ بھی اس کی دین ہیں اظؔہر خوشیاں بھی وہ دیتا ہے
وہ راکھا ہے، وہ داتا ہے، دُنیا سے کیا ڈرنا ہے

غزل

موت نے دستک دی تھی لیکن دل دروازہ بند رہا
قدرت کو منظور یہی ہے، جینے کا پابند رہا

لاکھ تخیل کی پروازیں، فلک کو چھوتی آوازیں
سوچوں کے پیراہن پر، مجبوری کا پیوند رہا

وقت خراشیں بھر دیتا ہے، چہرہ مُرجھا جاتا ہے
آتی جاتی رُت میں لیکن حُسن ترا دوچند رہا

جو بھی دوست ملا ہے ہم کو، آخر میں یہ بھید کُھلا
دل میں زہر بھرا ہے اُس کے، زہر میں وہ قند رہا

قسمت میں جو لکھا ہے، ہر حال میں ہو کے رہتا ہے
رب پہ توکّل رکھا میں نے ہر لمحہ خورسند رہا

تب تک قوم کے بچوں کو یہ خودکش حملے ماریں گے
جب تک ملک کا حاکم اپنی آنکھیں کر کے بند رہا

سب سے پہلا پتھر اظہرؔ، اُس نے مجھ کو مارا تھا
برسوں جس کی عزت کی تھی، جس کا عقیدت مند رہا

غزل

کوئی نہیں اُمید نہ حسرت، پھر بھی جینا پڑتا ہے
روٹھ گئی ہو چاہے قسمت، پھر بھی جینا پڑتا ہے

تُو نے اس قابل نہ چھوڑا، جینے کا میں نام بھی لُوں
اے میری ناکام محبت، پھر بھی جینا پڑتا ہے

دردر پھرتے، بے گھر رہتے، ہم کو صدیاں بیت گئیں
وقت نے چھینی ہر اک راحت، پھر بھی جینا پڑتا ہے

تاج محل کو دیکھ کے کب سے سوچ میں گُم صُم بیٹھا ہوں
پاس اپنے دولت نہ چاہت، پھر بھی جینا پڑتا ہے

غزل

جب جب شعر کا موڈ بنا ہے، بتی گُل ہو جاتی ہے
جذبے مسلے جاتے ہیں اور سوچوں کو موت آتی ہے

''تم سے پیار نبھاؤں گی میں، سارے درد بھلاؤں گی''
جو بھی لڑکی ملتی ہے، وہ دعوے ہی فرماتی ہے

سانس کی ڈوری ٹوٹ چلی ہے، سانجھ غموں کی چھوٹ چلی
عینیؔ، چنداؔ، مولی کی کیوں یاد مجھے تڑپاتی ہے

کس کس در پر دستک دی ہے، سکھ کی بھکشا مانگی ہے
خالی کاسہ دیکھ کے دل کا، آنکھ مگر بھر آتی ہے

اپنے گھروں میں بسنے والو، بے گھر کی فریاد سُنو
کیا کیا کچھ یاد آتا ہے اور کیا کیا یاد ستاتی ہے

اظہرؔ اپنا حال بھی اک بے تاب سمندر جیسا ہے
لہر وفا کی اُٹھے تو ساحل سے سر ٹکراتی ہے

غزل

ہزار ضبط کروں پھر بھی ٹوٹ جاتا ہوں
کبھی دُعا سے کبھی خود سے رُوٹھ جاتا ہوں

بہت ہے زعم مجھے، میں عظیم انساں ہوں
مگر ہوں بلبلہ، اک پَل میں پُھوٹ جاتا ہوں

کبھی یہ سوچا ہے تم نے جفا کی شہزادی
تمھاری قید سے میں کیسے چھوٹ جاتا ہوں

لبوں کو چھونا، کبھی کھیل لینا زُلفوں سے
مزے خیالوں میں کیا کیا میں لُوٹ جاتا ہوں

میں جبر کر لوں گا اظہرؔ اُسے بھلا دوں گا
میں اُس کے سامنے کہنے یہ جھوٹ جاتا ہوں

غزل

گھر، اِک اپنا گھر بھی ہوتا، سوچیں جب تڑپاتی ہیں
دل میں درد، کسک سینے میں اور آنکھیں بھر آتی ہیں

مدّت گزری وہ یہ بستی چھوڑ چکی، مُنہ موڑ چکی
اب بھی شہر کی ساری سڑکیں اُس کے گھر کو جاتی ہیں

جتنی لڑکیاں ملتی ہیں، سب ایک سی فطرت رکھتی ہیں
ایک سے وعدے کرتی ہیں، سب ایک سی قسمیں کھاتی ہیں

غم تو ہر پل سہرا لے کر سر پہ سجانے آ جاتے ہیں
خوشیاں دلہن بن کر دل میں آنے سے شرماتی ہیں

کس کی کشتی ڈوب گئی ہے، کس کا سوگ منانے کو
موجیں کیوں ساحل سے لپٹ کر سر اپنا ٹکراتی ہیں

سپنے ٹوٹ بھی جاتے ہیں اور جذبے روٹھ بھی جاتے ہیں
نئ اُمنگیں، نئ ترنگیں خواب نئے دکھلاتی ہیں

اظہؔر کیسی مجبوری ہے پیار میں ہر محبوبہ کی
پہلے پہلے ٹوٹ کے ملنا، آخر میں کتراتی ہیں

غزل

اُس نے نہیں آنا ہے لیکن آنکھیں رستہ تکتی ہیں
یہ پاگل، نادان اُمیدیں، اکثر ہم کو ڈستی ہیں

اپنا معالج کہتا ہے، ہر غم سے تُم آزاد رہو
کیا بتلاؤں دل میں کیا ناکام وفائیں بستی ہیں

اُس نے ملنا چھوڑ دیا ہے، ہر اک ناتا توڑ دیا ہے
سانسوں میں آسوں کی شمعیں پھر بھی بجھتی جلتی ہیں

پہلے اک میلہ رہتا تھا، جب سے بال سفید ہوئے
چنچل شوخ حسینائیں اب مجھ کو دیکھ کے ہنستی ہیں

اُوٹ پٹانگ یہ کہتا ہے

اُوٹ پٹانگ یہ کہتا ہے، میں جاؤں گا کشمیر
غازی بن کر مظلوموں کی بدلوں گا تقدیر

چھوٹا سا ہوں لیکن ہے مضبوط مرا ایمان
اللہ میرا والی ہے، رکھوالا ہے قرآن
نام محمدؐ کا میں لے کر توڑوں ہر زنجیر
اُوٹ پٹانگ یہ............

ہو گی دُور غلامی جلد، ملے گی پھر آزادی
ہر جانب ناچے گائے گی خوشیوں کی شہزادی
بن جائے گی میری وادی جنت کی تصویر
اُوٹ پٹانگ یہ............

شبنم والی ہریالی پر گھوموں ننگے پاؤں
سر پہ صنوبر اور چناروں کی ہو ٹھنڈی چھاؤں
اپنی قوم کے خوابوں کی میں بن جاؤں تعبیر
اُوٹ پٹانگ یہ............

ماہنامہ ''اُمنگ'' جون 1967ء
(بچوں کے لئے)

اوُٹ پٹانگ کی ہوگئی......

اُوٹ پٹانگ کی ہوگئی مسٹر گول مٹول سے کُٹی
ٹوٹ گئی ہے یاری ان کی، پیار کی ہوگئی چھُٹی

رُوٹھے رُوٹھے سے پھرتے ہیں دونوں منہ لٹکائے
لیکن دل میں خواہش ہے کہ کوئی صلح کرائے
جھوٹی موٹی غصے ہیں وہ، کوئی انہیں منوائے
گلے ملیں پھر کھیلیں کودیں، مُٹھی میں ہو مُٹھی
اُوٹ پٹانگ کی......

مسٹر گول مٹول کے بھیّا، اُس کی شبنم باجی
کہتے ہیں کہ تم دونوں کو کروائیں گے راضی
لیکن عہد کرو کہ پھر نہ ہو گی جھگڑے بازی
اب تو ہر اک بچے کی ہے تم پر انگلی اُٹھی
اُوٹ پٹانگ کی......

ماہنامہ ''اُمنگ'' فروری 1967ء
(بچوں کے لئے)

اُوٹ پٹانگ نے عید منائی

دیر سے جاگا عید کے دن بھی
ملیں سویاں اُس کو باسی
رو رو دیتا رہا دُہائی
...... اُوٹ پٹانگ نے عید منائی

سب نے کھائی دُودھ ملائی
موجیں لوٹیں، عیش منائی
ہو گئی اِس کی مُفت پٹائی
...... اُوٹ پٹانگ نے عید منائی

امّی ، ابّو ، بھیّا، باجی
دی نہ کسی نے اِس کو عیدی
سب نے جھڑکا ڈانٹ پلائی
...... اُوٹ پٹانگ نے عید منائی

دن بھر رو رو اُس نے سوچا
مَیں گر بنتا اچھا بچہ
کیوں ہوتی ایسی رُسوائی
...... اُوٹ پٹانگ نے عید منائی

ماہنامہ ''اُمنگ''، فروری 1967ء

(بچوں کے لئے)

تھر کی پیاس

تھر کے بلکتے، پیاسے بچو
جب میں اپنے بچوں، پیاروں اور یاروں کی سنگت میں
پیپسی کولا، کوکا کولا، ڈسٹل واٹر پیتا ہوں
اُن لمحوں میں
آنکھیں تو خوش ہو جاتی ہیں
لیکن روح میں دور کہیں گہرائی میں
انجانی سی پیاس مچلتی رہ جاتی ہے
ہونٹوں پر اک آگ سی جلتی رہ جاتی ہے
سوچیں ویراں کر دیتی ہیں
اور بھی حیراں کر دیتی ہیں
صدیوں پہلے کربل میں کچھ
تشنہ لب جو تڑپے تھے
اُن کی رسم نبھانے والو،
ہم جیسے دنیا داروں کو
لالچ، لوبھ اور خود غرضی کے
خوابوں سے چونکانے والو،
اشکوں کا سیلاب ہے حاضر
اک تحفہ، نایاب ہے حاضر
تم اپنے مشکیزے بھر لو
اپنی پیاس میں، تھر کے بچو
ہم کو بھی تم شامل کر لو!!

تھر کے پیاسے
(بچوں کے لئے)

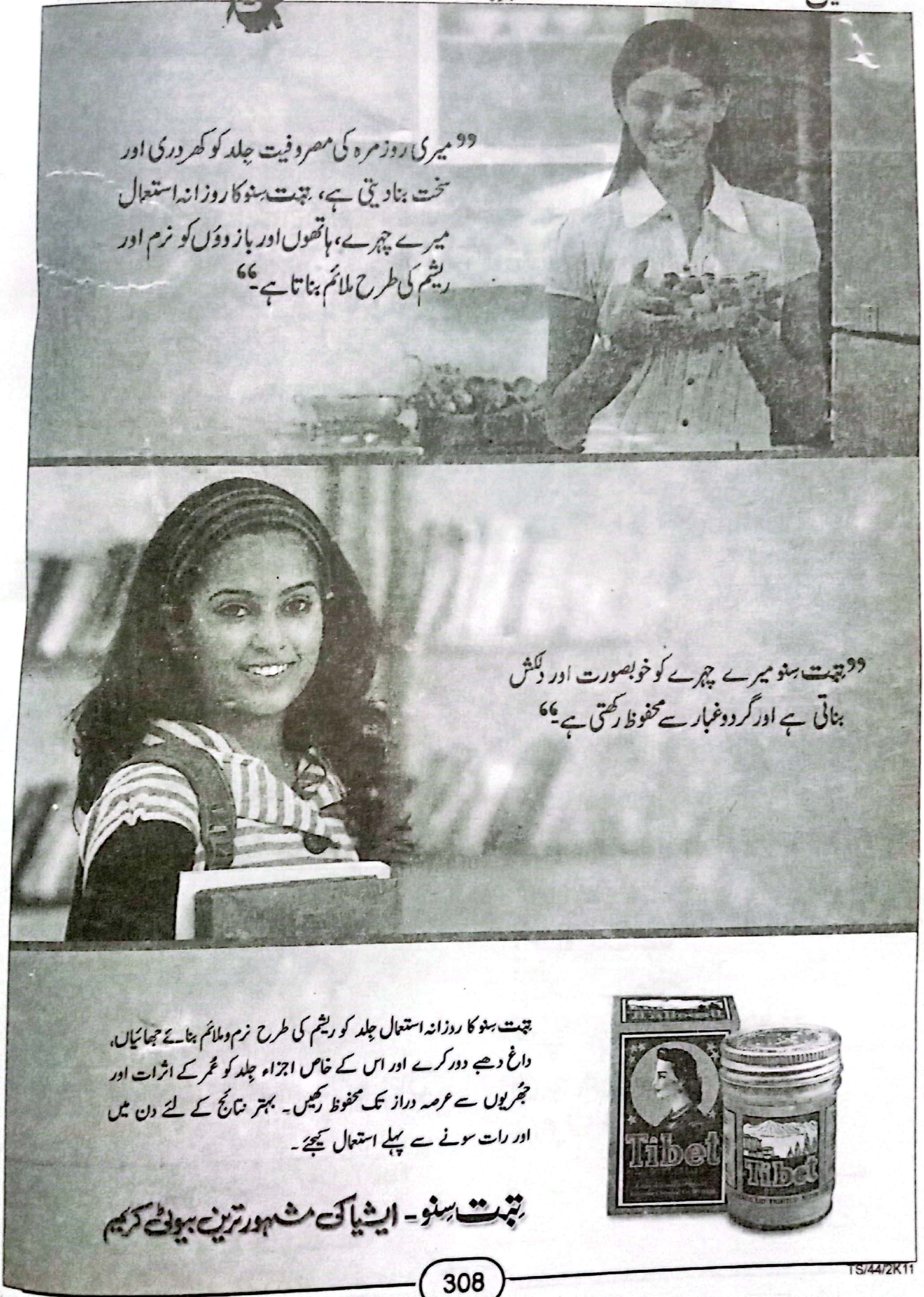
"میری روزمرہ کی مصروفیت جلد کو کھردری اور
سخت بنا دیتی ہے، تبت سنو کا روزانہ استعمال
میرے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں کو نرم اور
ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔"
"تبت سنو میرے چہرے کو خوبصورت اور دلکش
بناتی ہے اور گرد و غبار سے محفوظ رکھتی ہے۔"
تبت سنو کا روزانہ استعمال جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے جھائیاں،
داغ دھبے دور کرے اور اس کے خاص اجزاء جلد کو عمر کے اثرات اور
جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھیں۔ بہتر نتائج کے لئے دن میں
اور رات سونے سے پہلے استعمال کیجئے۔
Tibet
Tibet
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
TS/44/2K11

خاکہ

اسرار زیدی

اظہر جاوید

کچھ سال پہلے ایک کتاب نے بڑی دھوم مچائی تھی......

''موت کا منظر......عُرف......مرنے کے بعد کیا ہوگا۔''

کتاب کے مصنّف کوئی کٹھ ملا تھے، جنہوں نے صرف عوام کو ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ حالانکہ اُنہیں خود مرنے کا قطعی کوئی تجربہ نہیں تھا۔اس کتاب سے بھی بہت پہلے چوہدری افضل حق نے اپنی کتاب 'زندگی' میں موت کے بعد کے حالات لکھے تھے، مگر اُن کی تحریر میں شائستگی اور سلیقہ تھا۔اب تو ساری مہذّب دنیا میں 'موت کے بعد' کی زندگی پر تحقیق ہو رہی ہے اور ایسی کئی خواتین وحضرات کے تاثرات کتابوں میں شامل ہو رہے ہیں، جو شاید اس تجربے سے گزرے ہیں۔

ایک بار مُلا نصرالدین کو گمان گزرا، کہ وہ مر گیا ہے۔اُس نے قبرستان میں جا کر سفید چادر اوڑھی اور گھپ چپ لیٹ گیا۔اتفاقاً اُدھر سے دو سپاہی گزرے۔سفید چادر کو دیکھ کر للچائے، ہاتھ بڑھایا، تو مُلا نصرالدین تلملا اُٹھے، کہ مُردوں سے بھی چھیڑ خانی کرتے ہو۔سپاہی تو آخر سپاہی ہوتا ہے، اُسے فرض شناسی کا جنون چڑھے تو وہ جنرل کی کار کو بھی روک لیتا ہے۔ آپ لوگ مہربانی سے، ''مُردہ'' اور ''جنرل'' میں کوئی مماثلت نہ ڈھونڈیں، میں خواہ مخواہ رواروی میں لکھ گیا ہوں، حالانکہ کار روکنے والے سپاہی کا حشر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔مُلا نصرالدین والے سپاہیوں نے اُسے دو ڈنڈے رسید کئے اور کہا......

''اُٹھو، یہ ہمارا سامان اُٹھاؤ......''

مُلا نصرالدین کو اُردو زبان کی شُدبُد نہیں تھی، اور نہ ابھی تک ترکی میں سعادت سعید گئے تھے ورنہ وہ ضرور یہ مصرع پڑھتے............ ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''

سامان اُٹھائے اور دور تک لے جانے سے مُلّا بہت نڈھال اور بے حال ہو گئے۔اور لطف یہ ہے کہ سپاہیوں نے واپسی پر بھی دو چار ڈنڈے مزدوری کے طور پر عطا کر دیئے۔مُلّا بلبلاتے، تلملاتے اور جسم سہلاتے بستی کی طرف پلٹے، تو مسجد میں مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔دو فرشتے مُنکر اور نکیر آئیں گے۔تمام اعمال کا حساب کریں گے

اور......!''مُلا نے چیخ کر کہا......لوگو! یہ مولوی جھوٹ کہہ رہا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مرنے کے بعد فرشتے نہیں، دو سپاہی آتے ہیں۔ پہلے ڈنڈے رسید کرتے ہیں، پھر سامان اٹھواتے ہیں اور واپسی پر پھر ایسے ہی تواضع کر کے بھیج دیتے ہیں۔

صاحبو......تمہید لمبی ہوگئی مگر اسرار زیدی کے مرنے کا سفر بھی تو لمبا رہا۔ اُن کی وفات حسرت آیات کی خبر جب اشفاق نقوی نے ''ڈان'' میں چھاپی، تو میں گڑبڑا گیا۔ اُنہیں فون کیا، کہ آپ کو کہاں سے خبر ملی ہے......اُنہوں نے ڈاکٹر آغا سہیل کا نام لیا اور بتایا کہ آغا سہیل کو اسرار زیدی کے فلاں عزیز نے خبر دی تھی......اب میں بوکھلا گیا......جھٹ سے پاک ٹی ہاؤس میں فون کیا، وہاں زاہد کا صاحب زادہ بیٹھا تھا......اُس نے بے خبری کا اظہار کیا، مگر ایک عقل کی بات کی کہ اگر ایسا سانحہ ہوگیا ہوتا، تو ٹی ہاؤس کے بورڈ پر اعلان چسپاں ہوتا۔ یا ابّو بات کرتے......میں نے بے اطمینانی میں اشفاق رشید کو فون کیا......ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی، مگر فون پر پھر بھی بدحواس ہی سے لگے۔ شاید اُسی وقت کالج سے آئے تھے، یا والدین سے شادی کی خبر سُن چکے ہوں گے۔

اشفاق رشید نے مختار کھرل کا حوالہ دیا کہ ابھی کل پرسوں ہی تو اُن کی، اسرار زیدی سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے جب سے دل کا عارضہ ہوا ہے، میرے معالج ڈاکٹر جاوید سبزواری نے مجھے ہر طرح کے بالا خانے پر چڑھنے سے منع کر رکھا ہے۔ میں چوری چھپے بدپرہیزی تو کر لیتا ہوں، مگر اسرار زیدی کی سیڑھیاں تو مجھے اُن کے جیتے جی بھی چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی......کبھی چڑھ بھی لیتا، تو میرے چہرے سے زیادہ ویرانی اُن کے کمرے پر کھنڈی ہوتی۔ غالبؔ کو تو دشت دیکھ کر گھر یاد آیا تھا......وہاں گھر دیکھ کر دشت یاد آتا ہے۔

بہرحال، جب تصدیق ہوگئی کہ اسرار زیدی زندہ سلامت ہیں، تو ان کے دوبارہ جی اٹھنے پر، خواجہ زکریا، یونس جاوید اور میں نے مل کر یہیں شیزان میں ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں اشفاق نقوی اپنی بیماری کے باوجود حاضر ہوئے کہ چشم دید گواہی، کالم نگار کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اُس تقریب میں اسرار زیدی نے اپنی موت کی خبر سے متاثر ہو کر کہی ہوئی غزل بھی سنائی، جو اگرچہ ''تخلیق'' ہی میں چھپی تھی مگر مجھے اس کا کوئی شعر یاد نہیں آ رہا۔ یقیناً......اسرار زیدی خود ہی سنا دیں گے۔ ملّا نصر الدین کو نہ سہی، اُنہیں تو اُردو آتی ہے۔

اسرار زیدی ان دنوں اپنے دوستوں کے خاکے لکھ رہے ہیں......کیا ہی اچھا ہو، کہ ایک اپنا خاکہ بھی لکھ دیں اور بتائیں، موت کے بعد، ایک نہیں دو دو تقریبات شیزان میں ہوتی ہیں اور خواجہ زکریا اور مستنصر تارڑ جیسے زندہ اور تابندہ لوگ مضمون پڑھنے آتے ہیں۔ اسرار زیدی سے ان کی بہت پرانی دوستی ہے۔ اتنی پرانی کہ میرے بال سفید ہوگئے ہیں اور ان کے سفید بھی نہیں رہے...... پاکستان میں جو گنتی کے چند صحیح اور راسخ ترقی پسند رہ گئے ہیں، اسرار زیدی اُن میں نمایاں ہیں۔ اپنی وضع داری، رکھ رکھاؤ اور دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہونے اور اُن کے کام آتے رہنے کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز بھی ہیں۔ لوگ اُنہیں حلقے کی ''مڈوائف'' کہتے ہیں، میں اُنہیں ''گاڈ فادر'' کہنا چاہتا ہوں، مگر دل نہیں مانتا کہ اب یہ لفظ بھی منفی معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اُن کی تخلیقات پڑھ کر میں شرمسار ہوتا رہتا ہوں۔ آپ مسکرائیے نہیں، شرمسار اس بات پر

ہوتا ہوں کہ میں کیوں اتنا اچھا نہیں لکھ سکتا۔

میں نے اسرار زیدی کی وضع داری کا ذکر کیا ہے۔ایک روز میں ٹی ہاؤس میں گیا،تو وہ اتفاق سے اکیلے بیٹھے تھے۔علیک سلیک کے بعد دیکھا، کہ وہ کسمسا رہے ہیں، چہرے سے بیزاری ٹپک رہی ہے۔میں نے پوچھا خیریت ہے؟ بڑے درد بھرے لہجے میں کہنے لگے۔''برادر، کیا بتاؤں، ایک گھنٹے سے صوفے کی کیل کمر میں چُبھ رہی ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا......''زیدی صاحب......آپ نے سیٹ بدل کیوں نہیں لی......'' تقریباً غصے سے کہا......''کس سے بدلتا، سارا ٹی ہاؤس تو خالی پڑا تھا......''

اسرار زیدی ٹی ہاؤس میں جس جگہ پر بیٹھتے ہیں، وہاں ٹی ہاؤس والوں کو ان کے جیتے جی ہی، اُن کے نام کی تختی لگا دینی چاہیئے۔میں کبھی انگلستان تو نہیں گیا مگر کہیں پڑھا تھا کہ لندن کے بیرونی علاقے میں کوئی ریستوران ہے، جہاں نامور قلم کار اور فن کار بیٹھا کرتے تھے، اب اُن سب کے ناموں کی، اُن ہی کی کرسیوں پر تختیاں لگی ہوئی ہیں......ٹی ہاؤس کے مالک زاہد نے البتہ ایک کام کیا ہے......اُن کے والد سراج صاحب کے زمانے میں اُسی دیوار پر قائداعظم اور علامہ اقبال کی تصویریں آویزاں ہوتی تھیں، اب وہاں سے علامہ اقبال کی تصویر اُتار دی گئی ہے......اس میں اسرار زیدی کی اہمیت اور حیثیت برحق، مگر میرا خیال ہے، زاہد نے ایک اور واقعے پر ردِعمل ظاہر کیا ہے......کچھ سال پہلے سابق مسیحی لیڈر (صاحبو...... یہ سابق مسیحی کے ساتھ نہیں، لیڈر کے ساتھ استعمال ہوا ہے) جے سالک نے ایک خصوصی تقریب میں اپنے مخصوص جوشِ بیان میں کہا کہ''کنول فیروز ہم مسیحیوں کے علاّمہ اقبال ہیں......'' کنول فیروز نے ازرہِ انکسار انکار نہیں کیا۔

اسرار زیدی جیسی وضع داری میں بھی نبھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر ناکام ہو جاتا ہوں......وہ کسی بھی تقریب میں کسی بھی خاتون سے ملیں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں......افسوس، میں کم بخت سر پر ہاتھ نہیں پھیرتا۔اب بھلا، اسرار زیدی کی وضع داری کا مقابلہ کیا ہو۔میری ایک خاتون دوست برصغیر کے مذاہب پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھیں......اُنہیں پتا تھا کہ میں انڈیا جاتا رہتا ہوں، کہنے لگیں، اب کے اُدھر گئے تو مہاتما بدھ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مواد اکٹھا کر لائیں، ایک روز وہ میرے ساتھ ٹی ہاؤس گئیں......اسرار زیدی کو گیان دھیان میں دیکھا، تو چہرے پر رونق سی آ گئی......کہنے لگیں......کام بن گیا......؟ میں نے حیرت سے کہا......''کون سا کام''......کہنے لگیں،''بُدھ والا''......مگر آج تو منگل وار ہے......''ارے نہیں، وہ دیکھیں، وہ سامنے جو صاحب بغیر آسن جمائے گیان دھیان میں مگن ہیں، بالکل مہاتما بدھ لگتے ہیں۔'' میں چونکا، ہنسا اور کہا......''وہ ہمارے عزیز دوست اسرار زیدی ہیں، آئیں، اُن کے پاس ہی بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں، چلیں''......''اب کچھ ضروری نہیں رہا......'' میں حیرتی ہوا اور وہ خاتون مجھے تقریباً پکڑ کر باہر لے گئیں......پھر پتا نہیں کیا ہوا، اُس کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملیں......جانے اُن کا کام سُدھ ہو گیا، یا اپنے شوہر سے یدھ ہو گیا لیکن حاشا کلاّ میں اسرار زیدی پر شک نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ اس وضع دار دوست نے اُس کے سر پر بھی ہاتھ ہی پھیرنا تھا۔

◆◆◆

کالم

محفل محفل

اظہر جاوید

''ادب، ایک وسیع وعریض دریا کی طرح ہے کہ جو اپنے گھاٹ سے بہتا ہوا، راستہ بناتا ہوا سمندر میں جاملتا ہے۔ اس راستے میں ہر مشکل کو زیر کرتا، ہر سنگِ رہ کو نابود کرتا اور منزل کی جانب پہنچنے والے ہر اثبات کی ہمراہی کرتا ہے۔ جابر کا جبر اور ظالم کی مطلق العنانی ادب وفن کے راستے میں حائل کی جانے والی وہی کمزور چٹانیں ہیں جو دریا کے پانی کی یورش میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ قاری اور مصنّف کے درمیان ان سنگ ریزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔''

یہ مصر کے مشہور مصنّف طٰہٰ حسین کی ایک تحریر کا اقتباس ہے، جو مشہور صحافی اور دانشور عبداللہ ملک کے تازہ رسالے ''احتساب' کے ایک حصّے میں درج ہے۔ یہ 'احتساب' آج کل خود 'احتساب' کی زد میں ہے۔ کہیں محبتوں سے، کسی جگہ غیریت کے ساتھ'...... مگر یوں ہے کہ شہر شہر اور گاؤں میں...... ان دِنوں اشاعتی سلسلوں کے حوالے سے سب سے زیادہ یہی رسالہ موضوعِ گفتگو ہے۔ تاثیر مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

یوں اس رسالے کے مندرجات سے اختلاف کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں اور اس روز امین مغل نے یہ فریضہ سلیقے سے سرانجام بھی دیا۔ مگر بقول شخصے اس رسالے کے آنے سے ادبی رسالوں کے لگے بندھے طریقے اور ادبی حلقوں کے جمود اور ٹھہراؤ میں ایک تبدیلی سی، ایک ہلچل سی ضرور مچی ہے۔

گذشتہ روز عبداللہ ملک نے اپنے گھر میں ''تقریب رونمائی'' کے انداز میں ایک ''رسمِ پذیرائی'' کا اہتمام کیا اور دوستوں کو مل بیٹھنے اور رسالے پر تنقید اور گفتگو کرنے کا موقع دیا۔ امین مغل نے ایک بھرپور مضمون لکھا اور دنیا بھر کے ادب اور خصوصاً تیسری دنیا کے ادب کے تناظر میں پاکستانی ادب اور ادیب کا محاکمہ کیا اور ''احتساب'' کا جائزہ لیا اور کھری کھری کہتے ہوئے عبداللہ ملک کو یہ خراج بھی پیش کیا کہ وہ اپنی تحریر کی بُنت پر ذرا زیادہ توجہ دیا کریں تاکہ باتیں دہرانے کا عمل کم ہو سکے اور لفظوں کا زیاں نہ ہو۔ امین مغل نے اس پرچے میں شامل پاکستانی ادیبوں کی تحریروں کو خصوصی ہدف بنایا اور ان کے پس منظر محرکات کو ٹٹولنے کی خاصی جرأت مندانہ کوشش کی۔ انور سجاد اس رسالے میں دو حیثیتوں سے شامل ہیں۔ مصور اور ادیب

کے طور پر۔

اس محفل میں انہیں تیسرا منصب بھی عطا کیا گیا اور انہیں پرچے پر رائے دینے کی دعوت ملی۔ انور سجاد تحریر میں تو علامت استعمال کرتے ہیں مگر گفتگو میں استعارے نہیں برتتے۔ انہوں نے رسالے کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ اگر مدیر کے اختیار میں ہو تو ایک ہی شمارے میں بہت زیادہ ممالک کو شامل کرنے کی بجائے صرف ایک ملک کے ادب کا خصوصی شمارہ چھاپا جائے؟ اس پر حمید اختر نے سوال کیا ''تو کیا اس طرح پاکستانی ادب کو نظر انداز کر دیا جائے؟'' انور سجاد نے وضاحت کی کہ ان کا مطلب یہی ہے کہ پاکستان کے علاوہ ایک اور ملک لیا جائے۔ صلاح الدین محمود نے کہا۔ گویا دو ملک ایک شمارے میں ہوں۔'' اس پر پیچھے سے کسی نے ابراہیم جلیس کی کتاب کا عنوان دہرایا ''دو ملک ایک کہانی''۔

عبدالسّلام خورشید نے چند کلمات خیر کہے اور اس کے فوراً بعد انجمن جمہوریت پسند خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے طاہرہ مظہر علی نے کومٹ منٹ پر زور دیا اور تعریف کی رو میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے پہلے عبداللہ ملک نے جتنا کام کیا وہ کسی گنتی شمار میں نہیں، صحیح کام کا یہ پہلا قدم ہے اور ہماری خواہش ہے دوسرا قدم زیادہ خوبصورت ہو۔ عبداللہ ملک نے رسالے کے ابتدائیے میں جو گزارش کی ہے وہی اس تقریب کا افتتاحیہ بھی تھی اور عنوان بھی...... ''کسی بحث میں الجھنا مقصود نہیں بلکہ صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ 'احتساب' کا اجرا بھی ایک کومٹ منٹ ہے۔ ایک عہد ہے۔ اس عہد سے وفاداری کا اعلان ہے۔ یہ کومٹ منٹ، یہ عہد، اس عہد سے وفاداری کا اظہار آپ کو ان صفحات میں یقیناً ملے گا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے بہت سی جبینوں پر شکنیں اُبھر آئیں گی۔ کچھ کے ہونٹ غصے سے کپکپانے بھی لگیں گے اور کچھ حلقوں میں غیض وغضب کا اظہار بھی ہو گا لیکن یہ ہمارا مقدر ہے اور اس مقدر کو ہم ایک رُبع صدی سے تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ ہم کسی ردِ عمل سے گھبرائیں گے نہ پریشان ہوں گے۔ ہر جائز ردِ عمل کو تسلیم کریں گے۔ ہر صحیح نکتہ چینی کو ہم قبول کریں گے۔ اپنی غلطی کی نشان دہی ہم کو دل وجان سے قبول ہو گی۔

عبداللہ ملک نے جب اس تقریب کی دعوت دینی شروع کی تو اس وقت مدعوین کو یہ قطعی اندازہ نہیں تھا کہ انہیں وہاں بھی کچھ سُننا (کڑوا کسیلا) بھی پڑے گا۔ مستنصر حسین تارڑ کا خیال تھا کہ بس یہ ایک ملن پارٹی ہو گی اور انور سجاد یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہاں باقاعدہ کچھ لوگوں کی چھپی ہوئی تحریریں سننے کو بھی ملیں گی مگر وہاں انہیں امین مغل کی تلخ ترش تنقید سننا پڑی جو بہت خلوصِ نیت سے سینی گال کے شاعر عثمان سجین کے انداز میں پاکستانی اہلِ قلم سے مخاطب تھا۔

''ہمیں اپنی اُنگلیاں مجتمع کرنی چاہئیں
کہ وہ اس انگلی سے طاقت چھین لیں
کہ جو انسانیت کو نوحہ کناں رکھتی ہے۔''

روزنامہ ''امروز'' لاہور......27-05-1979

◆◆◆

انٹرویو

حمید اختر

اظہر جاوید

ابتدائیہ

حمید اختر سے میرا تعلق بہت گہرا تھا۔ وہ اتنے مرنجاں مرنج اور ملنسار تھے، کہ ہر ملنے والا خود کو اُن کے قریب سمجھتا۔ مگر کئی سلسلے شاہد ہیں کہ انہیں مجھ سے لگاؤ تھا اور ہمیشہ مجھے برابری کی سطح پر رکھتے تھے۔ اپنے کئی کالموں میں میرا ذکر کیا۔ ''تخلیق'' کے لئے اور کچھ نہیں تو محبت بھرا خط ہی لکھ دیتے تھے۔ اُن کا آخری افسانہ ''آ وَ۔ بیوی باتیں کریں''، ''تخلیق'' ہی میں چھپا اور بسترِ مرگ سے آخری، بالکل آخری تحریر بھی میرے لئے ہی تھی۔ وہ تحریر شمارہ اکتوبر 2011ء میں چھپی تھی۔

میں نے 1999ء میں ''اخبارِ جہاں'' کے لئے اُن کا انٹرویو کیا تھا۔ یہ بھی اُن کی زندگی کا آخری اور باقاعدہ مکالمہ تھا۔ بلاشبہ حمید اختر ایک انجمن تھے اور اپنے دل و دماغ میں یادوں کا انمول خزانہ رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں، اپنے عجزِ بیان کے باوجود میں اور بھی بہت کچھ لکھوں گا، لکھتا رہوں گا۔ ان کا یہ انٹرویو قارئین کی نذر ہے۔　　..............................　　(اظہر جاوید)

ترقی پسند تحریک نے جن اہلِ قلم کو جنم دیا اور انہیں ابھارا، ان میں حمید اختر کا نام نمایاں ہے۔ حمید اختر بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتوں کو روزانہ صحافت کھا گئی، اپنی صحافتی ذمہ داریوں اور سماجی مصروفیات سے بچ کر اور اپنے تخلیقی جوہر کو بچا کر انھوں نے جتنا ادب لکھا، افسانے بُنے اور شخصیت نگاری کی، وہ بھی کسی ''کارنامے'' سے کم نہیں، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کے بعد جو افسانہ نگاروں کی نسل آئی، ان میں حمید اختر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ حمید اختر سے پہلا سوال ترقی پسند تحریک، اس کے آدرش اور اس کی سوچ سے متعلق تھا کہ اتنے برس گزرنے اور پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ جانے کے بعد بھی کیا آج اس کے اثرات باقی ہیں؟

حمید اختر نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ ''اگرچہ وہ تنظیمی ڈھانچا ختم ہو گیا ہے مگر وہ نظریہ اور سوچ آج بھی قائم ہے

بلکہ اس کی ضرورت زیادہ ہے، اردو ادب میں حقیقت پسندی روشناس ہو چکی تھی مگر 1936ء کی ترقّی پسند مصنفین کی کانفرنس نے اسے مہمیز لگائی اور لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم مل گیا یہی تحریک بعد میں آزادی کی تحریک کا حصہ بنی، ناانصافیوں اور طبقاتی تقسیم نے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس دلایا کہ ان کی منزل آزادی ہے، غیر ملکی استبداد سے چھٹکارا پانے اور ان کے گماشتوں سے نجات پانے کے لیے آزادی اور لوک راج ضروری ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ برِصغیر کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے دو سال کے بعد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ ......

''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی''

ناانصافیاں بڑھ گئیں، غربت، بیروزگاری اور عدم مساوات زیادہ شدّت سے ڈسنے لگے۔ یوں لکھنے والوں میں تلخی بھی آئی اور سچ کڑوا ہو کر سامنے آنے لگا۔ وہی سب کچھ آج بھی تحریر ہو رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک اب تنظیم کے طور پر نہیں مگر یہ کوئی اتنا ضروری بھی نہیں، وہ احساس، وہ فکر تو قائم ہے، تنظیم کے بغیر بھی جو کچھ تخلیق ہو رہا ہے، جو تحریر کیا جا رہا ہے، وہ اسی سوچ کا حصّہ ہے۔''

''ترقی پسند متصنفین پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ صرف پروپیگنڈا ادب پیش کرتے رہے؟ حمید اختر کی بات میں سے ایک اور سوال اٹھایا گیا۔

''یہ بات جزوی طور پر درست ہو گی مگر مجموعی طور پر نہیں...... 47-1946ء تحریک کے عروج کا زمانہ تھا''۔ حمید اختر نے حوالہ دیتے ہوئے کہا''میں اس وقت بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری تھا۔ وہاں باقاعدگی سے انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے جن میں نامور اہلِ قلم سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، مجروح اور کرشن چندر وغیرہ حصّہ لیتے تھے، یہ لوگ اپنی شعری اور ادبی روایات کے امین اور پاسدار تھے، ان سب لکھنے والوں کی جڑیں اپنی دھرتی میں تھیں اور نئے پن کو خوش آمدید کہنے کے باوجود یہ زبان و بیان، اظہار کی سلاست اور روایتی ادبی قدروں کا خاص خیال رکھتے تھے، کسی کی بھی تحریر میں کوئی ایسی کمزوری ہوتی تو فوراً ٹوک دیا جاتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پریم دھون جیسے شاعر بھی تھے جو فلمی نغمہ نگار تھے مگر تحریک کے لیے بھی کام کرتے تھے ارمزدوروں، کسانوں کے جلسوں میں جا کر نظمیں سناتے تھے، وہ عوامی مزاج کو خوب سمجھتے تھے، اسی زمانے میں ......''حمید اختر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''یاس یگانہ چنگیزی جیسے کلاسیکی روایت کے شاعر کا مجموعہ سجاد ظہیر نے دارلاشاعت لاہور سے چھپوایا۔''

''ترقی پسندوں پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ باہر کی طرف دیکھا اور اپنے حالات اور ماحول پر نظر نہیں رکھی؟''

''اس الزام کا پس منظر کیا ہے، اس کا ذمہ دار مجھے سمجھیں۔''۔ حمید اختر نے صاف گوئی سے وضاحت کی۔''قیام پاکستان کے بعد جب کیمپوں میں رُلنے کے بعد میں لاہور آیا تو مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری چن لیا گیا، 1949ء میں لاہور میں پہلی بڑی ترقی پسند کانفرنس ہوئی جس میں روسی ادیبوں، سمرقوف، رسول زادہ اور موسیٰ ایبک نے بھی شرکت

کی، وہ اپنے ساتھ اپنی اور دوسرے روسی اہلِ قلم کی انگریزی اور اردو زبانوں میں چھپی ہوئی کتابیں لائے، سیکرٹری کی حیثیت میں وہ کتابیں میں نے وصول کیں اور رکھنے کے لیے گھر لے گیا، اسی رات خفیہ پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارا اور وہ سب کتابیں اٹھا کر لے گئی، خفیہ والوں نے بتایا کہ وہ تو کتابیں ادھیڑ کر یہ تلاش کرتے رہے تھے کہ کہیں کوئی روس سے پوشیدہ پیغام تو نہیں آیا......ادھر سارے شہر میں یہ دھوم مچ گئی کہ ترقی پسندوں کے پاس روسی لٹریچر آتا ہے۔''

حمید اختر باتوں کے دھنی ہیں، فیض کی محفلوں میں بھی وہی زیادہ تر چمکتے رہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی بات کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جب تقسیم کے وقت کلکتہ میں بھی فسادات ہوئے تو وہاں سہروردی کی مسلم لیگی حکومت تھی، کامریڈ پی سی جوشی نے مجھے باقاعدہ گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ ہمیں ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف لڑنا ہے، یہ فسادات بھی انسانیت کے خلاف سازش ہیں، ہمیں اس سے بھی نبرد آزما ہونا ہے، ترقی پسند مصنفین نے من حیث الجماعت آزادی اور قیام پاکستان کی حمایت کی تھی۔ پی سی جوشی نہایت جوش سے تقسیم کے حق میں مضامین لکھتے تھے اور ان میں حق خود ارادیت کی بات کرتے ہوئے ٹالسٹائی اور گورکی کے حوالے ہوتے تھے، اس پر اسرار الحق مجاز نے کہا کہ جوشی کے مضامین ذہن تو قبول کرتا ہے مگر دل نہیں مانتا کہ ملک تقسیم ہو۔'' حمید اختر نے اپنی لمبی بات کو خود ہی اصل سوال کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''واقعہ یہ ہے کہ روسی کلاسیکی لٹریچر کے مقابلے میں جو جدید لٹریچر ہے، وہ قطعی متاثر نہیں کرتا تھا، کسی بھی ترقی پسند لکھنے والے کی کسی بھی تحریر سے کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکتا ہاں......ایک آدھ معمولی سی مثال ہے جیسے عارف عبدالمتین نے نظم لکھی تھی......عظیم باپ اسٹالین۔''

''کیا آپ محسوس کرتے ہیں صحافت میں جانے کی وجہ سے آپ تخلیقی ادب سے دور ہو گئے؟''

''جی ہاں...... میں تسلیم کرتا ہوں......صحافت، ادب کو کھا گئی۔'' حمید اختر نے جواب دیا۔ ''لیکن......کیا کرتا...... ادھر سے لُٹ پُٹ کر آئے تو کیا کرتے......؟ تین ماہ تک نکودر میں مہاجر کیمپ میں پڑا رُلتا رہا۔''

حمید اختر نے بتایا۔ ''انہوں نے تحریک پاکستان میں بھی باقاعدہ حصّہ لیا تھا مگر کبھی شور نہیں کیا یا اسے کیش کرانے (کوئی مالی فائدہ اٹھانے) کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں نے جس طرح بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا، عورتوں کی بے حرمتی ہوئی، لوگ حیوانوں کی طرح مارے گئے، اس کا مجھ پر یہ ردِ عمل ہوا کہ میں سیاسی کام میں لگ گیا اور نہ کوئی کلیم داخل کیا، نہ کسی حق کا تقاضا کیا......ادب سے تو روٹی نہیں ملتی، عملی صحافت میں آنے سے پہلے تک 55-1954ء تک باقاعدہ کہانیاں لکھتا رہا مگر سچ پوچھیں عمر عزیز ضائع ہی کر دی ہے۔'' حمید اختر نے بے باکی سے اعتراف کیا۔

''آپ کسی سے متاثر ہوئے تھے یا کسی لکھنے والے کا گہرا اثر لیا تھا؟'' حمید اختر کو پھر ادب کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔

''یقیناً......متاثر ہوا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''کرشن چندر تھے، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو تھے......میں

کرشن چندر کو سب سے بڑا افسانہ نگار تو نہیں کہتا مگر یوں ہے کہ اس زمانے میں ان لوگوں کے افسانوں کا انتظار رہتا تھا، عصمت چغتائی اور غلام عباس بھی انہی کی صف میں شامل تھے ''ان داتا'' اور'' کالو بھنگی'' جیسی کہانیاں آج تک ذہن و دل میں بسی ہوئی ہیں......اب تو یہی معلوم نہیں ہوتا کون کس کے لیے لکھ رہا ہے...... میں سمجھتا ہوں لاشعوری طور پر میرے گریز کی بھی یہی وجہ ہے، قاری اور لکھنے والے کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے، ادبی رسائل ایک بڑا وسیلہ تھے (یا ہیں) مگر ان کی پذیرائی کا سلسلہ نہیں رہا......ایسے لگتا ہے ادب کسمپرسی کے عالم میں ہے۔''

''آپ کے ہم عصر کون کون تھے؟'' حمید اختر کو پرانے دنوں کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔

''ساحر لدھیانوی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس اور سیّد انور......اور بھی تھے، کچھ نام یاد نہیں آ رہے۔'' حمید اختر نے مختصر جواب دیا پھر گرہ لگائی۔ ''انتظار حسین نے بھی اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اور میں سمجھتا ہوں انتظار حسین کے علاوہ اس نسل کے دوسرے لکھنے والوں نے زیادہ محنت نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی جیسے لکھنے والوں کا کوئی گروپ ادب میں سامنے نہیں آیا، اس وقت عجیب بات تھی۔'' حمید اختر نے بات کو موڑ دیتے ہوئے کہا۔ ''یا تو کہانیوں میں زور تھا...... یا شاید حافظہ جوان تھا، مجھے آج بھی کرشن چندر کی کہانی ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' یاد ہے، اوپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیارتھی کی کہانیاں بھی اثر چھوڑتی تھیں مگر اب تو کسی اچھی سے اچھی کہانی کا بھی اثر دیرپا نہیں ہوتا......اس دور میں کوئی بڑا کہانی کار پیدا ہی نہیں ہوا......میرے ہم عصروں میں سے ابراہیم جلیس جب تک حیدر آباد (دکن) میں تھا، بڑی اچھی کہانی لکھتا رہا...... پھر وہ بھی صحافت میں پھنس گیا اور کہانی کار ختم ہو گیا، ظاہر ہے کالم نگار کو پذیرائی زیادہ ملتی ہے۔''

''آپ نے کرشن چندر، عصمت جیسے لکھنے والوں کے گروپ کا ذکر کیا ہے، کیا ان کے بعد کوئی قابل ذکر لکھنے والا آیا تھا؟'' سوال براہِ راست کیا گیا۔

''ان کے بعد اور ہم سے پہلے، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنا نام، مقام بنا چکی تھیں...... میں نے ابھی اس وقت تک دو کہانیاں لکھی تھیں، جب 1946ء میں ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ ''ہائے اللہ'' چھپ گیا تھا، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ، خدیجہ سے سینئر اور عصمت چغتائی سے جونیئر تھیں...... ہاجرہ، خدیجہ کی تحریروں میں ترقی پسند سوچ اور فکر کا عکس ملتا تھا مگر عینی کے ہاں نہیں...... وہ تو ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں کھڑی تھیں......عینی کے اسی رویّے کی وجہ سے عصمت چغتائی نے ایک مضمون بھی لکھا تھا ''پوم پوم ڈارلنگ'' جس میں قرۃ العین حیدر کی بورژوائی سوچ اور اظہار کا ذکر تھا مگر میں سمجھتا ہوں قرۃ العین حیدر بڑی رائٹر ہیں، میں ان کے اسلوب کا قائل ہوں، اگرچہ وہ ترقی پسند نہیں تھیں اور خود انہوں نے بھی کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔''

''شاعروں کے ساتھ آپ کی بہت دوستی اور سنگت رہی ہے، آپ نے کبھی شعر کہنے کی کوشش یا خواہش کی ہے؟'' سوال کو ایک اور رُخ دیا گیا۔

’’کوشش کی، مگر...... کامیاب نہ ہوسکا۔‘‘ حمید اختر نے سادگی سے جواب دیا۔’’میں بھی ابراہیم جلیس کی طرح اچھے بھلے مصرعے کو بے وزن کردیتا ہوں، بنّے بھائی (سجاد ظہیر) بھی کہتے‘‘ یہ ذرا میری نظم پڑھنا‘‘ پھر خود ہی فوراً کہتے’’نہیں...... نہیں رہنے دو......تم اسے بے وزن کردوگے، سچی بات ہے شاعروں پر رشک آتا ہے، نثر لکھنے کے لیے تو بہت مشقت کرنا پڑتی ہے مگر یہ بھی ہے جب فیض صاحب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تو یوں لگا کہ وہ جو کہتے ہیں، وہ ہمارے دل ہی کی کہتے ہیں۔ ساحر اور ابن انشاء کی شاعری بھی ہمیشہ دھڑکنوں میں بسی رہی۔‘‘

’’فیض کی شاعری اور ان کے مقام کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

’’شاعری کی سیدھی، سچّی تعریف تو یہی ہے کہ یہ دل میں اتر جائے، اپنی لگے اور یاد رہے۔‘‘ حمید اختر نے دوٹوک جواب دیا۔’’فیض کو یہ کمال حاصل ہے۔‘‘ انہوں نے بات جاری رکھی۔’’میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کا شعروادب سے کوئی تعلق نہیں مگر انہیں فیض کا پورے کا پورا کلام زبانی یاد ہے، ایک لوہے کے سوداگر ہیں، یہیں لاہور میں......انہیں فیض کا ایک ایک مصرع یاد ہے مگر اور کسی کا نہیں، وہی بات کہ شاعری میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ دل میں اتر جائے...... پیار بن جائے......ساحر میں بھی یہ خوبی تھی۔‘‘

’’کچھ (تنگ نظر) نقاد کہتے ہیں کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتے تو ساحر لدھیانوی بھی نہ ہوتے؟ سوال کو تھوڑا سا پلٹا گیا۔

حمید اختر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔’’یہ بات ابراہیم جلیس نے چلائی تھی......مگر صرف مذاق مذاق میں...... جب ساحر کی اور جلیس کی آپس میں تکرار بڑھ کر لڑائی بنتی تو ابراہیم جلیس یہ بات کہتے، چند لمحوں کے بعد وہی ابراہیم جلیس ساؔحر کی سب سے زیادہ تعریف بھی کررہے ہوتے......کسی نے کہا یا لکھا ہے کہ ساحر ٹین ایجرز (کمسن نوجوانوں) کا شاعر ہے......اس پر علی سردار جعفری نے بڑی ٹھوس اور مدلل بات کی کہ جو شاعر بیس، تیس سال تک ٹین ایجرز کا شاعر رہتا ہے، اس کے بڑا شاعر ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔‘‘ ساحر نے جو نظم ’’پرچھائیاں‘‘ لکھی ہے، حمید اختر نے حوالے دیتے ہوئے کہا۔’’یہ اتنی عظیم نظم ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ نظم ساحر ہی کہہ سکتا تھا، اس میں اس کا پورا رنگ ہویدا ہے......حیدرآباد (دکن) کے ایک مشاعرے میں ساؔحر نے یہ نظم پڑھی تو مجھے سجاد ظہیر کا خط آیا کہ ساحر کی اتنی طویل نظم جو ایک گھنٹے تک ساحر سناتا رہا، اس پر تمہارے دوست نے مشاعرہ لوٹ لیا، حاضرین نہ صرف تحمل سے سنتے رہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ داد دے رہے تھے...... چراغ حسن حسرت کی محفل آرائیاں تھیں، زندگی سے بھرپور ماحول تھا مگر وہ سب تباہ ہوگیا ہے، اجڑ گیا ہے...... چاروں طرف ایک ویرانی سی ہے، وہ چائے خانے اور ٹھکانے بھی ختم ہوگئے، میرے جیسا بندہ جس کی عمر اب 75 سال ہوگئی ہے، اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتا ہے، وہاں جاکر کتھارسس ہوجاتا تھا، دل کا غبار نکل جاتا تھا، اب تو اپنے آپ میں کڑھنے اور خود ہی سے باتیں کرنے کا سماں ہوتا ہے۔‘‘

''قیام پاکستان کے بعد بھی ...... چند سال پہلے تک......'' حمید اختر نے یادوں کا ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ''ریگل سنیما بلڈنگ میں جو میرا دفتر تھا، وہاں بھی احباب کا میلہ لگا رہتا تھا، فیض، سبطِ حسن، منٹو، خواجہ خورشید انور، حبیب جالب، مزدور رہنما مرزا ابراہیم، اخلاق احمد دہلوی اور مادام نور جہاں ......! اب وہ دفتر بھی بھائیں بھائیں کرتا ہے......کاش، ہم کسی زندہ معاشرے میں ہوتے تو ان مقامات پر ان نامور شخصیات کی تختیاں لگائی جاتیں۔''

''آپ نے دو فلمیں بھی بنائی تھیں ''سکھ کا سپنا'' اور پرائی آگ'' یہ فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں، آپ نے ان دونوں کے لیے خود کہانی کیوں نہیں لکھی تھی؟'' سوال اب ادب سے ثقافت کی طرف آ گیا۔

''اب میں محسوس کرتا ہوں، غلطی کی تھی۔'' حمید اختر نے اعتراف کیا۔ ''سکھ کا سپنا'' کی کہانی ایک آسٹریلین ناول سے اخذ کی گئی تھی مگر کہانی کا موضوع آج کا معاشرہ بنتا ہے...... 37 برس پیشتر آج جیسی پیسے کی دوڑ اور لوبھ نہیں تھا ''پرائی آگ'' کے لیے میری بیوی نے حمیدہ جبیں کا ناول پسند کیا تھا......دونوں تجربے ہر طرح سے ناکام رہے ''سکھ کا سپنا'' اگر آج ''ری میک'' ہو تو یقیناً ہٹ فلم ثابت ہو۔''

حمید اختر کی باتوں کی لہر تو رکنے والی نہیں تھی۔ پوچھا ''کوئی تازہ تخلیق......کوئی افسانہ......؟''

''دو تین کہانیاں کلبلا رہی ہیں ......مگر وہی مجبوری......اخبار کی اداریہ نویسی اور کالم نگاری سے سر اٹھانے کی مہلت تو ملے......تاہم وعدہ ہے، بہت جلد یہ کہانیاں مکمل کر دوں گا۔''

''اخبار جہاں''9/اگست 1999ء

◆◆◆

اثر چوہان

''یہ محض اتفاق تھا یا ''حُسنِ اتفاق'' کہ اظہر جاوید کا دفتر راجہ اِندر کا دربار لگتا تھا۔ انہی دنوں میں نے کہا......اظہر جاوید! میں نے تمہاری طرف سے ایک شعر کہا ہے۔ قبول کر لو۔ اُس نے کہا ''سناؤ'' میں نے عرض کیا :

''چار طرف پریوں کا جُھرمٹ
میں ہوں آج کا راجہ اِندر''

اظہر جاوید مسکرایا اور بولا ''یار اثر چوہان! ایہہ گل باہر نہ کڈھیں'' اظہر جاوید کو شاید اپنی ملامت کروانے کا شوق تھا لیکن وہ ایک بے ضرر انسان تھا، اس لحاظ سے اُسے ملامتی صوفی کہا جا سکتا ہے۔

اظہر جاوید سے انٹرویو

عزیز جبران انصاری

O ''کہا جاتا ہے کہ ادب تخیّلاتی چیز ہے جب کہ سائنس عمل سے عبارت ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر آج کے سائنسی دور میں شعر و ادب کی کیا ضرورت ہے؟''

☆ ''ادب کو تخیلاتی لکھ کر، آپ نے شعری لہجے میں تخیل سے الگ کرنے کی شعوری، لاشعوری کوشش کی ہے۔ ایک ہلکا سا فرق ہے ان دونوں میں۔ پھر بھی خیال ہی بنیاد ہے اور خیال کی طاقت مسلّمہ۔ ادب کی تخلیق بھی خیال سے نمو پاتی ہے اور سائنسی عمل بھی اس سے تحریک لیتا ہے۔ دُنیا کی تاریخ بتاتی ہے، شعر و ادب نے بہت انقلاب بپا کیے۔ عرب کی جنگی تاریخ تو رجز سے بھری پڑی ہے۔ سپاہی اُس وقت تک تلوار نہیں سونتتا تھا یا نیزہ نہیں سنبھالتا تھا جب تک رجز کا آغاز نہ ہو جائے۔ پھر ایسے ادیب و شاعر بھی معلوم تاریخ میں نظر آتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ جنگوں میں حصّہ لیا۔ اس کی بنیاد، ادب ہی تھا۔ ادب نے آگاہی دی، کہاں غلط ہو رہا ہے۔ زیادتی ہے یا ظلم کا راج ہے۔ ویسے جن معنوں میں آپ تخیلاتی کہتے ہیں، وہ بھی بجا، لیکن میرا خیال ہے، ایسی بُری بات بھی نہیں۔''

O کیا ادب کو نظریے کا پابند ہونا چاہیے؟

☆ ''ادب میں نظریہ تو ہوتا ہے، مگر اسے خود پہ وارد نہیں کرنا چاہیے، جیسے فیشن کے طور پر کوئی ترقی پسند بن جاتا ہے (یا بننا چاہتا ہے)۔ اور اس کی ضد میں اسلامی نظریے کا پھندنا لگایا جاتا ہے۔ دونوں طرح سے ادب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ''بے معنی'' سے مراد، یہ کہ نظریہ ادب کی چاشنی ختم کر دیتا ہے۔ ترقی پسند ہونا یا اسلامی ادب کا پیروکار رہنا دوسری بات ہے۔ بہت سا ادب ایسے نظریات کی زد میں آ کر فنا ہو گیا۔''

O ''ادب کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں کوئی کردار ادا کرتا ہے؟''

☆ ادب کی تخلیق کا مقصد؟ ظاہر ہے حساس لوگ ہی یہ صلیب اپنے کاندھوں پر اُٹھاتے ہیں، ایک مرحوم شاعر سیّد اکبر سلیم کا شعر ہے ؎

جواب حساس ہے زمانے میں　　　اُس سے کہہ دو کہ گُھٹ کے مر جائے

اِرد گرد پھیلی اور بکھری زندگی کے رنگوں (اور بدرنگی) کو نمایاں کر کے ادیب جہاں اپنی بھڑاس نکالتا ہے۔

(کتھارسس کرتا ہے) وہیں وہ دوسروں کو پڑھنے اور غور کرنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ تلقین کو ہدایت کرنے کے معنوں میں نہ لیا جائے۔ سیاہ و سفید کی پہچان بھی ادب ہی کراتا ہے۔ معاشرہ تو بہت سے مکھڑے بنا لیتا ہے اور بہ قول قتیل شفائی ع

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ''

O ''ادب کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں کوئی کردار ادا کرتا ہے؟''

☆ ''ادب اصلاح کرنے کی قوت نہیں رکھتا، اس کا راستہ سجھاتا ہے اور نشان دہی کر دیتا ہے۔''

O ''کیا ادب جغرافیائی حدود کا پابند ہے یا اسے پابند ہونا چاہیے؟''

☆ ادب کو تو کسی طرح پابند ہونا ہی نہیں چاہیے۔ جغرافیائی حدود کیا؟ ہاں یہ ضرور ہے اگر کوئی اہلِ قلم پاکستان میں موجود ہے تو اس کے ادب میں، اس کی تحریر میں پاکستان واضح طور پر نظر آئے گا لیکن یہ نہیں کہ دوسرے ممالک میں جہاں اُردو، سندی، بلوچی، پشتو اور پنجابی زبانیں سمجھی جاتی ہیں، وہ اسے صرف پاکستان کا ٹھپا لگا کر دیکھیں گے۔ تحریر کے اندر کا حُسن یا حالات کی بدصورتی شاید انھیں بھی اپنی اپنی سی لگے۔''

O ''اگر ادب زندگی کا عکاس اور ترجمان ہے اور اس کا تعلق عوام سے ہے تو آپ کی نظر میں علامت نگاری کا مقصد کیا ہے؟''

☆ ''قدرت کا عجیب نظام ہے۔ ساری دنیا میں، کبھی ایک ہی زمانے اور وقت میں بے شمار اہلِ علم اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر ایک وقت آتا ہے سارا ماحول سُونا سُونا اور بے کیف لگتا ہے۔ یوں جیسے اب اُن جیسا کوئی نہیں آئے گا یا ایک ہی دور میں اتنے صاحبانِ علم و ادب اکٹھے نہیں ہوں گے۔ میرا خیال ہے پچاس ساٹھ سال کی گردش کے بعد پھر ایسا دور آ جاتا ہے، آ جائے گا۔ یوں ارتقا کا تسلسل تو قائم رہتا ہے۔ جمود عارضی جھونکا ہوتا ہے۔ مغربی ادب میں اگر علامت نگاری آئی تو اس کی وجوہات ہم سے قدرے مختلف تھیں۔ اُردو ادب میں علامت نگاری کی ایک بڑی وجہ مغرب کا تتبع (نقالی) تھا۔ پھر علامت نگاری پاکستان میں جبر کے زمانے میں اُبھری۔ نثر میں بھی، نظم میں بھی۔ آمریت اور مارشل لا کی حکمرانی میں۔ سیدھے سبھاؤ جو باتیں سنسر کی زد میں آ جاتی تھیں، انھیں دوسری علامتوں میں پیش کیا گیا اور جبر، گھٹن، تاریکی کے لیے تمثیلیں بنائی گئیں۔ پتا نہیں ضیاالحق کے مارشل لا میں آپ کو کیسے تجربے ہوئے۔ ادبی رسائل کیا سبھی جریدے بھی پہلے سنسر ہوتے تھے۔ شروع شروع میں سنسر ہونے والے حصے کو خالی چھاپا جاتا تھا، اہلِ اختیار کو یہ بھی قبول نہ ہوا اور دوسرا مواد شامل کرنے کا حکم ہونے لگا۔ اخبار، رسالہ، میگزین چاہیے تاخیر کا شکار ہو گئے۔''

بہ شکریہ: سہ ماہی ''بیلاگ'' (خصوصی گوشہ: اظہر جاوید)......اپریل تا جون 2012ء

◆◆◆

پنجابی کہانی

دو جاٹی بیگ

اظہر جاوید

میں بنکاک ہوائی اڈے دے سوہنے جہے ریستوران وچ بیٹھا کھڑ کھڑ کر کے ہس پیا واں۔

بیرے نے سمجھیا ہونا ایں مینوں اوہدی انگریزی سمجھ نہیں آئی...... تے اوتھوں ذرا دور، کاؤنٹر تے کھلوتی تھائی کُڑی نے حیران ہو کے سوچیا ہونا، میں ایدھراودھر دے لشکارے اتے جلوے ویکھ کے بونتر گیا واں...... اوہنے اک واری اپنی تے اپنی ساتھن دی وردی ول وی تکیا اے کدھرے اوہناں دی قمیصاں دے بٹن بند تے نہیں...... اوتھے، ایہو سب توں ودھ حیرانی وی اتے اچرج گل ہوندی اے......

میں کینیڈا توں امریکا، تے اوتھوں چار پنج گھنٹے توں بعد ہوروی مے تے تھکا کے چُور چُور کر دین والے سفر توں آیا واں...... ہوائی کمپنی نے وڈی مہربانی کر دیاں ہویاں بنکاک ہوائی اڈے دے پنج تارا ہوٹل وچ رات دے چھ گھنٹے گزارن دا موقع دتا سی۔ لاہور آون والے جہاز نے شامیں اٹھ وجے چلنا اے۔ ہوٹل والی بی بی نے چھ گھنٹے پورے ہوجان تے پہلوں ٹیلی فون دیاں گھنٹیاں کھڑکائیاں۔ میں آکھیا، میں ریسپشن تے اپڑناواں پر اوہنے وساہ نہ کھادا تے آبوہا کھڑکان لگ پئی۔ اوہ غصے والی انگریزی وچ آکھ رہی سی، پئی جے کمرہ ہور ورتنا ای تے وادھو کرایہ دے دے...... میں اپنی پیاری پنجابی زبان وچ آکھیا...... وادھو پیسیاں دی گل تے کمرے دے اندر آ کے کری دی اے۔ اوہنے کُجھ نہ وی سمجھدیاں ہویاں گھوی پائی، تے مُڑتڑی لا کے ٹُر گی...... میں کپڑے بدل کے اوہدے پچھے ہو گیا تے نالے دل وچ سوچیا...... کڈی بھیڑی کُڑی اے، پنجابی زبان وی نہیں سمجھدی......

میں ہور چھ گھنٹیاں لئی پنجاہ ڈالر دتے۔ اوہنے امریکن کُڑیاں وانگوں مسکرایاں بغیر، مینوں رسید تے دو کارڈ دتے، پئی توں سامنے ریستوران وچ ہوائی کمپنی دی مہربانی نال ناشتہ تے لنچ کر سکنا ایں...... میں اوہنوں فیر پنجابی وچ آکھیا۔

''فِٹے مُونہہ'' اوہنے اِنجے سر، سٹیاں ہویاں آکھیا ''تھینک یو''

مینوں اوس ویلے اپنے پاکستانی لکھاری بڑے یاد آئے، جہڑے سفرنامیاں وچ ایہو جہی ہر کُڑی نوں اپنے اتے عاشق کر لیندے نیں۔ منیا اوہ سوہنے ہوندے نیں تے نالے ولایت اُتے امریکا دیاں کُڑیاں اوہناں دے خیال موجب اُگا ترسیاں تے تریہائیاں ہوندیاں نیں۔ میں سجے پاسے لگے وڈے سارے شیشے ول تکیا تے تسلی کیتی، پئی میں ایڈا وی کوجھا

نہیں۔ اپنے آپ نوں بھلیکھا پا کے میں پچھانہ مُڑیا تے چیتے آیا، لاس ویگاس دے جوئے خانے وچ جہڑی کُڑی مینوں اشارے کر کے بُلا رہی سی، اتے تھوڑا اُٹھ کے میرے ول آئی وی سی، تے میرے نال میرے جوان ساتھی نوں اوہنے تکیا وی نہیں سی، اوہ کیہ گل سی......؟ اتے امریکا دے ای اِک ناچ گھر وچ کپڑیاں توں بِنا نچن والیاں وچوں اِک جدوں اپنی واری بھگتا کے آئی، تے اِنج ڈھلک کے میرے نال بہہ گئی، کہ وچکار صرف میری پتلوں ای رہ گئی سی...... ڈھیر شور کر دی موسیقی پاروں اوہ میرے نال گل کرن لئی اینی کُو نیڑے ہو گئی کہ اوہدے چم چم کر دے تو ادھے ادھے ہنیرے وچ لشکاں ماردے جسم دے گنبد میریاں گلھاں نوں گرمائش دے رہے سن، تے بُڈھے تن بدن وچ وی بجلی دے کرنٹ وانگوں جھٹکے لا رہے سن۔

اوہنے مینوں بڑے پیار نال آکھیا۔

''چل...... آ، پچھلے کمرے وچ چلیئے۔''

میں کہیا ''ایہہ میرا یار تینوں پسند کر دا اے......'' میں اپنے جوان ساتھی ول اشارہ کیتا...... اوہنے ترت جواب دتا۔

''تے...... میں تینوں پسند کرنی آں......''

میں اِک پل لئی سفرنامے لکھن والیاں دی طرحاں خود نوں ہیرو جیہا سمجھیا، پر بھلے ویلے دماغ بُجھکا ماریا...... جھلیا...... ایڈز!!''

میں کُجھ ڈالر اوہدی تلی تے رکھے، تے آکھیا ''جیوندے رہو، تے فیر سہی کدی'' اوہ نراش ہو کے کِسے ہور پاسے ٹُر گئی۔

گل تے تہانوں میں بنکاک ہوائی اڈے دے ریستوران وچ بیٹھیاں، اپنے کھڑ کھڑ ہسن دی دسنا چاہنا واں...... ہویا اِنج سی جدوں بیرا ناشتہ اتے چاہ لے کے آیا، تے چاہ دی پیالی وچ اِک ٹی بیگ پیا ہویا سی...... میں اوہنوں آکھیا، پئی اِک ہور ٹی بیگ دے دے...... اوہنے کاؤنٹر والی کُڑی نوں دسیا، تے اوہنے جواب گھلیا...... دوجے ٹی بیگ لئی ڈیڈھ ڈالر دینا پے گا......''

میں ناشتہ کرنا بُھل گیا، تے ہسدیاں ہسدیاں سوچاں دا پینڈا اپٹ کے پاکستان اپڑ گیا......

چنگے دناں دی گل اے میرا اِک بیلی ہوندا سی...... ساڈے ورگا غریب غربا تے نہیں سی پر ہن دی طرحاں کروڑ پتی وی نہیں سی ہوندا۔ رل کے آوارہ گردیاں کرنے ساں، تے مل جل کے کا کھوہ وی لینے ساں...... اوہ اِک سرکاری دفتر وچ کم کردا سی، تے کِسے دوجے شہروں لاہور وچ اپنا تبادلہ کروانا چاہندا سی جہڑا سرکاری قیدے قانون پاروں اوکھا کم سی۔ میرا اِک یار اوہناں وڈے افسراں وچ لگا ہویا سی جہڑا ایہہ کم کر سکدا سی۔ میں اوہدا ترلا پایا، تے اوہنے ایہہ کم کرا دتا...... میرا اج دا کروڑ پتی سجن لاہور آ گیا تے مینوں اُکا ملن لئی نہ آیا...... اوس وڈے افسر مینوں کوئی دو تِن ہفتیاں بعد فون کر کے آکھیا۔

''توں، چنگا بندہ ایں...... تیرے یار دا میں کم کر چھڈیا، تے توں رُکھے مُونہ شکریہ وی نہیں کہیا......''

میں شرمندہ ہو کے آکھیا ''رب جان دا اے، مینوں ایس گل دا پتہ ای نہیں کیوں جے اوس بیلی نے مینوں لاہور آ

کے دسنا تے کیہ ملناوی ضروری نہیں سمجھیا۔'' فون کرن والے افسر نے ہس کے کہیا۔

''ایہ نویں گل نہیں ...... کم کرالین پچھوں سبھے لوکیں ایسے طرحاں کردے نیں، لاہوراپڑن والے یار کول میں گیا، تے اپنے ولوں گِلا کیتا...... اوہنے بڑے ارام نال جواب دتا۔

''ایہ کم، تیرے یار نے نہیں کیتا میں تے کوئی ہور وسیلہ لبھیا سی۔'' میں نموجھان ہو کے چُپ کر رہیا......

مُڑ رب کیتا تے اوہنے سرکاری نوکری چھڈ کے اپنا کاروبار شروع کرلیا، تے ویکھدیاں ویکھدیاں کروڑ پتی ہو گیا۔ ساڈا اپنا گُو میل جول رہیا کہ کدی کدار سلام دعا ہو جانی یاں ہس کے مل لینا اوہدی مہربانی کہ اک دو واری میرے دفتر وی آیا...... تے نالے مینوں ٹوکاں وی مارنیاں، پئی میں اوہدے ول کدی نہیں گیا۔

اِک دیہاڑے لوڑھے ویلے میں اوہدے ول گیا۔ خیر، ہسدے متھے میا جھٹ پچھوں اوہدا کاما چاہ لے آیا...... چاہ دی پیالی وچ اِک ٹی بیگ سی...... میں کامے نوں اکھیا'' پئی، اِک ٹی بیگ ہور دے دے۔''

میرے کروڑ پتی نے اِک دم کامے نوں ٹوکیا...... اپنی پیالی وچ پئے ٹی بیگ نوں تھوڑا جیہا ڈبویا تے آکھیا'' توں ایہو ٹی بیگ لے لے، مینوں چوکھی لوڑ نہیں ہوندی......''

میں بڑا اپچی ہویا...... عرصے بعد اوہدے ول گیا ساں، کُجھ کہہ وی نہیں سکدا ساں...... دوجا خیرات والا ٹی بیگ لے کے، میں کوڑے گُھٹ کر کے چاہ پیتی، تے مُونہہ لٹکا کے آ گیا۔

صفدر کِسے زمانے وچ اوہدے کول کم کردا سی، ہن اوہنے وی اوہو جیہا اپنا کاروبار شروع کرلتا اے، تے چنگا سوکھا اے...... میں اک دیہاڑے دُکھی ہو کے اوہدے کول بیٹھے یاراں دوستاں نوں ایہ واقعہ سنایا، تے اودوں پچھے، ہن جدوں وی صفدر دا فون آندا اے، آکھدا اے۔

''کیہ پئے کردے او...... چھڈ دو گاردے کم...... میرے ول آ جاؤ، تہانوں دو ٹی بیگ والی چاہ پلاواں گا۔''

واقعی، میں جدوں وی جاناواں، اوہنے اپنے نوکراں نوں وی دس چھڈیا اے، پئی مینوں دو ٹی بیگ والی چاہ دی پیالی دتی کرو۔

بنکاک ہوائی اڈے دے ریستوران وچ دوجے ٹی بیگ دا مُل ڈیڈھ ڈالر سن کے میں تانہ ای کھڑ کھڑ کر کے ہس پیا ساں کہ بندہ اِنج کروڑ پتی نہیں بن جاندا...... چاہ سُرکدیاں میرا دل کیتا، پئی صفدر نوں پاکستان فون کر کے یاد دساں پئی دوجے ٹی بیگ دا مُل کیہ ہوندا اے......

میں ہوکا بھریا تے آکھیا'' سچ کہنا ایں یارا...... جے ایہ گل میں وی گولی ہوندی، تے تہاڈے دوہاں وانگوں خبرے میں وی کروڑ پتی ہو گیا ہوندا؟

مہینہ وار'' پنجابی انٹرنیشنل''...... مارچ 2006ء

◆◆◆

اظہر جاوید کے کردار کا ایک نادر گوشہ

انور سدید

اظہر جاوید کی مرنجاں مرنج طبیعت اور صلح کُل فطرت کے اس زاویے سے بیشتر لوگ شناسا ہیں کہ وہ دوستی اور محبت کی قدروں کو پہچانتے تھے اور ان کی روح کے مطابق عمل کرتے تھے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ وہ معروف شاعر، مقبول افسانہ نگار اور ممتاز ادبی رسالہ ''فنون'' کے مدیر جناب احمد ندیم قاسمی کے نیاز مند تھے تو انہوں نے نظم جدید کے ممتاز شاعر، جدید اردو انشائیہ کے بنیاد گزار اور عہد ساز رسالہ ''اوراق'' کے ایڈیٹر ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی گہری عقیدت قائم رکھی تھی۔ اسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہنا چاہیے کہ اپنے عہد کے ان دو نامور ادیبوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پاکستان میں اردو ادب کے دو گروپ بن گئے، جن کی ''لفظی توپوں'' کے دہانے ایک دوسرے کے خلاف کھل گئے تھے اور رسائل اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں دونوں اطراف سے ''گولہ باری'' ہوتی رہتی تھی، حتیٰ کہ ''فنون'' اور ''اوراق'' کے لکھنے والوں کی گروہ بندی کے آثار بھی نظر آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''اوراق'' میں لکھنے والے رسالہ ''فنون'' میں اشاعت حاصل نہ کر سکتے اور ''فنون'' کے ادیبوں نے یہ الزام ''اوراق'' پر بھی لگایا لیکن اس کا ٹھوس ثبوت کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ اظہر جاوید چونکہ دونوں گروہوں کو عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ادبی اختلاف کو ذات کے مدار میں داخل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے، اس لیے وہ نہ صرف خود پریشانی سے گزر رہے تھے بلکہ ان کے رسالہ ''تخلیق'' کے قلمی معاونین بھی ان کی توجہ اس ادبی معرکہ آرائی کی طرف مبذول کرا رہے تھے چنانچہ انہوں نے ''احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا تنازعہ'' پر ''تخلیق'' میں اداریہ 'پہلی بات' بھی لکھا اور ادب کے اس گرم محاذِ جنگ کو سرد کرنے اور صلح و آشتی کے پھریرے لہرانے کی کوشش کی۔

المیہ یہ ہوا کہ جناب احمد ندیم قاسمی اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اظہر جاوید سے بھی ناراض ہو گئے۔ ''تخلیق'' کے ایک اداریے کی جو قاسمی صاحب کی حمایت میں لکھا گیا تھا، معنوی تشریح اس طرح کی گئی کہ قاسمی صاحب ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ لے کر عدالت میں چلے گئے۔ اس دور میں اظہر جاوید جس کرب انگیز کیفیت سے گزر رہے تھے، میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مقدمے کی اس ''ہنگامہ خیزی'' میں ''قاسمی وزیر آغا تصادم'' پس منظر میں چلا گیا اور 10 جولائی 2006ء کو قاسمی صاحب وفات پا گئے تو متذکرہ ''ادبی معرکے'' کا اہم ترین کردار زندگی کے منظر سے ہی رخصت ہو گیا۔

دوسری طرف اظہر جاوید نے قاسمی صاحب کے ازالہ حیثیت عرفی کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں جو اپیل داخل کر رکھی تھی، اس کی سماعت قاسمی صاحب کی زندگی میں نہ ہوئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے ورثاء نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور پیروی نہ کی۔ اب اظہر جاوید بھی دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو یہ مقدمہ بھی داخلِ دفتر ہو گیا ہے۔

اظہر جاوید کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سونان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے اظہر جاوید کی اس پریشانی کا ذکر کیا جو انہوں نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے اختلافات اور ترکِ تعلق کے دور میں محسوس کی تھی اور انہیں داد دی کہ انہوں نے کس وضع داری اور سلیقے سے ان دو مشاہیرِ ادب سے اپنی نیاز مندی کا سلسلہ قائم رکھا۔ میں نے اظہر جاوید کی ان کوششوں کا ذکر بھی کیا جو وہ ان دو مشاہیر کی صلح صفائی کے لیے کرتے رہتے تھے اور ملال کا اظہار کیا کہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا پاسبان اظہر جاوید بھی اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ میں نے سونان صاحب سے گزارش کی کہ اگر اظہر جاوید صاحب کے ادبی اثاثے سے ان کے کے کچھ خطوط دستیاب ہوں تو یہ ان کے داخلی مطالعے میں بے حد معاون ثابت ہوں گے۔

میں سونان اظہر جاوید کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تحقیق کے خارزار میں قدم رکھ دیا اور دفتر ''تخلیق'' کے منتشر کاغذات سے اظہر جاوید کے وہ دو خطوط ڈھونڈ نکالے جو انہوں نے 1992ء میں احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کو متذکرہ متنازعہ دور میں لکھے تھے اور دونوں کی رنجشیں مٹانے کی کوشش کی تھی۔ سونان صاحب نے مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کا جوابی خط بھی فراہم کیا ہے اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے شاید جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے ان کا خط دستیاب نہیں ہے۔

میں قارئینِ ادب کی خدمت میں یہ خطوط پیش کرتا ہوں۔ اظہر جاوید کے خطوط ان کے کردار کے ایک نادر پہلو کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں اور متذکرہ تنازعے پر اہلِ ادب کی تشویش کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ میں ان خطوط پر فی الحال تبصرہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ (انور سدید)

....

اظہر جاوید کا مکتوب جناب احمد ندیم قاسمی کے نام

بسم اللہ۔ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

محبِّ مکرم، مشفقِ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب

خداوندِ کریم آپ کو سلامت و شاداں رکھے۔

آپ کے سامنے دست بستہ اور مؤدبانہ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے جناب قتیل شفائی اور ستار طاہر صاحب سے بھی بات کی ہے اور اس بار ''تخلیق'' میں (آنے والے شمارے میں) بھی لکھا ہے کہ ادب کی فضا میں چند لوگوں کی وجہ سے جو دھندلاہٹ پھیلی ہوئی ہے، اسے کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔ (چند لوگ کوئی بھی ہو سکتے ہیں)۔

میری آپ سے نیاز مندی غیر مشروط ہے۔

وزیر آغا صاحب سے بھی یاد اللہ ہے۔ اور وہ کرم فرما ہیں، مشفق ہیں۔

یہ میرا منصب نہیں کہ کوئی رائے دوں۔ یہ بات الم نشرح ہے کہ زیادتی کہاں سے ہو رہی ہے اور ''بدتمیزی'' کی سطح تک ادب کیسے پہنچا ہے۔ (میرا روئے سخن کسی بھی طرف نہیں)۔

میں سوچتا ہوں (اور اکثر نئے لکھنے والے ''تخلیق'' میں خط لکھ کر سوال کرتے ہیں) کہ میرے واجب صدِ تکریم سینئرز اور ہم آنے والی نسل کے لیے کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

آپ وسیع القلب ہیں، روشن ضمیر ہیں اور عالی ظرف ہیں۔ آپ کی اجازت سے بات کو ایک اور طرح دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آپ اجازت دیں تو میں پیش قدمی کروں؟

آپ اور وزیر آغا ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ کچھ باتیں ہوں۔ کچھ ضمانتیں میں دیتا ہوں۔ کچھ آپ بزرگ فیصلہ کریں۔ ابھی وزیر آغا سے بات نہیں کی۔ مگر مجھے اعتماد ہے (یا شاید خوش گمانی ہے)

تحریری طور پر یہ ضمانت نامہ یا حلف نامہ پیش کروں گا کہ جناب انور سدید، پرویز بزمی یا اسی قبیل کا کوئی اور صاحب آپ کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کریں گے۔ اگر ایسا ہوا (خدانخواستہ) تو وزیر آغا صاحب سب سے پہلے مذمت کریں گے۔ اوّل تو آپ کی طرف سے کوئی لکھنے والا ہے ہی نہیں۔ ستار طاہر صاحب سے بھی عرض کی جائے گی کہ وہ اپنا غیر جانبدارانہ کردار بحال رکھیں۔

وزیر آغا صاحب کو اگر شکایت ہو تو وہ آپ سے کہیں یا آپ خود وضاحت فرما دیں۔

دونوں صاحبان یہ طے کریں کہ کسی اخبار والے یا ادبی ایڈیشن کے نگران سے کوئی متنازعہ بات نہ ہو۔ اگر وہ ایسا سوال کریں تو انہیں منع کر دیا جائے۔ زیادہ خرابی اخباروں سے پھیلی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس ضابطے پر عمل در آمد ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں ایک بڑی تقریب منعقد کروں گا جس میں آپ دونوں معزز حضرات تشریف فرما ہوں گے اور اس کے بعد ''فنون'' اور ''اوراق'' بھی اپنے صفحے ایک دوسرے کے لیے حاضر کریں۔ آپ ''اوراق'' میں اور وزیر آغا صاحب ''فنون'' میں چھپیں گے تو کئی فتنے خود بخود دب جائیں گے۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ رب راکھا آپ کا......اظہر جاوید، ۲۱ نومبر ۱۹۹۲ء

....

اظہر جاوید کا مکتوب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام

بسم اللہ۔ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

مشفقم، محترم، وزیر آغا صاحب!

اللہ تعالیٰ آپ کو شاد آباد رکھے۔ آپ کو دوستی میں لکھے ہوئے خطوں میں بے تکلفی ہوتی ہے۔ یہ سراسر نیازمندانہ

خط ہے۔

میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں، نہایت ادب اور احترام کے ساتھ!!

ادب پڑھنے والے قاری اور نئے لکھنے والے اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ادب کی فضا میں جو تکدّر پھیلا ہوا ہے، اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آپ اور ہم سب آنے والی نسلوں کے لیے کیا سرمایہ چھوڑ کر جارہے ہیں بہت معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس سلسلے میں سارا بار آپ پر اور جناب احمد ندیم قاسمی پر ڈال دیا جاتا ہے۔ آپ دونوں سینئر اصحاب چاہے جتنا بھی لاتعلق رہیں (بدنصیبی سے) ان تحریروں کے سارے اشارے آپ لوگوں تک پہنچتے ہیں، جن میں شائستگی کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے۔

میں رائے دینے کا حق نہیں رکھتا۔ نہ روئے سخن کسی طرف رکھتا ہوں مگر یہ بات کھلی حقیقت کی طرح سامنے ہے کہ ادب کی فضا میں یہ دھندلا پن کس نے پھیلایا ہے۔

آپ کی اجازت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس بار ''تخلیق'' میں بھی (آنے والے شمارے میں) لکھا ہے۔ آپ سے بھی مؤدبانہ التماس ہے اور نہایت واجب الاحترام احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھی خط لکھوں گا یا ملاقات کروں گا۔

کچھ لوگوں نے ادب میں بے ترتیبی پھیلا رکھی ہے۔ (کچھ لوگ کوئی بھی ہو سکتے ہیں) اسے کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں، میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا غیر مشروط نیاز مند ہوں۔

آپ بھی میرے کرم فرما ہیں، مشفق ہیں۔

میں عاجزانہ تجویز پیش کرتا ہوں۔ آپ اور جناب احمد ندیم قاسمی اکٹھے ہوں۔ کچھ باتیں کھل کر ہوں۔ اس کے بعد جناب انور سدید، پرویز بزمی اور جناب ستار طاہر کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں اپنا قلم روک لیں خدانخواستہ اگر کوئی لکھے تو کچھ دوستوں کی مذمت آپ کریں۔ کچھ لوگوں کو جناب قاسمی دبائیں۔

کوئی اخبار والا، ادبی ایڈیشن کا نگران یا دوسرے صفحے والا آپ صاحبان کا انٹرویو کرے اور اگر کوئی متنازعہ بات چھپوانا چاہے تو آپ سختی سے منع کریں۔ میرا خیال ہے، زیادہ خرابی اخباروں کی وجہ سے پھیلی ہے۔

میں چاہتا ہوں (اور یہ خوش گمانی ہی سہی) کہ آپ دونوں حضرات کی ملاقات کے بعد ایک بڑی ادبی تقریب منعقد کروں اور اس کے بعد اگر آپ ''فنون'' میں اور جناب احمد ندیم قاسمی ''اوراق'' میں چھپیں تو بہت سے ''فتنے'' خود بخود دب جائیں گے۔

اس ''ضابطے'' پر عمل ہونا کچھ ایسا مشکل نہیں، آپ اور جناب احمد ندیم قاسمی روشن ضمیر، وسیع القلب اور عالی ظرف ہیں۔ اگر کچھ درگزر بھی کرنا پڑے تو احتراز نہ کریں۔

آپ اجازت دیں تا کہ میں جناب احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں بھی عرض گزارش کرسکوں۔
آپ کے جواب کا انتظار رہے گا......رب راکھا　　آپ کا اظہر جاوید......۲۳نومبر......۱۹۹۲ء

....

ڈاکٹر وزیر آغا کا مکتوب جناب اظہر جاوید کے نام

سول لائینز۔سرگودھا (پاکستان)
۲دسمبر۱۹۹۲ء

برادرِعزیز،اظہر جاوید

السلام علیکم۔آپ کا خط مجھے مل گیا تھا۔مکروہاتِ دنیا میں اسیر ہونے کی وجہ سے فوری طور پر جواب تحریر نہ کرسکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے بڑی دردمندی کے ساتھ عصری صورتِ حال کو محسوس کیا ہے اور میں آپ سے سو فی صد متفق ہوں کہ یہ افسوس ناک اور بے معنی صورتِ حال ختم ہونی چاہیے۔ماضی میں بھی بعض کرم فرماؤں نے اس سلسلے میں کوشش کی تھی اور کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔مگر پھر بدقسمتی نے ہم سب کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔آپ کوشش کر کے دیکھ لیں۔مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اسے خوش آمدید کہوں گا۔اب ہم لوگ ''آخری کنارے'' جا لگے ہیں۔اگر باقی ماندہ سانس ہموار ہو جائیں تو سبحان اللہ!

ایک بات عرض کردوں،میری ناچیز رائے میں کوئی بھی ملاقات انور سدید اور خود آپ کے بغیر شاید نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکے۔آپ اس بات پر غور کریں۔خدا کرے آپ بخیروعافیت ہوں گے۔　　مخلص......وزیر آغا

....

متذکرہ بالا خطوط میں جناب اظہر جاوید نے محترم احمد ندیم قاسمی سے اپنی غیر مشروط نیازمندی کا اقرار کیا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا کرم فرما شمار کیا اور میں اپنے مشاہدے کی اساس پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنی ان نسبتوں کو دونوں مشاہیر سے قائم رکھا۔میں اظہر جاوید صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز انور سدید پر بھروسہ کیا اور دونوں اصحاب کو لکھا کہ اگر وہ تنازعہ یا رنجش ختم کریں تو اظہر جاوید صاحب مجھے اور پرویز بزمی کو اس سلسلے کی قلم آرائی سے روک دیں گے۔ اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے۔احمد ندیم قاسمی،وزیر آغا اور اظہر جاوید سب کا سانحۂ ارتحال ہو چکا ہے اور یہ خطوط وفات کے بعد منظرِ عام پر آئے ہیں۔اس مرحلہ پر میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر اظہر جاوید صاحب کی گزارش کو قبول کرلیا جاتا اور ادب کا مطلع صاف ہو جاتا تو میں اظہر جاوید صاحب کے ارشادات پر ضرور عمل کرتا۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کو اپنا محسن سمجھتا تھا۔وزیر آغا ادب سے بھاگے ہوئے انور سدید کو واپس لائے تھے اور اس کی ادبی تربیت میں گراں قدر حصہ لیا تھا اور جناب احمد ندیم قاسمی نے

مجھے ہمیشہ متحرک رکھا اور میرے قلم پر جمود طاری نہیں ہونے دیا۔ میں ان کے اس احسان کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور ان کی مغفرت کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ میں نے ''احمد ندیم قاسمی۔ وزیر آغا تنازعہ'' کو ہمیشہ تشویش کی نظر سے دیکھا اور اس دوران ادب کے ان دو زعما کو قریب لانے کے لیے ایک خط بھی لکھا جو گلزار جاوید صاحب کے رسالہ ''چہار سو'' راولپنڈی کی نومبر دسمبر ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔ یہ خط درج ذیل ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکم جون ۱۹۹۳ء

محترمی احمد ندیم قاسمی صاحب، ڈاکٹر وزیر آغا صاحب

سلام مسنون۔ اگلے روز میں نے خواب دیکھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب نواز شریف قومی اسمبلی کے ایوان میں سپیکر کی صدارت اور قومی اسمبلی کے منتخب ارکان کی موجودگی میں ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں۔ ماضی کی تلخیوں کو بھلانے، حال کو صحت مند اور مستقبل کو منور کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کھلی آنکھوں کا خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔

اس موقعہ پر مجھے وہ جنگ یاد آئی جو اخبار ''فرنٹیئر پوسٹ'' کی رپورٹ کے مطابق ''بے مقصد'' اور ادب کے لیے ضرر رساں قرار دی جا چکی ہے اور جس پر ۲۵ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیاست دان اپنے سیاسی تنازعے ختم کر سکتے ہیں تو دو ممتاز ادبا...... جناب احمد ندیم قاسمی ......اور جناب وزیر آغا اپنے ادبی تنازعے کیوں ختم نہیں کر سکتے ؟

اس مکتوب کا محرک وزیر اعظم کا خطاب اور قائدِ حزبِ اختلاف کی متذکرہ تقریر ہے۔ میں آپ تک یہ تاثرات اپنی ذاتی حیثیت میں اس درخواست کے ساتھ پہنچا رہا ہوں کہ جس طرح دو سیاست دانوں نے اقتدار کے تنازعات کو بالائے طاق رکھ کر صلح کی ہے اور دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ بھی ایک دوسرے کی طرف دستِ محبت بڑھا کر ادبی دنیا کو حیران کر دیں۔

اخبار ''فرنٹیئر پوسٹ'' نے اپنے اداریے میں خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کے لیے بے حد عمدہ اور قابلِ رشک مشورہ دیا ہے۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔ ملک کے دو بڑے سیاست دانوں نے جو مثال قائم کی ہے وہ قابلِ تقلید ہے اور آپ میں سے جو بھی پہل کرے گا وہ ادب اور انسانیت کی تاریخ میں قابلِ فخر مقام حاصل کر لے گا۔ لیکن یہ بات نظر انداز نہ ہو گی کہ فی الوقت سیاست دان ادیبوں پر سبقت لے گئے ہیں۔

اس ناچیز کی درخواست ہے کہ ادیبوں کو معاشرے کے سامنے بالعموم اور ادبی دنیا کے سامنے بالخصوص سرخرو کیجئے اور مناسب ہو تو مجھے جواب سے سرفراز فرمایئے۔ والسلام

مخلص......انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا نے میرے اس اقدام کو پسند فرمایا۔ لیکن محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کی طرف سے جواب نہ آیا اور یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔

ماہنامہ تخلیق
MONTHLY TAKHLEEQ
BHAGWAN STREET PURAN ANARKALI LAHORE - 54000
Phone: 230807

محترم و مکرم، مشفق، محترم اظہر جاوید صاحب

خداوند کریم آپ کو سلامت و شاداں رکھے۔

آپ کے سامنے دست بستہ اور مؤدبانہ گذارش کر رہا ہوں۔

میں نے جناب [illegible] اور تارڑ صاحب سے بھی بات کی ہے اور اس "تخلیق" میں (آنے والی تحریروں) کی کیفیت ہے کہ ادب کی فضا میں، چند لوگوں کی وجہ سے جو دھندلاہٹ پھیلی ہوئی ہے، اسے کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔ (چند لوگ کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔)

میری آپ سے نیازمندی غیر مشروط ہے۔

وزیر آغا صاحب سے بھی یاد اللہ ہے۔ اور وہ کرم فرما ہیں، مشفق ہیں۔

یہ میرا منصب نہیں کہ کوئی رائے دوں — یہ بات اہم تر ہے کہ زیادتی کہاں سے ہوئی ہے اور "بدتمیزی" کی سطح تک ادب کیسے پہنچا ہے۔ (میرا روئے سخن کسی کی طرف نہیں)

میں سوچتا ہوں (اور اکثر لکھنے والے "تخلیق" میں خط لکھ کر سوال کرتے ہیں) کہ بزرگ ادیب، جینئس اور قد آور ہم — آنے والی نسل کے لئے کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

آپ وسیع القلب ہیں، روشن ضمیر ہیں اور عالی ظرف ہیں۔ آپ کی اجازت سے بات کو آگے اور طرح دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آپ اجازت دیں تو میں پیش قدمی کروں۔

آپ اور وزیر آغا صاحب ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں — مجھ جانتے ہیں — کچھ ضمانتیں میں دیتا ہوں۔ کچھ آپ بزرگ فیصلہ کریں — ابھی وزیر آغا صاحب سے بات نہیں کی۔ مگر مجھے اعتماد ہے (یا شاید خوش گمانی ہے۔)

تحریری طور پر ضمانت نامہ یا حلف نامہ پیش کروں گا کہ جناب انور سدید، جناب پرویز بزمی یا اسی قبیل کے کوئی ادیب آپ کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کریں گے۔ اگر ایسا ہوا (خدانخواستہ) تو وزیر آغا صاحب سب سے پہلے مذمت کریں گے اور آپ کی طرف سے کوئی لکھنے والا ہے ہی نہیں — تارڑ صاحب سے بھی عرض کی جائے گی کہ وہ اپنا غیر جانبدارانہ کردار بحال رکھیں۔

وزیر آغا صاحب کو اگر کوئی شکایت ہے — یہ بزرگ وہ آپ سے کہیں یا آپ خود وضاحت فرما دیں۔

دونوں صاحبان یہ بھی طے کریں کہ کسی اخبار والے یا ادبی ایڈیشن کے نگران سے کوئی متنازعہ بات نہ کریں۔ اگر وہ ایسا سوال کریں تو انہیں منع کر دیا جائے۔ زیادہ خرابی اخباروں سے پھیلی ہے۔

میرا خیال ہے اس فارمولے پر عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی تقریب منعقد کروں گا، جس میں آپ دونوں معزز حضرات تشریف فرما ہوں گے اور اس کے بعد "فنون" اور "اوراق" بھی، پہلے ایک دوسرے کے [illegible] کریں۔ آپ "اوراق" میں اور وزیر آغا صاحب "فنون" میں چھپیں گے تو کئی فتنے خود بخود دب جائیں گے۔

آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

[illegible] اظہر [illegible]
۲۱

ماہنامہ تخلیق
MONTHLY TAKHLEEQ

محترمہ منصورہ احمد صاحبہ!!

اللہ تعالیٰ آپ کو شاد و آباد رکھے۔

آپ کے ادارتی صفحے پر نئے لکھنے والوں ہی کی شائع ہوئی ہے۔ یہ سب سرمایہ زندہ ہے۔

میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں، نہایت ادب اور احترام کے ساتھ!!

ادب پڑھنے والے قاری اور لکھنے والے اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ادب کی فضا میں جو تکدر پھیلا ہوا ہے، اس کا سبب کیا ہے، اور اس کی ذمہ داری کون ہے۔ (آپ اور ہم سب) آخر اس مضمون سے کیا مراد لیا جا رہا ہے؟

نہایت معذرت کے ساتھ گزارش کروں گا کہ اسی صفحے میں سارا بار آپ پر اور جناب احمد ندیم قاسمی پر ڈال دیا جاتا ہے۔

آپ دونوں حضرات ... (جو ہمیں ہے) ان تحریروں کے سارے اشارے آپ دونوں تک پہنچتے ہیں، جن میں شائستگی کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے۔

میں ذاتی طور پر کوئی حق نہیں رکھتا، نہ دوسرے شخص کی طرف سے لکھتا ہوں، مگر یہ بات کسی حقیقت کی طرح سامنے ہے کہ ادب کی فضا میں یہ دھندلا پن کہیں سے پھیلا یا ہے۔

آپ کی اجازت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے یہی "تخلیق" میں بھی (آنے والے شمارے میں) لکھا ہے۔ آپ سے بھی مودبانہ التماس ہے اور نہایت ادب و احترام سے احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھی خط بھیجوں گا یا ملاقات کروں گا۔

کچھ لوگوں نے جو ادب میں سیاست بھی پھیلا رکھی ہے (کچھ لوگ کوئی بھی ہو سکتے ہیں) اسے کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں، میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا غیر مشروط نیاز مند ہوں۔

آپ بھی مجھ پر کرم فرما ہیں۔ مشفق ہیں۔

میں عاجزانہ تجویز پیش کرتا ہوں۔ آپ اور جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ بیٹھیں۔ کچھ باتیں کھل کر ہوں۔ اور میرے جناب ... اور جناب ستار طاہر کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں اپنا قدم روک لیں۔ ... جناب اگر کوئی سمجھے تو کچھ دوستوں کی مشاورت کریں، کچھ لوگوں کو جناب قاسمی رابطے ...

کوئی افسانہ والا، ادبی ایڈیشن کا نگران یا ادبی صفحے والا ... اور اگر کوئی تنازعہ بات چھپنا ... خدانخواستہ جا رہا ہے، تو آپ نہیں روکنے کریں۔ میرا خیال ہے، زیادہ خرابی اخباروں کی وجہ سے بھی پھیلی ہے۔

ہم جانتا ہوں (یہ خوش گمانی ہی سہی) کہ آپ دونوں محترم شخصیات کی ملاقات کے بعد میں ایسی تحریریں ختم ہو جائیں گی۔

اور اسی طرح اگر آپ "فنون" میں اور جناب احمد ندیم قاسمی "اوراق" میں چھپیں تو سب تنبیہ سے فتنے خود بخود دب جائیں ...

... ہونا بھلا ایسا مشکل نہیں۔ آپ اور جناب احمد ندیم قاسمی ... ، وسیع القلب اور عالی ظرف ہیں، اگر مجھ ... آپ اجازت دیں تو میں جناب احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں بھی عرض گزار کروں۔

آپ کے جواب کا انتظار ہے۔

رب راکھا

آپ کا

اظہر جاوید

WAZIR AGHA
CIVIL LINES
SARGODHA (PAKISTAN)

Tel: 65781 Sargodha
370726 Lahore

Ref. ____________ Date ۱۲/۲

برادرم اظہر جاوید صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا۔ مگر دو ماہ تک دنیا میں اسیر ہونے کے باعث فوری طور پر جواب تحریر نہ کر سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے بڑی دردمندی کے ساتھ موجودہ صورتِ حال کو محسوس کیا ہے اور میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں کہ یہ افسوسناک اور بے معنی صورتِ حال ختم ہونی چاہیے۔ ماضی میں بھی بعض نرم خو لوگوں نے اس سلسلے میں کوشش کی تھی اور کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی مگر پھر بدقسمتی نے ہم سب کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔ آپ کوشش کر کے دیکھیں۔ مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے خوش آمدید کہوں گا۔ اب ہم قوسِ آخر کے کنارے آ گئے ہیں۔ اگر باقی ماندہ سانس ہموار ہو جائیں تو سبحان اللہ۔

ایک بات عرض کر دوں کہ کوئی بھی ملاقات [illegible] انور سدید اور خود آپ کے بغیر شاید بہتر ثابت نہ ہو سکے گی۔ آپ اس بات پر غور کریں۔

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

مخلص
وزیر آغا

تراشے

شبنم شکیل

اظہر جاوید دی شخصیت اوہدے ایس شعر وچ پوری طرحاں جھلکدی اے۔

چار چفیرے، دنیا والے، وچ میں کلم کلّا
جیوں لبستی دے بالاں وچ گھر جائے کوئی جھلّا

مینوں چنگی طرحاں یاد نئیں۔ شاید سٹھ دے دہاکڑے دے شروع وِچ۔ 1961ء یاں 1962ء وچ، میں اظہر جاوید نوں کسے مشاعرے چ ملی ساں۔ ایہہ اوہ زمانہ سی جدوں کشور ناہید تے میں ریڈیو تے مشاعرے پڑھنے شروع کیتے سن تے کجھ معتبر ہو گئے ساں۔ فیر ٹی وی آ گیا۔ ٹی وی نے مشاعرے پڑھن لئی کئی شاعر سفارشاں کرواندے سن، پر اظہر جاوید نے کدے وی اِنج نہیں کیتا۔ اوہ بوہت خوددار انسان سی۔ مشکل ویلے وی میں اوہنوں کسے دے اگے ہتھ پھیلاندے نہیں ویکھیا۔

اینہاں 50 ورھیاں چ میں اظہر جاوید نوں اک بوہت مستقل مزاج انسان دے طور تے ویکھیا۔ اوہ بوہت Motivated تے بوہت Committed سی۔ رسالہ ''تخلیق'' شروع کرن توں پہلاں اظہر جاوید ''سیارہ ڈائجسٹ'' لئی کم کر رہیا سی۔ لکھاریاں کولوں اونہاں دیاں لکھتاں کٹھیاں کرن لئی اوہ بڑے خلوص، لگن، حوصلہ مندی، مستقل مزاجی تے قوتِ برداشت توں کم لیندا سی۔ خورے اوہنوں ایہہ صفتاں رب نے دتیاں سن یاں اوس نے ایہہ حاصل کرن لئی اپنا دل مار لیا سی۔

''تخلیق'' شروع کرن ویلے اظہر جاوید نوں مالی مشکلاں توں گزرنا پیا۔ پر اوہ ثابت قدمی نال برداشت کردا رہیا۔ ادب لئی اوہدا لگاؤ بوہت زیادہ سی۔ اک دن اوہ قتیل شفائی ہوراں نال، آغا جی (ڈاکٹر عابد علی عابد) ہوراں کول ''تخلیق'' لئی غزل لین لئی آیا۔ آغا جی دا موڈ چنگا نہیں سی۔ اونہاں نے کہیا ''میرے کول کوی ءنویں غزل نئیں۔ دو تن مہینے بعد آئیں۔'' قتیل شفائی ہوراں آغا جی دا مزاج سمجھدے سن۔ اونہاں نے ایدھر اودھر دیاں گلاں کر کے آغا جی دا موڈ ٹھیک کر دتا، فیر اونہاں ہولی جیہی اظہر جاوید نوں کہیا ''یار جنی دیر تو چنگے ادیب یاں شاعر دی تخلیق لین لئی زور لاؤنا ایں جے کسے ''وڈے

بندے'' دی خوشامد کردا تے، کتھوں دا کتھے پہنچ جاندا'' آغا جی نے وی قتیل ہوراں دی ہاں وچ ہاں ملائی۔ اظہر جاوید نے صاف گوئی نال آکھیا۔'' عابد صاحب تسیں آپ شہرت تے دولت لئی ہن تیکر کجھ نہیں کیتا، تے اپنے کم وچ مصروف رہے۔ مینوں وی شہرت تے دولت توں محروم رہن دیو'' اظہر جاوید بے نیاز بندہ سی۔

جدوں ''تخلیق'' کجھ چمکن لگا، تاں بوہت سارے ادیباں تے شاعراں نے اوس نوں ''تخلیق'' وچ اپنے ''گوشے'' لئی کہیا، کجھ رشوت دی وی آفر کیتی، تے 500 رسالے خریدن دی وی، پر اوس نے انکار کر دتا۔ مینوں یاد اے پئی آغا جی دی وفات تے سب توں پہلاں نمبر ''تخلیق'' دا نکلیا۔ اظہر نے مواد اکٹھا کرن لئی میرے، میرے بھین شیریں دتے آغا جی دی دوجی بیوی محبوب دے گھراں دے کئی چکر لگائے۔ پیدل، تے رکشے تے، پر کم مکمل کر کے وکھایا۔

ظاہر اے پئی اوس نوں داد توں علاوہ ہور کیہ مل سکدا اسی۔ اوہ گھاٹے دا سودا خوشی نال قبول کر لیندا اسی۔ اوس نے ''تخلیق'' راہیں کئی نویں لکھن والیاں نوں متعارف کروایا۔ پر اوہ کسے نال وی بدتہذیبی نال پیش نہیں سی آؤندا۔ اوہ اپنی تعریف سن کے کدے ہس پیندا تے کدے اپنے خلاف آپ ای کوئی جملہ کسدا اسی۔ اوس دی مزاج دی حس بوہت Cultured سی۔ اوہ بنیادی طور تے Back bencher سی۔ اونہوں اپنے آپ نوں اگے کرن دا شوق نہیں سی۔ پر اونہوں پتہ سی پئی سچی گل کدوں کرنی اے۔ بھاویں کنا ای بھانبڑ کیوں نہ مچے۔ سچ آکھے تے اوہ ساری زندگی سچ دی فتح لئی لڑدا رہیا۔ اوہدی جدوجہد ایس لئی سی پئی ''سچ کہواں گا تے سچ توں علاوہ کجھ نہیں کہواں گا۔'' تسیں جاندے ای او پئی سچ بولن والیاں ناوں کدے کدے زہر دا پیالہ وی پینا پیندا اے تے کدے سولی تے وی چڑھنا پیندا اے۔ سو اوہ قطرہ قطرہ زہر پیندا رہیا تے جیوندا رہیا پر ساریاں مخالفتاں توں بعد وی اوجت گیا۔ جدوں اوہنوں پرائڈ آف پارفارمنس ملن دا اعلان ہویا تے پاکستان تے ہندوستان وچ کوئی وی اجیہا شخص نہیں سی جس نے اوہدی مخالفت وچ اک وی لفظ کہیا ہووے۔ لوکاں نے دلوں اونہوں داد دتی۔ اوہ لوک خوش قسمت نیں جیہڑے اظہر جاوید جیہے ادیب، شاعر تے دانشور نال محبت کر دے نیں۔

''کون ہوتا ہے، حریف مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر، لب ساقی پہ، صلا میرے بعد

(23 فروری 2012ء دی شام، پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد دے اجلاس وچ صدارتی خطبے دے طور تے پڑھیا گیا)

(مہینہ وار ''چانن'' لاہور/اسلام آباد...... مارچ 2012ء)

بیدار سرمدی

کہندے نیں ہنیرے دے اخیرلے سرے تو چانن شروع ہوندا اے۔ دو پھگن 2068 بکرمی 14 فروری 2012 تے 22 ربیع الاوّل 1433ھ نوں رات اٹھ وجے ماں دھرتی دی ہنیری جھولی راہیں جیہڑا اپنے خواباں دے چانن تے سجری سویر ولّ ٹریاں اوہ ہور کوئی نہیں سی، اظہر جاوید سی۔

لاہور چ پوری ادھی صدی توں لکھاریاں، شاعراں، ادیباں، دامان پردھان ماہنامہ ''تخلیق'' راہیں روپ پیار دی خوشبو پورے جگ وچ عام کرن والا، گلاب دی لغرور گا، پر کنڈیاں توں پاک۔ صرف تے صرف مدھ بھری رنگت والا۔ یقین نہیں آوندا جے اوہ ہن ایس خاکی دنیا وچ نہیں رئیا۔ اثر چوہان ہمیشہ سچیاں گلاں کردے نیں، پر اج اوہناں نیں فون تے اظہر جاوید دے ہمیشہ لئی لمبے سفر تے جان دی خبر سنائی تے پہلی واری انج لگا جے ایہہ خبر سچی نہ ہووے گی۔ اظہر جاوید کیویں اُوس پار جاسکدا اے۔ اوہدیاں جڑاں تے ایس جگ وچ پاکستان، بھارت ای نہیں پوری دنیا دے ملکاں وچ لوکاں دے دلاں نال جڑیاں ہویاں نیں۔ سرگودھا چ اکھ کھولن تے بولن دا سلسلہ شروع کرن والے اظہر جاوید نوں دنیا نے جو کجھ دتا اوس من موہنے درویش نے کئی گنا کولوں پا کے دنیا وچ ونڈیا۔ 4 جنوری 1938ء توں لے کے 14 فروری 2012ء تائیں اظہر جاوید کجھ لوکاں لئی پہیلی تے کجھ لوکاں لئی چمبیلی بنیا رہیا۔ تے فیر اچن چیتی ساریاں نوں اللہ بیلی آکھ کے کیولری گراؤنڈ دی آفیسر کالونی دے پچھلے پاسے کوڑے قبرستان دی بیری تھلے اپنے پرانے لنگوٹیے ڈاکٹر کنول فیروز تے سجناں بیدار سرمدی، جان کاشمیری تے نوید قتیل دے سامنے اپنے پتر سنان دے ہتھاں توں اُتر کے ماں دھرتی دی جھولی وچ لک گیا۔

اظہر جاوید اُنج تے لمی حیاتی پائی۔ اج دی گھمن گھیر جندڑی تے وسوں وچ تہتر، چوہتر ورھے جی لینا تے اوہ وی جی داراں ورگی حیاتی، کوئی معمولی گل نہیں۔ اوہناں سرگودھا وچ الطاف مشہدی دے پرچے ''خلوص'' دی ادارت توں بعد سٹھ دی دہائی وچ لاہور آ کے اظہار ترمذی دے رسالے ''پارس'' دی ادارت سنبھالی۔ سرگودھا دے ای ڈاکٹر کنول فیروز ہوریں جیہڑے ''شاداب'' رسالہ وی شائع کردے نیں تے آپ وی ترقی پسند تے خوبصورت شاعر نیں، اظہر جاوید دے نال نال اپنا ادبی تے صحافتی سفر کردے رہے۔ ادبی جریدیاں دی ادارت توں مڈھ بنھ کے اظہر جاوید روزنامے ول پرتیا تے ''جمہور'' اخبار تے روزنامہ ''امروز'' دے شعبہ ادارت وچ آون توں بعد وی اپنا ادبی رنگ روپ قائم رکھیا، تے کئی ورھے روزنامہ امروز دے ادبی ایڈیشن دے انچارج رہے۔ ایہہ اوہ زمانہ سی جدوں سرگودھا توں کجھ ہور پھلاں دی خوشبو لاہور آونی شروع ہوگئی۔ اوہناں وچ اثر چوہان وی شامل سن جنہاں سرگودھا لاہور آ کے اپنا نویکلا میلا لایا۔ ''سیاست'' اخبار کڈھیا تے ہر پاسے سوچ وچار دی اک نویں لہر بحر ہوگئی۔ احمد ندیم قاسمی تے ڈاکٹر وزیر آغا دوناں دا جم پل دا رشتہ ضلع سرگودھا نال جڑیا ہویا سی۔ دونویں ادب دے وڈے اُڈیار سن۔ بیدار سرمدی ہوراں پہلے اثر چوہان ہوراں دے اخبار ''سیاست'' تے فیر مجید نظامی دے اخبار نوائے وقت وچ ڈیرہ لایا۔ عاشق جعفری وی اثر چوہان دے نال سن، تے تاج الدین حقیقت ''امروز'' دے میگزین سیکشن دے ایڈیشن سنبھال چکے سن۔ علامہ اصغر علی کوثر وڑائچ وی ''امروز'' اچ رنگ جمائے ہوئے سن۔ ایہہ ماحول سی جس وچ اظہر جاوید ہوراں اپنی اک نویکلی پچھان اپنے ادبی رسالے ''تخلیق'' دی راہیں کرانی شروع کیتی۔ زندگی دا حسن کسے شکل وچ ہووے اوہ اوہدے عشاق سن۔ اوہناں دی کڑھت موت صرف ایہہ سی کہ رہتل وچ سوہنا پہ نہ مک جاوے۔ دُکھی لوکاں نوں سکھ ملے تو اوہ آپوں سوہنے ہو جاندے نیں۔ اکھاں وچ اڈدے پکھوں دی اکھاں دی چمک آجاوندی اے۔

اوہنا دی ترقی پسندی بس لوکائی نوں خوش تے سکھی ویکھن دی خواہش توڑ یسی۔ ایس نکی جئی خواہش تے خواب لئی اظہر جاوید نے کنیاں اوکڑاں دا سامنا کیتا۔ اپنی دھرتی تے ساہ گھٹ آمریت دے خلاف اک پتر تے دوجے لکھاریاں نال دستخط کیتے تے ''امروز'' دی نوکری توں جواب مل گیا۔ جس پیپلز پارٹی دی سوہنی لیڈر بےنظیر بھٹو لئی نعرے لکھے تے نعرے دی اجئے جے ''چاروں صوبوں کی زنجیر بےنظیر بےنظیر'' پارٹی دی پچھان بن گیا۔ اوسے دے پہلے اقتدار تے اختیار وچ اظہر جاوید ہوراں نے اپنا جان توں پیارا ''تخلیق'' بچانا مشکل لگن لگ پیا۔ میرے وانگوں اظہر جاوید وی احمد ندیم قاسمی تے ڈاکٹر وزیر آغا دا دلوں احترام کردے سن تے کسے اِک دھڑے دی مہر اپنے متھے تے نہیں سی لگوانا چاہندے۔ تے ایہو گل اوہناں دا قصور بن گئی۔ کجھ ناسمجھ مشیراں دے آکھے لگ کے احمد ندیم قاسمی ہوراں اک گل تے مٹی پان دی بجائے عدالتی کٹہرے وچ آن دا فیصلہ کیتا تے اظہر جاوید جیہڑے احمد ندیم قاسمی دا دلوں احترام کردے سَن اپنے آپ نوں بچان لئی سامنے آن کھلون تے مجبور ہوئے۔ ایس گل دا اوہناں دے دل تے بوہتا اثر سی۔ ویلا وی واہندے دریا دا پانی اے۔ کدی رُکیا اے؟ آج دونویں اگلے جہان ٹر گئے نیں تے سارے جھیڑے جھگڑے ای مک گئے نیں۔

اظہر جاوید تے اوہناں دے ''تخلیق'' نے ادیباں شاعراں دی اک پوری نسل تیار کیتی اے۔ 43 ورھے مسلسل تخلیق چھپیا تے ایہہ اک ریکارڈ وی اے۔ جے بغیر کسے سرکاری مدد دے، بغیر کسے نجی مالی سہارے دے اک صاحب جنوں مدیر نے اوہدے گنتی دے سجناں نیں زندہ رکھیا تے پوری دنیا دے آزاد مشن لکھاریاں توں دل دیاں گلاں کرن تے مرضی دے اکھر تخلیق کر کے اک دوجے دے سامنے رکھن دا پلیٹ فارم دتی رکھیا۔ اظہر جاوید نال اپنے گھر توں لے کے اللہ دے گھر مسجد محمدیہ غوثیہ دی جنازگاہ توڑی سنگت کرنے والے ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر کنول فیروز، یونس جاوید، اعزاز احمد آذر، مستنصر حسین تارڑ، سرور سکھیرا، صدیق جاوید، جان کاشمیری، سیّد سرفراز، شاہد بخاری، محمد صفدر، نوید قتیل، شہباز انور سمیت لاہور دے ادیباں تے شاعراں دی اک وڈی تعداد اپنے سجن تے متر لئی ہنجواں نوں پلکاں دی چھتنار اوہلے چھپا کے سوچ رئی سی جے ''تخلیق'' دی جلد نمبر 42 تے شمارہ نمبر 2 توں بعد کیہ نظر آوے گا۔ ڈر لگدا اے ایہہ سوچ کے جے بھئی لاہور اچ پچھلے کجھ ورھیاں وچ طفیل ہوشیار پوری گئے تے ''محفل'' دا اوہ رنگ نہ رہیا۔ محمد طفیل گئے تے ''نقوش'' دے اوہ خاص نمبر نہ رہے۔ احمد ندیم قاسمی گئے تے ''فنون'' دا رنگ روپ بکھر گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا گئے تے ''اوراق'' دی روایت باقی نہ رہی تے ہن اظہر جاوید گئے نیں تے ''تخلیق'' جیئیا فکری آزادیاں دا ترجمان تاریخ دا حصہ بن گیا اے۔ مینوں اپنا اِک شعر یاد آندا اے۔

ایہہ وی دکھ اے پھل وی سکدے جاندے نے
پھل ویچن والے وی مکدے جاندے نیں

ادب وچ نفعے دا سودا کرن والے تے بوہت نیں پر اظہر جاوید ورگے گھاٹے دا سودا کر کے ادب تے ادیباں دا

مان رکھن والے کتھوں آن گے۔ اظہر جاوید نوں آپ تے چانن کدھی لگ جاوے گا کیوں جے اوہ پکا نمازی وی سی تے دل دا صاف وی۔ پر اوہ اپنے پچھے جیہڑے ادبی ہنیرے چھڑ گیا اے اسی اوس وچوں کیویں نکلاں گے۔ ہتھ چکو دعا لئی۔

(مہینہ وار ''چانن'' لاہور...... مارچ 2012ء)

حسین شاد

بعضے ویلے بندے دے موہنوں اجیہاں گلاں نکل جاندیاں نیں، جنہاں تے کجھ دناں مگروں وا پر جانا ہوندا اے۔

فروری 2012ء دا تخلیق آیا تے اوہدے پہلے صفحے یعنی فہرست توں وی پہلے اظہر نے کجھ لائناں انج لکھیاں

''الحمد للہ ...... تخلیق کو باقاعدہ چھپتے ہوئے بیالیس برس ہو رہے ہیں۔ اس تمام عرصے میں نہ تو ہم نے کبھی مالی تعاون کے لیے فریاد کی ہے، نہ زبوں حالی کا واویلا مچایا ہے۔ دم ہے تو ''تخلیق'' بھی پیہم رہے گا۔ ورنہ ''افکار'' ''طلوع افکار'' ''علامت'' اور ''تحریریں'' کی فہرست میں تذکرہ نگار ایک اور نام کا اضافہ کر لیں گے۔'' گنتی کے جو چند اہل دل تخلیق کی سالانہ قیمت بھیجتے ہیں شاد آباد رہیں۔ کسی اور سے کوئی شکایت بھی نہیں۔''

کون جاندا سی کہ اظہر جاوید دیاں لکھیاں ایہہ لائناں آخری ہون گیاں۔ ''تخلیق'' ادبی تاریخ دا اک اہم رسالہ رہیا اے، تے ہن اظہر جاوید دا ناں ایس تاریخ وچ چمکدا دمکدا رہے گا۔ فروری دا مہینہ ادیباں اُتے کجھ بوہتا ای بھارا ثابت ہویا۔ ایسے مہینے ادیب شاعر صحافی تے اینکر افضال شاہد اللہ نوں پیارے ہوئے۔ ایس توں مگروں نامور کمپیئر شاعر تے اُستاد عباس نجمی دُنیا چھڈ گئے تے بالکل ای اگلے دن ایہہ خبر سُننی پئی کہ ادب نال دلوں بجانوں جڑے ہوئے، افسانہ نگار، شاعر، ناشر تے ایڈیٹر اظہر جاوید ایس جہان توں کوچ کر گئے۔ ایہہ خبر بوہت ای اچانک سی۔ پر کیہہ ہو سکدا اے۔ اللہ دی تے اللہ ہی جانے، اوہ جدوں چاہوے تے جنہوں چاہوے سد مار لیندا اے۔

اظہر جاوید دی حیاتی اُردو تے پنجابی ادب دی خدمت وچ گزری، تے اوہنے بڑے پکے پیریں ادب نال اپنی جڑت قائم رکھی۔ ''تخلیق'' کڈن لگیاں اوہنے اپنے دل نال جیہڑا وعدہ کیتا اوہ بیالی ورھے خوب نبھایا۔ بڑے ای اوکھے سوکھے ویلے آئے پر ''تخلیق'' پوری آب و تاب نال جاری رہیا، تے اظہر ہوری ہر مہینے نویں تے پرانے لکھاریاں دیاں خوبصورت لکھتاں دا گلدستہ پیش کیتا۔ ایہہ گلدستہ تر و تازہ رکھن لئی اوہنے کیہ کیہ جتن کیتے ایہہ دکھ اوہنے کدے کسے نال نہیں ونڈیا۔ سب کجھ اپنی جان اُتے برداشت کیتا۔ اوہنے ہمیشہ اُردو دے نال نال پنجابی زبان دی اہمیت نوں منیا، تے ''تخلیق'' وچ پنجابی دا اِک حصہ وی شامل رہیا۔ ''تخلیق دا افسانہ نمبر'' ایس لحاظ نال یادگار اے کہ اُردو افسانیاں دے نال ای کئی اہم پنجابی ادیباں دیاں لکھیاں کہانیاں وی شامل سن۔ ویکھیا جائے تے اظہر جاوید نوں پنجابی ادب نال وی گوہڑا لگاؤ سی۔ اوہناں روزنامہ ''امروز'' دے پنجابی ادبی صفحے نوں خوب لشکایا۔ پرانے لکھاریاں دے نال نال نت نویں لکھاریاں نوں وی شامل کیتا، تے اک خوبصورت ادبی صفحہ پڑھن والیاں نوں ملدا رہیا۔ اظہر ہوراں آپ وی بوہت سوہنیاں پنجابی کہانیاں

لکھیاں۔ کجھ چر توں ''تخلیق'' دا پنجابی حصہ بڑا سنگڑ گیا سی۔ پر فروری دے ایس شمارے وچ پنجابی شاعری نوں کافی تھاں دتی۔ خورے اوہنے ایس جہان توں ٹر جانا سی تے اللہ ولوں اوہدے دل وچ خیال آیا ہووے کہ جان مگروں کوئی اُلاہما نہ اوہدے سر آوے۔ اُنج تے ایڈیٹراں نوں اُلاہمے وی ملدے ای رہندے نیں، پر توصیف وتعریف وی جاری رہندی اے ''تخلیق'' دا حصہ ''انجمن خیال'' ایس گل دا وڈا گواہ رہیا اے۔ جہدے وچ اوہناں خطاں نوں تھاں ملدی رہی اے جیہڑے رسالے وچ چھپن والیاں لکھتاں بارے قارئین دیاں راواں تے مبنی ہوندے نیں۔ اوہناں دا مطالعہ اک قسم دا ادبی مطالعہ ای لگدا سی۔ ایہہ ادبی تحریراں، تعریفاں، تنقیداں شاعری ''تخلیق'' دا حسن رہیا اے تے ایس حسن نوں اظہر جاوید دے جذبے سدا اوہدا وا دیندے رہے...... بیالی ورہے اک ادبی تاریخ مرتب ہوندی رہی۔ آون والے زمانے ایس ادبی تاریخ دا ضرور حوالہ دیا کرن گے۔

تازہ ''تخلیق'' ملیا تے بڑے بھرواں پنجابی حصہ ویکھ کے بڑی خوشی ہوئی، تے میں سوچیا کہ ایس واری اظہر نوں اک تعریفی خط لکھاں گا پر ہن جدوں پتہ لگا کہ اظہر تے جہان ای چھڈ گیا اے تے دل نوں رُگ جہیا بھریا گیا اے کہ میں ہن کنھوں خط لکھاں گا۔ پر خط تے میں ضرور لکھاں گا۔ اینا ای ہووے گا ناکہ ایہہ خط ''انجمن خیال'' وچ چھپ نہیں سکے گا پر اظہر جاوید دی روح تے ضرور پڑھ لوے گی۔

پیارے اظہر جی!

السّلام علیکم...... خیریں وسو

فروری دا ''تخلیق'' ملیا۔ ہر وار دی طرحاں بھرواں پرچہ اے تے سوہنا وی۔ تہاڈیاں ہمتاں تے جذبیاں نوں سلام۔ ایس واری پنجابی حصے نوں پہلے توں بوہتی تھاں ملی اے۔ پنجابی ادب نال تہاڈے پیار دا ثبوت اے پر اصل گل تے ایہہ وے کہ تسیں ''تخلیق'' راہیں جیہڑی ادبی خدمت کر دے آ رہے او اوہنے اُردو پنجابی لکھاریاں دے دلاں وچ پکیاں اٹاں دا گھر بنا لیا ہوا اے جیہڑا اکدے نہیں ڈیہہ سکدا۔ ایہہ اک خوبصورت حویلی اے۔ جہدے ہر کمرے وچ ''تخلیق'' سجیا ہویا اے۔ ایہہ اجہی لائبریری اے جتھے جھاتی ماریاں پچھانہہ نہیں پرت ہوندا۔ بس پکا ای ڈیرا لگ جاندا اے تے ایہہ ڈیرا رُوحاں دا سکون اے۔ جذبیاں دا حسن اے۔ ادب دا حوالہ اے۔ ایسا حوالہ جہدا بیان بڑے فخر نال کیتا جائے گا۔

بیرا جی

فروری 2012ء نوں اظہر جاوید 74 ورھے دی عمر وچ دل دا دورہ پین نال اللہ کول ٹر گئے۔ اللہ اوہناں دی مغفرت کرے۔ اوہناں دے درجات بلند کرے تے اوہناں دی دھی پتر تے بیوہ دوستاں تے لواحقین نوں ایہہ صدمہ برداشت کرن دی ہمت دیوے۔ تے سب نوں صبر نال نوازے آمین۔ اج توں دو ورھے پہلاں وی اوہناں نوں دل دا اٹیک ہویا سی پر اوہ اپنے مہینہ وار رسالے ''تخلیق'' دی مصروفیات وچ گم رہے تے اردو پنجابی ادب دی دن رات خدمت کر

دے رہے۔ ایس وار فروری دو ہزار باراں، ادیباں، شاعراں تے صحافیاں واسطے بڑا بھارا رہیا اے۔ 4 فروری نوں افضال شاہد 13 فروری نوں عباس نجمی تے 14 فروری نوں اظہر جاوید نوں اللہ دے بلاوے تے اللہ کول جانا پیا۔ اظہر جاوید بڑی باقاعدگی نال 42 ورھے مہینہ وار ''تخلیق'' بطور ایڈیٹر چھاپدے رہے۔ ایہہ اوہناں دا ادبی تاریخ وی بوہت وڈا معرکہ سی۔ صدر پاکستان نے ادب وچ شاندار خدمات انجام دین پاروں 2011 وچ ای اوہناں لئی صدارتی تمغہ حسن کارکردگی دا اعلان کردتا سی۔ تے اگلے مہینے 23 مارچ نوں ایہہ پرائیڈ آف پرفارمنس اوہناں نوں ملنا سی۔ بے شمار ایوارڈاں توں علاوہ اظہر جاوید نوں انڈیا توں ساحر لدھیانوی ایوارڈ تے لائف اچیومنٹ ایوارڈ وی مل چکے نیں۔

اظہر جاوید بڑا محبت کرن والا مجلسی انسان سی۔ جیہڑا بے حد اپنائیت دے بھرویں جذبات رکھدا سی۔ بے حد ملا پڑا سی۔ اوہدا تعلق سرگودھا شہر نال سی۔ اوہناں دا جنم 4 جنوری 1938ء وچ ہویا سی۔ اوہناں لاہور آ کے 1969ء وچ مہینہ وار ادبی رسالہ ''تخلیق'' شروع کیتا۔

اظہر جاوید اوہناں صحافیاں وچ شامل سی جنہاں نوں جنرل ضیاء دے دور وچ صحافتی نوکری توں فارغ کیتا گیا۔ اوہ 70ء دی دہائی وچ ''امروز'' دے ہفتہ وار پنجابی صفحے دے انچارج وی سن۔ اوہناں نوں اُردو تے پنجابی دوناں زباناں تے یکساں عبور سی۔ ''تخلیق'' رسالہ اُردو تے پنجابی وچ چھپدا سی۔ اوہناں دیاں پنجابی کہانیاں دا پراگا ''بڑی دیر ہوگئی'' پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے چھاپیا۔ اوہناں دی شاعری دا پراگا ''غم عشق گر نہ ہوتا'' دے ناں توں چھپیا سی جہدی بڑی پذیرائی ہوئی ء۔ ایہدے توں اڈ، پھر غم جاناں، شہر غم، خزاں کے پتے دے ناں، تو وی اوہناں دیاں لکھتاں چھپیاں۔ اوہناں بلغارین افسانیاں دا اردو ترجمہ وی کیتا۔ تے، رابعہ بصری تے وی کتاب لکھی۔ اوہناں اپنے رسالے ''تخلیق'' وچ نویں تے سینئر ادیباں، شاعراں نوں بلا امتیاز چھاپیا، تے ادب واسیاں نوں 42 سال دی ادبی تاریخ پڑھن نوں دتی۔ اوہناں دے ''تخلیق'' رسالے دی ادبی خدمت صدیاں تیک ادیب شاعر یاد کردے رہن گے۔

شاعر سنگی سارے اک اک کر کے ٹر دے جاندی نیں
یاد آوندے نیں جد وی کوئی چنگا شعر سناندا اے

شہباز انور خان

اظہر جاوید صاحب سے پہلی ملاقات کب ہوئی، دن، تاریخ یا وقت تو یاد نہیں کہ یہ برسوں پرانی بات ہے۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ میں طالب علم تھا اور لکھنے لکھانے کا شوق مجھے ''ایسے لوگوں'' سے ملاقات پر اُکساتا رہتا تھا جو ادب سے ذرا سا بھی مَس رکھتے تھے، چنانچہ روزنامہ ''امروز'' میں بھی اسی وجہ سے جانا ہوتا تھا۔ وہاں پر اسلم کاشمیری (مرحوم) وحید عثمانی (مرحوم)، تاج الدین حقیقت (مرحوم)، عزیز اثری (مرحوم) اور اظہر جاوید (آہ وہ بھی اب مرحوم ہو گئے) ہوتے تھے اور ان سب ''بزرگ دوستوں'' سے سلام دعا ہوتی تھی۔ ''امروز'' میں میرے مضامین انہی بزرگوں کے توسط سے چھپتے تھے۔ وہیں ''امروز''

کے چیف ایڈیٹر ہارون سعد اور حمید جہلمی صاحبان سے بھی صاحب سلامت ہوئی اور اسی دفتر میں برادرِ محترم جناب سعید بدر سے بھی تعلق استوار ہوا۔ اظہر جاوید ادبی صفحہ کے انچارج ہوا کرتے تھے جو ''قسمت علمی و ادبی'' کے نام سے چھپتا تھا۔ ''محفل محفل'' کے عنوان سے وہ ادبی ڈائری بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ بڑے خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے اور چھوٹوں سے بھی بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اسی دور میں خالد محمود ہاشمی بھی ''امروز'' میں لکھا کرتے تھے جو اب ایم۔ اے۔ او کالج میں استاد ہیں۔ جنرل ضیاالحق کے دورِ نامسعود میں ہی اظہر جاوید نے میری ایک غزل ادبی صفحہ پر بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی تھی جس کے اشعار اس طرح تھے:

کارنامے سارے گنوائے گئے ''ہم کھلونے دے کے بہلائے گئے''
سیم و زر معیار تھا پیشِ نظر جو بھی مفلس تھے وہ ٹھکرائے گئے
سازشی تو صاف بچ نکلے مگر بے گناہوں پر ستم ڈھائے گئے
کیسی کیسی ہستیاں یارو مٹیں کیسے کیسے چاند گہنائے گئے
کس لیے مے خانے کا در وا ہوا جام سے کیوں جام ٹکرائے گئے
اُلفتوں کے دور میں بھی جابجا نفرتوں کے جال پھیلائے گئے
آستیں میں گو یدِ بیضا بھی تھا شہرِ کم دیدہ میں ٹھکرائے گئے
جب بھی آیا ان پہ دورِ ابتلا ہم اسی دم یاد فرمائے گئے
جو بھی سچائی کے تھے انورؔ نقیب دار پر بھی وہ ہی لٹکائے گئے

بعدازاں جب ''امروز'' کو سرکاری ''آکاس بیل'' نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو اظہر جاوید صاحب سے رابطہ کم ہو گیا۔ البتہ جب پیام شاہجہانپوری نے ہفت روزہ ''تقاضے'' شروع کیا تو اس نے پھر ہمارے درمیان ربط و تعلق میں ایک واسطے کا کام کیا۔ ''تقاضے'' اپنے وقت کا بڑا مشہور اور مقبول جریدہ تھا اور ہفتہ وار صحافت میں ایک نمایاں مقام کا حامل تھا۔ اس کے مستقل لکھنے والوں میں ظہیر بابر، سہیل احمد خان، منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، وحید عثمانی، بیدار سرمدی اور منیر احمد کے ساتھ ساتھ اظہر جاوید بھی شامل تھے اور یہ فقیر (شہباز انور خان) بھی اسی جریدے میں لکھا کرتا تھا۔ اس میں بیشتر ٹائٹل سٹوریز میری چھپتی رہی ہیں۔ یہ پرچہ بھی بدقسمتی سے اس کے مدیر اور صاحبِ اسلوب قلم کار پیام شاہجہانپوری کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا لیکن جناب اظہر جاوید سے یاداللہ برقرار رہی۔ اسی دوران میں ''جنگ'' سے روزنامہ ''ایکسپریس'' میں آ گیا۔ یہاں ادبی صفحہ شروع ہوا۔ لاہور کی ادبی ڈائری میرے ذمے ٹھہری تو یہ تعلق اور رشتہ مزید گہرا ہو گیا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ ''تخلیق'' کے دفتر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ اظہر جاوید کا یہ دفتر دراصل ادب نواز دوستوں کے لیے ایک ''میٹنگ پوائنٹ'' کا درجہ حاصل کر گیا تھا۔ یہاں جو بھی دوست آتا اظہر جاوید اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے۔

بیرون شہر یا بیرون ملک سے آئے ہوئے مہمانوں (خواتین وحضرات) سے میرا تعارف کرواتے۔ محترمہ عمرانہ مشتاق سمیت بہت سے دوستوں سے انہی کے توسط سے تعارف ہوا۔ وہ مجھے اکثر ''شہباز جی'' اور ''پیارے'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اپنے پروگرام کے بارے میں بروقت مطلع کرتے، مدعو کرتے ہوئے شرکت کی تاکید کرتے اور جب میں اس پروگرام کی خبر شائع کرتا تو لازماً شکریہ بھی ادا کرتے۔ ''تخلیق'' میں نظم ونثر کی اشاعت کے حوالے سے بارہا انہوں نے مجھے کہا اور اگلی ملاقات میں اپنی کوئی نہ کوئی تحریر ساتھ لے کر آنے کی تاکید کی لیکن سوءِ قسمت کہ ان کی اس خواہش (یا حکم) کی تعمیل نہ ہو سکی جس کا مجھے افسوس ہے۔

اظہر جاوید صاحب بڑے ملنسار، بہت محبت کرنے والے، بڑے وضع دار انسان تھے۔ ان سے مل کر، ان سے باتیں کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔ اکثر جو نئی کتاب ان کے پاس آتی وہ ''ایکسپریس'' میں تبصرہ کے لیے مجھے دیتے۔ دفتر میں چائے خود بنا کر پیش کرتے۔ ملاقات میں وقفہ آ جاتا تو فون کر کے بلا لیتے تھے۔ اتنی محبت کرنے والا، سراپا خلوص اور چاہت رکھنے والا انسان اب کہاں؟ اظہر جاوید کی اچانک وفات نے رُلا کر رکھ دیا ہے۔ اس حادثہ نے دل پر ایسا گھاؤ لگایا ہے کہ جلد پُر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے انتقال کی خبر نے بہت دل گرفتہ کیا۔ اطلاع ملنے پر سب سے پہلے ان کے اور اپنے دوست اور ہمدمِ دیرینہ بیدار سرمدی صاحب کو خبر دی جو لاہور سے باہر تھے۔ تاہم نمازِ جنازہ میں وہ بھی پہنچ گئے۔ جس کسی نے بھی ان کے انتقال کی خبر وحشت اثر سنی، سکتے میں آ گیا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ یوں یکایک اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ ان کی وفات سے صرف دو روز قبل عزیزی سونان اظہر نے مجھے اپنی سپورٹس سے متعلقہ خبر ''ایکسپریس'' میں اشاعت کے لیے دیتے ہوئے کہا کہ ''ابو آپ کو یاد کرتے ہیں'' اور میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور ان سے ملاقات کروں گا'' لیکن وہ ''کل'' نہیں آئی کہ اس سے پہلے ہی اجل آ گئی اور وہ اس دیار کے مکین بن گئے جہاں جانے والا لوٹ کے کبھی نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ اظہر جاوید وہاں بھی یاروں کی محفل سجائے ہوئے ہوں گے اور اپنی باتوں کی پُھل جھڑیاں چھوڑ رہے ہوں گے۔

(روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور)

شاہد بخاری

13رفروری 2012ء کو ایڈیٹر 'الحمرا' شاہد علی خاں نے U.K سے آئے ہوئے سائنس دان، شاعر وادیب ڈاکٹر سعید اختر درّانی کے ساتھ ایک شام کا اہتمام جم خانہ میں کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کو جب سلام کرنے میں ان کے قریب گیا تو اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے اظہر جاوید نے بہ آوازِ بلند کہا کہ ''یہ ہیں شاہد سرگودھوی ثُمّہ لاہوری۔ اُس سے اگلی صبح چیف ایڈیٹر ادبِ لطیف، صدیقہ بیگم نے فون پر جب اظہر جاوید کے انتقال کی خبر سنائی تو بالکل یقین نہیں آیا۔

کل اس کی آنکھوں نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں تک نہ ہوا وہ بچھڑنے والا ہے

مرحوم کے لیے متعدد تعزیتی ریفرینسز ہو چکے ہیں جن میں اکثر نے یہی کہا کہ اظہر جاوید کے یوں اچانک رخصت ہو جانے کا ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ پنجاب انسٹی ٹیوٹ میں صدیقہ بیگم نے بھی ادبِ لطیف کے سابق اعزازی مدیر اظہر جاوید کی یاد میں اُن کے اہلِ خانہ، احباب، شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کر رکھا تھا۔

کلماتِ صدارت میں ڈاکٹر انور سدید نے کہا کہ ''تخلیق'' قتیل شفائی اور اظہر لازم و ملزوم تھے۔ قتیل شفائی جب گھر سے اکتاتے تو ''تخلیق'' کے دفتر چلے جاتے۔ حمید اختر بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے دفتر کو ادبی گھر بنا رکھا تھا جہاں اہلِ ادب کا جمگھٹا رہتا تھا۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کہا کہ دنیا میں ہم ایک اننگ کھیلنے آئے ہیں۔ کوئی جلدی آؤٹ ہو جاتا ہے اور کوئی دیر سے۔ سب کا کہنا درست ہے کہ اظہر نے فیئر اننگ کھیلی۔ بطور ایڈیٹر ان کی کنٹری بیوشن اچھی رہی۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے کہا سرگودھا سے لاہور میں پہلے آیا لیکن اظہر لاہور مجھ سے پہلے چھوڑ گیا۔ طارق محمود نے کہا کہ سرکاری رائٹرز فنڈ سے مستحقین کی مدد کرانے میں وہ پیش پیش رہا۔ مولانا ظفر علی ٹرسٹ میں بحیثیت ایڈیٹر مطبوعات اظہر جاوید کی خدمات یاد رہیں گی۔ مستنصر حسین تارڑ نے کہا کہ جب اچانک موت کی خبر میں نے سنی تو دل سے بے اختیار یہ نکلا۔ ع یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

اظہر جاوید نے اپنی مرضی کی زندگی گزاری اور اچھی گزاری۔ ''تخلیق'' کے ہمراہ وہ مجھے ایک Love Letter ضرور بھیجتا تھا جسے میں اب بہت مِس کروں گا۔ ''تخلیق'' کی بدولت بھگوان سٹریٹ ساری دنیا میں پہچانی جاتی تھی۔

دھنک فیم سرور سکھیرا نے کہا کہ اظہر جاوید سوچ کا شاعر اور دل کا حاتم تھا۔ توجہ کی کوئی بھکارن اس کے ہاں سے خالی نہیں لوٹتی تھی۔ مجھے یقین ہے وہ جنت میں سوٹ پہنے حوروں کے ساتھ بیٹھا قہقہے لگا رہا ہوگا۔ یار اظہر تم نے اچھا نہیں کیا۔ ہم سب کو اکیلا چھوڑ گئے۔ باری میری تھی، لے تم گئے۔ سیما پیروز نے کہا، وہ محرومین کی نہ صرف خود مدد کرتے بلکہ اوروں سے بھی کرواتے تھے۔ سرفراز سیّد نے کہا کہ ایک دفعہ میں جب بے روزگار ہو گیا تو اظہر نے مجھ سے کہا کہ گھر والوں کو یہ خبر نہ ہونے دینا۔ حسبِ معمول تیار ہو کر گھر سے نکلنا اور میرے دفتر میں آ جایا کرنا۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔

افتخار چوہدری نے کہا کہ بانو آپا، اظہر کو بھگوان سٹریٹ کا کنہیا کہتی تھیں۔ اقبال راہی نے یہ قطعہ پڑھا۔

رہے گا زندہ جاوید راہی منور جس کی سوچوں کا چمن تھا
وہ اظہر ہم سے رخصت ہو گیا ہے جو اپنی ذات میں اک انجمن تھا

ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل شعیب جعفری نے کہا ''اظہر جاوید کی سب سے بڑی ادبی خدمت ''تخلیق'' تھا، جس کے ذریعے انھوں نے نئے لکھنے والوں کی کئی نسلیں تیار کیں۔ نئے لکھنے والوں کی وہ خاص طور پر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ خود بھی ایک ذہین ادیب و شاعر تھے۔ شاعری میں ان کے ہاں سہلِ ممتنع کا بہت خوب صورت استعمال ملتا ہے۔ زندگی کو انہوں نے ہر لحاظ سے برتا تھا، جس کی بھرپور عکاسی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔

◆◆◆

ملک مقبول احمد

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

۵۰ نامور ادبی شخصیات

سفرِ اُردو

سیاحت نامہ ترکی

تعلیماتِ قرآن

پذیرائی

گلشنِ ادب

نیا علم شفا بخشی

رہنمائے حج و عمرہ

آپس کی باتیں

ارمغانِ غزل

شناسائی

اہلِ قلم کے خطوط

گمشدہ افسانے

سفر جاری ہے

مقبول اکیڈمی۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

سوالنامے کے جوابات

لطیف قریشی (امریکہ)

O **سونان اظہر جاوید:** ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھئے۔

☆ **لطیف قریشی:** 1973ء میں میری سرگودھا میں بطور انکم ٹیکس افسر تعیناتی کے دوران میرا پہلا مجموعہ کلام ''بارامانت'' چھپا تو دیگر رسائل و اخبارات کو تبصرے کے لئے بھیجنے کے ساتھ جناب اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کو بھی اس کی دو جلدیں تبصرے کے لئے بھیجی گئیں۔ ویسے تو زیادہ تر اخبارات و رسائل نے مجموعے پر تبصرے شائع کئے لیکن صرف تین رسائل کے مدیران یعنی ''نیرنگ خیال کے سلطان رشک، ''تحریریں'' کی زاہدہ صدیقی اور ''تخلیق'' کے جناب اظہر جاوید کی طرف سے کتابیں ملنے کی رسید موصول ہوئی۔ جناب اظہر جاوید نے یہ بھی لکھا تھا کہ انہیں خوشی ہے کہ یہ مجموعہ ان کے شہر سرگودھا سے موصول ہوا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں جب بھی لاہور آؤں تو ان سے ملوں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ شام چھ بجے کے بعد پاک ٹی ہاؤس (مال روڈ پر وائی ایم سی اے کی بلڈنگ کے ایک پہلو میں واقع کوئی ایک دہائی پہلے تک ادیبوں اور شاعروں کی شام کی مجلس گاہ) میں ہوتے ہیں۔ میں جب چھ بجے سرگودھا کے ہی ادیب و شاعر پرویز بزمی (جن سے اس دوستی ہو چکی تھی اور جو میرے دورۂ لاہور کے دوران اتفاقاً میرے ساتھ تھے) کے ہمراہ پاک ٹی ہاؤس کے دروازے پر پہنچا تو سامنے سے ایک تیس پینتیس سالہ دراز زلفوں والے جوان رعنا کو آتے دیکھا۔ پرویز بزمی نے تعارف کروایا کہ یہی اظہر جاوید ہیں اور میرے بارے میں بتایا کہ میں لطیف قریشی ہوں تو اظہر جاوید نے بغل گیر ہوکر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوگئی جو آج تک قائم ہے۔

O تخلیق میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی؟ اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور غزل ہے تو مطلع لکھیئے۔

☆ ماہنامہ ''تخلیق'' میں میری پہلی تخلیق غالباً جون 1973ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ مجھے عنوان تو یاد نہیں لیکن یہ آزاد نظم تھی۔

O آپ کی تخلیقات کب تک اس پرچے میں چھپتی رہیں؟

☆ دسمبر 2011ء تک چھپنے والے زیادہ تر شماروں میں میری کوئی نہ کوئی تخلیق شائع ہوتی رہی جن میں آزاد نظمیں، پنجابی کافیاں، تنقیدی مضامین یا انجمن خیال میں مراسلے شامل ہوتے۔

O ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیئے؟

☆ ان تخلیقات کے بارے میں اظہر جاوید کے تاثرات کچھ یوں تھے کہ وہ نثری نظم کے قائل نہیں تھے جبکہ میری تخلیقات میں کچھ نثری نظمیں بھی شامل ہوتیں جنہیں وہ شائع نہ کرتے البتہ ’’انجمن خیال‘‘ میں چھپنے والی میری کچھ آراء اور کچھ تنقیدی مضامین کے بعد ان کی رائے تھی کہ مجھے زیادہ وقت تنقید کو دینا چاہیے۔

O کیا آپ کی تخلیقات پر انجمن خیال میں لکھنے والوں نے بھی اظہار خیال کیا؟

☆ جی ہاں۔ اکثر تخلیقات کو پسند کیا گیا البتہ بعض تخلیقات پر مخالفانہ تنقید بھی ہوئی۔

O اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیئے۔

☆ اظہر جاوید سے میری اکثر ملاقاتیں مختصر ہوتی تھیں جس کی وجہ کچھ میری مصروفیات اور کچھ میرا یہ خیال کہ ان کے دفتری اوقات میں ان کا زیادہ وقت نہ لیا جائے تا کہ اس دوران وہ دفتری کام مکمل کر سکیں۔ ان سے میری آخری ملاقات میرے اومان سے لاہور کے مختصر دورے کے دوران غالباً 12 جنوری 2012ء کو ان کے دفتر میں ہوئی جو قریباً دس منٹ جاری رہی اور تشنگی کے احساس کے ساتھ میں ان کیلئے اپنی دعائیں چھوڑتا ہوا اور ان کی دعائیں لیتا ہوا ان کے پاس سے اٹھ آیا۔ 13 جنوری 2012ء کو میں واپس اومان آ گیا جہاں 15 فروری کو ان کے وصال کی خبر پاکستان میں موجود میرے بیٹے منصور نے دی جس خبر کی تکلیف سے میں آج تک نہیں نکل سکا۔

O اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ۔

☆ اظہر جاوید سے روابط کے دوران کے دو واقعات بہت اہم ہیں جنہیں ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہوں گا کیونکہ ان سے اظہر جاوید کے مزاج اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

1989ء میں ملازمت سے پیش از وقت ریٹائرمنٹ لینے کے بعد میں نے لاہور میں وکالت شروع کی تو اعلان کیا کہ میں ادیبوں کے مقدمات کی کوئی فیس نہیں لیا کروں گا۔ غالباً 1995ء میں اکیڈمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے پاکستانی مزاحمتی شاعری کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں اظہر جاوید کی ایک نظم بھی شامل تھی۔ جہاں انہیں اکیڈمی ادبیات پاکستان کی طرف سے شائع شدہ انتخاب میں اپنی نظم شامل ہونے کی خوشی تھی وہاں انہیں یہ اصولی اعتراض تھا کہ اگر اکیڈمی ایسی تخلیقات کے مجموعے میں شمولیت کی رائلٹی نہیں بھی دے سکتی تھی تو کم از کم مجموعے میں شمولیت کی مصنف (شاعر) سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ اس کے بعد میرے مشورے پر اور ان کے حکم پر میں نے اس وقت کے چیئرمین اکیڈمی آف لیٹرز جناب فخر زمان کو دو لاکھ روپے ہرجانے اور تحریری طور پر معذرت کا قانونی

نوٹس دیا۔ چیئر مین صاحب نے اس نوٹس کا کوئی نوٹس نہ لیا تو میں نے اظہر جاوید کی ہدایت کے مطابق چیئر مین اکیڈمی آف لیٹرز کے خلاف بیس ہزار روپے ٹوکن ہرجانے اور تحریری معذرت کے لئے سیشن جج لاہور کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ فخر زمان صاحب نے بجائے اظہر جاوید صاحب سے رابطہ کر کے (جن سے ان کے اس سے قبل دوستانہ تعلقات تھے اور جو اظہر جاوید کے دفتر میں اکثر ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے) تحریری معذرت کرنے اور ہرجانے کی رقم چھوڑنے کی درخواست کرنے کے مقدمے میں بذریعہ وکیل جواب داخل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جس کے لئے ان کے وکیل صاحب نے تاریخوں پر تاریخیں لینا شروع کیں۔ ابھی یہ کارروائی جاری تھی کہ جناب فخر زمان کی جگہ نذیر ناجی صاحب چیئر مین اکیڈمی مقرر ہوئے اور انہوں نے اظہر جاوید سے فون پر رابطہ کر کے بتایا کہ اگر اظہر جاوید ہرجانے کی رقم چھوڑ دیں تو وہ اکیڈمی کی طرف سے تحریری معذرت کرنے کو تیار ہیں کیونکہ ان کی رائے میں فخر زمان صاحب کا مقدمے کی پیروی کرنے کا فیصلہ غلط تھا اور اسی لئے انہیں ہرجانے کی رقم بھی عدالتی فیصلے کے بعد اپنی جیب سے ادا کرنی ہوگی۔ اظہر جاوید کی تو پہلے سے یہ رائے تھی کہ انہوں نے مقدمہ صرف یہ اصولی بات منوانے کیلئے کیا ہے کہ اکیڈمی کے مصنفین کی تخلیقات کسی مجموعے میں شامل کرنے سے پہلے مصنفین سے اجازت لینی چاہیے۔ رائلٹی کا مطالبہ یا عدم مطالبہ مصنفین کا حق ہے جو پاکستان کے حالات میں اکثر مصنفین خوشی سے چھوڑنے کے لئے تیار ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے یہی جواب نذیر ناجی صاحب کو دیا کہ ہرجانے کی رقم کی وصولی یا عدم وصولی ان کے لئے اہم نہیں۔ اصل مطالبہ تحریری معذرت کا ہی ہے۔ اور اگر نذیر ناجی صاحب اکیڈمی کی طرف سے تحریری معذرت کر دیتے ہیں تو وہ یہ مقدمہ واپس لے لیں گے۔ نذیر ناجی صاحب کی طرف سے تحریری معذرت نامہ تیسرے دن ہی موصول ہو گیا اور اظہر جاوید نے حسبِ وعدہ مقدمہ واپس لے لیا۔

دوسرا اہم واقعہ بھی اسی قسم کے ایک مقدمے سے متعلق ہے جو غالباً 2006ء کا ہے جب اظہر جاوید نے اپنے ایک اداریئے میں جناب احمد ندیم قاسمی کے روزنامہ ''جنگ'' میں چھپنے والے ایک کالم پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ کالم میں جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا کہ انہیں لاہور کے گورنر ہاؤس میں دوسرے ادیبوں کے ساتھ اس وقت کے صدر مملکت جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کے لئے بلایا گیا جہاں ان کا ارادہ صدر مملکت سے (شاعری کی زبان میں) کچھ گفتگو کا تھا لیکن صدر مملکت نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا اور قطار میں کھڑے ادیبوں جن میں احمد ندیم قاسمی صاحب بھی شامل تھے) صرف مصافحہ کرتے ہوئے آگے گزر گئے۔ اس کے بعد کالم میں ادب کی تاریخ میں سے حسنِ طلب پر مشتمل ایک واقعہ اور ایک دو شعر درج کئے گئے تھے۔ اظہر جاوید احمد ندیم قاسمی صاحب کے دیرینہ مداحوں میں سے تھے۔ انہیں یہ بات بری لگی کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے پائے کا ادیب و شاعر صدر مملکت سے ملنے گورنر ہاؤس جائے، وہاں قطار میں کھڑا ہو اور صدر مملکت کے بے نیازانہ صرف مصافحہ کر کے آگے گزر جانے پر بجائے اظہار ناراضگی کرنے کے حسن طلب کا اظہار کرے اور ادیبوں میں گردش کرتی

ہوئی خبر کے مطابق اس حسن طلب کے جواب میں پانچ لاکھ روپے کا عطیہ بھی وصول کرے۔ بلکہ اظہر جاوید کا خیال تھا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کا مقام اتنا بلند تھا کہ صدر مملکت تک کو خود ان سے اجازت لے کر ان کے در پر حاضر ہو کر ان سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہیے تھا۔ یہی بات اظہر جاوید نے اپنے اداریئے میں لکھی جس پر احمد ندیم قاسمی صاحب کا ردعمل تھا کہ انہوں نے اس بات کو اپنی ہتک عزت گردانا اور اظہر جاوید کو پچاس لاکھ روپے ہرجانے کا نوٹس دے دیا۔ اظہر جاوید نے احمد ندیم قاسمی صاحب سے اجازت طلب کی کہ وہ ان کے پاس حاضر ہو کر اپنی پوزیشن واضح کرنا چاہتے ہیں لیکن احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس بات کی اجازت نہیں دی اور ان پر سیشن جج لاہور کی عدالت میں ہتک عزت کے لئے معافی نامہ اور 50 لاکھ روپے ہرجانے کا مقدمہ دائر کر دیا۔

احمد ندیم قاسمی کی طرف سے اظہر جاوید کو پچاس لاکھ روپے ہرجانے اور معافی نامہ کا نوٹس دیئے جانے کی خبر اخبارات میں چھپی تو ایک وکیل صاحب کا خط اظہر جاوید کو موصول ہوا اور وہ خط ''تخلیق'' میں بھی چھپا جس میں اظہر جاوید کو مقدمے کی پیروی کیلئے اپنی خدمات پیش کی گئی تھیں۔ اظہر جاوید مجھے ساتھ لے کر ان وکیل صاحب کے دفتر گئے جہاں ان وکیل صاحب نے اپنا طریقہ کار واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہم مقدمے میں مختلف قسم کے اعتراضات اٹھا کر اور کیس کو طویل کر کے احمد ندیم قاسمی صاحب کو خراب کریں گے۔ وہاں سے واپسی پر میرے دفتر پہنچ کر اظہر جاوید کا کہنا تھا کہ ان کا ارادہ کبھی بھی احمد ندیم قاسمی صاحب کو تکلیف پہنچانے کا نہیں تھا اور نہ ہے بلکہ وہ تو انہیں ادب میں اپنا استاد اور پیر و مرشد مانتے ہیں اور اب بھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کو غلط فہمی کے تحت پہنچنے والی تکلیف پر معذرت کرنے کو تیار ہیں۔ ان کا ارادہ کبھی بھی احمد ندیم قاسمی صاحب کی ہتک عزت کا تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا بلکہ اپنا اداریہ لکھنے کا ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کا مقام ان کی نظر میں اتنا بلند ہے جہاں صدر مملکت قسم کے لوگوں کو ان سے اجازت لے کر ان کے در پر حاضر ہو کر ان کے ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہیے نہ کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کو گورنر ہاؤس میں دوسرے ادباء کے ساتھ قطار میں کھڑا کر کے ان سے مصافحہ کر کے آگے گزر جانے کا مقام ہے۔ مجھے انہوں نے انہی ہدایات کے ساتھ اس مقدمے میں اپنی وکالت کرنے کیلئے کہا جس کیلئے جواب دعویٰ انہی ہدایات کے مطابق داخل کیا گیا اور انہی ہدایات کے مطابق مقدمے میں دلائل دیئے گئے۔

اظہر جاوید نے قاعدے کے مطابق فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل داخل کی اور اپیل کی سماعت سے پہلے ہی احمد ندیم قاسمی صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد جب اظہر جاوید نے ان کے ورثاء ڈاکٹر ناہید قاسمی (بیٹی) اور نعمان ندیم (بیٹے) سے ورثاء کے طور پر ان کے نام داخل کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے مقدمے میں فریق بننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کے والد گرامی نے یہ مقدمہ بعض لوگوں کے بہکاوے میں آ کر کیا تھا اور یہ کہ وہ دونوں اظہر جاوید کی اپنے والد احمد ندیم قاسمی صاحب کے مداح اور اپنے بزرگ

کے طور پر عزت کرتے ہیں اس لئے وہ ان سے کسی قسم کا ہرجانہ وصول نہیں گے اور نہ ہی ایسے کسی مقدمے میں فریق بنیں گے۔

O تخلیق کی بیالس سالہ صحافتی زندگی پر تبصرہ کیجئے۔

O جناب اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے ذریعے صحت مند ادب کی ترویج کی، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے خونِ جگر سے لکھے ہوئے اداریوں کے ذریعے قومی و معاشرتی رویوں پر ادب کی زبان میں تنقید کی۔

O اظہر جاوید کی صحافت پر آپ کی رائے کیا ہے؟

☆ اظہر جاوید کی صحافت، ماہنامہ ''تخلیق'' کے اداریوں، تخلیق کی ایماندارانہ پالیسی، اخبارات ورسائل میں چھپنے والے ان کے کالموں اور ادبی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے ان سب شعبوں میں ایماندارانہ رائے کو اہمیت دی اور اسے قائم رکھا۔

....

شباب للّت

اظہر جاوید مرحوم میرے عزیز دوست اور مربی تھے۔ ان سے متعدد ملاقاتیں اور رفاقت کے ایام گاہے بگاہے نصیب ہوئے۔ کبھی اقبالہ میں، کبھی شملہ میں۔ شملہ میں جن جن ادبی تقاریب میں موصوف کی شراکت رہی، اُن سبھی کی نظامت اس خاکسار کے حصے میں آئی۔ یہاں ان کا اور اُن کے ہمراہ آنے والے سبھی پاکستانی ادیبوں کا حد درجہ گرم جوشی اور فراخ دلی سے خیر مقدم کیا جاتا رہا۔

O **سونان اظہر جاوید:** ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی۔ اس ملاقات کے تاثرات لکھیے؟

☆ **شباب للّت :** آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے والد محترم سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی ہماری بزمِ ادب ہماچل کے صدرِ محترم جناب سُریندر ناتھ ورما آئی ایس کے ایما پر اظہر جاوید صاحب کو شملہ میں مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ مجھے ڈھلتی عمر کے باعث صحیح تاریخیں یاد نہیں رہتیں غالباً 1995ء کی بات ہے۔ اس ناچیز کی نظامت میں منعقدہ مشاعرہ اور ایک خصوصی ادبی تقریب میں ان کے ساتھ مفصل صحبتیں رہیں۔ موصوف کے اعزاز میں یہ خصوصی تقریب شملہ کے وائی ڈبلیو سی اے ہال میں ہماچل سرکار کے وزیرِ تعلیم، وابستہ و ثقافت پروفیسر نارائن چندر پراشر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔

ازاں بعد بھی بزمِ ادب ہماچل کی تحریک و ترغیب پر متعدد سرکاری مشاعروں میں اظہر جاوید کو شراکت کی دعوت دی گئی عموماً یہ سرکاری مشاعرے اس دور کی سب سے فعال ادبی سنستھا بزمِ ادب ہماچل (رجسٹرڈ) کے سرگرم اشتراک سے 1925ء سے شملہ میں عظیم الشان مشاعرے منعقد کرواتی رہی ہے۔ تب سر شیخ عبدالقادر بھی شملہ میں مقیم تھے، جناب تلوک چند، جگر مراد آبادی، جگن ناتھ آزاد، جوش ملیسانی، فنا نظامی، عرش ملیسانی، گوپال متل جیسے بیسیوں مشاہیرِ ادب ان مشاعروں میں شریک ہوئے۔

O ''تخلیق'' میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی ہے؟ اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور ''غزل'' ہے تو مطلع لکھیے۔

☆ مجھے صحیح تاریخ و مہینہ یاد نہیں۔ ڈائری کے سرسری حوالوں سے لگتا ہے کہ میری شعری تخلیقات آپ کے مؤقر رسالہ ''تخلیق'' میں 1996ء میں شائع ہونے لگی تھیں اور پہلی غزل جو شائع ہوئی اُس کا مطلع تھا :

وہ قلندر تھا مگر دل کا سکندر نکلا
ہم نے صحرا جسے سمجھا تھا سمندر نکلا

اس کے بعد بھی میری نظمیں، غزلیات، رباعیات وغیرہ وسط 2009ء تک ''تخلیق'' میں گاہے بگاہے اہتمام کے ساتھ چھپتی رہیں، ان میں قابل ذکر نظمیں تھی ''نکتۂ راز''، ''حقیقت کا ننگا بدن''، ''شیشہ خانہ''، ''گم شدہ''، ''فصل شعلوں کی''، وغیرہ۔

O آپ کی ''تخلیقات'' کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں۔

☆ میری آخری نظم جو ''تخلیق'' میں شائع ہوئی وہ اپریل 2009ء کے شمارے میں تھی۔ ''اپنے مرکز کی طرف'' بیسیوں غزلیں بھی ''تخلیق'' میں شامل ہوئیں۔ آخری غزل جو شاید جنوری 2009ء کے شمارے میں شائع ہوئی اُس کا مطلع تھا:

جو اہلِ دولت کے آستانوں پہ خم ہوئے ہیں
نکل گیا کام جب تو سر وہ قلم ہوئے ہیں

ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی غزل شائع ہوئی ہو۔

O ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیے؟

☆ میری تصانیف وتخلیقات پر اظہر جاوید مرحوم کے تاثرات ہمیشہ مثبت، خوشگوار اور حوصلہ افزا رہے۔ وہ میرے فن کے معترف، میری کچھ تصانیف پر ''تخلیق'' میں اُن کے بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ 1996ء کے ایک شمارے میں انہوں نے میرے تحقیقی مقالہ ''منور لکھنوی۔ ایک مطالعہ'' پر فاضلانہ تبصرہ کیا۔ تخلیق کے شمارے بابت اکتوبر 2006ء میں صفحہ 119 پر میرے حوالے سے ترتیب دی گئی۔ کتاب ''شباب للت شخصیت اور ادبی خدمات'' پر بھی موصوف نے تبصرہ شائع کیا۔

O کیا آپ کی تخلیقات پر ''انجمنِ خیال'' میں لکھنے والوں نے بھی اظہارِ خیال کیا؟

☆ جی ہاں ''تخلیق'' شمارہ اگست 2006ء میں مکرمی انور سدید صاحب نے ''تخلیق'' برائے سال 2005ء کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے صفحہ 113 پر میرا ذکر بھی کیا ہے۔ شمارہ اکتوبر 2009ء میں صفحہ 96-95 پر موصوف نے تخلیق برائے سال 2008ء کے مختصر جائزے میں اس کم ترین کا ذکر کرتے ہوئے میرے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اسی شمارہ کے صفحہ 154 پر ایک تبصرے میں میرا ذکر ہے جو مقصود الٰہی شیخ صاحب کے رسالہ ''مخزن'' پر آفتاب خان صاحب کے

تبصرے میں در آیا ہے۔

''تخلیق''، جون 2008ء میں انجمنِ خیال میں قیصر نجفی صاحب نے صفحہ 176 پر انجمنِ خیال میں نمائندہ غزل گو شعرا میں اِس خاکسار کا نام لیا ہے۔ ''تخلیق'' کے شمارہ فروری 2009ء میں انجمنِ خیال میں صفحہ 200 پر فرحت طاہر صاحبہ نے میرے اشعار پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ''تخلیق''، شمارہ دسمبر 2006ء میں اردو شاعری کے میرے بارہویں مجموعہ ''زندگی اک سمجھوتہ'' پر عمر زمان صاحب نے صفحہ 133 پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔

O اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔

☆ اظہر جاوید سے آخری ملاقات 2006ء کے وسط میں ہوئی۔

O اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ؟

☆ آپ نے اظہر جاوید کی رفاقت میں یادگار واقعہ کے بارے میں استفسار کیا ہے اس کی تفصیل مختصراً بیان کرتا ہوں 26/ اپریل 2004ء کو پاکستانی مہمانوں کے اعزاز میں منعقدہ ابدی تقریب کا مرکزی موضوع ہند پاک دوستی اور صلح دامن کی بحالی تھا۔ اِس محفل میں مہمانِ خصوصی اظہر جاوید صاحب کے علاوہ پاکستان سے تشریف لائے۔ ایڈیٹر ''نیرنگِ خیال''، راولپڈی جناب سلطان رشک اور لاہور کی دو شاعرات محترمہ تسنیم کوثر، محترمہ سلطانہ منور نے اپنی دلکش شعری تخلیقات پیش کیں۔ یہ تقریب بہت دلچسپ رہی اور شملہ کے ادب ذوق سامعین ان سے حد درجہ محظوظ ہوئے۔ جناب اظہر جاوید صاحب نے ایک خوبصورت نظم پڑھی:

ایک ہی نغمہ ایک صدا — امن، محبت، دوستی
نئے دور کی نئی صدا — امن، محبت، دوستی
تم مانگو بھگوان سے — ہم مانگیں رحمان سے
دونوں کی ہے ایک دُعا — امن، محبت، دوستی

پاکستانی مہمانوں کے ایک ایک شعر پر سامعین نے نعرۂ داد و تحسین بلند کیا۔

O ''تخلیق'' کی بیالیس سالہ صحافتی زندگی پر تبصرہ کیجیے۔

☆ ''تخلیق'' نے بلاشبہ اپنے گزشتہ چالیس برسوں کے دورِ حیات میں اردو کے قارئین اور اربابِ ذوق کو سنجیدہ، مفید اور صالح ادب دیا۔ ''تخلیق'' نے دورِ حاضر کی بہترین، شاعری، فکشن، سفرنامے، تنقیدی و تحقیقی مضامین، دلچسپ خاکوں، انشائیوں، پُرلطف و پُر آگہی خطوط سے قارئین کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم حضرات و خواتین کو محظوظ و باخبر کیا بلکہ اچھے ادیبوں اور شاعروں کو بھی نام وری، ترسیل و ترقی کے لئے ایک مؤثر و مؤقر و معتبر فورم مہیا کیا۔ ''انجمنِ خیال'' کے صفحات اس مجلّے کی جان تھے اور جب تک اِن پر کچھ غیر معتدل اور ناگوار سائے نہیں منڈلائے یہ ''تخلیق'' کے شیدائیوں کے لئے سامانِ فرحت و کشش رہے۔ ''تخلیق'' کی اس 40 سالہ دین نے اردو کے ذخیرۂ ادب و صحافت کو

مالا مال کیا۔

O اظہر جاوید کی ادبی صحافت پر آپ کی رائے کیا ہے؟

☆ اظہر جاوید مرحوم کی ادبی صحافت پر آپ نے میری رائے پوچھی ہے۔ وہ ایک کامیاب ادیب اور صحافی تھے۔ انہوں نے جہاں شاعری میں غمِ عشق کو وقار بخشا وہاں سوانح اور کردار نگاری میں ساحر لدھیانوی کو احترام و احتشام عطا کیا۔ پنجابی شاعری بھی ان کی تخلیقی کاوش کا جزو رہی۔ ان کے صحافتی سفر میں اگرچہ کئی صبر آزما مدارج و مسائل آئے اور بالآخر انہوں نے ''تخلیق'' کی پرورش و پرداخت پر اپنی زندگی کے بہترین چالیس برس صرف کر دیئے۔ اس پورے کیریئر میں انہوں نے استقلال کے ساتھ اور ذہانت، محنت، متوازن مصلحت اندیشی کے ساتھ سبھی مشکلات پر عبور پا لیا لہٰذا ''تخلیق'' کو بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی حلقوں اور قارئین میں یکساں پذیرائی ملی۔

....

ڈاکٹر طاہرہ بخاری

O **سونان اظہر جاوید:** ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھئے۔

☆ **ڈاکٹر طاہرہ بخاری :** اظہر جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات پوسٹل ٹریننگ سکول جی۔ پی۔ او لاہور میں ہوئی، جب ہم احمد فراز (مرحوم) کے حوالے سے ہونے والے تعزیتی ریفرنس میں شرکت کے لیے جھنگ سے لاہور پہنچے تھے۔ اظہر جاوید صاحب کوئی عام شخصیت نہیں تھے۔ آپ بہت مخلص، سب کا خیال رکھنے والے اور انتہائی محبت سے پیش آنے والے انسان تھے، اگرچہ بہت کم وقت ہم آپ کے ساتھ رہے لیکن انھوں نے جس طرح ہمارا خیال رکھا اور محبت وشفقت سے پیش آئے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

O ''تخلیق''، میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی ہے۔ اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور ''غزل'' ہے تو مطلع لکھیے۔

☆ تخلیق میں میری پہلی تخلیق نظم ''تو پھر تم یاد رکھنا'' کے عنوان سے 2007ء میں شائع ہوئی۔

O آپ کی ''تخلیقات'' کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں۔

☆ میری تخلیقات 2007ء سے 2012ء تک باقاعدگی سے ہر شمارے میں چھپتی رہیں، جو میرے لیے بہت بڑے اعزاز اور فخر کی بات ہے۔

O ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیے۔

☆ میری تخلیقات کو اظہر جاوید صاحب نے ہمیشہ سراہا۔ جب بھی کوئی غزل یا نظم ان کو ملتی تو فون کر کے اس کی تحسین کرتے اور اگر مجھ سے بھیجنے میں تاخیر ہو جاتی تو بار بار فون کر کے اصرار کرتے کہ پہلی فرصت میں اپنی تخلیقات ارسال کریں۔ کئی مرتبہ خط لکھ کر بھی آپ نے میری حوصلہ افزائی کی جو کہ میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔

O کیا آپ کی تخلیقات پر ''انجمنِ خیال'' میں لکھنے والوں نے بھی اظہارِ خیال کیا؟

☆ ''تخلیق'' کی انجمنِ خیال میں لکھنے والوں نے اکثر و بیشتر میری تخلیقات پر تبصرہ بھی کیا اور تحسین بھی کرتے رہے جس کے لئے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

O اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔

☆ اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا کہ جی۔ پی۔ او لاہور میں ہونے والی ملاقات ہی اظہر جاوید صاحب سے آخری ملاقات ٹھہری۔ جب ہم احمد فراز (مرحوم) کے حوالے سے ہونے والے تعزیتی ریفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے تو آپ شعیب جعفری صاحب کے آفس میں ہمارے منتظر تھے۔ آپ نے ریفرنس کے دوران ہمارا بہت خیال رکھا اور اختتام پر ہمیں اپنے دفتر ''تخلیق'' لے کر گئے۔ فرحت طاہر اور مجھے دو پین (قلم) تحفے میں دے کر کہنے لگے میرے خیال میں ادیبوں کے لئے قلم سے زیادہ قیمتی تحفہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ خود دفتر سے باہر آ کر گاڑی تک خدا حافظ کہنے آئے۔ اور دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔ وہ منظر آج تک میری نگاہوں میں محفوظ رہے۔

O اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ؟

☆ جب ہم اظہر جاوید صاحب سے رخصت ہو کر جھنگ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ نے ہمیں خاص طور پر تاکید کی کہ تم لڑکیاں ہو راستے میں کہیں گاڑی نہیں روکنی۔ اسی لئے انھوں نے ہمیں شعیب جعفری اور نیاز احمد برکات سے لنچ بکس بھی بنوا کر دیئے تھے کہ کہیں ہم راستے میں کچھ کھانے کے لیے گاڑی نہ روکیں۔ موٹروے پر سفر کے دوران تمام وقت بار بار فون کر کے ہماری خیریت دریافت کرتے رہے۔ اور جب ہم نے جھنگ پہنچ کر آپ کو اطلاع دی تو یہ کہہ کر اطمینان کا اظہار کیا کہ ''لوکڑیو ہن تسیں اپنے اپنے گھراں نوں پہنچ چکیاں ہو ہن میں اطمینان نال سون لگاں۔''

O ''تخلیق'' کی بیالیس سالہ صحافتی زندگی پر تبصرہ کیجئے۔

☆ تخلیق کی بیالیس سالہ صحافتی زندگی قابل فخر ہے۔ بیالیس سال تخلیق کا باقاعدگی سے شائع ہونا ایک کارنامہ ہے جس کا سہرا اظہر جاوید صاحب کے سر ہے۔

O اظہر جاوید کی ادبی صحافت پر آپ کی رائے کیا ہے؟

☆ اظہر جاوید صاحب کی ادبی صحافت کے حوالے سے میری رائے یہ ہے کہ آپ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آپ نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے آپ نڈر، صاف گو اور حقیقت پسند انسان تھے۔ آپ نے طویل عرصہ ادب کی آبیاری کی۔ آپ کا خلا مدتوں پُر نہیں ہو سکے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

◆◆◆

خبر قبیلہ

حصہ اوّل

کتاب میں پاکستان کی صحافتی تاریخ کے ہر سوال کا مدلل جواب موجود ہے

انٹرویوز: ندیم اُپل

مرتب: علامہ عبدالستار عاصم

دنیائے صحافت کے 20 شہسوار

اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں

- آزاد صحافت میری زندگی کا مشن ہے — نوائے وقت — (مرحوم) مجید نظامی
- اپنے اندر کے ضیاء شاہد کو مرنے نہیں دیا — خبریں — ضیاء شاہد
- 'پاکستان' مجھے اللہ 'میاں' نے دیا — پاکستان — مجیب الرحمٰن شامی
- سیکس اور سنسنی خیزی کی صحافتی دوڑ میں شریک نہیں ہونا چاہتا — وفاق — مصطفیٰ صادق
- ڈمی اخبارات سرکاری چندے پر پلتے ہیں — روزنامہ جنگ — عارف نظامی
- بھٹو سے پنگا لیا اور سرخرو ہوئے — اردو ڈائجسٹ — ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
- فلم کی طرح صحافت میں بھی دو نمبر مافیا کا غلبہ ہے — فیملی — علی سفیان آفاقی
- سابق صدر پرویز مشرف محب وطن پاکستانی ہیں — جنگ — ڈاکٹر صفدر محمود
- کالم نگار، ایڈیٹر اور حکومت کو بیوقوف بنا کر اپنی بات کہہ جاتا ہے — روزنامہ ایکسپریس — عبدالقادر حسن
- خاکروب ملک کا سب سے بڑا خادم ہے — اشفاق احمد
- پورا ملک میرے مخالفوں سے بھرا ہوا ہے — جنگ — احمد ندیم قاسمی
- ادبی جائزہ میرٹ کی بنیاد پر لکھتا ہوں — نوائے وقت — ڈاکٹر انور سدید
- سیاستدانوں کی موجودہ لاٹ میں کوئی لیڈر نہیں — روزنامہ ایکسپریس — عباس اطہر
- اصل نماز مسجد سے باہر ہوتی ہے — جنگ — حسن نثار
- تقسیم ایوارڈ میں ہمیشہ ڈنڈی ماری جاتی ہے — جنگ — عطاء الحق قاسمی
- میں ضیاء الحق دور کا پہلا قیدی تھا — جنگ — نذیر ناجی
- اب ادب کا زمانہ نہیں رہا — نوائے وقت — اجمل نیازی
- میرے ملک کا صحافی اگر اخبار کی حرمت کو نہ بیچتا تو ہم بہت آگے ہوتے — اوصاف — سرفراز سیّد
- اپنے خاندان میں واحد پڑھا لکھا آدمی ہوں — روزنامہ ایکسپریس — امجد اسلام امجد
- سیاحتی مقامات کے باسیوں کی حالت زار خوبصورت وادیوں پر بدنما دھبہ ہے — فری لانسر — عارف محمود اُپل

ناشر: چودھری جمیل اختر

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

آفس نمبر 34، فرسٹ فلور، شالیمار مارکیٹ
مین بلیوارڈ، ڈیفنس لاہور (0333-4393422)

انجمنِ خیال (خطوط)

عزیزم سونان اظہر جاوید!

مَیں اور میری فیملی آپ کے والد محترم جناب اظہر جاوید کی وفات پر پیغام تعزیت دیتے ہیں اور آپ کے دُکھ اور آپ کی امی جان مسرت اظہر کے ملال میں اور تمہاری ہمشیرہ سلمونیہ اور ان کی فیملی ممبران کے رنج والم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ خدائے رب العزت آپ سب کو اور خاص طور پر ہماری بھابھی مسرت کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

.... مسز شمیم خان اور خان پرویز، لندن

برخوردار سونان اظہر جاوید! السلام علیکم!

برادرِ محترم اظہر جاوید کو اللہ کریم اپنا جوارِ رحمت نصیب فرمائے۔ ان کی آخرت کی منزلیں آسان اور درجات بلند فرمائے۔ آپ کے والد ماجد عظیم انسان تھے، ادب کی دنیا میں ان کا نام اور مقام بہت بلند ہے۔ ان کے محبّ اور قدردان دنیا کے ہر اس گوشے میں پائے جاتے ہیں جہاں تک ان کا مؤقر جریدہ ''تخلیق'' جاتا تھا۔ آپ نے اور مرحوم کے احباب نے ''تخلیق'' کو جاری رکھنے کا عزم باندھا ہے، مرحبا مرحبا! ''تخلیق'' اظہر جاوید کا مشن تھا، نظریاتی وابستگی تھی، مطمح حیات تھا۔ انہوں نے یہ جریدہ چالیس برس سے زائد خونِ دل سے سینچا اور تادم واپسیں جاری رکھا، انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد! اللہ رب العزت آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ عمر دراز بخشے!

.... آپ کا چچا......سلطان احمد علوی، سرگودھا

اظہر جاوید صاحب ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری یادداشتوں میں، ہمارے تذکروں میں، ہماری محفلوں میں اور ہماری لائبریری میں ہمیشہ موجود رہیں گے، آپ کا نام آپ کا کام ختم نہیں ہوسکتا۔ آپ ادب میں امر ہوگئے ہیں، جو امر ہو جاتا ہے وہ ختم نہیں ہوسکتا، ہم آپ سے بالمشافہ نہیں مل سکے لیکن آپ ہمارے پاس بہ صورت 'تخلیق' آتے رہے، کئی برسوں کے ''تخلیق'' آپ کی صورت میں موجود ہیں۔ جو ہمیشہ موجود رہیں گے، آپ کے اندیشے، آپ کے اندازے، آپ کے الفاظ آپ کی تحریریں ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی، فانی انسان تو چلا جاتا ہے، لیکن اِس کا لکھا ہوا کبھی ختم نہیں ہوتا ہے، تو آپ بھی ختم نہیں ہوئے، اظہر جاوید ایک نئے انداز میں ہمارے ساتھ ہے، ہمارے دلوں میں ہے، ہمیشہ رہے گا، سچ ہے لکھنے والا ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا

عشق اور اس کی محبت 'ادب' ہے، آپ کی محبت بھی ختم نہیں ہو سکتی لوگ کہتے ہیں کہ ''تخلیق'' ختم ہو گیا،نہیں اظہر جاوید کا 'تخلیق' ختم ہونے کیلئے نہیں ہے۔اظہر جاوید صاحب آپ تخلیق میں امر ہو گئے ہیں۔جو امر ہو جاتا ہے وہ مرا نہیں کرتا۔

عادل حسن......کراچی

....

عزیز و مکرم سونان اظہر جاوید

7 مارچ 2012ء کو آپ کا خط ملا۔تعمیلِ ارشاد میں فوراً نظم ہو گئی جو آج 8 مارچ کو دفتر کے پتے پر بھیج رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مرحوم کی محبت ہی تھی جس نے پل چھن میں نظم کہنے پر مجبور کر دیا۔

''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' نکالنا بہت مستحسن فیصلہ ہے۔میری دعا ہے کہ رب العزت آپ کو کامیابیوں سے سرفراز فرمائے۔مرحوم کی وفات سے چند روز پہلے میں نے ''تخلیق'' کے پرچے کے لیے ایک غزل، نذرِ مومن، خلوصِ مہر و محبت پہ جو ہوا سو ہوا'' ارسال کی تھی۔اُسے کسی آئندہ شمارے میں شامل نہ کیجیے گا۔وہ ''الحمرا'' میں چھپ رہی ہے۔لہٰذا مذکورہ غزل اور اُس سے منسلک خط ضائع کر دیجیے گا۔اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

نیاز آگیں: امین راحت چغتائی (کراچی)

....

عزیزم سونان اظہر جاوید

آپ کے والد اور ہمارے دیرینہ اور محترم دوست اظہر جاوید صاحب کی ناگہانی رحلت پر دل بہت مغموم ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ان کے اور ہمارے ایک بہت قریبی دوست ضیاء الرحمٰن ضیاء صاحب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے والد کے جاری کردہ رسالے 'تخلیق' کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اگلا شمارہ ان کی یاد میں نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب فرمائے اور آپ کی زندگی کو خوشیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار کرے۔

اظہر جاوید صاحب نے کبھی نئے ذرائع ابلاغ یعنی انٹرنیٹ، ای میل، فیس بک وغیرہ کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن آپ سے ہماری استدعا ہے کہ آپ اس آسان، تیز رفتار اور سستے کمیونی کیشن میڈیم پر ضرور توجہ دیں اور اسے رابطے اور تخلیق کی بہتری اور فروغ کے لئے استعمال کریں۔ آپ کی خوشیوں اور بہتر مستقبل کا خواہاں

خورشید عالم سیّد، کراچی

....

عزیزم سونان میاں! دعائیں لاتعداد!

ایک مختصر سا مضمون بھیج رہی ہوں۔خدا کرے بروقت مل جائے۔18/ مارچ کے ختم میں حاضر نہ ہو سکی۔ان دنوں میں کراچی میں تھی۔اب قومی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے اسلام آباد میں ہوں۔اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔آمین!

دعا گو......**بشریٰ رحمان**، اسلام آباد

....

سونان بیٹے!

اظہر جاوید کے سانحۂ ارتحال کا غم آپ کا ہی نہیں ہم سب کا مشترکہ غم ہے۔ اظہر جاوید جیسے انسان کہاں روز روز پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ان کے روابط گذشتہ پینتیس سال سے تھے۔ یہی مدت میری تخلیقات کی ''تخلیق'' میں شائع ہونے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو صبرِ جمیل کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین! اظہر بھائی کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔

شریکِ غم ...... **سجاد مرزا، گوجرانوالہ** ....

عزیز القدر سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام و دعا، بے بہا۔ اپنے مخلص دوست آپ کے ابا حضور کی اچانک وفات پر یہ اشعار کہے تھے جو ''تخلیق'' کے اظہر جاوید نمبر کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ اگر چہ اس میں تاخیر ہوگئی ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے آپ آزمائش کے اس دور میں ثابت قدم رہیں گے۔ پرخلوص دعاؤں کے ساتھ، آپ کی درازئ عمر اور کامیاب زندگی کے لئے سراپا دُعا۔

صفدر سلیم سیال (جھنگ) ....

عزیزم سونان اظہر جاوید!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ''تخلیق'' کی اشاعت ملک کے مشہور اور عظیم قلم کار جاری رکھیں گے۔ اللہ ان عظیم فن کاروں کو اپنے ارادے میں پختگی دے۔ اظہر جاوید صاحب کے بارے اپنے تاثرات بھیج رہا ہوں۔ دو ایک روز میں اظہر جاوید صاحب کے بارے نظم بھی ارسال کر دوں گا۔

والسلام...... **پروفیسر زُہیر کنجاہی** (راولپنڈی) ....

محترمی/محترمہ!

سلام مسنون! مجھے نہیں معلوم کہ اظہر جاوید صاحب کے بعد 'تخلیق' کی اشاعت کی ذمہ داریاں کون نبھائے گا؟ معلوم ہوا کہ 'تخلیق' شائع ہو رہا ہے اور اظہر جاوید نمبر کی صورت میں منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ خوشی ہوئی کہ آپ تخلیق کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے حوالے سے اظہر جاوید صاحب کا نام بھی۔ ایک مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ ''تخلیق'' کی کامیابی کے لیے دعائیں!

رضی الدین رضی (ملتان) ....

برادرم! پہلے تو اظہر جاوید کے انتقال پر دلی تعزیت قبول کیجئے۔ میرا ان سے پرانا تعلق تھا۔ دوستی اور ادب پرستی دونوں کا۔ پروردگارِ عالم انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین! ضیاالرحمٰن ضیاء جس کی زبانی پتہ چلا کہ آپ اظہر جاوید نمبر نکال رہے ہیں، بے حد اچھا لگا۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ ایک مضمون اپنی یادوں کے حوالے سے ارسال کر رہا ہوں۔

خلوص کار، **نجم الحسن رضوی**، کراچی ....

محترمی!

اظہر جاوید میرا دیرینہ دوست تھا۔ میرا اس سے تعارف کنول فیروز کے ذریعہ ہوا۔ اظہر جاوید، ستار طاہر اور راقم الحروف فری لانسر کے طور پر ایک عرصے تک روزنامہ 'امروز' میں ترجمہ نگار کی حیثیت سے مضامین لکھتے رہے۔ اظہر جاوید نے کئی ڈائجسٹوں، رسائل اور جرائد میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ روزنامہ 'امروز' میں تو اسے کل وقتی ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے وہاں کئی سال تک کام کیا۔ آخرکار ''امروز'' بھی دم توڑ گیا۔

اب اس نے اپنے رسالہ ''تخلیق'' پر خاص توجہ مرکوز کی اور دوماہی رسالہ ''تخلیق'' پوری آب وتاب سے نکلتا اور تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ اظہر جاوید نے پاکستان، بھارت اور دیگر مغربی ممالک کے نئے لکھنے والوں کو بالخصوص متعارف کرایا۔ یوں یہ رسالہ 1969ء سے پُرشکوہ انداز میں اظہر جاوید کے سانحۂ انتقال تک چلتا رہا۔

اظہر جاوید ایک لائق ایڈیٹر، شاعر، مصنف اور مترجم تھا۔ اس نے اداریہ نویسی میں ایک نیا انداز وضع کیا تھا۔ خلوص و ہمدردی اس کے رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی۔ ہم قلم دوستوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ افسوس، وہ اس دارِفانی سے کوچ کر گیا۔

حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد

سالار مسعودی، لاہور

....

پیارے سونان اظہر جاوید!

جناب اظہر جاوید نہایت خامشی کے ساتھ ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اُٹھ کر چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اُن کے وصال کی خبر پڑھتے ہی دل کی دھڑکنوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد جب دھڑکنوں کا تسلسل قائم ہوا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اظہر جاوید، آپ کے شفیق والدِ محترم تھے۔ لیکن عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود مجھے یہ اعزاز حاصل تھا کہ میں اُن کے بے تکلّف دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ اُن کی حسبِ فطرت خوش دلانہ پذیرائی اور حسنِ سلوک نے مجھے کم عمر، کم علم ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ ''تخلیق'' کے دفتر میں حاضری ہوتی۔ وہ ادبی لطیفوں اور چٹکلوں سے ہمیشہ محظوظ کرتے۔ جب جانے کی اجازت طلب کرتا وہ مجھے کسی نہ کسی ادبی تقریب کے دعوت نامے سے اور کتاب سے نوازتے۔

سونان بھائی! اُن کی گوری چٹی رنگت، سفید ریشم بال، پتلے ہونٹ، لمبی ناک، مناسب قد، فطرت نے اُنہیں غیر معمولی جمال بخشا تھا۔ ہلکے رنگ کے سوٹ پہنے جب وہ میرے دفتر تشریف لاتے بے اختیار اُن کی اُجلی اُجلی، نکھری نکھری، سوہنی من موہنی شخصیت کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ یقیناً حُسن پرست لوگ اپنے انتخاب اور اظہار میں کبھی بُخل سے کام نہیں لیتے۔ دوچار پروگرامز میں مجھے نقیبِ محفل کے فرائض ادا کرنے پڑے۔ اُن کے خطاب کی دعوت سے پہلے میں اُن کے حُسن

و جمال کا ممدوح بن گیا۔ ''کوئی چہرہ خوبصورت ناک کے بغیر خوبصورت نہیں ہوتا''۔ وہ خوبصورت انسان تھے اور اپنے سینے میں ایک نہایت خوبصورت دل رکھتے تھے۔ ''تخلیق'' دو ماہ کے کٹھن انتظار کے بعد موصول ہوتا۔ سب سے پہلے ''اپنی بات'' پڑھتا۔ مجھے سخت حیرت ہوتی کہ وُہ ''اپنی بات'' میں اپنے احساسات کی شدید تپش کو کیسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں؟ جبکہ پڑھنے والوں کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ ''اپنی بات'' کے بعد ''انجمنِ خیال'' (خطوط) کو جی بھر کے پڑھتا اور ایک انجانی سی مسرت سے میں سرشار ہو جاتا کہ ادب کے شناور ''اظہر جاوید'' سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ ''برادرِ عزیز''، ''جانِ من''، ''جانِ لطف و کرم''، ''محترم اظہر''، ''اظہر جاوید جی'' خطوط نویسوں کا یہ اندازِ تخاطب مجھے بہت بھلا لگتا۔ اور یہ اُن کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

آخر کار، ایک خوبصورت شخص اپنے خوبصورت دل کے ہاتھوں مات کھا گیا۔ اس دورِ خرابات میں جب ہر بلندی پستی کی زد میں ہے، حالات و واقعات نے انفرادی صفات کے اظہار کی کئی راہیں بند کر دی ہیں لیکن ''تخلیق'' کا بیالیس سال تک مسلسل اجراء، مالی تعاون کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا، نہ ہی زبوں حالی کا واویلا مچانا۔ خودداری اور غیرت مند ہو کر زندگی بسر کرنا اور پھر قدیم روایات کا بھی امین ہونا۔ یہ صرف اور صرف ''اظہر جاوید'' کا ہی کام ہے۔ ''اظہر جاوید'' اپنی تخلیق کے حرفوں، لفظوں میں زندہ ہے اور زندہ رہے گا......

....

برکات احمد نیاز

سونا ن اظہر جاوید! دعائیں!

اظہر جاوید صاحب سے میرا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ یہ تعلق 1982ء میں قائم ہوا تھا اور اس تعلق کو قائم کرانے والے میرے اور ان کے مشترکہ دوست قیوم زاہد تھے۔ اس زمانے میں اظہر صاحب ''امروز'' سے وابستہ تھے اور میں نیشنل بینک کی جانب سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ پہلی نگاہ ہی میں اچھے لگ جاتے ہیں، دل میں بس جاتے ہیں۔ اظہر صاحب ان میں سے ایک تھے۔ یہ تعلق ایسا بڑھا کہ جب بھی لاہور جانا ہوتا اظہر جاوید صاحب سے ملاقات اس دورے کا لازمی حصہ ہوتی جس کا مقصد اُن کی نرم اور دھیمے لہجہ میں شائستہ، پھول برساتی گفتگو میں شامل ہونا ہوتا تھا۔

''تخلیق'' کے ''اظہر جاوید نمبر'' کے بعد تمہارے اور ممتاز اہلِ قلم کے عزم سے ماہ بہ ماہ اشاعت کا پڑھ کر اب یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ ''تخلیق'' دیگر ادبی پرچوں کی طرح قصۂ ماضی نہیں بنے گا بلکہ اظہر جاوید کے مشن کو لے کر آگے بڑھتا جائے گا۔ نیشنل بینک میں بحیثیت پی آر او فرائض انجام دینے کے بعد ''تخلیق'' کے نیشنل بینک کے اشتہار کے لئے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کوشش جاری رہی ہے اور اب اس میں چوہدری اشفاق جو اب پی آر ڈیپارٹمنٹ میں تعینات ہیں کا بھی عملی تعاون شامل ہے۔ آئندہ ''تخلیق'' کے لئے جس لائق رہا دامے درمے، سخنے میری خدمات حاضر ہیں۔

اور ہاں اُن کے ''تخلیق'' کے لفافے پر سبز رنگ سے لکھے پتہ کو نہ معلوم کیوں میں نے لاشعوری طور پر ان لفافوں کو

محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا اور اب تمہارے ملنے والے خط پر سبز رنگ میں پتہ دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا نام دفتری ریکارڈ میں ان کے چاہنے والوں کی فہرست میں شامل ہے۔تخلیق کی ترقی اور تمہاری صحت وزندگی کی دعا کے ساتھ۔

جمیل صدیقی

....

محترمی!

دو روز قبل سرگودھا سے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب نے مجھے بذریعہ SMS مطلع کیا کہ برادر عزیز، محترم اظہر جاوید کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔ میں مرحوم سے غائبانہ طور پر کافی عرصے سے متعارف تھا کیونکہ میری مزاحیہ تحریریں ’’تخلیق‘‘ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔فروری 2012ء کے تازہ ترین شمارے میں بھی میرا مضمون (قلم سے کفگیر تک) موجود ہے۔تاہم میری ان سے بالمشافہ ملاقات جولائی 2009ء میں ’’ادارہ ثقافت اسلامیہ‘‘ کے دفتر میں ہوئی تھی جب سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے ادیبوں کا وفد اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت پنجاب کے دورے پر تھا، وہاں لاہور کے چند دیگر ثقہ ادیب اور دانشور بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں اظہر جاوید صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ جو خلوص اور کھرا پن ان کی تحریر میں تھا میں نے وہی ان کی گفتگو میں بھی پایا۔

مندرجہ بالا دورے کی روداد سفر نامے کی صورت میں دو سال تک ’’ٹیلی نیوز‘‘ (کراچی) میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔اس کی ایک قسط میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے دورے کا بھی ذکر تھا۔جس کا تراشہ میں نے اظہر جاوید صاحب کو بھیجا تھا۔، اب یہ سفر نامہ کتابی صورت میں زیرِ طباعت ہے۔ اس میں مذکورہ ملاقات کا احوال اور اظہر جاوید صاحب کی ادبی خدمات کا بیان (مع تصویر) آ رہا ہے۔

میں نے بہ صد عجز و نیاز مرحوم کے لئے قرآن حکیم کے ایک پارے کا ایصالِ ثواب کر دیا ہے جو مجھ پر واجب تھا۔
میری دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)

’’تخلیق‘‘ نے اظہر جاوید صاحب کی ماہرانہ ادارت میں اردو اور پنجابی ادب کی جو گراں قدر خدمت کی ہے وہ ان دونوں زبانوں کی ادبی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ بیالیس سال تک ایک ضخیم ادبی دستاویز کی اشاعت ایک کارِ دارد ہے جو ان کے جذبے، حوصلے، عزم اور خلوص کے باعث ممکن ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ ادبی صحافت پر انہوں نے جو اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں وہ اظہر جاوید صاحب کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لئے کافی ہیں۔

ازراہِ نوازش میرے مندرجہ بالا جذبات مرحوم کے اہل خاندان تک پہنچا دیجئے۔شکریہ۔

ایس ایم معین قریشی (کراچی)

◆◆◆